آموزش

۹ شماره ۴] — لاهور — [جولائی ۹۵۶

اس شمارہ میں

ر ہ تحریر { پروفیسرسراج الدین / پروفیسر ایم - اے - مخدومی }

معاونین { عبدالغفور چوهدری / فضل احمد }

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

جولائی سنہ ۱۹۵۶ء

جلد ـــــــــ ۹

شمارہ ـــــــــ ۴

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

ناشر

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

ر، ایچ ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

ادارىہ

اُستادوں کی قومی تنظیم کی ضرورت

ایم۔ اے مخدومی

آزاد جمہوری زندگی میں یہ بات اہم ہے کہ ہر پیشہ قومی سطح پر منظم ہو تاکہ نہ صرف وہ اپنے جائز حقوق کا تحفظ کر سکے بلکہ قومی تعمیر میں ایک باوقار اور مؤثر کردار بھی ادا کر سکے۔ جدید زندگی میں معلّمی کے پیشے کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ملک کی تعلیمی ضرورتوں کا صحیح جائزہ لینا۔ عوام کو ان ضرورتوں سے آگاہ کرنا۔ موزوں قسم کے تعلیمی قوانین منظور کرانا استادوں کی تربیت کے لیے موزوں معیار مقرر کرنا۔ تعلیمی تحقیق کے میدان میں رہنمائی کے فرائض انجام دینا۔ یہ اور اس قسم کی دوسری اہم تعلیمی خدمات انجام دینا فی الحقیقت استادوں کی قومی تنظیم ہی کا کام ہے۔

قومی سطح پر ہمارے یہاں استادوں کی کوئی تنظیم موجود نہیں۔ صوبوں میں استادوں کے مختلف گروہوں کی چند تنظیمیں ضرور موجود ہیں مثلاً بورڈ ٹیچرز یونین۔ لیکچررز ایسوسی ایشن وغیرہ۔ ان جزوی تنظیموں میں بڑی کمی یہ ہے، کہ ان کی وساطت سے تعلیم عوام کو ایک آواز سے نہیں بلکہ کئی آوازوں سے خطاب کرتی ہے۔ جس سے نہ رائے عامہ کو کوئی فائدہ پہونچتا ہے اور نہ تعلیم کو۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ملک میں کام کرنے والے تمام استاد، خواہ وہ کسی سطح پر یا کسی حیثیت سے بھی کام کرتے ہوں۔ ایک ہمہ گیر قومی تنظیم میں منسلک ہو جائیں۔ اس تنظیم کے مختلف شعبے ہو سکتے ہیں مثلاً یونی ورسٹی تعلیم کا شعبہ، ثانوی تعلیم کا شعبہ۔ ابتدائی تعلیم کا شعبہ، نگرانی اور انتظام کرنے والے افسروں کا شعبہ اور اس قسم کے دوسرے اور شعبے لیکن ان تمام شعبوں کو ایک مرکزی قیادت کے ماتحت لاکر ان میں ہم آہنگی اور ربط پیدا کرنا چاہیے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اس قسم کی قومی تنظیمیں موجود ہیں۔ امریکہ کی نیشنل ایجوکیشن ایسوسی ایشن اس قسم کی قومی تنظیم کی بہترین مثال ہے۔

دوسرے ملکوں سے جو ماہرین تعلیم پاکستان میں آتے ہیں انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہاں استادوں کی کوئی قومی تنظیم موجود نہیں۔ آزاد زندگی کی تعمیر ہمیشہ آزاد ذہنوں پر ہوا کرتی ہے۔ ذہنی آزادی کی پہلی شرط تعلیم کا ہر خارجی اثر سے آزاد ہونا ہے۔ جب تک ہمارے استاد تمام تعلیمی امور حکومت پر چھوڑے رکھیں گے، اس وقت تک پیشہ معلمی کو وہ بلند مقام حاصل نہیں ہو سکتا جس کا وہ جائز طور پر حق دار ہے۔

غرض آزاد قومی زندگی نے جو نئی ذمہ داریاں پیدا کی ہیں ان میں سے استادوں کو بھی اپنا حصہ جرأت اور ہوش مندی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ قومی تعمیر میں تعلیم کو جو کلیدی کردار ادا کرنا ہے اس کا بوجھ پاکستانی استادوں کی قومی تنظیم ہی اٹھا سکتی ہے۔ پیشہ معلمی کے لیے یہ ایک بے حد اہم مسئلہ ہے جس کے متعلق تمام استادوں کو بڑی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

جامعہ اسلامیہ

فضل احمد

ایک ثانوی درس گاہ جس کا ہال وسعت کے لحاظ سے یونی ورسٹی ہال لاہور کے لگ بھگ ہو جس کی سائنسی تجربہ گاہ ۵۳×۲۰×۲ فٹ اور کتب خانہ بھی اتنا ہی بڑا ، اس کی تعداد طلبہ کے متعلق کیا قیاس کیا جائے گا۔ یقیناً ایسے مثالی ادارے میں طلبہ کی بے پناہ بھیڑ ہونی چاہیے۔ گو وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے۔ جب جامعہ اسلامیہ واقع کوٹ خدا بخش عطا ضلع منٹگمری میں مغربی پاکستان کے گوشے گوشے سے طالب علم کھچے چلے آئیں گے لیکن اس وقت اس درس گاہ میں تعداد طلبہ قابل رشک حد تک محدود ہے۔ دسویں جماعت میں تقریباً درجن بھر لڑکے ہوں گے اور نویں میں دو درجن۔ سب سے زیادہ تعداد چھٹی جماعت میں ہے جس میں کوئی پچاس لڑکے درج رجسٹر ہیں۔

تعداد کی یہ کمی دو اسباب کی رہین منت ہے :-

(۱) جامعہ اسلامیہ کا یہ پہلا سال ہے۔ اور پہلے ہی سال چھٹی سے دسویں تک تمام جماعتیں جاری کر دی گئی ہیں۔

(۲) جامعہ کو دانستہ طور پر ایک ایسے علاقے میں جاری کیا گیا ہے جو تعلیمی بیداری اور سیاسی شعور کے لحاظ سے پاکستان کے پسماندہ ترین رقبوں میں سے ہے، یہ درس گاہ عارف والا سے کوئی چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور اس سے چند میل آگے دریائے ستلج کے پار سابقہ ریاست بہاولپور کا وہ علاقہ شروع ہو جاتا ہے جہاں میلوں تک کوئی ہائی سکول موجود نہیں اور جہاں کا سارا معاشرہ آج بھی قرون وسطیٰ کے روح کش معاشی نظام اور اس سے پیدا ہونے والی معاشرتی روایات کی گرفت میں ہے۔

تعلیم اور معاشرہ

تعلیم ہر معاشرے کے تحفظ اور بقا کا ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ ہر معاشرہ بعض اقدار پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ اقدار روایات اور مجلسی آداب کا جامہ پہن لیتی ہیں۔ ان میں سے بعض غیر رسمی طور پر خانگی زندگی اور مجلسی میل ملاپ کے ضمن میں ہی نئی پود کو منتقل کر دی جاتی ہیں اور بعض کے لیے رسمی درس و تدریس لازمی نظر آتی ہے۔ اس رسمی تعلیم کا ذریعہ مدرسہ ہے۔ لہٰذا ہر معاشرہ مدرسے سے

بجا طور پر یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ محض لکھنا پڑھنا ہی نہ سکھائے بلکہ اس لکھائی پڑھائی کو مخصوص معاشرتی اقتدار کے انتقال کا ذریعہ
بنائے۔ لکھائی پڑھائی بذات خود مقصود نہیں ہیں بلکہ اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کے لیے آلوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر
مدرسے کے لیے بے حد اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ تعلیم کس مقصد کے لیے دی جائے:

جس وقت برطانیہ اور امریکہ میں عوامی ذہن کو ہر طرح کی زنجیروں سے آزاد کرنے کے لیے تعلیم کو عام کرنے
کی تحریکیں چل رہی تھیں، تقریباً اس زمانے میں نپولین فرانس میں عوامی تعلیم کے لیے مدرسوں کا جال بچھا رہا تھا لیکن
یہ تعلیم عوامی ذہن کو آزاد بنانے کے لیے نہیں بلکہ اسے آمریت کا زیادہ مستعد آلہ کار بنانے کے لیے تھی۔ زمانہ حال میں
ہٹلر اور موسولینی بھی عوامی تعلیم کے سرگرم حامی ہو گذرے ہیں۔ مگر سب کو معلوم ہے کہ اس تعلیم نے جرمنی اور اٹلی کے عوام کو
آزاد، بے لاگ نگاہ عطا کرنے کی بجائے ایک اندھا دھند تعصب کا شکار بنا دیا تھا۔ زمانہ ماقبل جنگ کے جاپان میں
بھی خواندگی کا تناسب بہت بلند تھا لیکن تعلیم کی یہ روشنی شہنشاہ جاپان کی الوہیت کے باطل تصور کو کمزور نہ کر سکی۔

غرض ہر معاشرہ تعلیم کو اپنی پسندیدہ اقدار کی بقا کا آلہ کار بناتا ہے۔ ہیگل اور کارل مارکس اس نظریاتی جھگڑے
میں الجھے بغیر کہ آیا نظریات اور اقدار پہلے جنم لیتے ہیں یا معاشی نظام، ہم یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ
دونوں میں سے اولیت خواہ کسی کو بھی ہو تعلیم کو بہر حال ان کے تابع رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر تعلیم کا رخ ان سے
مخالف سمت میں ہو تو زود یا بدیر معاشرتی اقدار اور معاشی نظام کا حلیہ بھی بدل کر رہے گا۔

یہ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ جامعہ اسلامیہ کے بانی نے اپنی تعلیمی کوششوں کا مرکز ایک ایسے علاقے کو
بنایا ہے جہاں انسانوں کی اکثریت کو اپنے شرف انسانی تک میں یقین نہیں۔ ان کے ساتھ صدیوں سے غیر انسانی سلوک
ہوتا چلا آیا ہے اور وہ اسے ایک قدرتی چیز سمجھنے لگے ہیں۔ صدیاں گذریں یہ بدنصیب دین فطرت کی گود میں آئے
تھے مگر یہاں بھی انہیں اسلامی ناموں کے سوا اور کچھ نہ دیا گیا۔ تھوڑی بہت بدلی ہوئی شکلوں میں وہ آج بھی انہی اصول
و روایتی لکیروں کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں جنہوں نے ان کے بت پرست اسلاف کے ذہنوں کو ماؤف
کر رکھا تھا۔ جامعہ اسلامیہ یہ مقصد لے کر اٹھی ہے کہ ان تمام ذہنی زنجیروں کو توڑ کر ان لوگوں کو شرف انسانیت کی لذت
سے آشنا کرے اور انہیں اسلام کی حقیقی برکات سے مالا مال کرے۔

اسی جہاد میں جامعہ کے نوجوان اساتذہ کو جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کی تعبیر ایک استاد نے

ان الفاظ میں کھینچی ہے :-

ان لڑکوں میں یہ شعور پیدا کرنے کے لیے کہ تم بھی باقی انسانوں جیسے انسان ہو بڑا جتن کرنا پڑے گا۔ ان میں سے اچھے سمجھ دار لڑکے بھی جب استاد کو ملنے آتے ہیں تو بلا تامل زمین پر بیٹھ جاتے ہیں جب انہیں ہاتھ سے گھسیٹ کر پاس پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھنے کو کہا جاتا ہے تو انہیں ایسا ہی پریشان کن تعجب ہوتا ہے جیسے کسی غلیظ بھنگی سے کہا جائے کہ مسجد میں امام کے مصلے پر کھڑا ہو کر جماعت کرائے، مگر رفتہ رفتہ وہ اس نئی بلند تر حیثیت کو قبول کرنے لگے ہیں"

ایک سہانے خواب کی تعبیر

نومبر ۱۹۵۵ء میں میرا تعارف پہلی بار رانا ظفر اللہ بانی جامعہ اسلامیہ سے ہوا۔ اس صحبت میں مجوزہ جامعہ اسلامیہ کے متعلق کچھ ابتدائی بات چیت ہوئی۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد اس منصوبہ پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے کے لیے ایک جلسہ بلایا گیا جس میں مختلف تجرباتی پس منظر کے لوگ شریک تھے۔ منصوبہ سب کو پسند تھا، مگر بعضوں نے یہی مشورہ دیا کہ اتنے لمبے چوڑے منصوبے کو بیک وقت ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ابتدائی درجوں سے کام شروع کیا جائے اور آٹھ دس سال کے عرصے میں پوری درس گاہ وجود میں آ جائے۔ سب سے بڑا اندیشہ مجوزہ تعلیمی ادارے کی مالیات کے متعلق ظاہر کیا گیا۔ ایک صاحب نے واشگاف الفاظ میں کہا:- "ظفر! اس وقت مالی امداد کے جو وعدے کیے جا رہے ہیں اغلب یہ ہے کہ ان میں سے اکثر پورے نہیں ہوں گے۔ بہت سی غیر متوقع سمتوں سے مخالفتیں سر اٹھائیں گی۔ جو اصحاب آج یہاں جمع ہیں ان میں سے بعض کو زبانی تائید کی توفیق بھی باقی نہیں رہے گی۔ بہتر ہے کہ ہر قدم بڑی احتیاط سے پھونک پھونک کر رکھا جائے اور اپنی مالی بساط کے مطابق پاؤں پھیلائے جائیں"

اس پُرخلوص انتباہ کے باوجود دسمبر ۱۹۵۵ء کے اواخر میں جامعہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا اور اکابرین علاقہ کے ایک بڑے مجمع میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اپریل میں جامعہ چھٹی سے دسویں تک تمام جماعتوں میں لڑکے داخل کرے گی۔ اپریل تک جامعہ کی وسیع عمارت کا وسطی حصہ جو اس درس گاہ کے دفاتر پر مشتمل ہے، تیار ہو چکا تھا۔ اس دفتر میں ملازم رکھے جانے والے اساتذہ کے ساتھ انٹرویو کیا گیا اور تعطیلات بہار کے بعد وسط اپریل میں جامعہ نے باقاعدہ کام شروع کر دیا۔

مئی کے تیسرے ہفتے میں مجھے پہلی بار اس سہانے سپنے کی جزوی تعبیر دیکھنے کا موقع ملا جس کی لفظی شرح پچھلے نومبر کے

ایک مختصر سے اجتماع میں سنی تھی۔ عمارت کا وسطی حصہ مکمل ہو چکا تھا۔ اس کا بایاں بازو جس میں سائنس کی کشادہ تجربہ گاہ واقع ہے، تیزی سے سر اٹھا رہا تھا اور دائیں بازو کی ابھی بنیادیں ہی بھری گئی تھیں۔ دائیں بازو سے کوئی سو گز کے فاصلہ پر سڑک کے پار، استادوں کے لیے رہائشی مکان تیزی سے تیار ہو رہے تھے۔ ہر جگہ معماروں کے ہتھوڑوں اور بڑھئیوں کے اوزاروں کی کھٹا کھٹ جاری تھی، درجنوں مزدور کام پر لگے تھے اور اس تعمیری ہماہمی کے درمیان نوجوان استادوں کی ایک جماعت بڑی دل سوزی اور تندہی سے اس پسماندہ علاقے کے بچوں اور نوجوانوں کے دل و دماغ کو جہالت اور ذہنی غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرنے میں مصروف تھی۔

میں دیر تک اس روح پرور تصویر کے مختلف پہلوؤں کو دیکھتا رہا۔ کمی اور نایابی کے اس دور میں ایک دور افتادہ گمنام، دیہی گوشے میں اتنی وسیع و عریض عمارت کی داغ بیل ڈال دینا اور اسے اتنی تیزی سے تکمیل کے مراحل تک لے جانا ایک ایسا بڑا کارنامہ ہے جس کی شرح کسی غیر معمولی قوت کی کارفرمائی میں ہی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ اینٹیں خود اپنے بھٹوں میں تیار کرائی جا رہی تھیں۔ کوئلے کی کمی کا علاج لکڑی سے کیا گیا تھا۔ آہنی گاڈروں کا بدل سیمنٹ کے شہتیروں کی شکل میں تلاش کیا گیا تھا۔ غرض کسی کم یابی یا نایابی کو کام کا راستہ روکنے کی اجازت نہ دی گئی تھی اور عمارت اصل نقشے کے عین مطابق جدید ترین وضع کی تیار ہو رہی تھی۔ ایک باعزم انسان کے حسین خواب کی اس ٹھوس تعبیر کو دیکھتے دیکھتے میں مرکزی بلاک کے سامنے آن رکا، جہاں سنگ بنیاد نصب تھا۔ یہ چھوٹا سا پتھر اس بے پناہ قوت کا اعلان کر رہا تھا جو اس عظیم الشان منصوبے کے لیے قوت محرکہ کا کام کر رہی ہے۔ یہ قوت قرآن حکیم کے یہ چند جامع اور بلیغ الفاظ تھے:۔

"إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَمْوَالَهُمْ وَأَنفُسَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔" (ترجمہ: بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کے مال اور ان کی جانیں جنت کے بدلے خرید لی ہیں)

میں دیر تک اس پتھر کے سامنے کھڑا اس آیہ کریمہ کے مطالب پر غور کرتا رہا۔ بے شک کوئی بھی بڑا اور قابل ذکر کارنامہ انجام دینے کے لیے ایسے انسان یا انسانوں کی ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو اپنے مال اور جان کو ذاتی ملکیت نہیں بلکہ قوم و ملک کی امانت سمجھے۔ زندگی کا یہ ابدی راز جو خیر الامت کو بتایا گیا تھا اب ہی اس کی ناخلف اولاد کے دلوں سے محو ہو چکا ہے۔ آج اس قوم کے افراد، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں روپے سالانہ کتوں، گھوڑ دوڑوں، تمباکو اور دوسری منشیات اور لغویات کی نذر کر دیتے ہیں جب کہ ان کے بچے قطار در قطار غیر ملکی مسیحی سکولوں کے دروازوں سے جگہ جگہ ٹھکرائے جاتے ہیں

سیاہ بخت بچے اور ان کے والدین رہ رہ کر یہ آرزو کرتے ہیں کہ کاش انہیں بھی ان غیر ملکی مدرسوں میں تہذیب
لاق کی سعادت مل جائے جن کے استادوں کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جنہیں کل تک چھونا بھی برا خیال کیا
اتھا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

بے نفسی اور خدمت خلق کا جو سبق ہمیں دیا گیا تھا وہ آج مغرب کی میراث ہے ہمارے اکثر اہل ثروت بھی غیر ملکی
ہی اداروں کے آگے ہاتھ پھیلانا عار نہیں سمجھتے۔ اگر ان لوگوں میں سے کچھ بھی ایسے ہوں جو اپنی دولت
م و ملک کی امانت سمجھنے لگیں تو ہماری بہت سی قومی مصیبتیں جلد ختم ہو جائیں۔ جامعہ اسلامیہ اس بے لوث
مت کی طرف ایک نمایاں قدم ہے۔ امید رکھنی چاہیے کہ اس کا وجود دوسرے ذی استطاعت لوگوں کے دلوں میں سچے
ذبات خدمت ابھارنے کا موجب ہوگا۔

صنعتی اور حرفتی تعلیم

جامعہ اسلامیہ اگر محض ایک اچھا ثانوی مدرسہ بننے پر ہی اکتفا کر دیتی تو یہ بھی ایک قابل قدر چیز تھی۔ مگر جامعہ کا
سارا تصور تعلیم کے جدید ترین نظریات پر قائم کیا گیا ہے۔ موجودہ دنیا سائنس اور ٹکنالوجی کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں باعزت
زندگی گذارنے کے لیے ہمیں سائنس اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں دوسری قوموں کے شانہ بشانہ چلنا چاہیے۔ قومی عظمت کی
عمارت مضبوط معاشی بنیادوں پر ہی اٹھائی جا سکتی ہے۔ جامعہ اسلامیہ کے منصوبے میں اس حقیقت کو لحظہ بھر کے لیے
نظر انداز نہیں کیا گیا۔ سائنس کی بہترین تدریس جامعہ اسلامیہ کا امتیازی نشان ہوگا۔ اس غرض کے لیے نہ صرف ایک وسیع
تجربہ گاہ اور ایک عمدہ لیکچر تھیٹر تیار کیا گیا ہے۔ بلکہ جدید ترین سائنسی سامان بھی فراہم کیا گیا ہے۔

مگر سائنس کی نظری تعلیم پر رک جانا ہرگز مقصود نہیں۔ جامعہ میں کئی ایک صنعتی اور حرفتی ورک شاپ موجود
ہوں گے جن میں سائنس کی نظری تعلیم سے عملی کام لینا سکھایا جائے گا۔ جدید زرعی اور صنعتی مشینوں کو یکجا کرنا۔ ان کی
مرمت کرنا اور ان سے کام لینا سکھایا جائے گا۔ مثلاً زرعی فارم میں نہ صرف ٹریکٹروں اور دوسرے مشینی آلات سے کام لینا
سکھایا جائے گا بلکہ ورک شاپ میں ان مشینوں کی مرمت بھی ہو سکے گی۔ اسی طور پر بجلی کے کام اور موٹروں کے کام کے
ورک شاپ ہوں گے جہاں فنی ماہر طلبہ کو صنعت و حرفت کی عملی تربیت دیں گے۔

اس جدید صنعتی و حرفتی تعلیم کے پہلو بہ پہلو چھوٹی صنعتوں میں عملی تربیت کا اہتمام بھی ہوگا۔ ہماری معیشت بنیادی

طور پر ایک زرعی معیشت ہے جس میں گھریلو صنعتوں کو بہت اہم مقام حاصل ہے۔ اس گنجان آباد پسماندہ ملک میں پہلی ضرورت یہ ہے کہ انفرادی آمدنی بڑھانے کی آسان راہیں ڈھونڈی جائیں۔ پاکستان اشیائے صارفین کی بہت بڑی منڈی ہے حال ہی تک اس منڈی پر کلی طور پر غیر ملکی کارخانہ داروں کا قبضہ رہا ہے۔ اب ملک میں کچھ کارخانے قائم ہو گئے ہیں، لیکن تمام اشیائے صارفین سستے داموں گھر پر تیار کرنے کی اکیلی صورت یہ ہے کہ گھریلو صنعتوں کا گھر گھر چرچا ہو تاکہ بہت بڑے پیمانے پر ضائع ہونے والی انسانی قوت کو سودمند راہوں پر لگایا جائے اور اس طرح نہ صرف انفرادی آمدنی میں اضافہ کیا جائے بلکہ اس آمدنی سے خریدی جانے والی اشیاء و خدمات کے ذخیرے میں بھی نمایاں اضافہ یقینی ہو جائے زرعی پیداوار کی کئی چیزیں جواب بالکل بے کار ہیں یا برائے نام افادیت رکھتی ہیں۔ سائنس اور فنی مہارت کی بدولت ان سے بڑی کارآمد چیزیں بنائی جاسکتی ہیں۔ دیہی قصبوں میں سبزیوں اور پھلوں کی کاشت کو بڑھانا، انہیں محفوظ کرنا اچھے مویشی اور مرغیاں پالنا۔ ریشم کے کیڑے پالنا۔ گھریلو استعمال کی چیزیں تیار کرنا، یہ اور اس قسم کی دوسری دست کاریاں جامعہ میں گھریلو صنعت کے طور پر سکھائی جائیں گی۔

تربیت کردار

جامعہ کے نصاب میں جو اہمیت سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کو دی گئی ہے۔ بالکل وہی اہمیت تربیت کردار کو حاصل ہے۔ یہ غایت حاصل کرنے کے لیے رسمی وعظ و تلقین کو سہارا نہیں بنایا جائے گا بلکہ جامعہ کی ساری زندگی میں بھی اسلامی اقدار کو یوں سمو دیا جائے گا کہ اس زندگی میں حصہ لینے والا ہر بچہ غیر شعوری طور پر ان اقدار کو جذب کر لے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ کو ہر شہری اثر سے دور ایک خود مکتفی معاشرہ بنایا جا رہا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جو اپنی ساری ضرورتوں اور اپنے تمام انتظامات کا خود ذمہ دار ہوگا، یہ سارا کام زیادہ تر طلبہ کے ہاتھوں انجام پائے گا، وہ جامعہ کی کوآپریٹو دکانوں، اس کے بنک اور دوسرے اجتماعی اداروں کو چلائیں گے۔ اپنے دارالطعام کا بندوبست سنبھالیں گے اور جامعہ کے انتظامی امور میں حصہ لیں گے۔ یہ سارا کام اسلامی شوریٰ اور جمہوری نمائندگی کے اصولوں پر انجام پائے گا۔ اس سے طلبہ میں نہ صرف احترام نفس اور خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ بلکہ وہ افہام و تفہیم رواداری۔ بردباری، امانت، دیانت اور بے غرض خدمت کے بلند اوصاف کی عملی تربیت بھی حاصل کریں گے۔

اس جمہوری اجتماعی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے ساتھ ساتھ طلبہ کو قرآن اور اسوۂ نبوی کی تعلیم بھی دی جائے گی

تاکہ روشنی کے وہ بلند مینار ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے رہیں جن کی رہنمائی میں انہیں زندگی کے گردابوں سے بچ کر سفر طے کرنا ہے۔ یہ تعلیم بھی رسمی درس و تدریس کی بجائے زیادہ تر مطالعہ و مذاکرہ کی شکل میں ہوگی۔ عربی زبان کا پڑھنا ہر طالب علم کے لیے لازمی ہوگا تاکہ وہ اسلامی ثقافت کے سرچشموں سے بذاتِ خود سیرابی حاصل کر سکے۔

کتب خانہ

جدید تعلیم جائز طور پر واقفیت اور معلومات کی بجائے اطوار و عادات کو تعلیم کا اصل مقصد قرار دیتی ہے۔ روایت پرست تعلیم کا یہ تصور کہ طلبہ کو پیچیدہ گردانیں اور الجھے ہوئے کلیات و قواعد رٹانے سے ذہنی ضبط پیدا ہوتا ہے جدید تعلیم کے نزدیک ناقابلِ قبول ہے۔ ترقی پسند تعلیم درست طور پر یہ کہتی ہے کہ رٹے ہوئے قواعد اور معلومات محض ایک ذہنی بوجھ کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ بوجھ مدرسہ چھوڑنے کے بعد جلد ہی بے طیب خاطر اتار پھینکا جاتا ہے کیوں کہ عملی زندگی میں اس کی کوئی افادیت نہیں۔ اس رٹوانی طریق تدریس سے اگر کوئی پائدار ذہنی مزاج پیدا ہوتا ہے تو وہ مدرسے اور کتابوں سے ایک مستقل تنفر ہے۔ یقیناً یہ بڑی ناپسندیدہ نتیجہ ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ مدرسے چھوڑنے پر طالب علم اپنے ساتھ مطالعہ کا مستقل شوق اور مطالعہ کرنے کا صحیح ڈھنگ لے کر جائے۔ تاکہ زندگی میں جب کبھی کسی قسم کی معلومات اور واقفیت کی ضرورت پڑے تو وہ انہیں آسانی سے فراہم کر لیا کرے۔ نیز وہ اپنے فارغ اوقات کو پرلطف مطالعہ سے پُر کر لیا کرے۔ جو تعلیم یہ پسندیدہ ذہنی اطوار پیدا نہیں کرتی وہ شاندار امتحانی نتائج دکھانے کے باوجود اپنے حقیقی مقصد میں بری طرح ناکام رہتی ہے۔

آج ہمیں معیاروں کے گرنے کی جو عام شکایت ہے اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہمارے طلبہ امتحان تو پاس کر لیتے ہیں ان میں تجسس اور تفکر کا جذبہ مفقود رہتا ہے۔ مدرسوں اور کالجوں میں انہیں رٹنا سکھایا جاتا ہے۔ اپنے طور پر مطالعہ کرنا اور خود سوچنا نہیں سکھایا جاتا۔ ترقی یافتہ ملک اس تباہ کن "تعلیمی مرض" کے بارے میں بے حد محتاط ہیں۔ اس کی مؤثر روک تھام کے لیے انہوں نے کتب خانوں کو ترقی دی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ان کے نظامِ تعلیم کے حقیقی دھڑکتے ہوئے دل کمرہ ہائے جماعت کی بجائے سکولوں اور کالجوں کے کتب خانے ہیں، ان کتب خانوں میں ہر طرح کی سہولتوں کی فراوانی ہے۔ یہ دن اور رات کا بیشتر حصہ کھلے رہتے ہیں۔ یہاں ہر طالب علم اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق کتابیں، اخبارات و رسائل اور حوالے پڑھتا اور ان کے نوٹ لیتا ہے۔ طلبہ کی مدد اور رہنمائی کا پورا انتظام موجود رہتا ہے۔ اس طور پر ہر طالب علم کسی نہ کسی حد تک تحقیق و تعمق کی وہ نگاہ حاصل کر لیتا ہے جو انکشاف و اختراع کی پہلی شرط ہے۔

جامعہ اسلامیہ نے کتب خانے کو اس کی صحیح اہمیت دی ہے، جیسا پہلے کہا گیا ہے۔ یہ ایک بڑا ہال ہوگا جس میں مختلف زبانوں اور رنگارنگ موضوعات پر پرانی اور نئی کتابیں جمع کر دی جائیں گی، جامعہ کے ہر طالب علم کے لیے ممکن ہوگا کہ کتب خانہ میں بیٹھ کر سائنس ٹیکنالوجی اور دوسرے علمی میدانوں میں تازہ ترین افکار و معلومات کو اخذ کر لے۔

غرض کتب خانہ اور سائنس کی تجربہ گاہ جامعہ اسلامیہ کے دو اہم مراکز اعصاب ہوں گے۔ جامعہ کا وسیع و عریض ہال ان دونوں مرکزوں کے ادراکات کی نشر و اشاعت کا مرکز ہوگا۔ اس ہال میں جامعہ کے بسنے والے نہ صرف علمی اور سائنسی مباحثوں اور مذاکروں کے لیے جمع ہوا کریں گے بلکہ اپنی اجتماعی زندگی کے مسائل طے کرنے کے لیے بھی۔

اساتذہ

جامعہ اسلامیہ کو پہلے دن سے اس بات کا قوی احساس ہے کہ کوئی نصاب خواہ کیسا ہی بلند اور جامع کیوں نہ ہو اسے حقیقت کا لباس پہنانے والے اساتذہ ہوتے ہیں۔ کسی درس گاہ کا معیار تعلیم اور اس کی زندگی کی عام سطح اس کے اساتذہ کی علمیت اور شخصیت سے بلند تر کبھی نہیں ہو سکتی۔ یہ اس احساس کا نتیجہ ہے کہ استادوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتی گئی ہے۔ حتی الامکان کوشش یہ کی گئی ہے کہ ایسے نوجوانوں کی خدمات حاصل کی جائیں جو علمی کو محض کسب معاش کا ذریعہ ہی خیال نہ کرتے ہوں بلکہ اس پیشے کے ساتھ سرگرم نظریاتی لگاؤ بھی رکھتے ہوں۔

ان پیش بندیوں کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا کہ استاد بھی دوسرے لوگوں کی طرح زندگی کی معاشی ضرورتوں سے بالا نہیں۔ جامعہ نے ان کی تنخواہوں اور پیمانہ ہائے تنخواہ کے بارے میں فراخ دلی برتی ہے، امید رکھنی چاہیے کہ ابتدائی تعمیری مسائل پر قابو پا لینے کے بعد جامعہ کے استادوں کو مزید سہولتیں دی جا سکیں گی۔

مادی صلہ کے علاوہ جامعہ کے استادوں کی دوران ملازمت بالیدگی کا تسلی بخش انتظام کیا گیا ہے۔ اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ جامعہ کے نوجوان استاد پیشہ ورانہ فکر کی پیش قدمی سے مسلسل باخبر رہیں اور ملکی اور عالمی تعلیمی مسائل کے بہاؤ سے کٹ کر الگ تھلگ نہ ہونے پائیں۔ استادوں کی یہ ذہنی بیداری اور پیشہ ورانہ بالیدگی جامعہ کی بلند علمی اور فنی سطح کی سب سے بڑی ضمانت ہو گی۔

مستقبل قریب کی جھلک

اس وقت جامعہ اسلامیہ ایک ثانوی مدرسہ ہے اور بس۔ مگر یہ اس کی زندگی کا اولین قدم ہے جس سے آگے

ے اعلیٰ تر علمی اور فنی تعلیم کی کئی منزلوں کا سامان کرنا ہے۔ منتہائے نظر یہ ہے کہ جامعہ اسلامیہ ایک مستقل یونیو
جائے جس میں نہ صرف پاکستان کے گوشے گوشے سے علم و فن کے پیاسے کھچے آئیں بلکہ جو بیرونی ممالک بالخصو
دوسرے اسلامی ملکوں کے طلبہ کے لیے بھی کشش کا باعث ہو۔

جامعہ اسلامیہ میں طلبہ کے لیے ایک اول درجہ کا دار الاقامت تیار کیا جا رہا ہے۔ مگر یہاں ایسے طالب علم
ھتے ہیں جو صرف دن کے وقت تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایسے بچوں کو آنے جانے کی خاطر خواہ سہولتیں مہیا کرنے کے لیے
اپنی بسیں ہوں گی جو بچوں اور نوجوانوں کو صبح کے وقت منٹگمری اور بہاول نگر تک کے شہروں قصبوں اور دیہات
ے آیا کریں گی اور شام کو واپس انہی مقامات تک پہنچایا کریں گی۔ جامعہ بچوں کے دوپہر کے کھانے کا بندوبست بھی کر
۔ ہر بچے کو دن میں کم سے کم ایک بار متوازن غذا مل سکے۔

شاید یہاں یہ پوچھا جائے کہ جامعہ کا یہ مستقبل کتنی دور ہے؟ جن لوگوں نے پچھلے چند مہینوں میں جامعہ ..
ایک معین لفظی منصوبے سے وجود میں آتے دیکھا ہے وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مستقبل بہت قریب
ن نگاہوں نے جامعہ اسلامیہ کو آج دیکھا ہے وہ چند سال بعد اسے مشکل ہی سے پہچان سکیں گی۔

غیر نصابی سرگرمیاں

جامعہ اسلامیہ کی زندگی کا ایک بڑا امتیازی پہلو اس کی طرح طرح کی غیر نصابی سرگرمیاں ہوں گی۔ فوجی تربیت
ریب قریب ہر طالب علم کے لیے لازمی ہو گی۔ تیراکی سکھانے کے لیے ایک بڑا تالاب تعمیر کیا جا رہا ہے۔ گھوڑ سوا
ی مشق کے لیے گھوڑوں کا اصطبل موجود ہو گا۔ ہر قسم کی کھیلیں اور جسمانی کرتب ہوں گے۔ سیر و سیاحت کے وسیع
مہیا کیے جائیں گے۔ تعطیلات گرما میں جامعہ بیرونی ملکوں کی یونیورسٹیوں کے ساتھ استادوں اور طلبہ کے تبادلہ
ہ پروگراموں پر عمل کیا کرے گی۔ طلبہ کو ہر ممکن سہولت دی جائے گی کہ وہ اپنے ملک کے مختلف حصوں اور بیرونی دنیا
اکثر حصوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور قدرتی دولت کے خزانوں کے امکانات کا جائزہ لینا سیکھیں۔

ان سرگرمیوں کے علاوہ جامعہ کی اجتماعی زندگی بے شمار چھوٹی چھوٹی انجمنوں، کلبوں اور مجلسوں میں
ہو گی تاکہ ہر بچہ اپنی استعداد اور دلچسپی کے مطابق گروہی زندگی میں حصہ لینا اور اس کی ذمہ داری سنبھ
سیکھنے۔ اس محدود گروہی زندگی میں اسے قیادت اور اطاعت کے صحیح مفہوم کا علم ہو، وہ بلا جھجک اپنے

دوسروں کے سامنے بیان کرنے کے قابل ہو جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے انفرادی جوہروں کو آزادی سے سطح پر آنے کا موقع ملے۔ یہ رنگارنگ گروہی سرگرمیاں باہم مل کر جامعہ کی کل اجتماعی زندگی کو متوازن اور ہم آہنگ شکل دیں گی۔ ایسی زندگی جس میں حصہ لے کر آج کے بچے اور نوجوان کل کی شہری ذمہ داریاں قابلیت اور کامیابی کے ساتھ سنبھالنے قابل ہو جائیں گے۔

ب ـ مثالی ادارہ

جامعہ اسلامیہ کوٹ خدا بخش خان کو کئی اعتبار سے ایک مثالی درس گاہ کہا جا سکتا ہے۔ ملک میں اس وقت بعض اول درجے کی سرکاری درسگاہیں موجود ہیں۔ ان میں بہت سی صرف علمی تعلیم دیتی ہیں اور کچھ ٹیکنیکل تعلیم۔ جامعہ اسلامیہ تعلیم کے ان دونوں پہلوؤں کو یکجا کر کے پیش کر رہی ہے۔ لیکن موجودہ سرکاری اور غیر سرکاری ادارے امتحانی نتائج کو اہمیت دیتے ہیں۔ تشکیل کردار ان کے نصابوں کی ضمنی پیداوار کہلا سکتی ہے۔ ان کا مرکزی نقطہ نہیں۔ جامعہ اسلامیہ میں کردار و سیرت کو ہر منزل پر پہلا درجہ حاصل ہے۔ جامعہ اسلامیہ کا سب سے نمایاں پہلو اس درس گاہ کی غیر سرکاری نوعیت ہے۔ آج تک ہماری تعلیم کی سب سے بڑی کمی یہ رہی ہے کہ اس کے تمام خدوخال کی شکل پذیری سرکاری رہنمائی میں ہوئی ہے۔ نجی کوشش نے اگر اس وادی میں ڈرتے ڈرتے قدم بھی رکھا ہے تو اس نے بلا تامل سرکاری رہنمائی ہی کی پیروی کی ہے۔ جامعہ اسلامیہ سب سے پہلی نجی تعلیمی کوشش ہے جس نے بڑی جرأت سے اپنے لیے ایک نئی راہ تجویز کی ہے۔

اپنے ابتدائی مراحل پر جامعہ اسلامیہ کا نصاب اور اس کا اسلوب کار امریکی ہمہ گیر مدرسے سے ملتا جلتا ہے۔ پاکستانی مٹی میں یہ پودا بالکل نیا ہے۔ لیکن اس مٹی کے ساتھ اس کی سوزنیت میں کچھ کلام نہیں۔ نئی نئی آزاد زندگی کے تقاضے ہمارے نوجوانوں کی ہمہ جہتی نشوونما کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جامعہ اسلامیہ اس اہم قومی ضرورت کی تشفی کی طرف پہلا جرأت مندانہ قدم ہے۔ امید ہے کہ یہ مثالی پاکستان کی تعبیر نو کا خواب دیکھنے والوں کے لیے امید کا پیغام ثابت ہوگی اور جامعہ اسلامیہ ایک ایسا مرکز ثابت ہوگا جس سے قومی جسم کو تازہ اور صحت مند خون مہیا ہونے لگے گا۔ تعلیم میں دلچسپی رکھنے والے تمام پاکستانی اس نئے تعلیمی تجربے کے نتائج بڑی دلچسپی سے مطالعہ کریں گے۔

بچوں کا نفسیاتی علاج

فضل الرحمان ناصر

نئی تعلیم کا امتیازی خاصہ

نئی تعلیم اور پرانی تعلیم میں بنیادی فرق صرف ایک ہے، وہ یہ کہ نئی تعلیم اپنے نظریات اور طریقہ ہائے کار کی بنیاد سائنسی حقائق پر رکھتی ہے۔ جبکہ پرانی تعلیم کا سارا سہارا روایات ہیں۔ موجودہ صدی کے آغاز تک تعلیم محض ایک فن کا درجہ رکھتی تھی، اس کے مروجہ طریقوں کی سند اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ پشتوں سے استاد ان پر عمل پیرا چلے آرہے تھے۔ کہیں کہیں بعض صاحب نظر استاد ایسے بھی تھے جو انسانی فطرت کی گہرائیوں کی جھلک دیکھ کر اپنے طریقہ ہائے کار کو ان کے مطابق ڈھال لیتے تھے۔ مگر سائنسی طریق کار کے ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو یکجا کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

غرض علم نفسیات کی آمد سے پہلے علم التعلیم کی بالکل وہی کیفیت تھی جو علم عضویات سے پہلے طب کی تھی۔ علم عضویات سے پہلے بھی انسانوں کا علاج کیا جاتا تھا، اول اول جادو منتروں اور تعویذوں سے پھر رفتہ رفتہ جڑی بوٹیوں سے۔ یہ علاج بعض اوقات بڑے شافی بھی ثابت ہوتے تھے۔ مگر ان کی تاثیر کے متعلق قطعی تقیین کسی صورت میں ممکن نہ تھا۔ عضویات کے علم کی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ علم طب کو بھی بلند تر مقام حاصل ہوتا گیا۔ بالکل یہی حال نفسیات اور تعلیم کے باہمی رشتے کا ہے۔

انسان نفسیاتی حقائق سے قطعی طور پر بے خبر کبھی نہیں رہا۔ مگران حقائق کو ایک منظم علم یعنی سائنس کا درجہ موجودہ صدی کے آغاز ہی میں ملا ہے نفسیات کی آمد نے علم التعلیم میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔ اس کی آمد سے پہلے تعلیم کے پاس کوئی ایسا ترازو نہ تھا جس کی مدد سے وہ اپنے نتائج کا درست اندازہ اور موازنہ کرسکتی۔ دو مدرسوں یا مختلف طریقہ ہائے تدریس کی اضافی افادیت کو ماپنے کا کوئی قابل اعتماد ذریعہ موجود نہ تھا۔ جب تک تعلیم کو اس قسم کا قابل اعتماد پیمانہ ہاتھ نہ لگ جاتا اس وقت تک اسے سائنس کا مقام ملنا محال تھا۔

نفسیات کی آمد نے تعلیم کی یہ اہم ضرورت پوری کردی۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں فرانسیسی مجلس

ئمین ساز نے ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ ضعیف العقل بچوں کی تعلیمی رفتار کا اندازہ کرنے کے لیے ذرائع تلاش کیے جائیں۔ اس کمیٹی میں سائمن اور بنے نامی دو صاحب نظر اراکین بھی تھے۔ بنے پیشے کے لحاظ سے ایک طبیب تھا ان دونوں کی دقتِ فکر کی بدولت بچوں کی ذہانت ناپنے کا ایک آلہ تیار ہوگیا۔ یہ آلہ بعد میں ذہنی خارج قسمت کے نام سے مشہور ہوا۔ شروع شروع میں یہ آلہ خاصہ بھدا تھا۔ مگر امریکی ماہرین نفسیات نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور چند ہی سال کے عرصے میں اسے ایک عمدہ اور اطمینان بخش شکل دے دی۔

ذہنی خارج قسمت کی بدولت تعلیم یک دم ایک حرفت کے درجے سے سائنس کے درجے کو جا پہنچی۔ اس آلے کی بدولت یہ ممکن ہوگیا کہ مختلف بچوں کی ذہانتوں کو تولا جا سکے اور مختلف مدرسوں کی کارگذاری کا موازنہ کیا جا سکے ذہنی خارج قسمت کے علاوہ طرح طرح کی نفسیاتی آزمائشیں وضع کی گئیں جن کی مدد سے بچوں اور نوجوانوں کی فطری استعدادوں، دلچسپیوں، ان کے اطوار اور ان کی کارکردگی کا تسلی بخش طور پر حال معلوم کرنا ممکن ہوگیا۔ ان تمام باتوں نے تعلیم کو ایک وقیع سائنس کا مقام عطا کر دیا۔

نئی اور پرانی تعلیم کے درمیان صرف یہی فرق ہے کہ اول الذکر اپنے طریقہ ہائے کار کی بنیاد نفسیاتی حقائق او انکشافات پر رکھتی ہے جبکہ ثانی الذکر روائتی طریقوں پر قانع رہتی ہے۔ جدید تعلیم اس بات کی قائل ہے کہ علم نفسیات نے گو انسانی ذہن کی کارفرمائیوں کے متعلق بہت سی کام کی باتیں بتائی ہیں۔ ابھی ان کے متعلق بہت کچھ معلوم کرنا باقی ہے۔ علم نفسیات اور دوسرے انسانی علوم جوں جوں نئے نئے نفسیاتی حقائق کی خبر دیں گے تعلیم کو فوراً ان کی روشنی میں اپنے انداز کار اور اسلوب فکر پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ تعلیم کو ایک تجرباتی طریق کار پر کاربند اور نئی تعلیمی سرحدیں معلوم کرنے کے لیے تیا رہنا چاہیے۔ روایت پرست تعلیم ان میں سے کسی بات کی قائل نہیں، وہ پرانی لکیروں کو ساتھ چمٹے رہنے کو ہی سب بڑا فنی کمال خیال کرتی ہے۔

نفسیاتی علاج

نئی تعلیم اپنے تمام مسائل حل کرنے کے لیے نفسیات سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ پرانی تعلیم کا یقین یہ ا کہ جو بچہ بے ڈھب نکلے اس کا واحد علاج بدنی سزا ہے۔ نفسیات نے اس نظریہ کا کھوکھلا پن پوری طر ظاہر کر دیا ہے۔ اس بارے میں تجرباتی شہادت ناقابل انکار ہے کیوں کہ بہت سے بچے جو مختلف مضامین

ناقابلِ علاج حد تک کمزور قرار دیے جا چکے تھے۔ ان کی کمزوری کی اصل وجہ ان کی لاپروائی یا غبی پن نہ تھا، بلکہ بعض نفسیاتی اسباب تھے۔ جب ان نفسیاتی اسباب کا تدارک کر دیا گیا تو ان کی تعلیمی کمزوری بھی از خود دور ہو گئی۔

بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک طالبِ علم جو پڑھائی میں کمزور ہے اس کا نفسیاتی علاج کیا جائے مگر یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ بعض بچے قرات میں محض اس لیے کمزور رہتے ہیں کہ وہ جذباتی الجھنوں کا شکار ہوتے ہیں۔ جونہی ان الجھنوں کا تدارک کیا گیا وہ فرفر کتاب پڑھنے لگے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں اب یہ چیز مدرسے کے بنیادی فرائض میں سمجھی جاتی ہے کہ وہ بچوں کی چھوٹی موٹی نفسیاتی رہ نمائی کا بندوبست کرے، وہ کمزور اور بے ڈھب بچوں کے ذاتی مسائل کا مطالعہ کرے اور ان کی ذہنی رکاوٹیں دور کرے۔ اس غرض کے لیے ہر بچے کا ایک مفصل ذاتی ریکارڈ تیار کیا جاتا ہے۔ مدرسے کے ایک استاد کا جزوقتی یا ہمہ وقتی کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے بچوں کی دست گیری کرے۔ بچوں کی ہر طرح کی مشکلات کو ہم دردی سے سنے اور انہیں مناسب مشورہ دے۔ مدرسے کے اس کام کو (GUIDANCE PROGRAMME) یعنی "رہ نمائی کا پروگرام" کا نام دیا جاتا ہے جس استاد کو یہ خدمت خصوصیت سے سونپی جاتی ہے اسے "مشیرِ طلبہ" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ استاد نہ صرف طلبہ کے ذاتی مسائل اور ضبط سے متعلق مسائل کو سلجھاتا ہے بلکہ مدرسہ چھوڑنے والے طلبہ کو پیشہ کے انتخاب کے بارے میں ماہرانہ رائے دیتا ہے۔

تاہم بچوں کے بعض نفسیاتی مسائل اتنے ٹیڑھے ہوتے ہیں کہ مدرسہ خود ان کا علاج نہیں کر سکتا۔ ایسے بچوں کو نفسیاتی علاج گاہوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اولاً ہر استاد یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنی جماعت کے طلبہ کو خود نفسیاتی مدد دے۔ اگر وہ کسی صورت میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا تو یہ معاملہ مشیرِ طلبہ کے حوالے کر دیتا ہے جس بچے کا نفسیاتی علاج مشیرِ طلبہ کے بس سے بھی باہر ہو، اسے نفسیاتی علاج گاہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ایک عام استاد جس حد تک خود بچوں کی دست گیری کر سکتا ہے۔ اس کی وضاحت نیچے دی ہوئی ایک مثال سے ہو سکے گی۔ اس مثال میں پہلی جماعت کی ایک استانی نے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی ایک ننھی شاگرد کا نفسیاتی علاج کیا اس علاج کی کیفیت خود اس استانی کی زبانی سنیے۔

<u>ایملی کا نفسیاتی علاج</u>:— یہ میری ایک شاگرد ایملی کی سچی کہانی ہے۔ میں نے اسے پہلی بار اس وقت دیکھا

جب وہ پہلی جماعت کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ سہمی سہمی قدم رکھ رہی تھی۔ وہ چھوٹی مگر مضبوط جسم کی تھی۔ اس کی بڑی بڑی گول آنکھیں ادھر ادھر یوں دیکھ رہی تھیں جیسے کسی دشمن ماحول کا جائزہ لے رہی ہوں۔

ایملی دو سالہ طالب علموں میں سے ایک تھی۔ وہ پچھلے سال بھی پہلی جماعت ہی میں پڑھتی تھی۔ مگر اس وقت اس جماعت کو ایک اور استاد پڑھاتا تھا۔ اس کے ریکارڈ کارڈ میں اور بھی کئی ایک دلچسپ تفصیلیں درج تھیں۔ ایملی کتاب بالکل نہیں پڑھ سکتی تھی۔ سچ یہ ہے کہ وہ ایک لفظ تک بھی نہ بولتی تھی۔ وہ استاد کے کسی سوال کا جواب نہ دیتی تھی اور نہ ہی جماعت کی کسی سرگرمی میں حصہ لیتی تھی۔

یہ پہلا دن تھا۔ اس لیے مجھے یہ سوچنے کا بہت کم موقع ملا کہ ایملی کی مدد کس طرح کی جائے تاکہ اس کی خوفناک مشکل ختم ہو جائے۔ جب کھیل کا گھنٹہ آیا تو میں اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ بچے گول دائرے میں کھڑے کھیل رہے تھے۔ میں نے دائرے میں کھڑے ہو کر ایملی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایملی کی طرف سے قطعاً کسی سرگرمی کا اظہار نہ ہوا۔ اس کا ہاتھ اس طرح بے حس و حرکت تھا جیسے کوئی پرندہ قید میں پھنسا ہو۔

دن گذرنے گئے۔ دوسرے لڑکے اور لڑکیاں بعض اوقات ستانے لگتے اور مدرسے کی سرگرمیوں سے خوب لطف اٹھاتے۔ تصویر کشی کے لیے ایک نیا پردہ لگایا گیا تھا۔ بچے باری باری اس کے سامنے جاتے اور تصویریں بنا بنا کر خوش ہوتے، ہر بچے نے پلاسٹک کا بنا ہوا جبہ پہن رکھا تھا اور جی میں جو ترنگ آتی تھی اس کے مطابق وہ رنگ سے شکلیں بناتا تھا۔ سب کے سب اس دل لگی میں مگن تھے۔ مگر ایملی پتھر کی طرح چپ چاپ بیٹھی تھی۔

جب بھی اسے ذرا اشارہ کیا گیا کہ وہ بھی کوئی تصویر بنائے اس نے جھٹ انکار میں سر پھیرا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے آثار سے خالی تھا۔ میں نے چند مرتبہ بڑے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرا اور دھیمی آواز میں کہا "ایملی جب بھی تم تصویر کشی کرنا چاہو مجھے بتا دینا کیا تم ایسا نہیں کرو گی؟" اس پر اس کی آنکھیں ابھر آئیں مگر وہ منہ سے کچھ نہ کہتی۔

میں تقریباً مایوس ہو گئی۔ میں نے جی میں کہا کہ اس بچے کا علاج نفسیاتی معالج ہی کو کرنا ہوگا۔

اچانک ایک صبح مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایملی مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ جب باقی تمام بچے پردے کے سامنے سے ہٹ گئے تو میں نے ایملی کا ہاتھ پکڑا اور سوالیہ انداز میں اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ دی۔ ایملی نے جھجکتے ہوئے کہا: "تصویر کشی ..... میں تصویر کشی کرنا چاہتی ہوں"۔ زندگی بھر میری طرح کی اور کسی نقطہ سے

اتنا اطمینان نصیب نہ ہوا تھا۔ جتنا آج ایلی کے اس جملہ سے ہوا۔

میں جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پردے کے سامنے لے گئی، میں نے اسے پلاسٹک کا جبّہ پہننے میں مدد دی اور دل سے دعا مانگی کہ وہ تصویر کشی میں لذت محسوس کرنے لگے۔

میں نے اگلے چند لمحے بڑی بے قراری میں گذارے۔ میں تصویر کشی کے پردے سے پرے چلی گئی تھی۔ مگر باربار دزدانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی تھی۔

ایلی نے ڈرتے ڈرتے برش ہاتھ میں پکڑا، اور اسے رنگ میں ڈال دیا۔ کئی منٹوں تک وہ اسے مضحکہ خیز انداز میں پردے پر ادھر اُدھر پھیرتی رہی۔ یہ منٹ مجھے ایک بہت لمبا عرصہ دکھائی دیتے تھے۔ میں سخت بے قراری کے عالم میں اس وقت کے انتظار میں تھی جب ایلی کا خوف دور ہو جائے۔ آخر یہ متوقع گھڑی آن پہونچی۔ ایلی تصویر کشی میں پورے طور پر محو تھی اور اس کام میں لذت محسوس کر رہی تھی۔

دس منٹ کے لمبے عرصے تک میں اپنے دوسرے کاموں میں لگی رہی۔ تب کسی نے میرا دامن کھینچا اور کہا "ذرا آکر دیکھیے" ایلی مجھے تصویر کشی کے پردے کی طرف لے جا رہی تھی۔

میں نے پہلے تصویر پر نگاہ ڈالی، پھر ایلی پر، اور مسکراتے ہوئے کہا "واہ، واہ، ایلی! یہ تو بے حد خوبصورت ہے،" ایلی نے خوشی سے سر ہلایا، اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

پھر خوشی سے اتراتے ہوئے اس نے کہا "یہ ایک پھول ہے۔ یہ میں نے بنایا ہے" اس نے آخری جملہ دو تین بار دہرایا۔ گویا یہ کارکردگی اس کی بساط سے کہیں بڑھ کر تھی، یکایک ایک بچہ دوڑتا ہوا ایلی کے ساتھی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اب اس کے دوڑنے کی باری تھی۔ مگر آج تک اس نے کبھی کھیل میں حصہ نہ لیا تھا۔ کیا آج یہ ممکن تھا؟ ہاں آج ایسا ہی ہوا۔ ایلی نے سر گھما کر میری طرف دیکھا اور بھاگ کھڑی ہوئی۔

اس وقت سے مجھے یقین ہو گیا کہ ایلی نے خوف اتار پھینکا ہے۔ اس وقت سے اس نے آہستہ آہستہ ہر چیز کو اخذ کرنا شروع کر دیا اور وہ ہر کام میں خوشی محسوس کرنے لگی۔

ترقی پسند تعلیم کے بنیادی تصوّرات

نذیر احمد

ترقی پسند تعلیم کی تحریک پہلی عالمی جنگ کے پیدا کردہ اسباب کا نتیجہ تھی۔ اگرچہ یہ تحریک بالکل نئی نہ تھی موجودہ صدی کے آغاز بلکہ اس سے بہت پہلے تمام صاحب نظر ماہرین تعلیم اس بات پر زور دیتے رہے کہ تعلیم کو انسانیت نواز، معقول اور بامعنی طریق کار اختیار کرنا چاہیے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ بچوں کی زندگیوں کو زیادہ بھرپور، زیادہ پُرمقصد اور زیادہ پُرمعنی بنایا جائے۔ پہلی عالمی جنگ نے تاریخ میں پہلی بار سائنسی آلات جنگ کی ہمہ گیر ہلاکت آفرینی کے امکانات کی نشان دہی کی۔ اس پر بعض حساس طبیعتوں میں اتنا شدید ردِّعمل پیدا ہوا کہ انہوں نے انسانی درندگی کے خلاف ایک عالمگیر تحریک جاری کرنا چاہی۔ اس تحریک کا آغاز انہوں نے مدرسوں سے کیا۔ یہ تعلیم کی ترقی پسند تحریک تھی۔

دونوں عالمی جنگوں کا درمیانی وقفہ ترقی پسند تعلیم کے شباب کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں یہ تحریک جنگل آگ کی تیزی کے ساتھ پہلے امریکہ میں پھیلی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے باقی مہذب ملکوں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ انگلستان اور دوسرے جمہوری ملکوں میں اسے بڑی مقبولیت نصیب ہوئی جن ملکوں نے نظریاتی اختلاف کی بنا پر اس تحریک کو کھلے طور پر نہ اپنایا۔ ان کا تعلیمی فکر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ مگر اس کی بہت سی بنیادی تدریس جوں کی توں برقرار رکھی گئی ہیں۔ اس مضمون میں ترقی پسند تعلیم کے بنیادی تصورات میں سے زیادہ اہم تصورات پر ایک مختصر نگاہ ڈالی جائے گی۔

شخصیت کا احترام

ترقی پسند تعلیم کا ایک مرکزی تصور یہ ہے کہ بچے کی شخصیت کا احترام بھی بالکل اسی طرح ہونا چاہیے جس طرح کسی بالغ کی شخصیت کا۔

یہ تصورات روایت پرست تعلیم کے اس بے رحمانہ نظریہ کے خلاف ردِّعمل تھا جو بچے کو کوئی طلعد یہ جذبات

اور احساسات سے عاری خیال کرتا تھا۔ استاد جماعت پر اس طرح چھایا رہتا تھا کہ بچوں کو دم مارنے کی اجازت نہ تھی۔ استاد جس طرح چاہتا اس کا تمسخر اڑاتا، اس کے ذمہ ایسے کام لگاتا جو اس کی استعداد اور پختگی سے بالکل باہر ہوتے اور اپنے ہر جائز، ناجائز حکم کی بجا آوری کے لیے بدنی سزا سے کام لیتا۔ اس کا نتیجہ مدرسے سے ایک ہمہ گیر تنفر کی صورت میں نکلتا۔ بچے مدرسے کے نام سے کانپتے اور اس سے جان بچانے کے لیے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈتے۔

ترقی پسند تعلیم کی تحریک نے مغربی ملکوں میں اس افسوسناک صورت حال کا کلی طور پر خاتمہ کر دیا ہے۔ مگر ہمارے ملک میں استادوں کی بھاری اکثریت ابھی اس بات کی قائل نہیں کہ استاد کو ایک آمر کی نہیں بلکہ ایک شفیق رہنما اور مددگار کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ جو لوگ روائتی ضبط کے حامی نہیں ان کی بڑی دلیل یہ ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کو ذرا سی ڈھیل مل جائے تو وہ ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ تجرباتی شہادت اس دلیل کو سہارا نہیں دیتی۔ جن مدرسوں نے اپنے ضبط کی بنیاد طالب علموں کی شخصیتوں کے احترام پر رکھی ان کا ضبط ایسا ہی معیاری رہا جیسا کسی بڑے سے بڑے جابر سر معلم کے مدرسے کا۔

یہ درست ہے کہ ترقی پسندی کی دھن میں بعض استاد اپنی قائدانہ حیثیت سے اس حد تک دست بردار ہو گئے کہ طالب علم ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ مگر اس قسم کی انتہائی صورتیں روایت پرست مدرسوں میں بھی پیش آجاتی ہیں بعض اوقات یوں بھی ہوا کہ طلبہ نے ایکا کر کے ایک بے حد سخت گیر استاد کے خلاف محاذ قائم کر لیا اور اسے مدرسے سے مار بھگایا۔ یا اسے سزا دینے کے لیے کوئی ایسی راہ نکالی جس سے اس کی ہیبت کا بھرم ہمیشہ کے لیے جاتا رہا راقم کو پرانی وضع کے ایک سخت گیر سر معلم کا واقعہ کبھی نہ بھولے گا۔ یہ بزرگوار ذرا ذرا سی بات پر مشق بیدزنی کے عادی تھے ایک روز بید اٹھائے ایک لڑکے کو پیٹنے کے لیے لپکے۔ لڑکا کچھ سزا کے خوف سے اور کچھ قصداً تیزی سے پیچھے ہٹا۔ اس پر سر معلم صاحب کے مزاج میں طوفانی تیزی آئی۔ غصے سے پیچ و تاب کھاتے دیوانہ وار آگے جھپٹے۔ اس بات سے بالکل بے خبر کہ راہ میں ایک چھوٹا سا بنچ حائل ہے۔ فوراً حضرت کی ٹکر اس سے لگی اور قلابازی کھا کر دھڑام سے اوندھے منہ گرے۔ پگڑ لڑھکتا ہوا کہیں کا کہیں گیا اور ایسی کرکری ہوئی کہ پھر اس جماعت میں طوفانی غصے کا مظاہرہ کبھی نہ کیا۔

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ بھی سن لیجیے۔ ایک بزعم خود غلط سر معلم کو اپنی مؤثر تدریس پر بڑا گھمنڈ تھا۔ لیکن یہ تاثیر سرتاپا بید کی پیداوار تھی۔ لڑکوں کو یوں جلاد وار پیٹتے کہ غریب اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ ان کے مضمون میں

ہیں لگے رہتے۔ ایک روز ایک طالب علم کی مرمت کرنے لگے، سردی کا موسم تھا، ابھی اس بیچارے کے بید کی چند ہی ضربیں لگی تھیں کہ غش کھا کر کھٹ سے بچوں کے بیچ میں گر پڑا۔ اس پر سر علم صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس بوکھلاہٹ میں آپ کی دلی کیفیت کا سارا حال جماعت پر اس بری طرح واضح ہوا کہ بید سے قائم کیا ہوا سارا رعب پل بھر میں جاتا رہا، اور باقی سارا سال حضرت کو گرگ ظالم کی بجائے کھسیانی بلی کا کردار ادا کرنا پڑا۔

پچھلی چند دہائیوں میں انسانی علوم نے جو تجرباتی شہادت جمع کی ہے اس نے بڑی شدت کے ساتھ ترقی پسند تعلیم کے اس نظریے کی تائید کی ہے کہ بچوں کے احساسات اور ان کی خواہشات کا احترام ہونا چاہیے۔ ہم کسی شخص کے طرز عمل پر اپنی گرفت قائم کر کے اس طرز عمل میں مستقل تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسا ہمہ گیر اصول ہے جس کا اطلاق بچوں اور نوجوانوں پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح بالغوں پر۔

تعلیم بامقصد سرگرمی کا نام ہے

ترقی پسند تعلیم کا دوسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ مؤثر تعلیم اس بامقصد سرگرمی کا نام ہے جس میں بچوں کی ضروریات کو مرکزی مقام حاصل ہو۔ یہ نظریہ روایت پرست تعلیم کے اس یقین کے خلاف ردعمل تھا کہ مضامین کو منطقی لحاظ سے مرتب کرنا چاہیے اور پھر انہیں رٹ لینا چاہیے۔ امتحانوں اور آئے دن کی آزمائشوں کے ذریعہ یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ یہ کام کس حد تک پورا ہوا ہے۔ تعلیم فقط اسی چیز سے عبارت ہے۔

تعلیم کا یہ فرسودہ تصور ہمارے یہاں آج بھی پورے طور پر ختم نہیں ہوا۔ مگر پہلی عالمی جنگ کے زمانہ تک اس کی حکمرانی تقریباً ہر جگہ تھی۔ ایک مغربی مصنف ۱۹۱۵ء میں لکھتا ہوا تعلیم کے مروجہ مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"علم کے ذخیرے کتابوں، مجوزہ درسی کتابوں اور استادوں اور عالموں کے دلوں میں موجود ہیں۔ مدرسے اس لیے وجود میں آئے ہیں کہ ان علمی ذخیروں کو پر چون کی شکل طلبہ تک پہنچائیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ علم کو ایسی جگہ سے، جہاں وہ ہے، ایسی جگہ تک پہونچائیں جہاں وہ نہیں۔ یہ کام آسانی سے انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ علم کو چھوٹے چھوٹے، احتیاط کے ساتھ تیار کیے ہوئے لقموں یا پوری صحت کے ساتھ ماپی ہوئی خوراکوں کی شکل دی جائے۔ یہ کام درسی کتابیں لکھنے والوں اور طریقہ ہائے تدریس وضع کرنے والوں کا ہے۔"

اس نظریہ کے مطابق تدریس اس بات کا نام ہے کہ طالب علم کو ہر روز علم کی مقررہ خوراکیں دے دی جائیں۔

سبق سننے اور امتحان لینے کی غرض یہ معلوم کرنا ہونا چاہیے کہ آیا یہ کام اچھی طرح انجام پا رہا ہے یا نہیں"

غرض تعلیم کے روایت پرست نظریے کے مطابق نفس مضمون اور اس کی منطقی ترتیب کو اولیت حاصل ہے اور بچے کو ثانوی درجہ. ترقی پسند تعلیم نے اس ترتیب کو بدل کر بچے کو اولیت کا درجہ دیا. اس نے یہ مطالبہ کیا کہ بچے کی موجودہ ضرورتیں اور دل چسپیاں ہی اس کی مؤثر تعلیم کا سرچشمہ قرار دی جانی چاہئیں۔ وہ کسی چیز کو ذاتی سرگرمی کے بغیر اخذ نہیں کر سکتا. ترقی پسند تعلیم نے اپنے اس نظریے کو پرزور طریق پر پیش کرنے کے لیے اس قسم کے مقولے وضع کیے جیسے: "ہم کام کر کے ہی کسی کام کو سیکھ سکتے ہیں" یا "ہم وہ باتیں سیکھتے ہیں جن پر ہم عمل کریں اور ہم انہیں باتوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں جو ہم نے سیکھ رکھی ہوں"۔

ان نظریات کی اشاعت نے تعلیمی فکر اور مدرسے کے نظم و نسق پر بڑا اثر ڈالا. پرانے تصورات کے مطابق بچے کے لیے چپ چاپ بیٹھے سنتے رہنے یا استاد کے حکم کے مطابق لکھنے پڑھنے کے سوا اور کچھ کام نہ تھا. نئے تصور نے اس کی پسند اور موجودہ ضرورتوں کو پہلی صف میں لا کھڑا کیا. اس سے مدرسے کی تعلیم اور اس کے ساز و سامان پر جو گہرا اثر پڑا اس کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۸۹۶ء میں جب جان ڈیوی نے کوئی ایسا مدرسہ تلاش کرنا چاہا جس کا ساز و سامان بچوں کی آزادانہ سرگرمیوں کا ساتھ دے سکے تو اسے کوئی ایسا مدرسہ نظر نہ آیا. آج حالت یہ ہے کہ مغرب کے ترقی پسند ملکوں میں پرانی وضع کے وہ ڈیسک سرے سے دستیاب ہی نہیں جن پر بچے جکڑے بیٹھا رہا کرتے تھے۔

اوّل اوّل ترقی پسند تعلیم کے اس تصور کو بہت دفعہ غلط سمجھا گیا. کئی استادوں نے بچوں کی ضرورتوں کو اولیت دینے کا مطلب یہ سمجھا کہ ان کی ہر ترنگ کی پیروی کی جائے. اس طرح کئی نام نہاد ترقی پسند استادوں نے اپنی تکمیل پورے طور پر بچوں کے ہاتھ میں دے کر بعض اوقات اپنے لیے مضحکہ خیز صورت حال پیدا کر لی۔

اب کئی سال گذر جانے پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جو حالات بچوں کی دل چسپی کا سامان پیدا کرتے ہیں، وہ بے حد پیچیدہ ہیں اور ان پر دعوے کے ساتھ انگلی رکھنا مشکل ہے. اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی یقینی ہے کہ جب تک بچے کسی چیز کے ساتھ کچھ نہ کچھ لگاؤ محسوس نہ کریں، جب تک انہیں کمرۂ جماعت کے سبق اور دوسری سرگرمیوں میں ذاتی مقاصد کی جھلک نظر نہ آئے، اس وقت تک وہ اس سے کوئی ایسی چیز اخذ نہیں کر سکتے جو پائدار قدر و قیمت رکھتی ہو. جوں جوں وقت گذرتا گیا یہ احساس بھی شدت پکڑتا گیا کہ بچوں کو ایسی سرگرمیوں کا راستہ دکھانا جو ان کے لیے حقیقی طور پر بامقصد

ہوں ایک بڑا مشکل کام ہے، اس بات کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے کہ استاد کے نقطۂ نگاہ سے کوئی سرگرمی طلبہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہو۔ مگر خود طلبہ میں اپنی ان ضرورتوں کا شعور پیدا نہ ہوا ہو۔

یہ سچ ہے کہ ترقی پسندی کی دھن میں بعض لوگ اس حد تک آگے نکل گئے کہ انہوں نے نفس مضمون کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ ان لوگوں کا نعرہ یہ تھا کہ "ہم بچے پڑھاتے ہیں مضامین نہیں پڑھاتے" اس افسوس ناک انتہائی موقف نے قوم کی ثقافتی میراث کو سرے سے غیر اہم خیال کیا، اس انتہا پسند نظریہ کے خلاف عرصہ سے ردّ عمل ہو چکا ہے۔ اب بجا طور پر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ نفس مضمون کو بھی بالکل وہی اہمیت حاصل ہے جو طریق تدریس کو۔ یہ بات بہت پسندیدہ ہے کہ استاد ایسے اسباق اور ایسی سرگرمیوں کا اہتمام کرے جو طلبہ کے مقاصد کے ساتھ مطابقت رکھتی ہوں۔ سبق میں دلچسپی پیدا کیے بغیر کوئی تدریس مؤثر نہیں ہو سکتی اور دلچسپی پیدا کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ طلبہ کی فوری ضرورتوں کو مرکز توجہ بنایا جائے۔ طریق تدریس میں یہ سب احتیاطیں بے حد اہم ہیں لیکن بالکل اسی قدر اہم یہ چیز ہے کہ تدریس کا نفس مضمون کیا ہے۔ کوئی ثقافت یا طرز زندگی زیادہ دیر تک اس بات سے بے نیاز نہیں رہ سکتی کہ نئی پود کو کونسی روایات منتقل کی جا رہی ہیں۔

طریق تدریس اور نفس مضمون پر بہ یک وقت نگاہ رکھنا آسان نہیں۔ روایت پرست استاد کو محض نفس مضمون سے غرض تھی اور ترقی پسند استاد کو محض طریق تدریس سے۔ موجودہ تعلیمی فکر ان دونوں کے بین بین راہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ قومی روایات اور ثقافتی اقدار کی قدر و قیمت کا بھی اسی قدر قائل ہے جس قدر سائنسی طریق کار کا۔ بایں ہمہ یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ ترقی پسند تعلیم نے یہ دوسرا بنیادی تصور پیش کر کے تعلیم کی ایک حقیقی خدمت انجام دی تھی۔

ہمہ جہتی نشوونما

ترقی پسند تعلیم کا تیسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ مدرسے کا فرض بچے کی ہمہ جہتی نشوونما ہونی چاہیے، یہ غایت حاصل کرنے کے لیے اسے ایسا اجازت دہ ماحول، اس قسم کی سرگرمیاں اور ایسی سہولتیں بہم پہنچانی چاہئیں کہ بچے کی تمام تخلیقی قوتیں نشوونما پا کر بروئے کار آنے لگیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر ترقی پسند تعلیم نے عملی فنون کو داخل نصاب کیا اور نصاب کے حدود کو وسعت دی۔

ترقی پسند تحریک کے آخری سالوں میں ذاتی ہم آہنگی کو زیادہ توجہ ملنے لگی تھی۔ کوشش یہ ہونے لگی تھی

طالب علم جو معلومات اور مہارتیں اخذ کرے ان سب کو اس کے ذاتی مسائل کے گرد منظم کیا جائے۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مضامین کی دو امتی حدیں بڑی حد تک ختم کر دی گئیں اور مسئلہ منصوبہ اور وحدت تعلیم مطالعہ کے ذریعے قرار پائے۔

جوں جوں ترقی پسند تعلیم کی تحریک نے زور پکڑا مدرسے نے بچے کی نشوونما کے مختلف پہلوؤں کے متعلق ذمہ داری قبول کرنا شروع کی۔ والدین نے اس رجحان کا بالعموم خیر مقدم کیا۔ بہت سے والدین بچوں کی ذہنی بالیدگی کے مسائل اور اس کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر نہ تھے۔ انہوں نے اس بات کو غنیمت جانا کہ مدرسہ ان کی ذمہ داری کا بڑا بوجھ اپنے کندھوں پر لینے لگا ہے۔ آج یہ مسئلہ موضوع بحث بنا ہوا ہے کہ آیا مدرسے کے فرائض میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ذہنی نشوونما کے علاوہ کسی اور چیز کی ذمہ داری قبول کرے۔ جو لوگ مدرسے کو بچے کی ہر قسم کی نشوونما کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتے ان کا کہنا ہے کہ اپنی بساط سے بڑھ کر پاؤں پھیلانے کے باعث مدرسہ اپنے پرانے فرض یعنی بچے کی ذہنی نشوونما کے بارے میں بھی قاصر رہنے لگا ہے۔ لہٰذا اسے چاہیے کہ پھر سے صرف اسی فرض کو اپنی ذمہ داری قرار دے اور اس ذمہ داری کو اچھی طرح نباہے۔

اس نکتہ چینی میں کہاں تک سچائی موجود ہے کہ بچے کی ہمہ جہتی نشوونما کی ذمہ داری سنبھالنے سے مدرسہ اسکی ذہنی نشوونما کی طرف بھی پوری طرح توجہ نہیں دے سکتا؟ اس سوال کا کوئی دو ٹوک جواب دینا بڑا مشکل ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ انسانی علوم کی شہادت جواب تک ہاتھ لگ سکی ہے وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ انسانی فطرت کے کسی ایک پہلو کو دوسرے پہلوؤں سے کلی طور پر الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی شخصیت ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے اور ہمیشہ بطور ایک وحدت کے ہی کام کرتی ہے۔ مثلاً قرأت سیکھنے اور ذاتی مراسم اور جذباتی ہم آہنگی کے درمیان بظاہر کوئی تعلق نہیں۔ لیکن یہ عین ممکن ہے کہ ایک بچے کو قرأت سیکھنے میں صرف اس لیے دشواری پیش آ رہی ہو کہ استاد یا ہم مکتبوں کے ساتھ اس کے ذاتی مراسم خوش گوار نہیں یا اس لیے کہ بعض ذاتی مسائل نے اس کے جذباتی توازن کو برہم کر رکھا ہے۔

نفسیاتی شہادت یہی ہے کہ کسی شخص کی ذہانت بالکل اکیلی کبھی کام نہیں کرتی۔ زندگی کی ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کی ساری ہستی کو بروئے کار آنا پڑتا ہے۔ اس کل ہستی میں ذہانت کے علاوہ انسان کی بدنی حالت، اس کے جذبات اور اطوار بھی شامل ہیں۔ اس نفسیاتی شہادت کی موجودگی میں مدرسوں کو یہ مشورہ دینا کہ وہ اپنی توجہ بعض ذہنی نشوونما پر مرکوز رکھیں، کوئی معقول مشورہ نظر نہیں آتا۔

تاہم اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ قابل سے قابل استاد بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ بچے کی ہر قسم کی بالیدگی کی راہنمائی کر سکتا ہے۔ اخلاقی اور روحانی اقدار اور معاشرتی آداب کے بہت سے سبق بچے کو لازمی طور پر گھر پر ہی سیکھنے چاہئیں۔ مغربی ملکوں میں گھر نے ان فرائض سے دست بردار ہو کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ افسوس ہے کہ مغرب کی اندھا دھند تقلید میں ہمارے یہاں بھی یہ رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ بہت سے "روشن خیال" پاکستانی والدین ایسے ہیں جو گھریلو ماحول کے مذہبی اور روحانی اقدار سے یکسر خالی ہونے کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ وہ غلطی سے یہ یقین کر لیتے ہیں کہ بچے کو کسی زیادہ فیس وصول کرنے والے انگریزی مدرسے میں داخل کرا دینے سے وہ اس کی ہمہ جہتی نشوونما کے متعلق مطمئن ہو سکتے ہیں یہ ایک بہت بڑی بھول ہے، جو گھر مذہبی اور روحانی اقدار کی حکمرانی سے خالی ہے اس کے پلے ہوئے بچوں کو مدرسہ اکیلا کوئی پائدار جذباتی تربیت عطا نہیں کر سکتا۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ گو انسانی شخصیت ہمیشہ بطور ایک وحدت کے کام کرتی ہے اور اس کے کسی ایک پہلو کو دوسرے پہلوؤں سے الگ نہیں کیا جا سکتا اس سے یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ اس کی تربیت کا کام ایک سے زیادہ اداروں کے درمیان تقسیم نہیں ہونا چاہیے۔ مدرسے کو یقیناً تعلیم و تربیت کے میدان میں قائدانہ کردار ادا کرنا چاہیے۔ مگر اس کام میں گھر اور مسجد کو بھی اس کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ یہ تینوں ادارے ایک سمت میں زور لگا کر ہی ہمہ جہتی نشوونما کا مقصد پورا کر سکتے ہیں۔ اگر گھر اور مسجد اپنے فرائض کی بجا آوری سے ہاتھ کھینچ لیں تو مدرسے کو کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ اس سے جو کچھ بن آتا ہے کر گذرے، مگر اس کوشش کے نتائج اس درجہ کو کبھی نہیں پہنچیں گے جو ان تینوں اداروں کی متحدہ کوششوں سے برآمد ہو سکتے تھے۔

انگریزی عہد سے پہلے کے مدرسوں میں بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کا کام مسجد کے کام کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ تھا اور گھر کا ماحول بھی انہی مذہبی اور روحانی اقدار سے بھرپور ہوا کرتا تھا جو مدرسے اور مسجد میں حکمران نظر آتی تھیں۔ ان ہر تعلیمی عوامل کی یک جہتی حیرت انگیز نتائج پیدا کرتی تھی۔ انگریزی عمل داری کے بعد بھی ایک عرصے تک یہ نقشہ رہا۔ رفتہ رفتہ مغرب کی تقلید نے گھریلو ماحول سے مذہبی اور روحانی اقدار کو مار بھگانا شروع کیا۔ مدرسے کو پہلے ہی ان اقدار سے عاری بنایا جا چکا تھا۔ بنیادی تعلیمی عوامل کے اس طرح الگ الگ راہیں اختیار کرنے کا لازمی نتیجہ پست تعلیمی معیاروں کی صورت میں نکلا۔ قیام پاکستان کے بعد سے یہ رجحان رکنے کی بجائے اور زیادہ شدت پکڑ گیا۔

ذمہ داریوں کے اپنے ہاتھ میں آ جانے سے کھاتے پیتے لوگوں کی ایک نئی جماعت وجود میں آئی۔ اس "روشن خیال" طبقہ نے کے ہاتھ میں ملکی قیادت ہے۔ مذہب سے بے گانگی کو ترقی پسندی کی علامت خیال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر، مدرسے مسجد کے درمیان جس معاندت کا بیج انگریزی عملداری نے بویا تھا وہ اور بڑھا پھولا اور تعلیمی معیار پست سے پست تر ہونے لگے۔

غرض ترقی پسند تعلیم نے طالب علم کی ہمہ جہتی نشوونما کے تصور پر زور دے کر ایک اہم تعلیمی نکتے کی طرف توجہ دلائی۔ اگر ترقی پسند مدرسہ اس ہمہ جہتی نشوونما کا سارا بوجھ اکیلا نہیں اٹھا سکا تو یہ کوتاہی ایسے اسباب کی پیداوار ہے، جن پر اسے قابو حاصل نہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں گھر اپنے فرائض سے دست کش ہو رہا ہو اور مذہبی اقدار کی گرفت ختم ہو رہی ہو وہاں مدرسے کا اکیلے ہی تمام فرائض سنبھالنے کے لیے آگے بڑھنا غنیمت سمجھنا چاہیے۔

اندرونی دلچسپی کی اہمیت

ترقی پسند تعلیم کا جو تعابنیادی تصور یہ ہے کہ مؤثر تعلیم کے لیے حقیقی دلچسپی پہلی شرط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کتاب اس لیے پڑھی جانی چاہیے کہ اس نے پڑھنے والے کی توجہ کو جذب کر لیا ہے۔ اسے کسی خوف یا لالچ کی خاطر پڑھنا بے کار ہے۔ اگر کوئی کتاب جوں توں کر کے اس لیے پڑھی جاتی ہے کہ امتحان میں کامیابی ہو، یا کوئی انعام حاصل کیا جائے یا کسی سزا سے بچا جائے تو اس کا پڑھنا پائدار تعلم کا باعث نہیں ہوگا۔

یہ تصور روایت پرست تعلیم کے طریقہ ہائے کار سے براہ راست ٹکراتا ہے۔ امتحان میں حاصل کردہ نمبروں کی بنا پر درجہ بندی، انعام، وظائف، تمغہ جات اور مسابقتی دوڑ دھوپ کے دوسرے ذرائع جو مدرسوں میں مدتوں سے مروج تھے، ترقی پسند تعلیم کے اس نظریے نے ان سب کی صحت مندی کو یک قلم محل نظر قرار دے دیا۔ ان سب کی بجائے اس نے تعلیمی ترقی کے اندازے کا یہ پیمانہ مقرر کیا کہ ہر طالب علم کو اس کی فطری قابلیت کے ترازو میں تولا جائے۔ اگر ایک طالب علم نسبتاً کند ذہن ہے اور پوری کوشش کے باوجود معمولی نمبر حاصل کرتا ہے تو اس کی اس کامیابی کو اعلیٰ درجے کی کامیابی قرار دینا چاہیے۔ اس کے برعکس اگر ایک غیر معمولی ذہانت کا بچہ معمولی کام کر کے اچھے نمبر حاصل کر لیتا ہے تو اس کی کامیابی کو بہت گھٹیا درجہ دینا چاہیے۔

اس تصور کی تائید میں ترقی پسند تعلیم کا استدلال بڑا دلچسپ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک جماعت کے

تمام بچوں کے پاؤں ایک جیسے لمبے نہیں ہوتے۔ اس فطری اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ بچے مختلف سائزوں کے جوتے پہنتے ہیں۔ ہم کسی بچے کو اس لیے انعام کا مستحق نہیں سمجھتے کہ وہ بڑے سائز کا جوتا پہنتا ہے۔ نہ ہی کسی بچے کو اس لیے ملامت کرتے ہیں کہ اس کے پاؤں میں چھوٹے سائز کا جوتا پورا آتا ہے۔ اس طور پر ہم کسی بچے کو کبھی اس بنا پر سخت سست نہیں کہتے کہ وہ اپنے باپ کی طرح تیز نہیں دوڑ سکتا۔ اس استدلال کو جاری رکھتے ہوئے پوچھا جاتا ہے کہ جب ہم جسم کے قد اعضا کی جسامت وغیرہ کے فطری اختلافات کو پوری طرح قبول کرتے ہیں اور ان کی بنا پر کسی شخص کو قابل تحسین یا لائق ملامت خیال نہیں کرتے تو ہمیں کیا حق ہے کہ ذہانت کے فطری اختلافات کو تحسین و ملامت کی بنیاد قرار دیں؟ ایک اعلیٰ ذہانت والے بچے کو ایک معمولی ذہانت والے بچے کے مقابلہ پر لا کھڑا کرنا آخر الذکر پر ایسی ہی زیادتی ہے جیسے ایک بچے سے کہا کہ وہ ایک پہلوان سے کشتی لڑے۔ اس غیر مساوی مقابلہ میں ناکامی پر اس غریب کا تمسخر اڑانا اور اسے دوسروں کی نگاہوں میں گرانا ستم بالائے ستم ہے۔ انصاف اور معقولیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر بچے کو اس کی اپنی فطری صلاحیتوں کے ترازو میں تولا جائے اور بس۔

ترقی پسند تعلیم کے اس تصور پر معترضین نے بہت لے دے کی ہے۔ ان کی سب سے کڑی نکتہ چینی یہ ہے کہ زندگی میں قدم قدم پر مسابقت کی دوڑ موجود ہے۔ طلبہ کو اس سے بے خبر رکھنا انہیں زندگی کے حقائق سے بے خبر رکھنا ہے یہ اعتراض ترقی پسند تعلیم کو اپنے ایک اور اہم نظریے کے بطلان کا ملزم گردانتا ہے۔ وہ اہم نظریہ یہ ہے کہ بچوں کو زندگی کے حقائق کا تجربہ دلانا چاہیے۔

اس نظریے پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ہر ممکن سہولت کے باوجود تعلیم حاصل کرنا ایک خاصہ کٹھن کام ہے، اس کے کئی پہلو ایسے ہیں جن پر قدرت حاصل کرنے کے لیے انعام یا سزا کے خوف جیسے بیرونی عوامل کا سہارا ڈھونڈے بغیر چارہ نہیں۔ یہ بات بہت پسندیدہ ہے کہ تعلیم کے ہر پہلو میں کافی اندرونی دلچسپی موجود ہو تاکہ وہ اپنی ذاتی کشش سے ہی سیکھنے والے کی توجہ کو جذب کرلے لیکن بدقسمتی سے بہت سی قابل تعلیم چیزوں میں یہ اندرونی دلچسپی موجود نہیں ہوتی اس کمی کا ازالہ کرنے کے لیے بیرونی مقاصد سے کام لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ان خارجی مؤثرات کی ضرورت خام طبع بچوں کے معاملے میں خصوصیت سے پیش آتی ہے۔

مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کے حق میں اور ان کے خلاف پیش کردہ دلیلوں کا موازنہ کرنا قدرے مشکل کام ہے۔

نفسیاتی طور پر یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ جس چیز میں اندرونی دل چسپی موجود ہو وہ بہترین طور پر اخذ کی جاتی ہے۔ اسکی بہترین مثال وہ اساتذہ ہیں جو اپنے طالب علمی کے زمانے میں ریاضی یا گرامر کے بعض قاعدوں کو ہرگز نہ سمجھ سکے تھے۔ لیکن جب انہیں بالغ زندگی میں یہ مضامین اوروں کو پڑھانے پڑے تو یہی منفور چیزیں ان کے لیے بڑی دل چسپ بن گئیں
سچ یہ ہے کہ ہمیں دل چسپی اس چیز میں ہوتی ہے جس کی ہمیں ضرورت محسوس ہو۔ ضرورت جس قدر شدید ہوگی اسی قدر زیادہ دل چسپی ہوگی۔ جو طالب علم مڈل سے کے زمانے میں سود مرکب کا قاعدہ اچھی طرح اخذ نہیں کرتا اس کے ذہنی پس منظر میں غالباً یہ احساس کام کر رہا ہے کہ وہ اس قاعدے کو نظر انداز کر کے بھی امتحان میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن جب یہی طالب علم بڑا ہو کر معلم ریاضی کے فرائض انجام دینے لگتا ہے تو وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ جماعت میں کسی قاعدے سے بے خبری کا اظہار اس کی حیثیت کو خطرے میں ڈال دے گا۔ ضرورت کا یہ قوی احساس اب سود مرکب کے قاعدے میں بڑی دل چسپی پیدا کر دیتا ہے اور وہ فوراً اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اندرونی اور بیرونی دل چسپی اضافی اصطلاحیں ہیں۔ ان کا بہت کچھ انحصار استاد کی مؤثر تدریس پر ہے۔ ایک قابل اور چابکدست استاد اکثر طلبہ کے دلوں میں خشک سے خشک موضوع کے متعلق بھی دلچسپی پیدا کر دے گا۔ وہ اسے اس رنگ میں اور اس انداز سے پیش کرے گا کہ بہت سے طلبہ اسے زندگی کے لیے ضروری سمجھنے لگیں گے۔ اس کے برعکس ایک پھوہڑ استاد دل چسپ سے دل چسپ موضوع کو بھی ایسے پھیکے رنگ اور ایسے بھونڈے انداز میں پیش کر سکتا ہے کہ طالب علموں کے لیے اس میں کوئی کشش باقی نہ رہے۔

بطور استاد ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عام حالتوں میں اندرونی اور بیرونی دل چسپی ملی جلی ہوتی ہے۔
قابلِ تعلیم چیزوں میں ہماری اکثریت ایسی چیزوں کی ہے جن میں اندرونی دل چسپی رفتہ رفتہ ہی پیدا ہو سکتی ہے اکثر یوں ہوتا ہے کہ کسی چیز کا مطالعہ بیرونی دل چسپی (مثلاً امتیازی درجہ حاصل کرنے کی آرزو یا سزا سے بچنے کی خواہش) کے ماتحت شروع کیا جاتا ہے۔ تھوڑا سا تعارف ہو جانے کے بعد اس چیز میں اندرونی کشش بھی نظر آنے لگتی ہے۔ اور یوں اندرونی دل چسپی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نقطے سے آگے بیرونی اور اندرونی دل چسپی باہم ملی جلی نظر آتی ہیں۔
اس تجزیے کے بعد یہ بات قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ تعلیم کے لیے یہ ہرگز ممکن نہیں کہ بیرونی دل چسپی کو شجرِ ممنوعہ قرار دے دے۔ اگر آج تمام مدرسے اور کالج یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ سارا کام اندرونی دل چسپی کے سہارے کا

نجام دیں گے اور سابقتی جدوجہد کے تمام دروازے بند کردیں گے تو ان کی زندگیاں بالکل بے کیف ہو کر رہ جائیں۔

ترقی پسند تحریک کا انحطاط

ترقی پسند تعلیم کے اہم بنیادی تصورات کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس تحریک نے عام تعلیمی فکر کی بہت صحت مند آبیاری کی ہے۔ یہ تحریک زیادہ شدت کے ساتھ سن ۱۹۲۰ء میں ابھری اور دوسری عالمی جنگ کے آغاز تک پورے عروج پر رہی۔ اس کی بدولت تعلیم کے بہت سے بنیادی پہلو منظر عام پر آئے۔ اس کے حامیوں اور مخالفوں نے ان تمام پہلوؤں کو اچھی طرح جانچا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیمی نظریات اور طریقہ ہائے کار میں ہر جگہ اور ہر سطح پر اصلاح ہوئی۔ تعلیمی فکر نے نئی قدریں اور نئی نئی راہیں ڈھونڈ نکالیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ وہ ملک جس نے ترقی پسند تعلیم کی تحریک کو جنم دیا تھا اسی ملک میں سب سے پہلے اس کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ کے جلد بعد سرد جنگ کے تقاضوں نے امریکی عوام کی اس سرد مہری نے ترقی پسند تعلیم کے وقار کو سخت صدمہ پہنچایا۔ اس کے ساتھ ہی اس تحریک میں اندرونی انحطاط بھی پیدا ہوا۔ اس کے بنیادی نظریوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ نئی شہادت کی روشنی میں نظریات اور طریقہ ہائے کار پر لگاتار نظرثانی ہوتی رہنی چاہیے۔ یہ تحریک زمانہ مابعد جنگ میں اپنے اس اصول پر پوری نہ اتری۔

ترقی پسند تعلیم کی تحریک کا انحطاط جدید تعلیم کی ایک بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ کیوں کہ اس تحریک کی جگہ کسی دوسری تعلیمی تحریک نے نہیں لی۔ اس سے مروجہ طریقہ ہائے کار پر سے وہ پیہم احتساب اٹھ گیا ہے جس نے جدید تعلیم کو نئی زندگی کا راستہ دکھایا تھا۔ تعلیم ایک ایسا میدان ہے جس میں جرأت مندانہ فکر، معقول استدلال، تنقیدی مطالعہ اور تجرباتی طریق کار کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔

ابتدائی جماعتوں میں تخلیقی سرگرمیاں

ادریس احمد

حل مسائل کا طریق

تعلیم کی اہم ترین غایت یہ ہے کہ اپنے طور پر سوچنے اور مسائل زندگی کے حل معلوم کرنے کی صلاحیت پیدا کرے یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان نے ترقی کی ساری منزلیں طے کی ہیں۔ ابتدائی انسان نے جب دنیا کے ماحول میں آنکھ کھولی تو اس کو طرح طرح کی ضرورتوں نے ستایا۔ ان ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے کوئی بنے بنائے حل موجود نہ تھے اس کے گرد و پیش میں ایسی چیزوں کی فراوانی ضرور تھی جنہیں جوڑ توڑ کر یہ ضرورتیں پوری ہو سکتی تھیں۔ لیکن اسے قطعیت کے ساتھ یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کام کس طرح انجام دینا چاہیے۔ تاہم قدرت نے اسے ایک انمول قوت عطا کر رکھی تھی۔ یہ قوت اس کا بے مثال ذہن تھا۔ یہ ذہن اس قابل تھا کہ ایسی چیزوں کے تصور بھی گھڑ لے جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی نہ سنی تھیں۔ اپنے ذہن پر زور دینے اور آزمائش و سہو کا طریقہ اختیار کرنے سے انسان بالآخر سائنس اور ٹکنالوجی کی اس منزل کو جا پہونچا جس کے تجربے معجزوں سے کم حیران کن نہیں۔

فطرت کا یہ انسان پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اسے بنے بنائے اور رسید سے ملکے حل عطا کرنے کی بجائے ایک ایسی قوت عطا کر دی جو ہر لحظہ نئے سے نئے حل تلاش کرنے پر قادر ہے۔ عقل و ذہانت وہ آسمانی نور ہے جس نے انسان کو بربریت اور وحشت کی پستیوں سے اٹھا کر تہذیب و تمدن کے مدارج تک پہونچایا۔ اس خداداد نور کی تربیت کرنا اور اسے اس کے حقیقی وظیفہ کی اہمیت سے آگاہ کرنا تعلیم کا سب سے اہم فرض ہے۔

پچھلی کئی صدیوں میں جن لوگوں نے تعلیم کی تجدید کرنا چاہی ہے۔ انہوں نے تدبر اور تفکر کی آبیاری ہی پر زور دیا ہے۔ زمانہ مابعد تاریخ میں اسلام وہ سب سے پہلی آواز تھی جس نے مشرق و مغرب کی فضاؤں میں یہ گونج پیدا کی کہ انسانیت کا شرف محض انسانی عقل کے ساتھ وابستہ ہے۔ انسان کی نجات اور سربلندی اسی بات میں ہے کہ معقولیت کو چراغ راہ بنائے۔ پرانی ریتوں اور روایتوں کا غلام بن کر نہ رہے۔

صدیوں تک اسلام کا یہ نعرۂ حق ظلمت کدہ مغرب کی آہنی دیواروں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر ختم ہوجاتا رہا۔ بالآخر ان پیہم ضربوں نے تعصب اور تنگ نظری کی ان آہنی دیواروں میں اس حد تک شگاف پیدا کرلیے کہ معقولیت طرازی کا یہ پیغام زیادہ مستند طبائع کو متاثر کرلے۔ آج مغرب کو اس بات کا اعتراف ہو یا نہ ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ کیونکہ روسو اور اس قماش کے دوسرے مغربی مصلحوں کی آوازیں براہ راست دین فطرت کی معقولیت نواز تعلیمات سے متاثر تھیں۔ روسو کا مسیحی یورپ میں یہ اعلان کرنا کہ انسانی پیدائش کو گناہ کی پیداوار کہنا ایک خلاف فطرت عقیدہ ہے کسی دوسری توجیہ کا حامل نہیں ہوسکتا۔ انسانیت کو یہ مژدہ دین فطرت ہی نے سنایا تھا کہ انسان بالکل صاف فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اسے سنوارنا یا بگاڑنا اس کے اپنے بس کی بات ہے۔

جب انسان کی آزادیٔ عمل ثابت ہوگئی تو اس سے اگلا قدم اس مختاری سے فائدہ اٹھانے کا تھا۔ چنانچہ مغربی ماہرین تعلیم نے یکے بعد دیگرے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ بچے کو اپنے فطری تقاضوں کے مطابق بڑھنے پھولنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ یہ اصول اگرچہ تعلیم کی تمام منزلوں پر قابل توجہ ہے۔ لیکن ابتدائی منزل پر اس کی اہمیت بے حد غیر معمولی ہے کیوں کہ پہلے نقوش سب سے پائدار نقوش ثابت ہوتے ہیں۔ اگر ابتدائی بچپن میں بچوں کو اپنے طور پر سوچنے اور اپنی ذمہ داری پر کام کرنے کی اجازت مل جائے تو وہ ایسی پسندیدہ ذہنی عادتیں اخذ کر لیتے ہیں جو زندگی بھر کام دیتی ہیں۔ کنڈرگارٹن، مانٹسوری اور اس قسم کے دوسرے تدریسی طریقے جو قبل از پرائمری جماعتوں کے ساتھ مخصوص ہیں، اسی بنیادی نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہیں۔

یہ تمام طریقے جو کھیل کھیل میں "تعلیم" کا اہتمام کرتے ہیں رسمی تدریس کی روایتی پابندیوں سے یکسر آزاد ہیں۔ ان کا نصاب کلی طور پر بچوں کی آزاد سرگرمیوں پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ نصاب ہر قسم کی مقررہ حدوں سے آزاد ہوتا ہے اس کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ جس طرح ہم بالغ زندگی میں کئی قسم کے مواقع اپنے ساتھ کھلے پاتے ہیں اور ان کو جانچ تول کر کسی خاص فیصلہ کو پسند کرکے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور پھر اس فیصلہ کے نتائج کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں، بالکل اس طرح بچوں کو اپنے مسائل کے حل میں آزادیٔ عمل حاصل ہونی چاہیے۔ ان کی ننھی سی دنیا بھی طرح طرح کے مسائل سے بھرپور ہے۔ ہمیں یہ مسائل مضحکہ خیز نظر آئیں تو آیا کریں۔ خود بچوں کے نزدیک وہ مسائل بہت اہم ہوتے ہیں وہ ان کی ساری توجہ کو جذب کیے رکھتے ہیں۔ انہیں ایک ایسا اجازت دہ ماحول میسر آنا چاہیے جس میں معقول حد تک

ل کی فراوانی ہو۔ اس ماحول میں وہ اپنی پسند اور اپنی افتاد طبع کے مطابق اپنے مسائل حل کریں گے اور یوں ضمنی طور پر بنیادی انسانی تربیت حاصل کر لیں گے جو ہر انسانی پیش قدمی کے لیے واحد قوت محرکہ کا درجہ رکھتی ہے۔

ـــ منصوبے کے تحت مرتب شدہ ماحول

بچوں کی آزادی عمل پر زور دینے سے یہ مطلب نہیں کہ انہیں ابتدائی انسان کی طرح کرخت ماحول کے رحم پر چھوڑ دیا جائے۔ ماحول کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق منظم کرنا۔ اس میں مطلوبہ قسم کی سہولتوں اور وسائل کا بہم پہونچانا، یہ بالغ نظر ماہرین تعلیم کا کام ہے۔ فروبل کے کنڈرگارٹن کے تحفے اور مانٹسوری مدرسے کا اخلاقی سامان ن قسم کا مرتب شدہ ماحول ہی مہیا کرتے ہیں اور اپنی قوت فیصلہ سے جس طرح جی چاہے کام لے۔

ماحول کے اس طور پر مرتب ہونے سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ بچوں پر کس قسم کی یکسانیت تھوپی جا رہی ہے شخص ذرا بھی بصیرت رکھتا ہے، وہ انسانی زندگی کے دو خصائص سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ہماری زندگیوں یں حیرت انگیز حد تک یکسانیت موجود ہے۔ کیوں کہ ہر انسان کی بنیادی ضرورتیں بالکل ایک سی ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہر انسان کی زندگی میں ایک ناقابل انکار انفرادیت بھی موجود ہے۔ ہر شخص اپنی بنیادی ضرورتوں کو اپنے مخصوص انفرادی نداز میں پورا کرتا ہے۔

بالکل یہی حال ابتدائی جماعتوں کے پہلے سے مرتب شدہ ماحول کا ہے۔ اس کی مختلف چیزیں یا ہر بچے کے لیے جو مطلب اور دلچسپی رکھتی ہیں وہ اپنی جگہ یگانہ ہے۔ ایک کنڈرگارٹن مدرسے میں جو کھیل کا سامان مہیا کیا جاتا ہے ہر بچہ آزادانہ اس سے کھیلتا ہے۔ لیکن ہر بچے کے لیے اس کا مفہوم جداگانہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک ڈنڈا ایک بچے کے لیے گھوڑے کا درجہ رکھتا ہے جس پر وہ سوار ہوتا ہے، دوسرے بچے کے لیے یہی ڈنڈا ایک درخت بن جاتا ہے جسے ہلا ہلا کر وہ اس کا پھل نیچے گراتا ہے۔ تیسرے بچے کے لیے یہی ڈنڈا ایک سانپ بن جاتا ہے، جسے نچانے کے لیے وہ اس کے سر پر بین بجاتا ہے۔

ننھے بچوں کی سرگرمیاں بڑوں کو مضحکہ خیز نظر آتی ہیں تو آئیں۔ وہ خود ان میں ایسی سنجیدگی کے ساتھ مگن ہوتے ہیں جو بالغ زندگی کو بھی کم میسر آتی ہے۔ کنڈرگارٹن اور مانٹسوری مدرسوں کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ بچوں کی سرگرمیوں کی ہنسی اڑانے کی بجائے انہیں اس احترام کا حق دار سمجھتے ہیں جس کا بالغوں کی سرگرمیوں کو۔ ہاں وہ

اپنے ماحول کو پہلے سے اس سوجھ بوجھ کے ساتھ منظم کرتے ہیں کہ بچے صرف درست قسم کی سرگرمیوں کا انتخاب کریں۔ اب استاد ان سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اس سے بچوں کا اعتمادِ نفس اور بڑھتا ہے۔ وہ بڑے یقین اور جذبے کے ساتھ کام کو ہاتھ ڈالتے ہیں اور اس کی پوری ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔

بچوں میں ذمہ داری کے احساس کو جس حد تک ترقی دی جا سکتی ہے اس کا اندازہ ایک مثال سے ہوگا۔ ایک قبل از پرائمری مدرسے میں بچوں کو رنگ کے ساتھ تصویریں بنانے کا شوق چرایا۔ ان کی عمریں تین اور چار سال کی تھیں۔ کمرے کا فرش نہایت خوب صورت اور شفاف تھا۔ بچے برش ہاتھ میں لیے تصویریں بنانے میں محو تھے۔ جب اس کام سے فارغ ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ فرش پر جگہ جگہ رنگ کے دھبے پڑ گئے ہیں۔ اس پر جھٹ طے پایا کہ فرش پانی سے دھو کر صاف کرنا چاہیے۔ فوراً بوٹ اور جرابیں اتار دی گئیں۔ کچھ بچے بالٹیوں میں پانی بھر بھر کر لانے لگے اور کچھ فرش کو رگڑ رگڑ کر دھونے لگے۔ تھوڑی دیر میں فرش پہلے کی طرح صاف شفاف ہو گیا۔

اس قسم کے مدرسوں میں بچے کھانے پکاتے اور ساتھیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ وہ بے حد مستعدی کے ساتھ مختلف کام اپنے ذمہ لیتے اور انھیں انجام دیتے ہیں۔ بے شک وہ ہر کام میں بڑوں کی نقل کرتے ہیں۔ مگر اس نقالی میں ہر جگہ انفرادیت کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ مثلاً زید اگر سکنجبین تیار کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اس کے لیموں نچوڑنے اور کھانڈ حل کرنے کا ڈھنگ باقی سب سے نرالا ہوگا۔ بلکہ لیموں اور کھانڈ کا تناسب بھی دوسروں سے مختلف ہوگا۔ اسی طرح سلمیٰ اگر ساتھیوں کے ہاتھ دھلاتی ہے تو اس کے صابن پکڑنے اور تولیہ پیش کرنے کا انداز اس کا اپنا مخصوص انداز ہوگا۔ زکیہ برتن صاف کرے گی تو اس کی انفرادیت اس کام میں بھی ظاہر ہوئے بغیر نہ رہے گی۔ وہ برش کو ایک خاص طریقے سے استعمال کرے گی اور صاف شدہ برتنوں کو ایک خاص ترتیب سے دھرے گی۔

ان آزاد سرگرمیوں کی بدولت نہ صرف بچوں کی انفرادیت پوری طرح ترقی پاتی ہے بلکہ وہ مل جل کر کام کرنے اور ذمہ داری قبول کرنے کا ڈھنگ بھی سیکھ جاتے ہیں۔ انہیں یہ قیمتی تربیت مل جاتی ہے کہ موجودہ ماحول جو متبادل طریق ہائے کار پیش کرتا ہے۔ ان میں سے ایک مخصوص طریقے کو کس طرح چنا جاتا ہے۔ متبادل راستوں کے امکانات کو جانچنے اور ان کی افادی اضافیت کو تولنے سے سوچ بچار کی عادت خوب پرورش پاتی ہے۔ یہ تمام پسندیدہ ذہنی اطوار مابعد کی زندگی میں بے حد مفید ثابت ہونے والے ہوتے ہیں۔

ہم معلم کیوں بنیں؟

حسن عزیز

کیا آپ نے کبھی اپنے دل سے یہ سوال بھی کیا ہے کہ آپ کو آئندہ زندگی میں کیا کچھ کرنا چاہیے؛ کالج کے طالب علم یا ایسے نوجوان سے جس نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا ہو توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی آئندہ زندگی کے پیشے کے لیے منصوبہ بنائے

زندگی میں منصوبہ بندی

زندگی تو ایک جوا ہے اور اس کے اکثر پانسے ہمارے خلاف پڑتے ہیں۔ اس لیے زندگی کا ایک اچھا کھلاڑی اس کھیل کے داؤ پیچ بہت محنت اور غور و فکر سے سیکھنے کی کوشش کرتا ہے، کرکٹ کا ایک اچھا گیند پھینکنے والا اپنا سٹائل اور انداز خود اپنے منصوبے کے تحت تیار کرتا ہے، وہ اچھے منصوبے کے خواص اور طریقے سکھاتا ہے۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ بذاتِ خود منصوبہ بنانا سیکھتا ہے۔

طالب علم معلم کی رہنمائی چاہتے ہیں۔ انھیں خود اس بات کا پتہ نہیں ہوتا کہ کالج میں ان کا کیا مقصد ہے اور سند حاصل کرنے کے بعد وہ کیا کرنا چاہتے ہیں اور انہیں کون سے مضامین اختیار کرنے چاہئیں۔ اور کون سے مواقع ان کی ترقی اور نشوونما کے لیے ضروری ہیں اور زندگی کی تکمیل کے لیے وہ کیا کرنا چاہتے ہیں، مختصراً زندگی ان کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ تاہم تاہم آپ جانتے ہیں کہ منصوبہ بندی سے ان کی زندگی میں ایک نئی کرن پھوٹ سکتی ہے اور آج کی منصوبہ بندی ان کی آئندہ زندگی پر خوش گوار اثر ڈال سکتی ہے۔

خوش فہم لوگوں کی رائے۔

آپ ان لوگوں کو بھی جانتے ہوں گے جن کا نظریہ یہ ہے کہ "جو ہوگا وہ تو ہو کے ہی رہے گا" ان کا عقیدہ ہے کہ انسان قسمت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہے۔ اس لیے منصوبہ بنانا کم سے کم انسان کے بس کی بات نہیں اور وہ کسی ایسی قسمت کے رحم و کرم پر ہے جو اس کے قابو سے باہر ہے۔

اس کے برعکس ایسے لوگ بھی ہیں جن کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کا ارادہ آزاد ہے۔ کیوں کہ انسان خود اپنی قسمت کا

بنانے والا ہے۔ اس نظریے کو ایک شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "میں اپنی قسمت کا مالک ہوں۔ میں اپنی قسمت کا حاکم ہوں"۔

شاید آپ بحیثیت طور پر یقین نہ کرتے ہوں کہ آیا انسان خود قسمت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہے یا خود اپنی قسمت کا بنانے والا۔ اور یاد رکھیے کہ ایسے لوگوں کے لیے جو ان میں سے کسی ایک نظریے میں اندھا دھند یقین رکھتے ہیں تعلیم موزوں نہیں ہو گی۔ جو شخص یہ سوچتا ہے کہ اس کا آج کا کام اس کی آئندہ زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتا ایسے شخص کا معاملہ بالکل مایوس کن اور بلا مقصد ہو گا۔ مثلاً ایک استاد ہی کو لے لیجیے۔ اگر اسے یقین ہے کہ خواہ وہ کتنی کوشش کرے اس کی جماعت کے بچوں کی پوری پوری ترقی اور نشوونما نہیں ہو سکتی تو ایسے معلم کا معاملہ بھی ویسا ہی پریشان کن ہے دوسری طرف ہم مسئلہ اختیار یا ارادے کی آزادی پر یقین رکھنے والے استاد کو بچے کے ہر پہلو کی پوری پوری نشوونما کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔

اگرچہ آپ جانتے ہیں کہ بعض لوگ کسی خاص تصور کی بنا پر اپنا اٹل فیصلہ دے دیتے ہیں اور منصوبہ بندی پر ان کو خاص اعتماد نہیں ہوتا۔ پھر بھی آپ کو اکثر اوقات اس بات کا احساس ہوتا رہتا ہے کہ ہر شخص کے لیے منصوبہ بندی لابدی ہے، جب بھی آپ کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو منصوبہ بیچ میں حائل ہو جاتا ہے

منصوبہ بندی نہ کرنے کے نتائج

آپ نے اکثر ایسے دوستوں کے بارے میں سوچا ہو گا جنہوں نے کوئی غیر دلچسپ پیشہ اختیار کر کے بہت سے سال گنوا لئے۔ کیوں کہ اس زمانے میں اس کو یہی پیشہ وقتی طور پر آسانی سے مل سکتا تھا۔ آپ کو اس بات کا اندازہ ہو گیا ہے۔ کہ ان دوستوں نے اپنے پیشے کے لیے ایک گھٹیا درجے پر منصوبہ بندی کی زندگی میں غیر منصوبہ بندی کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً بعض لوگ کسی کار کو پسند کر لیتے ہیں اور اس کو خریدنے کی خاطر اپنی تنخواہ میں سے بچا کر اقساط ادا کرتے رہتے ہیں۔ بعض دفعہ اپنا بیمہ کسی غلط کمپنی میں کروا لیتے ہیں۔ مری جانے کی بجائے محض اس لیے کراچی پہنچ جاتے ہیں کیوں کہ ان کی خالہ جان نے ان کو وہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ اور بعض اوقات ہفتہ ہفتہ کی تنخواہ یہ سوچتے ہوئے خرچ کر ڈالتے ہیں کہ اس سے چنداں فرق نہیں پڑے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں باوجود آپ کی کوشش کے منصوبہ بندی کی افادیت پر یقین نہیں ہو سکتا۔ اور یہ لوگ عین بوقت ضرورت فوری طور پر اپنے منصوبے کی بنیاد رکھ لیتے ہیں اور

جب وہ انسانی مسائل کے سمندر میں غرق ہونے لگتے ہیں تو چند تنکوں کا سہارا لے کر ہمیشہ نامساعد حالات کا سامنا کرتے رہتے ہیں اور کبھی اپنے بل بوتے پر مسائل کو مؤثر طریقے سے حل نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے۔

آپ شاید ایسے لوگوں کو بھی جانتے ہوں گے جو ایسی خواب کی دنیا میں بستے ہیں جو محض تصورات کا مجموعہ ہوتی ہیں، اور یہ دنیا انہیں اس حقیقت کی دنیا کی نسبت زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے جس میں انہیں حقائق زندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ قطعی طور پر اپنے گردوپیش سے بے بہرہ ہو جاتے ہیں۔

ایک طالب علم کی مثال

آپ ذرا اس طالب علم کی مثال لیں جو نیا نیا کالج میں داخل ہوا ہے۔ اگرچہ داخلے کے ٹسٹ اور انٹرویو میں اس نے چنداں کامیابی حاصل نہ کی لیکن اس کے باوجود وہ بڑے وثوق سے کہتا ہے کہ وہ علمی لحاظ سے نہایت شاندار نتائج دکھائے گا۔ مگر جب وہ پانچ میں سے چار مضامین میں فیل ہو جاتا ہے تو وہ کسی پریشانی کا اظہار نہیں کرتا۔ لیکن جب پہلی ششماہی کے بعد بھی اس کا امتحان میں یہی حال رہتا ہے تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ اصل خرابی اس بات کی تھی کہ کورس مشکل تھا، اس کو اپنے آپ پر پورا اعتماد تھا کہ وہ امتحان میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ اس بات کو بھی تسلیم نہیں کرے گا کہ وہ کسی لحاظ سے بھی کمزور تھا۔ اس طالب علم کی کمزوری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے کام کو کسی خاص منصوبے کے تحت نہیں کیا تھا۔

بعض لوگ کام کرنے کے فیصلوں کو ملتوی کرکے رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایسی نوبت بھی آجاتی ہے جب کہ آخر کار ان کو ایک دن وہ کام مجبوراً کرنا ہی پڑ جاتا ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں وہ اس بات کا احساس نہیں کرتے کہ وہ آئندہ کے اُن مسائل کا جائزہ نہیں لینا چاہتے جو ان کے منصوبہ نہ بنانے کی صورت میں وارد ہوں گے۔

مثال کے طور پر بعض لوگوں کے لیے یہ بہت آسان ہے کہ وہ پہلی سہ ماہی میں خوب مزے اڑائیں اور اس کام کو جو انہوں نے کرنا تھا ملتوی کرتے رہیں۔ حتیٰ کہ سالانہ امتحان سر پر آجاتا ہے اور وہ دیوانوں کی طرح امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے تیاری کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اچھے قسم کی پڑھائی بھی کچھ نہیں کر سکتی اور ایسے موقعوں پر انہیں اکثر ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کام ان سے نہ ہو سکے گا تو وہ آئندہ سال کے لیے ایسی جماعت میں

رہنے کا ارادہ کر لیتے ہیں اور تہیہ کرتے ہیں کہ وہ آئندہ منصوبہ بندی کریں گے۔ اس قسم کے مشاہدات سے جو مایوسی ہوتی ہے ان کو صرف ایک اچھی منصوبہ بندی ہی دور کر سکتی ہے۔

ہمارے ہاں منصوبہ بندی کی کمی

اوپر کی بحث سے آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ منصوبہ بندی زندگی میں ہمارے لیے کتنی اہم ہے۔ مگر یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہماری زندگی میں منصوبہ بندی کی بہت کمی ہے۔ اگرچہ قومی تعمیری کام میں کچھ حد تک منصوبہ بندی کو دخل ہے۔ مگر فرداً فرداً ہم کسی منصوبہ سے کام نہیں لیتے اور یہی وجہ ہے کہ عام طور پر اپنے کاموں میں ناکامیاب ہوتے ہیں۔

جب ہم اپنے لیے پیشہ کا انتخاب کرنے میں تو سب سے بڑا محرک ماں باپ یا خاندان کی رائے ہوتی ہے۔ بعض اوقات تو خاندانی پیشہ اختیار کرنا مفید رہتا ہے کیوں کہ بعض فطری صلاحیتیں نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی رہتی ہیں ہمارے ہاں کا بڑا محرک خاندانی روایات کی پیروی ہے۔ لیکن بعض اوقات کسی نفسیاتی الجھن کی وجہ سے خاندانی پیشے کی بغیر سوچے مخالفت بھی کی جاتی ہے۔

اختیاری مضامین کے انتخاب میں ہمارے ہاں دوسروں کی نقل کو بھی بڑا دخل ہے۔ ہم دوستوں اور ہمسایوں کے پیشوں کا غیر شعوری طور پر اثر لیتے ہیں اور بلا سوچے سمجھے ان کو اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے اکثر ناکام رہتے ہیں۔ کالج میں ۹۰ فی صد لڑکے ایک دوسرے کو دیکھ کر اختیاری مضامین کا انتخاب کرتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں کسی اچھے پیشے کی تلاش کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اصل ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ہمیں کو اختیاری مضامین کے انتخاب میں تعلیمی اداروں کی طرف سے سلجھی ہوئی رہنمائی دی جائے اور مختلف پیشوں کی خوبیاں ان پر واضح کی جائیں۔

معلمی کا پیشہ

معلمی کے پیشے ہی کی مثال لے لیں۔ ہمارے ہاں جب کسی شخص پر ساری دنیا کے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو وہ معلمی کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اس پیشے کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ جب حالات کی مجبوریوں سے اس میں داخل ہو جاتے ہیں تو اکثر پریشان اور غیر مطمئن رہتے ہیں۔ اکثر ایسے لوگ بھی دیکھے

گئے ہیں۔ جو کسی نہ کسی وجہ سے دوسرے پیشوں میں چلے گئے لیکن انہیں فطری طور پر معلمی کے پیشے سے لگاؤ تھا اور انہیں ساری عمر ایک معلم بننے کی حسرت رہی ہے۔

اگرچہ آج کل اقتصادی اور سماجی لحاظ سے معلمی کا پیشہ ہمارے ہاں کوئی اونچا درجہ نہیں رکھتا۔ لیکن ہمارے ملک کی روایات اس بارے میں بہت شاندار رہی ہیں۔ اور اس کے گئے گذرے زمانے میں بھی معلمی کے پیشے میں کچھ ایسی خوبیاں موجود ہیں جن کی طرف لوگوں کا دھیان نہیں جاتا۔

معلمی کے پیشے کی خوبیاں

اب ہم ان خوبیوں کو تفصیلی طور پر بیان کرتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے اصحاب جن کے دل میں فطری طور پر معلم بننے کی صلاحیت ہے، اور وہ ابھی تک اس میں داخل نہیں ہوئے۔ انہیں ان خوبیوں کے مطالعے سے متاثر ہو کر پیشے میں داخل ہونے کا حوصلہ ہوا۔ اور جو پہلے سے اس میں داخل ہو چکے ہیں۔ انہیں اس مضمون کو پڑھ کر ایک نئی قسم کی طمانیت اور مسرت حاصل ہو۔ اور انہیں اس بات کا احساس ہو جائے کہ اگرچہ وہ مالی لحاظ سے گھاٹے میں ہیں۔ لیکن انہیں اس کے علاوہ اس پیشے کی بدولت بہت سی خوبیاں میسر ہیں۔

اقدار کا مسئلہ

آپ کا دل ضرور چاہتا ہوگا کہ آپ کو چالیس سال کی عمر میں ہی تین ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی ہونے لگے۔ آپ کی یہ خواہش بھی ہوگی کہ آپ کے پاس تین چار کاریں ہوں اور ایک شاندار کوٹھی بھی ہو۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نہایت کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن اس نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے یہ بہتر ہوگا کہ آپ مندرجہ ذیل سوالوں کا جواب دیں:- کیا یہ چیزیں زندگی کی سطح نگاہ کو پورا کر سکتی ہیں؟ کیا آپ دوسروں کی زندگی کے ذاتی اور سماجی مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں مدد دیتے وقت ذہنی سکون حاصل کرتے ہیں۔ کیا آپ عوام میں ہر دل عزیزی چاہتے ہیں۔ کیا آپ سیاست کے میدان میں شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ان سوالوں کے جواب کا طرز یہ ظاہر کر دے گا کہ آپ کے نزدیک زندگی میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اور کون سا پیشہ آپ کی یہ خوبیاں مہیا کر سکتا ہے۔ بہت پہلے آپ کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اقدار جو آپ کسی بھی پیشے میں حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ آپ ہر طریق سے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ جس حد تک آپ ان اقدار کو پہچاننے میں کامیاب

ہوں گے، وہ آپ کے رجحان اور کوشش پر مبنی ہوگا محض یہ حقیقت کہ آپ نے کسی خاص پیشے کو اختیار کیا اس سے اس بات کا پتہ نہیں چل سکتا کہ اس پیشے کی ذاتی خصوصیات کیا ہیں۔

دو قسم کے استاد

مثلاً آپ ان اساتذہ کی یاد کرتے ہوں گے جو اپنے آپ کو ناخوش، غیر مطمئن اور غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بعض تعلیم کو کمائی کا ذریعہ تصور کرتے ہیں اور اس کام کا معاوضہ تنخواہ کے چند پیسوں کو سمجھتے ہیں۔ وہ اسکول کے کام سے نفرت کرتے ہیں اور جونہی چھٹی ہوتی ہے وہاں سے جلد از جلد فرار ہونے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ صبح کو اسکول آنے سے بھی گھبراتے ہیں۔ اس کے برعکس آپ کو ان اساتذہ کی بھی یاد ہوگی جن کا نظریہ یہ ہے کہ تعلیم دینا ایسا مقام رکھتا ہے جس سے انسان کو بہت اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ صرف وہ استاد جو کہ بچوں کو تعلیم و تربیت کے ذریعے ایک صحیح شہری کے ڈھانچے میں ڈھالتے ہیں اطمینان حاصل کرتے ہیں اور اس چیز کو اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ بچوں پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کریں کہ ان میں تعلیم حاصل کرنے کی زیادہ سے زیادہ کتنی اہلیت ہے۔ ایسے اساتذہ خوب جانتے ہیں کہ ان کا یہ پیشہ کتنا وسیع ہے۔ اور اس میں ان کو کتنی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اس کام میں جوش اور ولولہ بھی ہوتا ہے۔ ہر صبح ان کے لیے نئی خوشیوں اور مواقع کا پیغام لاتی ہے۔ اور اس اطمینان کی وجہ سے بعض اوقات کٹھن کام بھی حل ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے زندگی خوشی اور مسلسل تعمیری منصوبے کا نام ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ بچے بھی اتفاق رکھتے ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو تعلیم کی ماہیت کا صحیح اندازہ لگا لیتے ہیں۔

جب ہم تعلیمی پیشے کی خصوصیات کا جائزہ لینے بیٹھتے ہیں تو یہ واضح کر لینا چاہیے کہ کوئی مخصوص خوبی کبھی اکیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر خوبی ذاتی خواص سے متعلق ہوتی ہے۔ بعض اوقات ان خواص کو فرداً فرداً دیکھا جاتا ہے۔ مگر یہ مخصوص انسانی رویہ کے مطالعے کی خاطر کیا جاتا ہے۔ لیکن آخر میں جب چال چلن کا پورے طور پر جائزہ لیا جائے تو ہر ایک خوبی کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔

عوامی خدمت

آئیے اب ہم دیکھیں کہ تعلیمی پیشے میں ہمیں کیا کچھ مواقع ملتے ہیں۔ عام طور پر تقریباً ہر شخص پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کی امداد کرے۔ قومی ابتلا اور آزمائش کے زمانے میں یہ رجحان زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ مگر روزانہ کی

زندگی میں اس کا معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر کسی کے رو۔ یے کا بہت ہی قریب سے مطالعہ کیا جائے تو پھر شاید ایک دن میں ہی معلوم ہو جائے کہ وہ دوسروں کے لیے کس حد تک مفید کام کر سکتا ہے۔ ٹریفک کے قوانین کا احترام پبلک ملکیت کی حفاظت، دوسروں کی بھلائی اور اس قسم کی دوسری چیزیں صرف اس جذبے کی مرہون منت ہیں کہ ہم دوسروں کا ہاتھ بٹائیں۔

عام طور پر ایک جمہوری سماج میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں میں دوسروں کی خدمت کرنے کا جذبہ ضرور موجود رہتا ہے۔ یہ انسانی رجحان ہمارے جمہوری سماج کی فضا کا ایک حصہ ہے اور افراد اس رجحان کو اس سماج سے اپناتے ہیں۔ لوگوں کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دوسروں کی خدمت کرنے کا کس حد تک جذبہ ہے۔ ہماری سیاسی تعلیمی، سماجی اور مذہبی تاریخ ایسے محبان وطن کی مثالوں سے بھرپور ہے جنہوں نے دوسروں کی خدمت کی خاطر اپنی ذاتی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا۔ بعض پیشے ایسے ہوتے ہیں جن میں ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جن میں انسانی خدمت کا جذبہ دوسروں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ جب تک آپ نسلِ انسانی کی خدمت کو بہت وسیع نہ سمجھیں اس وقت تک آپ تعلیمی اور سماجی نشو و نما۔ وزارت اور حکومت کے کام میں مسرت اور کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

نسلِ انسانی کی خدمت

استاد نسلِ انسانی کی خدمت کرنے والوں میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ سماج میں مدرسے کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ بچوں کو ہماری سماجی میراث سے باخبر کردے اور اس کام کی مستعدی اور تکمیل کا دارومدار صرف استاد پر ہے۔ اور یہ استاد کا فرض ہے کہ وہ ہماری سماج کے اقدار اور اہم خصوصیات کا صحیح اندازہ لگائے اور ان کو آنے والی نسلوں کے دل و دماغ میں رچا دے۔ اور یہ بھی استاد ہی کے ذمے ہے کہ وہ بچوں کے کردار کے ایسے نمونے پیدا کر دے کہ جس سے جمہوری سماج میں پھر سے نئی زندگی پیدا ہو جائے۔ اور یہ بھی فرض ہے کہ استاد ہر ممکن طریق سے تمدن کا معیار بلند کرے جس سے ہر فرد کی زندگی خوش حال ہو جائے۔ (باقی)

ثانوی مدارج میں ریاضی کی تعلیم

فضل محمد خاں ایم۔ ڈی

فروری ۱۹۵۷ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں واشنگٹن سٹیٹ کالج، سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور اور نیو ایجوکیشن فیلوشپ (N. E. F) کے زیر اہتمام ایک نصابی مباحثہ منعقد ہوا تھا۔ اس مباحثہ میں لاہور۔ بہاولپور، ملتان اور راولپنڈی کی کمشنریوں سے تعلیم سے متعلق افراد نے شرکت کی تھی۔ شرکت کرنے والوں کا گروہ ثانوی اداروں کے سرمعلمین اور معلمین، مدارس کے ناظر، پرائمری مدارس کے معلمین اور سرمعلمین، سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور اور لیڈی میکلیگن کالج لاہور کے اساتذہ۔ صدر مرکز تعلیم مغربی وحدت کا عملہ اور مختلف کالجوں کے پرنسپل پر مشتمل تھا۔ ان کے علاوہ آئی سی اے کے اعلیٰ شعبۂ تعلیم پروفیسر ہیمن بی آلمن (HEYMAN B. ALLMAN) اور ماہر نصاب ڈاکٹر اوسکر سی شویرنگ (OSCAR C. SHWIERING) نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ مباحثہ کی افتتاحی رسم عزت مآب سردار عبدالحمید خاں دستی وزیر تعلیم نے فرمائی۔ اور اختتامی رسم ڈاکٹر محمد جہاں گیر خاں، ڈائرکٹر تعلیم مغربی وحدت کے زیر صدارت منعقد ہوئی تھی۔

اختتامی رسم میں ثانوی مدارج میں ریاضی کے نصاب کا مسئلہ زیادہ وقت زیر بحث رہا۔ ماہرین تعلیم کا ایک گروہ اس حق میں تھا کہ ریاضی کو ثانوی مدارج میں اختیاری مضمون قرار دیا جائے اور دوسرے گروہ کی یہ رائے تھی کہ ریاضی کو اختیاری مضمون قرار دینا طلباء اور قوم دونوں کے لیے مضر ثابت ہوگا۔ اس مقالے میں مصنف نے باوضاحت بیان کرنے کی کوشش کی ہے، کہ ثانوی مدارج میں ریاضی کا کیا درجہ ہونا چاہیے۔

موجودہ صورت حال

ثانوی مدارج میں ریاضی کے نصاب کا مسئلہ ابھی تک کامیابی سے حل نہیں کیا جا سکا۔ اس مسئلہ سے متعلق دو نکات ہر جگہ زیر بحث رہتے ہیں۔ اولاً آیا ریاضی میٹریکولیشن یا اس کے مترادف امتحانوں کے نصاب میں لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل ہونا چاہیے یا نہیں۔ دوسرے اگر یہ مضمون لازمی قرار دیا جائے تو اس کے نصاب کی

نوعیت کیا ہونی چاہیے۔ ان نکات کی وضاحت کے لیے آئیے اب ہم مختلف ممالک میں ثانوی مدارج میں ریاضی کے نصاب کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیں۔

(۱) **پاکستان** :- اس وقت بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن لاہور، پشاور یونی ورسٹی، سندھ یونی ورسٹی، اور بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کراچی اور ڈھاکہ کے بورڈوں سے میٹرکیولیشن یا اس کے مترادف امتحانات منعقد ہوتے ہیں۔ پشاور یونی ورسٹی، لاہور بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن اور سندھ یونی ورسٹی نے ریاضی کو میٹرکیولیشن امتحان کے نصاب میں لازمی مضمون قرار دیا ہے۔ کراچی اور ڈھاکہ کے بورڈوں نے میٹرکیولیشن یا اس کے مترادف امتحان میں نصاب ریاضی کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ ایک حصہ لازمی ہے۔ اس حصہ میں علم حساب تجربی ہندسہ اور الجبرا کے چند قاعدے شامل ہیں۔ دوسرا حصہ اختیاری ہے۔ اس میں اثباتی ہندسہ اور الجبرا شامل ہیں، اس حصہ کو صرف وہ طالب علم لیتے ہیں جن کو کالجوں میں جاکر ریاضی کی تعلیم حاصل کرنا ہوگی یا جن کو آئندہ زندگی میں ایسے پیشے اختیار کرنے ہوں گے جن میں اعلیٰ ریاضی کی ضرورت پڑتی ہے۔ حال ہی میں بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن لاہور نے جو آئندہ ثانوی مدارج کا نصاب پیش کیا ہے، اس میں ریاضی کو صرف ان طلبا کے لیے لازمی مضمون قرار دینے کا فیصلہ کیا ہے جو سائنس پڑھیں گے اور باقیوں کے لیے ریاضی کو اختیاری مضمون قرار دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ضمناً یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ نصابی مباحثہ (جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) کی اس کمیٹی نے جس نے ثانوی مدارج کے نصاب پر بحث کی تھی، یہ فیصلہ کیا تھا کہ ریاضی کو اختیاری مضمون قرار دے دینا چاہیے اور اس کمیٹی نے جس نے ریاضی کے نصاب پر تفصیلی بحث کی تھی، یہ فیصلہ کیا تھا، کہ ریاضی کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ ایک حصہ لازمی ہو اور دوسرا اختیاری جیسا کہ کراچی بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے کیا ہے۔ نیز یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ پنجاب یونی ورسٹی کمیشن نے جو سنہ ۱۹۵۰ء میں تعلیم کا جائزہ لینے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اس مضمون کو ثانوی مدارج میں لازمی قرار دینے کے حق میں فیصلہ کیا ہے۔

(۲) **دیگر اسلامی ممالک** :- مصر میں ثانوی تعلیم کا کورس (۵ سال کی پرائمری تعلیم کے بعد) ۵ سال پر مشتمل ہے اس کے دو مدارج ہیں۔ پہلا درجہ چار سال پر مشتمل ہے اور دوسرا صرف ایک سال پر۔ ریاضی پہلے درجہ کا لازمی جزو ہے اور دوسرے درجہ میں اس کی حیثیت اختیاری مضمون کی ہے۔ لازمی نصاب میں حساب، الجبرا اور ہندسہ شامل ہیں۔

عراق میں ثانوی تعلیم چھ سال کی ابتدائی تعلیم کے بعد ۵ سال تک دی جاتی ہے۔ ثانوی تعلیم کے دو مدارج ہیں ۳ سالہ وسطانی درجہ اور پھر دو سالہ ثانوی درجہ۔ ثانوی درجہ میں چار قسم کے مختلف کورس پڑھائے جاتے ہیں ادبی۔ سائنٹیفک۔ تجارتی اور کورس برائے طالبات۔ ریاضی ہر کورس میں لازمی مضمون ہے۔ مگر ریاضی کے نصاب کی نوعیت ہر کورس میں جدا ہے، چنانچہ ادبی کورس اور کورس برائے طالبات میں صرف عام افادی ریاضی شامل ہے سائنٹیفک کورس میں الجبرا، ہندسہ اور علم مثلث شامل ہیں اور تجارتی کورس میں تجارتی حساب شامل ہے۔

(۳) دولت مشترکہ کے ممالک:- انگلستان کی مختلف یونی ورسٹیوں نے اپنے میٹریکیولیشن امتحان کے نصاب میں ریاضی کی حیثیت مختلف دی ہے مثلاً لندن میٹریکیولیشن کے لیے ابتدائی ریاضی لازمی مضمون ہے اس میں حساب، الجبرا، ہندسہ اور عددی علم مثلث شامل ہیں۔ اس امتحان کے نصاب میں اعلیٰ ریاضی کے نام سے ایک دوسرا مضمون بھی شامل ہے۔ اس کی حیثیت اختیاری مضمون کی ہے، اس میں الجبرا علم ہندسہ مستوی اور مجسمی اور علم الاحصاء شامل ہیں۔ برسٹل میں صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں کے میٹریکیولیشن امتحان میں ریاضی کو بالکل چھوڑا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں بھی صورت حال ایسی ہی رہی ہے جیسی کہ انگلستان میں۔ وہاں چند ایسی یونی ورسٹیاں ہیں، مثلاً علی گڈھ۔ جس کے میٹریکیولیشن امتحان کے نصاب میں ریاضی ہمیشہ سے لازمی مضمون رہا ہے اور اس میں حساب، الجبرا، جیومیٹری اور علم مثلث کے مبادیات شامل ہیں۔ یو۔ پی بورڈ آف ایجوکیشن میں ۱۹۲۵ء تک ریاضی امتحان ہائی اسکول کے نصاب کا لازمی حصہ تھا۔ اس میں حساب، الجبرا، ہندسہ اور ساحت، شامل تھے۔ اس کے بعد اس نصاب میں صرف حساب لازمی جز رہ گیا اور الجبرا اور ہندسہ اختیاری مضمون بنا دیے گئے پھر ۱۹۴۸ء میں ریاضی کو کلیۃً اختیاری مضمون کی حیثیت دیدی، اب اس کو لڑکوں کے لیے از سر نو لازمی بنا دیا گیا ہے اور لڑکیوں کے لیے اختیاری۔ وہاں ایسی بھی یونی ورسٹیاں ہیں مثلاً حیدر آباد اور کلکتہ جن میں ریاضی دو مضمون پر منقسم ہے۔ لازمی اور اختیاری۔ جنوبی افریقہ۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں یہ مضمون ثانوی مدارج کے لیے اختیاری ہے۔ آسٹریلیا میں ثانوی مدارج کے طلبہ کو دو امتحان دینے پڑتے ہیں۔ سکول انٹرمیڈیٹ اور سکول لیونگ۔ سکول انٹرمیڈیٹ امتحان میں ریاضی کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) حساب (۲) ریاضی الف (۳) ریاضی ب ان میں سے کوئی بھی گروہ لازمی نہیں ہے۔ ریاضی الف میں حساب، الجبرا، جیومیٹری اور علم مثلث کے مبادیات

شامل ہیں۔ ریاضی ب میں الجبرا، جیومیٹری اور علم مثلث کے مزید چند قاعدے شامل ہیں۔ سکول لیونگ امتحان میں بھی ریاضی کے تین گروہ کیے گئے ہیں (۱) عام ریاضی (۲) ریاضی الف (۳) ریاضی ب، یہ سارے کے سارے گروہ سائنٹیفک سیکشن میں شامل ہیں جن میں ریاضی کے علاوہ اور بھی بہت سے مضمون شامل ہیں اور ان میں سے صرف ایک مضمون میں پاس ہونا ضروری ہوتا ہے۔ عام ریاضی میں حساب، الجبرا، ہندسہ۔ اور علم مثلث کے مبادیات اور ان کا اطلاق شامل ہیں۔ ریاضی الف میں الجبرا۔ علم الاحصا، اور عددی ہندسہ شامل ہیں۔ اور ریاضی ب میں علم مثلث۔ ہندسہ اور میکانک شامل ہیں۔

(۴) دیگر ترقی یافتہ ممالک:۔ امریکہ میں پہلے آٹھ سالوں میں یعنی گریڈ VIII تک ریاضی سب طلبہ کے لیے لازمی ہے، اس میں حساب، الجبرے کی مبادیات تجربی ہندسہ اور علم مثلث کا تھوڑا سا جزو شامل ہے۔ اسی نصاب میں ریاضی کے وہ اجزا شامل ہیں جن کی ضرورت روزمرہ کے کاموں میں پڑتی ہے۔ نویں جماعت میں ریاضی کے دو حصے کر دیے گئے ہیں۔ عام ریاضی اور الجبرا اور ہر ایک طالب علم کو ان میں سے ایک جُز لازمی لینا ہوتا ہے۔ عموماً وہ لڑکے جو ریاضی میں کمزور تصور کیے جاتے ہیں عام ریاضی لیتے ہیں اور دوسرے الجبرا۔ غرض امریکہ میں پہلے نو سال کے نصاب میں کسی نہ کسی شکل میں ریاضی کو لازمی مضمون قرار دیا ہے۔ آج کل یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ وہاں کم سے کم ایک سال اور کسی نہ کسی شکل میں ریاضی لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جانا چاہیے۔

مابعد جنگ تعلیمی تجاویز کے مطابق روس میں یہ لازم ہو گیا ہے کہ ثانوی مدارس میں سات سال سے سترہ سال کی عمر کے طالب علم داخل کیے جائیں۔ وہاں سترہ سال تک کے ہر بچے کے لیے ایک ہی قسم کا نصاب ہے۔ ریاضی نصاب کا لازمی جزو ہے اور یہ حساب، الجبرا، ہندسہ، علم مثلث اور علم ہیئت پر مشتمل ہے۔

ایک سوال نامہ کی تحلیل

اب تک ہم نے میٹرکیولیشن اور مترادف امتحانوں میں جو پاکستان میں یا بیرونی ممالک میں منعقد ہوتے ہیں۔ ریاضی کی حیثیت پر بحث کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ میٹرکیولیشن کے نصاب میں ریاضی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے رکھنا یا لازمی مضامین کی فہرست سے اس کو خارج کرنا ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ ہو گیا ہے جس کو آسانی سے سلجھانا مشکل ہے اب آپ کے سامنے ایک سوال نامہ کی تحلیل پیش کی جاتی ہے۔ یہ ان لوگوں کو بھیجا گیا تھا۔ جو بچوں کی تعلیم سے بالواسطہ

یا بلاواسطہ تعلق رکھتے ہیں۔ چند سال گذرے مصنف نے برصغیر ہندو پاک میں کچھ لوگوں کو ایک سوال نامہ بھیجا گیا تھا۔ جس میں ان سے پوچھا گیا تھا کہ آیا ریاضی کو میٹریکیولیشن یا اس کے مترادف امتحان کے نصاب کا لازمی جزو ہونا چاہیے یا نہیں اور ان سے یہ بھی التجا کی گئی تھی کہ وہ اپنے جواب پر مدلل اور تفصیلی بحث کریں جن لوگوں کو یہ سوال نامہ بھیجا گیا تھا ان میں سکولوں کے ناظر، ٹریننگ کالجوں کا عملہ، سکولوں کے سر معلمین، کالجوں کے پرنسپل اور لیکچرار، وکلاء، انجینئر اور ڈاکٹر شامل تھے ۴۸۶ جواب موصول ہوئے۔ ان جوابوں کو مندرجہ ذیل چار گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(ا) وہ گروہ جو ریاضی کو سب کے لیے لازمی قرار دینا چاہتے ہیں اور وہ اس امر پر متفق تھے کہ مختلف یونی ورسٹیوں نے جو موجودہ ریاضی کے نصاب بنائے ہیں وہ کم و بیش ہر ایک کو پڑھنے چاہئیں یہ گروہ ۱۸۷ افراد پر جن میں ۶۹ ریاضی کے اساتذہ تھے مشتمل تھا۔

(ب) دوسرا گروہ ریاضی کو لازمی مضامین کی فہرست سے خارج کرنے کے حق میں تھا اس میں ۱۴۴ افراد شامل تھے۔

(ج) تیسرا گروہ جس میں ۱۱۹ افراد شامل تھے کی رائے یہ تھی کہ ریاضی کے دو حصے کر دیے جائیں جو امور روزمرہ کے انجام دینے میں افادی حیثیت رکھتے ہیں اور اختیاری حصہ جس میں اعلیٰ ریاضی شامل ہو۔

(د) چوتھا گروہ جس میں ۳۶ افراد تھے اس حق میں تھا کہ ریاضی ہائی سکول تک لازمی طور پر پڑھایا جائے مگر اس کا کورس موجودہ کورس سے بہت کم ہونا چاہیے۔ ہر گروہ تیسرے گروہ سے صرف اس حالت میں مختلف ہے کہ تیسرے گروہ کے لوگ اختیاری ریاضی کے کورس کے حق میں بھی ہیں۔ اور چوتھا گروہ اختیاری ریاضی کے متعین کرنے کے سلسلے میں خاموش ہے۔ آیئے ہر گروہ کے دلائل پر مختصر بحث کی جائے۔

ریاضی کو لازمی قرار دینے کے حق میں دلائل

ریاضی کی افادی حیثیت

پہلا گروہ اس حق میں ہے کہ ریاضی کو میٹریکیولیشن کے امتحان کے نصاب میں ایک لازمی مضمون کی حیثیت ملنی چاہیے، وہ لوگ ایسا کرنے کی سب سے بڑی وجہ اس کی افادی حیثیت بتاتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ موجودہ زمانے میں سائنس نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ وہ طالب علم جو ثانوی مدارس تک ریاضی کی تعلیم حاصل کرنے سے بے بہرہ رہتا ہے اس کا اس زمانے میں کامیابی سے زندگی بسر کرنا ناممکن ہے۔ معاشرے میں سیاسی اور اقتصادی تبدیلیاں روز افزوں

قی پر ہیں۔ دنیا کے ہر گوشے سے صنعت و حرفت کی ترقی کی آوازیں آرہی ہیں۔ آج کل آہنی مشینیں ایجاد ہو گئی ہیں
ںدان کا استعمال اس قدر زیادہ ہو چکا ہے۔ نیز ان کے تاثرات انسانی زندگی پر اس قدر گہرے ہیں کہ اگر موجودہ
ور کو مشینی دور کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ صنعت و حرفت اور سائنس کی اس بے پایاں ترقی کی جڑ ریاضی ہے
ناں چہ ریاضی کی تعلیم پر ہمیں مختلف زاویوں سے نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ زمانے میں جنگ سائنٹیفک اور
یکانکی ہو چکی ہے جس میں ریاضی کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اگر ہم یہ کہہ دیں کہ موجودہ جنگ میں
ریاضی کا ایک اونس بہادری کے ایک پونڈ سے بہتر ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ پھر علم طبیعات۔ علم کیمیا اور میکانکی اساس
ریاضی ہی ہے کہ اس کے علاوہ ایسے مضامین جیسے معاشیات۔ جغرافیہ اور تجربی نفسیات کے صحیح مطالعہ کے لیے
ریاضی کی اچھی خاصی تحصیل کی ضرورت ہے۔ یہ وہ مضامین ہیں جو طالب علم اعلیٰ تعلیمی اداروں میں جا کر پڑھتے ہیں چناں چہ
ہائی سکولوں میں ریاضی کی تعلیم کو اختیاری بنا دینا طالب علموں کو مذکورہ بالا مضامین کی صحیح تحصیل سے محروم رکھنا ہے
ریاضی کی افادیت اتنی زیادہ ہے کہ مصنف کے خیال میں اس پر کسی دوسرے مضمون میں تفصیلی بحث کی ضرورت ہے
تاہم چند سطور نیچے درج کی جاتی ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ریاضی کا موجودہ تمدن میں کیا حصہ ہے۔

اب بھی چند اشخاص ایسے ہیں جو اس امر سے لاعلم ہیں کہ ریاضی کائنات کی اہم کنجی ہے۔ ریاضی کے بغیر
علم سائنس کی بہت سی شاخیں، بہت سے پیشے، سیکڑوں تجارتیں اور صنعتیں قائم نہیں رہ سکتیں۔ اگر ریاضی کو تباہ
کر دیا جائے تو نہ ہم شمار کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی چیز کی پیمائش کر سکتے ہیں۔ حساب کتاب اور بہی کھاتہ میں مندرجات
بنک کا کاروبار۔ تقویم اس کے بغیر نہیں چل سکتے۔ تجارتی کاروبار اور آمد و رفت ریاضی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر
ریاضی نہ ہو تو فن انجینیری ختم ہو جائے اور ہمارے آسائش کی چیزیں، فلک نما عمارتیں، بڑے بڑے پل، لمبی لمبی سڑکیں
بڑی بڑی فیکٹریاں، ریلیں، موٹر کاریں اور دخانی جہاز ختم ہو جائیں۔ ریاضی کے بغیر نہ ٹیلیفون ہو سکتے ہیں اور نہ ریڈیو
ہو سکتے ہیں اور نہ ٹیلی ویژن۔ موجودہ زمانے کی اہم خصوصیات کا دار و مدار سائنس اور ریاضی کی متفقہ جدوجہد کا نتیجہ
ہے۔ اس لیے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ موجودہ زندگی کا انحصار بہت حد تک ریاضی پر ہے۔

ریاضی اور ذہنی ضبط

دوسری دلیل جو یہ گروہ ریاضی کی لازمی تعلیم کو برقرار رکھنے میں پیش کرتا ہے وہ ریاضی کی انضباطی حیثیت ہے۔ ان کا

خیال ہے کہ ریاضی ایک قسم کا ذہنی ضبط پیدا کرتا ہے جو دنیا کے ہر کاروبار کو صحیح طور پر عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ کوئی اور مضمون اتنا عمدہ ذہنی ضبط پیدا نہیں کر سکتا جتنا کہ ریاضی، چناں چہ ماہرین تعلیم و نفسیات اس نظریے کی بیسویں صدی کے شروع تک تصدیق کرتے رہے ہیں. حکیم افلاطون تو اس نظریے سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ انہوں نے اپنے تعلیمی ادارے کے بڑے دروازے پر یہ لکھ دیا تھا کہ جو شخص علم ہندسہ سے بے بہرہ ہے میرے ادارے کے اندر داخل نہ ہو"۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ حکیم افلاطون کے مدرسے میں سارا دن زاویوں اور لکیروں پر بحث رہتی تھی۔ اس کے برعکس معاشرے کے بنیادی مسائل پر بحث و تمحیص میں مبتلا رہتے تھے حکیم افلاطون کا اس جملے کا دروازے پر کندہ کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس کے خیال میں جس شخص نے علم ہندسہ کی تعلیم نہیں پائی وہ صحیح نتائج نکالنے اور کسی مسئلہ پر صحیح بحث کرنے سے قاصر ہے۔

ریاضی کو اختیاری بنانے میں خطرہ

تیسرے اس گروہ کا خیال ہے کہ اگر ریاضی کو میٹرکیولیشن یا اس کے مترادف امتحان میں لازمی نہ رکھا گیا تو اس کی صحیح تعلیم نظر انداز کر دی جائے گی اور طلباء کو اس مضمون سے نفرت ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ طلبہ کی کثیر تعداد اس مضمون کو پڑھنا چھوڑ دے گی اور ریاضی سے لاعلمی ان کو ایک اچھے شہری کے فرائض ادا کرنے کے لیے ہمیشہ سدِ راہ ہو گی۔ اس سلسلہ میں دو امکانات ہیں (۱) یہ کہ مضمون سب کو پڑھایا جائے۔ مگر اس میں فیل ہونے والے درگذر کر دیا جائے، ایسے ہی جیسے کہ آج کل سیکنڈری ایجوکیشن لاہور کے میٹرکیولیشن کے امتحان میں تاریخ، جغرافیہ کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے۔

(۲) اس مضمون کو اختیاری مضامین کی فہرست میں ڈال دیا جائے اور طالب علموں کو اپنی مرضی کے مطابق اسے چننے کی اجازت دی جائے۔ یعنی اس کی وہی حیثیت ہو جو کہ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور نے سائنس، پاکستانی زبان، اور ڈرائنگ وغیرہ کو دی ہے، دونوں امکانات پر تفصیلی بحث کی ضرورت ہے تاکہ دونوں حالتوں میں کسی نتیجہ پر پہونچا جا سکے۔ سب سے پہلے آئیے اس حالت کا جائزہ لیں جو تاریخ اور جغرافیہ کی موجودہ حالت کے مترادف ہو گی۔ سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے آئین و قوانین کے مطابق ایک طالب علم کو ثانوی مدارس میں انگریزی، ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ (جو کہ ایک مضمون تصور کیا جاتا ہے) اور دو مزید مضمون اپنی مرضی کے مطابق سائنس اور علم الابدان و صحت (فز

ہائی جین، اشہریت وصحت۔ پاکستانی زبان۔ کلاسیکی زبان۔ زراعت اور ڈرائنگ وغیرہ میں سے لینا ہوتے ہیں۔
میٹرکیلیولیشن امتحان کو پاس کرنے کے لیے ایک طالب علم کو انگریزی، ریاضی اور کسی دیگر دو مضامین میں پاس ہونا ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ وجغرافیہ کی حیثیت لطور ایک لازمی مضمون بہت اونچی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلبہ کا نظریہ تاریخ اور جغرافیہ کی طرف بالخصوص جغرافیہ کی طرف اچھا نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے لیے صرف دو مضمون یعنی انگریزی اور ریاضی صحیح مطالعہ کے لیے لازمی بنائے گئے ہیں۔ چناں چہ وہ تاریخ وجغرافیہ کا صحیح مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہاں پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے دو اختیاری مضمون کا مطالعہ بھی طلبا کو اچھی طرح نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دو مضامین طالب علم اپنی مرضی سے لیتے ہیں۔ عموماً وہ وہی دو مضمون لیتے ہیں جن میں ان کو دلچسپی ہوتی ہے۔ چناں چہ وہ ان دونوں مضمونوں کو بوجھ نہیں گنتے اور تاریخ وجغرافیہ کو وہ بوجھ تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کم زور طلبا تو پاس ہونے کے لیے انگریزی، حساب اور خود انتخاب کردہ دونوں مضامین کو پڑھتے ہیں اور تاریخ جغرافیہ کے مطالعہ کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن لاہور نے جو تاریخ وجغرافیہ کا نصاب مقرر کیا ہے وہ بہت طویل ہے۔ اس میں برصغیر ہند و پاک کی تاریخ، انگلستان کی تاریخ طبعی جغرافیہ اور نقشہ کشی برصغیر ہند و پاک کے جغرافیہ کا تفصیلی مطالعہ اور جغرافیہ عالم کا سرسری مطالعہ شامل ہیں۔ کم زور طلبہ کے لیے اتنے طویل کورس کو چھوڑ دینا ایک نعمت ہے۔ اوسط درجے کے طلبہ اور اوسط سے اچھے طلبہ اس کا مطالعہ ضرور کرتے ہیں، مگر وہ بھی جغرافیہ کا صحیح مطالعہ نہیں کرتے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس مضمون کے کل نمبر ۱۵۰ ہیں جس میں تاریخ کے پرچے کے نمبر ۹۰ ہیں۔ لہٰذا اساتذہ اور طلبہ قدرتی طور پر تاریخ میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور جغرافیہ میں کم۔ ظاہر ہے کہ ۹۰ نمبروں کے پرچے میں طالب علم آسانی سے ۵۰ تک نمبر حاصل کر سکتا ہے جو کہ پورے مضمون تاریخ وجغرافیہ میں پاس ہونے کے لیے ضروری ہیں، صرف اوسط سے زیادہ ذہین طلبہ جغرافیہ کا صحیح مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ جغرافیہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس بیان کی تصدیق صحیح واقعات سے کرنا بے جا نہ ہوگا۔

سابقہ پنجاب کے نویں اور دسویں جماعت کے طلبہ کو ایک سوال نامہ بھیجا گیا تھا۔ اس سوال نامے میں ان سے یہ پوچھا گیا تھا کہ وہ ان تمام مضامین کو جن کو وہ پڑھتے ہیں، اپنی ترجیح کے مطابق نزولی ترتیب میں

لکھیں یعنی جس مضمون کو وہ سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں اس کو سب سے پہلے لکھیں اور جس کو وہ سب سے زیادہ ناپسند کرتے ہیں اس کو سب سے آخر میں۔ وغیرہ۔ اس سوال نامے کا جواب ۱۱۰۴ لڑکوں نے دیا۔ مندرجہ جدول میں مختلف جگہ پر مختلف مضامین لکھنے والوں کی تعداد درج ہے۔

نمبر شمار	مضامین	پہلی جگہ	دوسری جگہ	تیسری جگہ	چوتھی جگہ	پانچویں جگہ	چھٹی
۱	انگریزی	۲۸۵	۳۱۱	۱۲۴	۲۱۷	۸۸	۹
۲	حساب	۲۳۶	۱۷۳	۱۹۷	۱۷۱	۱۹۵	۲
۳	تاریخ	۸۳	۱۶۴	۲۰۲	۲۶۶	۳۱۳	
۴	جغرافیہ	۱۰	۲۹	۱۰۷	۱۵۰	۳۱۱	[illegible]
۵	دیگر اختیاری مضامین						
۶	مزید مضامین	۴۹۰	۴۲۷	۴۷۲	۳۰۰	۲۲۷	[illegible]

حیرانی کی بات یہ ہے کہ جغرافیہ کو پہلی جگہ ایک فی صد سے کم لڑکوں نے دی ہے اور اس کے خلاف ۔۔۔ نے اس کو چھٹی جگہ اور ۲۸ ٪ نے اس کو پانچویں جگہ دی ہے۔ اگر تمام مضامین کی نسبتی شہرت کا شماریاتی حساب لگا[ئیں] تو ہم مندرجہ ذیل نتیجہ پر پہنچتے ہیں (جبکہ ۱۰۰ کو ہم اوسط نسبتی شہرت فرض کریں) (۱) انگریزی ۱۲۱ یعنی ۲۱ زیادہ (۲) ریاضی ۱۰۵ یعنی اوسط سے ۵ زیادہ (۳) تاریخ ۹۴ یعنی اوسط سے ۶ کم (۴) جغرافیہ ۶[۸] اوسط سے ۳۲ کم (۵) اختیاری مضامین ۱۲۳ یعنی اوسط سے ۲۳ زیادہ۔ اس شماریاتی تجزیہ سے ہم یہ نتیجہ [نکالتے] ہیں کہ تاریخ و جغرافیہ ہی ایسے دو مضمون ہیں جن کی نسبت شہرت اوسط سے کم ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر ایسا اختیاری مضمون بنا دیا جائے جیسا کہ تاریخ جغرافیہ کو تو اس کا بھی یہی حشر ہوگا۔ آئیے اب ہم اس [کا] جائزہ لیں جس میں کہ ریاضی کو ان اختیاری مضامین کی فہرست میں ڈالا جاتا ہے جن میں ڈرائنگ اور وغیرہ ڈالے گئے ہیں۔ ہندوستان کے صوبہ یو۔پی میں ۱۹۴۴ء تک ریاضی ثانوی مدارس میں لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن یو۔پی نے یہ فیصلہ کیا کہ ا[س] کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے:۔ (۱) حساب اور (۲) ریاضی۔ حساب سب کے لیے لازمی ہو اور

جیومیٹری. علم مثلث پر مشتمل ہو اختیاری کر دیا جائے۔ صوبجات یو.پی کے محکمہ تعلیم کے ڈائرکیٹر نے ایک سلسلہ میں گشتی سے تمام ہائی سکولوں کے ہیڈ ماسٹروں کو روانہ کیا۔ جس میں اس نے واضح طور پر یہ تحریر کیا تھا کہ ریاضی کو چھوڑنے کی اجازت صرف ان طلبہ کو دی جائے جو ریاضی میں بہت کم زور ہوں اور وہ بھی اگر والدین تحریری درخواست پیش کریں۔ اس تبدیلی کے تاثرات کا جائزہ لینے کے لیے مصنف نے اس صوبہ کے سکولوں کے ہیڈ ماسٹروں کو ایک خط بھیجا جس میں ان سے یہ درخواست کی کہ وہ دو مسلسل سالوں میں طلبہ کی تعداد سے مطلع کریں۔ جو اس تبدیلی کے بعد اختیاری ریاضی پڑھنے لگے ہوں۔ ۵۰ لڑکوں کے ہائی سکولوں سے لڑکیوں کے ہائی سکولوں سے جواب آئے۔ لڑکوں کے سکولوں میں پہلے سال ۹۱۲۷ طلبہ میں سے ۵۸۵۲ ریاضی پڑھتے تھے اور لڑکیوں کے سکولوں میں سے ۶۳۶ لڑکیوں میں سے ۳۲۸۔ اگلے سال ۱۱۰۰۰ میں سے ۶۲۳۸ اور ۷۰۵ لڑکیوں میں سے ۲۶۸ نے اختیاری ریاضی پڑھی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈائرکٹر تعلیم کی ہدایات پر بھی طلبہ کی ایک کثیر تعداد نے اختیاری ریاضی کو جس میں الجبرا اور جیومیٹری شامل ہیں اور جس کو عام طور پر طلبہ نفرت سے نہیں دیکھتے چھوڑ دیا تھا اور ہو سکتا تھا کہ اگر ڈائرکٹر تعلیم ہدایات جاری نہ کرتے تو اختیاری ریاضی چھوڑنے والوں کی تعداد اور زیادہ ہوتی۔

مندرجہ بالا دونوں حالتوں پر تفصیلی بحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خواہ ریاضی کو کسی بھی شکل میں لازمی بنا دیا جائے۔ طلبہ اس کے مطالعہ کو نظر انداز کریں گے۔ چناں چہ ان لوگوں کا جو ریاضی کو ثانوی مدارس میں مضمون کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں، خیال ہے کہ حساب الجبرا اور جیومیٹری کا موجودہ نصاب جو ثانوی سکولوں کے نصاب میں شامل ہے روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے از بس ضروری ہے اور اس کو لازمی نصاب سے خارج کرنا طلبہ کی قابلیتوں کے معیار کو ناجائز طریقہ سے کم کرنا ہے۔

تدریس عربی (مفید ہدایات)

مختار فاروقی

یاد رہے کہ عربی سیکھنے سکھانے سے تین مقاصد پیش نظر ہوتے ہیں:۔

(۱) طلبہ عربی زبان میں گفتگو کر سکیں۔

(۲) عربی کتابیں جو عربی رسم الخط میں چھپی ہوئی ہوں۔ روانی کے ساتھ سمجھ کر پڑھ سکیں۔

(۳) اپنے خیالات کا اظہار تحریر کے ذریعے صاف طور پر کر سکیں۔

—— گفتگو کے لیے ان باتوں کی ضرورت ہے :۔

(۱) الفاظ کا منہ سے نکلتے ہی جان لینا۔ کانوں کو بذریعہ مشق ایسا عادی بنانا چاہیے کہ وہ آوازوں میں بخوبی تمیز کر سکیں

(۲) لفظ کو فوراً بغیر کوشش ارادی اس شے یا خیال سے منسوب کرنا جسے وہ تعبیر کرتا ہو۔

(۳) اپنی زبان میں اہل زبان کے سوچنے کی طرزوں سے کامل واقفیت یعنی عربی کو بطور آلۂ خیال استعمال کرنے کی قدرت۔ لہذا عربی سیکھنے کے شوقین حضرات کو جملوں میں الفاظ کی ترتیب مشاہدہ کرتے اور فقرات خود بناتے رہنا چاہیے۔

(۴) عربی الفاظ کا تلفظ صحت و صفائی سے ادا کرنے کی قابلیت

یہ بات آلاتِ آواز کے مقام پر ہر دم توجہ دینے اور سوچ سمجھ کر بار بار مشق کرنے سے حاصل ہوتی ہے متشابہ (ملتی جلتی آواز والے حروف) جیسے ا، ع، غ، ہ، ح ۔ ق، ک ۔ س، ص اور ہم مخرج حروف میں تمیز (ہم مخرج حروف وہ ہوتے ہیں جو ایک ہی مقام سے ادا کیے جائیں جیسے ء ح خ ہ ع غ سب اہل زبان کے لب و لہجہ کی نقالی کرنے سے ہی سیکھی جا سکتی ہے۔ عربی اس ضمن میں سب زبانوں میں ممتاز ہے۔ کیوں کہ زبر زیر پیش جزم اور تلفظ کا اختلاف معانی میں زمین و آسمان کا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درس نظامیہ میں قراءت سیکھنے پر عمر کا ایک حصہ لگا دیا جاتا ہے۔

پڑھنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ آواز اور اس کے معنی کا چھپی ہوئی علامت سے ایسا گہرا تعلق پیدا کر دیا جائے کہ لفظ دیکھتے ہی اس کا مفہوم فوراً یاد آ جائے۔

لکھنا اس امر کا مقتضی ہے کہ آواز اور اس کا مفہوم تحریری علامت سے خوب مربوط ہو۔ ان اغراض کے واسطے (۱) طلبہ کو ایک وقت میں ایک ہی بات سکھائیے۔ پہلے انہیں لفظ کی آواز کتاب دکھائے بغیر بتائیے پھر کتاب میں وہی کتاب روشناس کرائیے۔ اخیر میں طالب علم کو تحریر سکھائیے۔ کان، آلات آواز اور آنکھ تینوں کی تربیت کرنی چاہیے۔ کان کی آواز کو تمیز کرنے کے لیے۔ آلاتِ آواز کی آواز نکالنے کے لیے اور آنکھ کی علامتِ آواز پہچاننے کے لیے۔

یاد رکھو کہ مادری زبان کے علاوہ دیگر تمام زبانیں زیادہ تر تقلید اور مشق سے آتی ہیں۔ صرف و نحو کے قواعد رٹ لینے سے نہیں۔ کوئک صاحب کا قول ہے کہ "ہر ایک زبان استعمال سے سیکھنی چاہیے، صرف و نحو کے قاعدوں سے نہیں۔ قاعدوں سے استعمال میں مدد ملتی ہے اور اس کی صحت کا مقیاس ہاتھ لگتا ہے۔ لیکن انہیں استعمال کے بعد لینا چاہیے پہلے نہیں"۔

اساتذہ عربی کا بڑا مدعا یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ میں صحت کے ساتھ بات چیت کرنے کی مہارت پیدا ہو جائے اور وہ اپنے خیالات بذریعہ تقریر ظاہر کرتے وقت اہل زبان کی طرح زبان استعمال کر سکیں۔ اس لیے:-

حتی الامکان نئے الفاظ کو براہِ راست اُن اشیاء و افعال سے وابستہ کیجیے جنہیں وہ تعبیر کرتے ہیں۔ دیگر زبان کے ہم معنی الفاظ سے نہیں۔

جہاں تک ہو سکے عربی لفظوں اور ترکیبوں کو عربی میں ہی روشناس کراؤ۔ ابتدائی اسباق میں اپنا مطلب سمجھانے کے لیے اکثر دیسی زبان (MODERN PAKISTANI LANGUAGE) میں توضیح و تشریح کرنی پڑے گی۔ لیکن سال اول (یعنی وہ درجہ جس میں آداب عالیہ میں سے کوئی ایک بطور مضمون انتخاب رکھا جائے (عربی، فارسی لاطینی وغیرہ CLASSICAL LANGUAGES) کے بعد کوشش کیجیے کہ صرف عربی زبان سے کام لیا جائے۔

پڑھنے کے سبق کے ہر ایک جملے کو انشا پردازی کی بہت سی زبانی مشقوں کی بنیاد بنائیے۔ کسی لفظ کو جانا ہوا مت کیجیے جب تک کہ طالب علم اسے جملے میں استعمال کر کے نہ دکھائے۔ فارسی عربی یا کسی اور متبادل زبان کے

استفہامیہ الفاظ طلبہ جلد سیکھ لیتے ہیں. لہٰذا معلم ادب جمالی (CLASSICAL TEACHER) ہر ایک جملے پر بہت سے ایسے سوالات آسانی سے پوچھ سکتا ہے جن سے (۱) طالب علم باری باری جملے کے ہر ایک حصے پر توجہ کرے (۲) اُسے تلفظ اور لب ولہجہ کی مشق ہو جائے اور (۳) وہ استفہامیہ اور بیانیہ دونو قسم کے جملوں میں الفاظ کی ترتیب اور استعمال سے آشنا ہو جائے.

اپنے شاگردوں کو ابتدا میں پورے جملوں میں جواب دینے کی عادت ڈالیے.

شروع ہی سے پر پوری توجہ کیجیے. خیال رکھیں کہ آپ کے متعلمین لاپرواہی سے غلط کرنے کی عادت نہ ڈال لیں. ورنہ ایسی قبیح عادت مٹانے میں کئی برس لگیں گے. لہٰذا ۔

خود اپنے تلفظ کی صحت کا خیال رکھیں. طلبہ کے سامنے بہت عمدہ نمونہ پیش کیجیے۔

علامت سے پہلے اس کی آواز سکھائیے. ایک وقت میں ایک بات تعلیم کیجیے. بہت سے عام الفاظ کے ہجے بے قاعدہ ہیں. اس لیے اگر آواز سکھانے سے پہلے علامت بتائی جائے تو اس سے طالب علم کی مشکلات بڑھ جاتی ہیں. مثال قَالُوْا بولنے میں قَالُوْ آتا ہے اور ظَفَرُ الْمِلَّةِ وَالدِّیْن کا تلفظ ظفرل ملتِ وَدّدِین ہے اور عوام اسے ظفرل ملتِ وَالدِّین پڑھتے ہیں. آئندہ نظم میں نشان زدہ مرکبات قابل غور ہیں ۔

ہم آواز الفاظ کا تلفظ بذریعہ مقابلہ و باہمی ربط ذہن نشین کرائیے :۔ مثال عَاهِمَةٌ (آباد) آمِرَةٌ (حکم دینے والی) قَالُوْا (انہوں نے کہا) کَالُوْا (انہوں نے ناپا)

جن الفاظ میں خاص دقتیں پیش آئیں. انہیں جملوں میں استعمال کرائیں اور ان جملوں کو اور چند آسان پرعمل نظموں کو احتیاط کے ساتھ حفظ یاد کرائیں جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے :۔

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ

اَلْإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ

(ترجمہ) تم لوگوں میں ہر ایک شخص حاکم ہے اور ہر ایک سے اپنی رعایا اور اپنے زیردستوں کے بارے میں پوچھ ہوگی ۔ بادشاہ سب ملک پر حاکم ہوتا ہے تو اسے اپنی تمام رعیت کے بارے میں بازپرس ہوگی (آیا ان کے حقوق کی نگہداشت کی یا نہیں)

اَلْمَدْرَسَةُ

أَنَا الْمَدْرَسَةُ اجْعَلْنِيْ كَأُمٍّ ، لَا تَمِلْ عَنِّيْ
وَلَا تَفْزَعْ كَمَأْخُوْذٍ مِّنَ الْبَيْتِ إِلَى السِّجْنِ
كَأَنِّيْ وَجْهُ صَيَّادٍ وَأَنْتَ الطَّيْرُ فِي الْغُصْنِ
أَنَا الْمِصْبَاحُ لِلْفِكْرِ أَنَا الْمِفْتَاحُ لِلذِّهْنِ
أَنَا الْبَابُ إِلَى الْمَجْدِ تَعَالَ ادْخُلْ عَلَى الْيُمْنِ

(مصباح الادب)

جو آوازیں دیسی زبان میں ہوں لیکن عربی زبان میں نہ ہوں ان پر خاص توجہ دیجیے اور اس بات کا خیال رکھیں کہ تمہارے خوشہ چین ان آوازوں کی بجائے اور آوازیں نہ نکالیں۔

اپنے اسباق کو درسی کتاب کی عبارت پر مبنی کیجیے۔ ایسا کرنے سے استاد کا کام محدود و معین ہو جاتا ہے۔ اور دہرانے میں آسانی رہتی ہے۔ نئے الفاظ جو زبانی سکھائے جائیں وہ ایسے ہوں جو طالب علم کو بعد ازاں درسی کتاب میں مل جائیں۔ گریمر کے اسباق کے لیے مثالیں اور ترجمے کے لیے مشقیں بھی اسی منبع سے لیجیے۔

سبق کا بیشتر حصہ مت سکھایئے۔ تھوڑا سکھایئے۔ مگر اچھی طرح سکھایئے۔ شروع شروع میں چار پانچ سطروں کا چھوٹا سا پیرا بہت کافی ہوگا۔

آموختہ کو اکثر دہراتے رہیے۔ نیا سبق شروع کرنے سے پہلے پچھلے پڑھے ہوئے سبق کے الفاظ اجزائے جملہ دہرائیں۔ روزانہ ایسا کرنے سے ایک تو آپ کے شاگرد یہ سمجھ لیں گے کہ سبق یاد کیے بغیر گزارہ نہیں دوسرے اعادہ کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ وسطانی (حصہ مڈل) درجوں میں ایسا کرنا اشد ضروری ہے۔ لیکن ثانوی جماعتوں (حصہ ہائی) میں بھی یہ امر فائدہ سے خالی ثابت نہیں ہوگا۔ بلکہ پہلی سہ ماہی میں ہر جماعت میں پچھلی جماعت سے سیکھے ہوئے قواعد صرف و نحو اور ان پر مبنی ترجمہ کی مشق کرانے سے طلبہ میں آموختہ کالنقش فی الحجر ہو جائے گا

ابتدائی جماعت کے پڑھنے کے لیے سبق کا خاکہ

(۱) طالب علم کا ذخیرہ الفاظ بڑھانا۔ اور نئے الفاظ کا صحیح تلفظ سکھانا

(۲) نئے الفاظ کو چھپی ہوئی علامات سے منسوب کرنا۔

(۳) طلبہ کو جملے میں الفاظ کی مروجہ ترتیب کا خوگر بنانا یعنی سادہ فقروں کی ساخت کا۔

طریقہ تعلیم کے متعلق ہدایات

تمہید (۱) بھرتی سے سوالات کر کے پچھلے اسباق کے الفاظ اور اجزائے جملہ دہرائیں۔

مضمون سبق (مطلب بتانا) :- سبق کی کہانی یا مضمون دیسی زبان (اردو، پشتو، بنگالی، سندھی، پنجابی میں سے جو قریب الفہم زبان آپ کے شاگرد آسانی سے سمجھ جائیں) میں بیان کریں۔

خیالات سے الفاظ کی طرف چلنا واجب ہے۔ اس بات کی احتیاط رکھیں کہ آپ کے خیالات میں ترتیب وہی ہو جو سبق کی عبارت میں ہے۔

عبارت کے الفاظ، نئے الفاظ سے خیالات مربوط کرنا :- کہانی پھر بیان کیجیے۔ سبق کے نئے الفاظ سکھائیے۔ اگر کہانی کی کسی تصویر سے توضیح کی گئی ہے۔ یا سبق میں کسی جانی پہچانی چیز کا ذکر ہے جو آپ اپنے طلبہ کو دکھا سکتے ہیں۔ تو الفاظ کو بلا واسطہ (براہِ راست) شے سے وابستہ کیجیے۔ نہ صرف دیسی زبان کے ہم معنی الفاظ سے۔

تلفّظ :- صحت مخرج (حرف کی ادائیگی کی جگہ) اور تفصیل پر جتنی توجہ کی جائے اتنی ہی تھوڑی ہے۔ جب کوئی مشکل پیش آئے تو ہم آواز ملتے جلتے جیسے قَالَ اُس نے کہا۔ کَالَ اس نے ناپا وغیرہ الفاظ کے ساتھ مقابلہ کر کے مشابہت نکلوائیے۔ حرف کی صحیح آواز کا طلبہ کی غلط نکالی ہوئی آواز سے مقابلہ کر کے اختلاف ظاہر کیجیے اور زبان آہستہ صاف اور پر زور ہونی چاہیے۔ "یہ نہ خیال کریں کہ چلّانے سے مشکل آواز زیادہ واضح ہو جائے گی"

حروف کی آوازوں کے متعلق خاص دقت طلب امور پر خاص توجہ دلائیے۔

نئے الفاظ کو تختۂ سیاہ پر خوش خط بنا کر لکھیے، اور شاگردوں کو مہارتی کے طریق سے ان کے تلفظ کی مشق کرائیے

پڑھنے کا خاص سبق (الفاظ کو چھپی ہوئی علامات سے منسوب کرنا) :- پہلا جملہ آہستہ آہستہ صاف طور پر پڑھ کر دکھا طلبہ اسے اپنی کتابوں میں دیکھتے جائیں آپ اس کے معنی پر سوال کریں۔

تشریح و ترجمہ: (الف) جملے کے بڑے بڑے حصے بتائیے اور ان کا ترجمہ کرائیے (ب) مشکل الفاظ اور اجزائے جملہ کے معنی پوچھیے (ج) تمام جملے کا ترجمہ کرائیں۔

اجتماعی پڑھنا: جملے کو اس کے بار بط جزو بنا کر پڑھیے اور ہر ایک جزو کی طلبہ سے اجتماعی طور پر (بہ یک آواز) تقلید کرائیے سارا جملہ پڑھیں اور اسے اجتماعی طور پر دہرائیں۔ جملے کے الفاظ کو باربط مجموعوں کا بنا ہوا سمجھیں۔ علیحدہ علیحدہ الفاظ کا نہیں اس لیے خیال رکھیں کہ قاری مجموعہ مجموعہ کر کے پڑھیں اور ہر ایک مجموعہ کے بعد تھوڑا وقفہ کریں۔ الغرض شروع ہی سے تجزیہ عبارت پر توجہ دیں۔

انفرادی پڑھنا: دو یا تین لڑکوں سے جملہ انفرادی طور پر پڑھوائیں۔ تلفظ وغیرہ کی غلطیاں جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے ویسے درست کریں۔ باقی جملوں کے پڑھانے میں بھی یہی طریقہ برتیں۔

عبارت پر مشقیں: عربی میں بہت سے آسان سوال پوچھیے۔ جن سے طالب علم کو باری باری جملے کے ہر حصے پر توجہ کرنی پڑے اور اپنے جواب میں اس حصے کے الفاظ کو استعمال کرنا پڑے اور ان پر خاص توجہ دینی پڑے۔ مثلاً کون یا کس نے اور مرکب سوال کریں تو جواب میں جملے کا فاعل آئے گا جیسے مَنْ ذَهَبَ؟ کون گیا؟ جواب میں کہیں گے ذَهَبَ خَالِدٌ تو خالد فاعل ہوا۔ اگر جملے میں مفعول معلوم کرنا چاہیں تو فعل سے پہلے ما لگا کر سوال کیجیے جیسے كَتَبَ حَمِيْدٌ كِتَابًا۔ یا يَضْرِبُ زَيْدٌ لِصًّا۔ یہاں سوال یوں بنیں گے (۱) مَا كَتَبَ حَمِيْدٌ؟ (۲) لِمَنْ يَضْرِبُ زَيْدٌ؟ شاگرد صحیح جواب ابتدا میں یوں دیں گے (۱) كِتَابًا (۲) لِصًّا۔ لیکن پورے جملوں میں جواب دینے کی عادت مناسب رہے گی یعنی مندرجہ صدر مکمل جملے جواب کے طور پر بیان کریں۔ جیسا کہ اردو میں فعل سے قبل کس کو یا کیا کے کلمات استفہام لگا کر سوال کیا جائے تو جواب میں مفعول آئے گا۔ (ا) کس قسم کا اور مسند اور مسند الیہ ملا کر سوال کریں تو جواب میں متعلقات فعل معلوم ہو جائیں گے جیسے (ب) کس طرح (کب یا کہاں) اور مسند و مسند الیہ ملا کر پوچھا جائے تو بھی وہی جواب ہوگا۔

عربی مثالیں: ضَرَبَ زَيْدٌ خَالِدًا بِالْعَصَا۔ كَيْفَ ضَرَبَ؟ جواب ضَرَبَ بِالْعَصَا تو بِالْعَصَا ضَرَبَ فعل کا متعلق ہوگا۔ شَرِبْتُ الْمَاءَ عِنْدَ النَّوْمِ سے مَتٰى شَرِبْتُ سوال بنے گا اور جواب شَرِبْتُ عِنْدَ النَّوْمِ یا عِنْدَ النَّوْمِ ہوگا۔ صَعِدَتْ زَيْنَبُ عَلَى السَّطْحِ اس پر سوال یوں کریں أَيْنَ صَعِدَتْ زَيْنَبُ؟ جواب میں یہی جملہ آئے گا اور لڑکے پہلے یوں کہیں گے عَلَى السَّطْحِ اور یہی متعلق فعل ہے۔ (باقی)

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

ایک عوضی استاد کی رپورٹ

ریاست پنسلوینیا کے ایک ہائی سکول میں کام کرنے والے ایک عوضی استاد نے اپنے ذاتی تجربات کا حال یوں بیان کیا ہے :-

میں کمرے میں گیا۔ سارا کام بالکل ٹھیک چل رہا تھا۔ اتنے میں ایک لڑکا جو سامنے کی ڈیسک پر بیٹھا تھا۔ کھڑا ہوا، اور بولا "آپ عوضی استادوں کو یہ کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ آج ٹھیک ٹھیک یہی کام کرنا ہے"؟

میں مسکرا کر چپ رہا۔ میں اس جماعت میں پہلی بار کھڑا ہوا تھا۔ اس کے باوجود مجھے علم تھا کہ سبق کس مقام سے شروع کرنا ہے۔

اس مدرسے میں عوضی استادوں کے ساتھ دوسرے مدرسوں کی نسبت مختلف سلوک کیا جاتا ہے۔ مدرسے میں حاضری سے پہلی شام کو پرنسپل نے مجھے بلایا اور بڑی مفید بات چیت کی۔ اس سے میں اس قابل ہو گیا کہ مدرسے میں ہر طرح تیار ہو کر آؤں۔ جب میں صبح مدرسے کے دفتر میں پہونچا تو رخصتی استاد کا لکھا ہوا ایک رقعہ ملا۔ اس میں استاد نے اپنی ہر جماعت کے دو دو طالب علموں کے نام درج کیے تھے اور لکھا تھا یہ لڑکے نہ صرف ہر قسم کا ضروری سامان مہیا کر دیں گے بلکہ یہ تفصیل بھی بتا دیں گے کہ طریق کار کیا ہو۔

جب میں کمرے میں اپنی کرسی پر بیٹھا تو سامنے میز پر لڑکوں کی نشست کا ایک نقشہ کاغذ پر درج تھا اور ساتھ ہی ایک کاپی میں کام کا تفصیلی منصوبہ درج تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ آج کون کون سے اسباق پڑھانے ہوں گے۔ پچھلے چند ہفتوں میں کیا کچھ پڑھایا گیا ہے اور آئندہ کام کا خاکہ کیا ہونا چاہیے۔

مجھے اس مدرسے میں پہلے بھی کئی بار بطور عوضی استاد کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ استاد کے رخصت پر جانے کا علم سر معلم کو کافی عرصہ پہلے ہو گیا۔ ایسی صورت میں مجھے کام شروع کرنے سے پہلے استاد کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے بلا لیا گیا۔ میں نے کئی اور مدرسوں میں بھی بطور عوضی استاد کام کیا ہے۔ مگر اور کوئی مدرسہ

رِقِ کار اختیار نہیں کرتا۔ تاہم یہ طریقِ کار عوضی استاد کے لیے بے حد مفید ہے۔ استاد چند مختصر اشاروں میں ہی اپنے
ہ اور جماعت کے کام کے متعلق وہ سب کچھ بتا دیتا ہے جس کے جاننے کی عوضی استاد کو سخت ضرورت ہوتی ہے

اس مدرسے میں طلبہ میرے ساتھ قابلِ تعریف طور پر تعاون کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس مدرسے
ں عوضی استادوں کی جو تنظیم ہوتی ہے اس کے لیے استادوں نے بڑی محنت سے کام کیا ہے۔

یہ تمام باتیں نہایت پسندیدہ ہیں۔ میری رائے ہے کہ شروع سال میں نصاب کی تیاری کے لیے مدرسے
ا استادوں کا جو جلسہ ہوا کرتا ہے اس میں عوضی استادوں کو بھی بلایا جائے۔ میری یہ بھی تجویز ہے کہ انہیں طلبہ کی
عمال شدہ درسی کتابیں اور سلیبس کی ایک نقل بھی مہیا کی جائے۔ سرِ معلم اور دوسرے استاد عوضی استاد کی رہنمائی
لیے اسے یہ بتا سکتے ہیں کہ ضبط کے مسائل کو کیوں کر حل کرنا چاہیے۔ ان مشوروں پر عمل کرنے سے عوضی استادوں کا
زیادہ بہتر ہو سکتا ہے۔

نے آج کیا پڑھا؟

آج تم نے مدرسے میں کیا سیکھا؟ یہ وہ سوال ہے جو گھر پہنچتے ہی بہت سے بچوں سے پوچھا جاتا ہے۔ کئی بچے
ں کا کچھ جواب نہیں دے سکتے جس سے بعض والدین یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ مدرسے میں کچھ پڑھایا ہی نہیں جاتا
رام کے ساتھ صحت مند مراسم استوار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسے غلط تاثرات کا خاتمہ کیا جائے۔ اس کی سہل صورت
ہے کہ مدرسہ ختم ہونے سے پہلے استاد لڑکوں سے خود یہ پوچھتے کہ:-

بچو! بھلا بتاؤ آج تم نے کیا کچھ سیکھا ہے؟ اس سے بچے دن بھر کے کام کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے قابل بھی
جائیں گے اور گھر جا کر والدین کو بھی مطمئن کر سکیں گے۔

ستاد کا مقام

لاس انجیلز ہیرلڈ ایکسپریس اپنی ایک تازہ اشاعت میں لکھتا ہے:- "ہمیں ایسے استادوں کی ضرورت ہے
ہمارے بچوں کو آئندہ زندگی کا سامنا کرنے کے قابل بنا دیں۔ ہم میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو استادوں سے یہ بھی
قع رکھتے ہیں کہ جو تربیت بچوں کو گھر پر ملنی چاہیے تھی اس کی ذمہ داری بھی وہ اٹھائیں۔ ان ساری باتوں کے باوجود
م ابھی اس قابل نہیں ہو سکے کہ امریکی نوجوان کے ان محافظوں اور معلموں کے لیے عوام میں تعلیم کا وہ فلسفہ پیدا کر سکیں،

جس کے وہ حق دار ہیں۔

امریکن ایسوسی ایشن آف یونی ورسٹی وومن نے پچھلے اجلاس میں تعلیم کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا:۔

عوامی مدرسوں میں ہمیں جو دلچسپی اور ان کی حمایت کا ہمیں جو شدید احساس ہے ہم اس پر از سر نو زور دینا ضروری سمجھتی ہیں۔ پبلک سکولوں کا وجود ہمارے جمہوری طرز زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ جو لوگ ان مدرسوں میں تدریس اور انتظامی خدمت پر مامور ہیں۔ ہمیں ان کی پیشہ ورانہ اور مالی حیثیت کی ترقی کا بہت خیال ہے۔ ان کی شرائط ملازمت کو بہتر بنانا اس بات کی ضمانت ہوگی کہ مدرسوں میں کام کرنے کے لیے موزوں اور قابل لوگ مہیا ہوتے رہیں گے۔

تعلیم اور قومی آمدنی

امریکی کانگرس کی اقتصادی کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے ایک مشہور ماہر تعلیم نے کہا:۔

دیہاتی مدرسوں کو بہتر بنانے اور پیشہ ورانہ تعلیم پر روپیہ لگانا غالباً بڑا نفع بخش سودا ثابت ہوگا۔ اعداد و شمار کی شہادت پیش کرتے ہوئے گواہ نے کہا کہ قومی آمدنی کے علاجوں میں تعلیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ اس مسئلے کے حل میں بڑا کردار ادا کر سکتی ہے۔ گواہ نے مزید کہا کہ اس وقت استادوں اور مکانیت کی جو کمی ہے اگر اس کا جلد تدارک نہ کیا گیا تو اس کا خمیازہ اگلی نسل کو بھگتنا پڑے گا۔

ایک اور گواہ نے کہا کہ اگر ہم تمام نوجوانوں کو ایک سی تعلیمی سہولتیں دینا چاہتے ہیں تو مدرسوں کی مکانیت یا فوری اضافہ ہونا چاہیے۔ جو ریاستیں اس مطلب کے لیے کافی روپیہ نہیں رکھتیں مرکزی حکومت کو ان کی مالی مدد کرنی چاہیے میں نہیں سمجھتا کہ تعمیری پروگرام میں مدد حاصل کرنے سے تعلیم کی مقامی آزادی عمل میں کوئی کمی واقع ہو سکتی ہے۔

کمشنر آف ایجوکیشن سیموئل براؤنیل نے اپنی شہادت میں کہا کہ تعلیم اور آمدنی کے درمیان ناقابل انکار رشتہ ہے۔ چھوٹی آمدنی والے گروہوں کی مشکل کا علاج یہی ہے کہ تعلیمی سہولتوں اور زیادہ عام اور مساوی کیا جائے۔ یہی وجہ کہ امریکہ کی مرکزی حکومت نے مدرسوں کی تعمیرات کے لیے مالی امداد کا منصوبہ تیار کیا۔

فنی ماہر اور تعلیم

دنیا کے اکثر ملکوں کو آج یہ شکایت ہے کہ فنی ماہر کافی تعداد میں دستیاب نہیں ہو رہے۔ اس کی وجہ یہ نہ ان ملکوں میں آبادی کی کمی ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ ان کے نوجوانوں کو فنی تربیت کی کافی سہولتیں میسر نہیں۔

امریکہ کے ایجوکیشن پالیسی کمیشن نے اس مسئلہ پر یوں اظہار خیال کیا ہے۔ اس مسئلہ کے حل کی اہم ترین چابی تعلیم کے ہاتھ میں ہے۔ فوری مسئلہ کل تعداد کا نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کی فنی قابلیت کے فقدان کا ہے۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے مدرسوں، کالجوں اور تعلیم بالغان کے اداروں کو بہت سی ذمہ داریاں قبول کرنی پڑیں گی۔

امریکہ کا ذکر کرتے ہوئے کمیشن نے کہا کہ گو اس ملک کی کل آبادی بڑھ رہی ہے۔ اس کے نوجوان بالغوں کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔

پچھلے پانچ سال سے امریکی کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نسبتاً تھوڑے لوگ کیمیا کی تعلیم حاصل کر کے نکل رہے ہیں اس سے ملک میں ماہرین کیمیا کی کمی پیدا ہو گئی ہے۔ امید ہے یہ کمی ایک سال تک پوری ہو جائے گی۔

ایک امریکی یونیورسٹی کے صدر نے ۶۵۸ یونیورسٹیوں اور کالجوں سے اعداد و شمار جمع کرنے کے بعد اپنے ایک حالیہ خطبے میں اعلان کیا کہ قوم کی خدمت کے لیے زیادہ استاد اور انجینئر چلے آ رہے ہیں۔ نئے داخل ہونے والے طلبہ میں ان دونوں پیشوں کا رجحان ترقی پر ہے۔ لیکن معلمی کے متعلق خصوصیت کے ساتھ انتباہ ضروری ہے کہ جن نوجوانوں نے اس پیشے کا قصد کیا ہے انہیں اس میں رہنے کے لیے آمادہ کیا جانا چاہیے۔

امریکی انجینئرنگ کمیشن کے نائب صدر نے انتباہ کیا ہے کہ ٹکنالوجی کے میدان میں اپنی قائدانہ حیثیت قائم رکھنے کے لیے امریکہ کو زیادہ انجینئر اور سائنس دان تیار کرنے چاہئیں۔ انہوں نے کہا کہ عام تعین یہ ہے کہ سوویٹ یونین اپنے سارے میزانیہ کا پانچواں حصہ تعلیم پر صرف کر رہی ہے اور تعلیم میں سائنس اور ریاضی پر خصوصی زور دیا جا رہا ہے۔

معذور بچے

جو بچے جسمانی نقائص کے باعث زندگی کے تمام مواقع سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ہم انہیں معذور بچوں کا نام دیتے ہیں۔ مثلاً ایک بچے کی بینائی ناپید ہے، ہم اسے اندھا کہتے ہیں۔ لیکن محض اسے ایک نام دے کر معاملے کو ختم کر دینا اس بچے کے ساتھ انتہائی بے انصافی ہے۔ یہ بجا ہے کہ اس کی آنکھیں نہیں مگر اس کی جسمانی مشین کے باقی تمام پرزے صحیح ہیں جذبات و احساسات کے لحاظ سے اس کی فطرت کے تقاضے بالکل ایسے ہیں جیسے عام بچوں کے۔

معذور بچے کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ اس کے جذبات و احساسات کا پورا پورا احترام کیا جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اس کی معذوری کو آڑ بنا کر دیا جائے بلکہ اس معذوری کی تلافی اس رنگ میں کی جائے کہ اس کا احساس

حتی الامکان ختم ہو جائے۔ بچے کو اجتماعی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے قابل بنایا جائے۔ اسے نمایاں مقام حاصل کرنے اور اپنے تمام جوہر دکھانے کے مواقع دیے جائیں۔ اس طرح قبول کیے جانے کے بعد وہ معذور بچہ نہیں رہے گا بلکہ ایک عام بچہ بن جائے گا۔

استادوں کے باہمی مراسم

ایک ہی مدرسے میں کام کرنے والے استادوں کے درمیان مراسم کا قائم ہونا قدرتی بات ہے۔ لیکن کسی بڑے شہر یا قصبے کے مختلف مدرسوں میں کام کرنے والے استادوں کے درمیان مراسم قائم کرنے کے لیے خاص تدابیر پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ پچھلے سال ڈی ٹرائٹ (مشی گن) کے استادوں کی انجمن نے اس مطلب کے لیے ایک بہت عمدہ تدبیر اختیار کی۔ انجمن نے اپنے تمام اراکین کو مقامی ادارے اور اہم مقامات دکھانے کا پروگرام بنایا۔ پروگرام کی آخری شق یہ تھی کہ استاد ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اپنے شہر کا فضائی منظر دیکھیں۔ پروگرام کے خاتمہ پر انجمن نے مقامی کمپنیوں کے تمام عہدہ داروں کو کھانے کی دعوت دی۔ اس تقریب پر ایک فرضی تعلیمی سیاحت کا بندوبست کیا گیا۔ حاضرین کے سامنے کنڈرگارٹن کے درجوں سے لے کر یونیورسٹی تک کی لفظی تصویر پیش کی گئی۔

تعلیم میں موسیقی کا مقام

پچھلے سال یونیسکو کے زیر اہتمام برسلز (بلجیم) کے مقام پر ایک بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ موضوع زیر بحث یہ تھا کہ بچوں اور بالغوں کی تعلیم میں موسیقی کو کیا مقام حاصل ہے۔ کانفرنس میں چالیس ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔

انکم ٹیکس کا نصاب

انکم ٹیکس ایک جدید ترقی پسند ریاست کے لیے وہی درجہ رکھتا ہے جو خون انسانی بدن کے لیے۔ جدید ریاست کے یہ بات بہت اہم ہے کہ اس کے بننے والے شہری نہ صرف انکم ٹیکس کی قومی ضرورت کو سمجھیں بلکہ اس کی باقاعدہ ادا میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔ عام طور پر انکم ٹیکس کو ایک ایسا ناخوش گوار مالی بوجھ سمجھا جاتا ہے جس سے بچنے کے لیے؛ جائز ہو یا اس کی ادائے گی سے متعلقہ سرکاری کاغذات کو ایک ناقابل فہم گورکھ دھندا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ غلط تصوّرات شہریت کے شعور کی ترقی کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ انہیں دور کرنے کے لیے امریکی محکمہ محاصل نے ہائی سکول

طلبہ کے لیے ایک آسان مگر جامع نصاب تیار کیا ہے۔ اس میں ایک کتابچہ استاد کی رہ نمائی کے لیے ہے اور ایک کتاب طلبہ کے استعمال کے لیے۔ طلبہ کی کتاب میں انکم ٹیکس کی ان عام صورتوں سے بحث کی گئی ہے جو زندگی میں عام پیش آتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں وہ نقشے بھی ہیں جو انکم ٹیکس کی ادائیگی کے سلسلے میں پُر کرنے پڑتے ہیں۔

مکانیت کی کمی

امریکی مدرسوں کو مکانیت کی کمی سے جو دشواریاں پیش آرہی ہیں ان کی طرف توجہ دلاتے ہوئے والدین اور اساتذہ کی انجمن نے اپنے ایک حالیہ اجلاس میں کہا تھا۔ مدرسوں کو نئی عمارتوں کی جو ضرورت ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ اگر نیویارک کے مجسمہ آزادی سے لے کر کیلی فورنیا کے سنہری دروازہ کے پل تک (جو تین ہزار میل سے زیادہ فاصلہ بنتا ہے) ۵۷ فٹ چوڑی یک منزلہ عمارت تعمیر کی جاسکے تو اس سے مکانیت کی موجودہ کمی پوری ہوسکے گی۔ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ مکانیت کا مسئلہ اس قدر ٹیڑھا ہو چکا ہے کہ امریکہ کی کوئی ریاست بھی محض اپنے وسائل سے اس کا حل تلاش نہیں کرسکتی۔

منیجروں کی تربیت

سائنس اور انجینیرنگ کے جن گریجوایٹوں کو صنعت میں نظم و نسق کا کام سنبھالنا ہوتا ہے انھیں مغربی ملکوں میں باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ حال ہی میں ہیروگیٹ کے مقام پر نظم و نسق کی برطانوی انسٹی ٹیوٹ کا ایک اجلاس ہوا جس میں ان مسائل پر بحث ہوئی جن کے حل ابھی تک تلاش نہیں کیے جاسکے۔ پروفیسر ایون نے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے بتایا کہ کوئلے کی صنعت میں جو منیجر کام کرتے ہیں ان کا صرف ۵ فی صد وقت انجینیرنگ کے مسائل پر صرف ہوتا ہے اور باقی وقت کا زیادہ حصہ مزدوروں کے ذاتی مسائل کے حل کرنے میں۔ منیجروں کی تیاری کے لیے اب تک جو نصاب مقرر ہیں، انھیں غلط نہیں کہا جاسکتا تاہم یہ احساس عام ہے کہ اس نظم و نسق کے کام کو خوبی کے ساتھ انجام دینے کے لیے بعض سائنسی اصولوں سے واقفیت بے حد ضروری ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو سائنس اور انجینیرنگ کے نصابوں میں کافی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ لیکن اب تک ان سائنسی اصولوں کا پورے طور پر کھوج نہیں لگایا جاسکا اور جب تک یہ کام تحقیقاتی مطالعوں کی روشنی میں پورا نہ ہو جائے اس وقت تک سائنس اور انجینیرنگ کے موجودہ نصاب ہی جاری رہنے چاہئیں ⁂

فوجی نوجوانوں کی تعلیم

بعض برطانوی حلقے کچھ عرصہ سے یہ رائے ظاہر کر رہے تھے کہ جو نوجوان قومی دفاع کی خاطر فوج، بحری بیڑے یا ہوائی فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں ان کا تعلیمی مستقبل بالکل تباہ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ نوجوان فوجی ملازمت اختیار نہ کرتے تو یقیناً یونی ورسٹی تعلیم حاصل کرتے اور ان کی خداداد ذہانتوں سے ملک کو بہت فائدہ پہنچتا۔ لارڈ برڈ ووڈ نے دارالامراء میں اس سوال پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کے خیالات سراسر بے بنیاد ہیں۔

لارڈ برڈ ووڈ نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ فوجوں میں تعلیم پھیلانے کا کام ہمیشہ بڑی مستعدی سے جاری رہتا ہے۔ ہزاروں ایسے نوجوان بھرتی ہوتے ہیں جو خواندگی کی معمولی سطح سے زیادہ آگے نہیں ہوتے، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ خواندگی زنگ آلود ہوتی جاتی ہے، فوجی محکمۂ تعلیم اس زنگ کو دور کرنے کے لیے لگاتار کوشش میں معروف رہتا ہے یہ محکمہ فوجی نوجوانوں کی تعلیم کے سلسلہ میں بڑی اہم خدمت انجام دیتا ہے۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ فوجی محکمۂ تعلیم کی یہ تعلیمی خدمت ثانوی مدرسوں سے زیادہ قیمتی ہے۔

دارالعوام میں بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی۔ وزارتِ جنگ کے نائب سکیرٹری نے ایک تحریری جواب میں بتایا کہ ۱۹۵۳ء کے بعد جو نوجوان بھرتی ہوئے ہیں ان میں سے کوئی ایک فی صد ان پڑھ تھے۔ تقریباً ۲۰ فی صد کی تعلیمی حالت معمول سے کمتر تھی۔ ان میں سے کچھ تعداد ایسے نوجوانوں کی بھی تھی جو پرائمری درجہ کی تعلیم بھی بے حد معمولی درجہ کی رکھتے تھے، ایسے تمام نوجوانوں کو مواقع بہم پہنچائے گئے کہ ڈیوٹی کے اوقات میں اور فارغ اوقات میں اپنی تعلیمی قابلیت کو بہتر بنائیں۔

ڈبلن کے فارغ التحصیل استادوں سے بے انصافی

برطانوی استادوں کے لیے جو پیمانہ ہائے تنخواہ مروج ہیں ان کے متعلق سب سے عجیب بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے ڈبلن کے ٹرنٹی کالج سے ۱۹۲۲ء کے بعد ڈگری حاصل کی ہے وہ خاص الاؤنس حاصل نہیں کر سکتے۔ اگرچہ انگلستان کے مدرسوں میں ایسے استادوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں، پھر بھی ایسے استاد موجود ضرور ہیں۔ ان استادوں کی طرف سے آواز اٹھائی گئی ہے کہ جب برن ہم کمیٹی کی سفارشوں کو آخری شکل دی جائے تو ان کی دیرینہ شکایت کا ازالہ بھی کیا جائے۔ موجودہ غیر مساوی سلوک آئرلینڈ کی تقسیم کی تلخ یادوں میں سے ہے۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

اموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر
پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

آموز

شماره ۵] لاهور [اگست ۱۹۵۶

اس شمارہ میں

تحریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوھدری
فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

اگست سنہ ۱۹۵۶ء

جلد ——— ۹

شمارہ ——— ۵

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشر

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی۔ خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا۔

ٹیکنیکل تعلیم کی اہمیت

ایم اے۔ مخدومی

مخصوص تاریخی حالات کی بنا پر ہمارا نظامِ تعلیم برطانوی نمونے کو سامنے رکھ کر وضع کیا گیا تھا۔ ایک عرصے تک اس نظامِ تعلیم نے ان توقعات کو خوب پورا کیا جو اس کے وضع کرنے والوں نے اس کے ساتھ وابستہ کی تھیں۔ مگر اس وقت ہماری قومی ضروریات اس قدر مختلف ہو چکی ہیں کہ انہیں تسلی بخش طور پر پورا کرنے کے لیے نظامِ تعلیم میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت اس لیے اور بھی زیادہ شدید ہے کہ جس نمونے کو سامنے رکھ کر یہ نظامِ تعلیم وضع کیا گیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد خود اس میں انقلابی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔

سنہ ۱۹۴۴ء کا قانونِ تعلیم برطانوی نظامِ تعلیم کے لیے ایک انقلابی موڑ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس قانون نے تعلیم کی بنیادوں کو اس حد تک کشادہ کر دیا کہ اس کے دروازے ثانوی درجے تک خواص و عوام سب کے لیے یکساں طور پر کھل گئے۔ دوسری عالمی جنگ نے سائنس اور ٹکنالوجی کی پیش قدمی کی رفتار میں جو بے پناہ اضافہ کیا تھا یہ قدم اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اٹھایا گیا تھا۔ ہر چند کہ سائنسی تہذیب نے جزائر برطانیہ ہی میں جنم لیا تھا۔ مگر بعض نئے حریف اس میدان میں برطانیہ سے بازی لے جاتے نظر آتے تھے۔ انہوں نے بھاری صنعت اور انبوہی پیداوار کی ایسی ہوش ربا تکنیکیں ڈھونڈ نکالی تھیں جن کی بدولت ان کی معاشی قوت بڑی تیزی کے ساتھ عالمگیر وسعت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس نئے عالمی نظام میں باعزت جگہ حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ انجینئروں اور فنی ماہروں کی تربیت انبوہی پیمانہ پر ہو۔ گنے چنے نوجوانوں کو اعلیٰ ٹیکنیکل تربیت دینے کے دن ہمیشہ کے لیے گذر چکے تھے۔

پرانے برطانوی نظامِ تعلیم کا سرمایۂ افتخار اس کے گرامر سکول اور اس کی یونیورسٹیاں تھیں۔ ان میں اعلیٰ ذہانت کے چیدہ چیدہ نوجوانوں کی تعلیم و تربیت بڑی غور و پرداخت کے ساتھ ہوتی اور انہیں زندگی کے ہر میدان میں عالمی نمائندگی

کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ ۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم نے ثانوی جدید مدرسوں اور ٹیکنیکل مدرسوں کو جنم دیا۔ ان نئے مدرسوں کے نصاب میں علمی کی بجائے عملی رنگ غالب رکھا گیا اور یوں ثانوی تعلیم کے ایک بڑے حصے کو جدید صنعتی اور کاروباری ضرورتوں سے قریب تر لانے کی کوشش کی گئی۔ یہ تجربہ خاصہ کامیاب رہا، مگر جلد یہ حقیقت واضح ہونے لگی کہ ثانوی درجے سے آگے بھی اعلیٰ ٹیکنیکل تعلیم کے دروازے عوام پر کھلنے چاہئیں۔ برطانوی یونیورسٹیاں یہ خدمت انجام دینے کے ناقابل تھیں۔ یہ خدمت اب نئے قائم شدہ ٹیکنیکل کالجوں کو سونپی گئی ہے جو ثانوی جدید مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبہ کو ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم دیں گے اور انہیں ٹیکنالوجی کا ڈپلوما دیا کریں گے۔ ان کالجوں کے نصاب صنعت کاروں کے مشورے سے تیار ہوں گے اور ان کے طلبہ کم سے کم آدھا وقت کارخانوں میں صرف کیا کریں گے۔

برطانوی تعلیم کی یہ انقلابی تبدیلیاں ہر وقت ہمارے پیش نظر رہنی چاہئیں۔ یہ خطرہ بہت حقیقی نظر آتا ہے کہ تعلیم کی تعمیرِ نو میں ہم کہیں اسی فرسودہ برطانوی نمونے کی پیروی نہ کرتے جائیں جسے آج خود برطانیہ خیرباد کہنے پر مجبور ہے۔ تعمیرِ نو کے ہر قدم پر ہمیں جدید عالمی نظام کے تقاضوں کا پورا پورا لحاظ رکھنا ہوگا۔ ایسا کیے بغیر ہم وہ مضبوط معاشی بنیادیں قائم نہیں کر سکتے، جو آبرومند قومی زندگی کی پہلی شرط ہیں۔

نگرانی کا نیا تصوّر

فضل احمد

نگرانی کی ضرورت

تعلیمی نگرانی کی ضرورت عوامی تعلیم کے وجود میں آنے کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ جب تک مدرسوں کے دروازے صرف گنے چنے بچوں کے لیے کھلے تھے۔ اس وقت تک مدرسوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ ان کی نگرانی کا کام کسی خاص آدمی کو سونپنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہر مدرسے کا سرمعلم ہی تدریس کی رہنمائی اور نگرانی کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ لیکن جب پہلی صدی کے نصف آخر میں صنعتی ترقی نے محنت کشوں کو تاریخ میں پہلی بار یہ مطالبہ کرنے پر ابھارا کہ ان کے بچوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں حاصل ہوں۔ اور آجروں کو بھی یہ احساس ہو کہ ان کا اپنا مفاد بھی اسی میں ہے کہ مزدور پڑھنا لکھنا جانتے ہوں تو مغربی ملکوں میں یکے بعد دیگرے ابتدائی مدرسوں کا جال بچھ گیا۔ اس تحریک کا آغاز انگلستان سے ہوا تھا۔ نپولین نے اپنی مطلق العنانی کو مضبوط تر بنانے کے لیے بھی عوامی تعلیم ہی کا سہارا لیا تھا۔ جب جرمنی، امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں نے صنعتی میدان میں ترقی کی ٹھانی تو انہوں نے بھی ابتدائی تعلیم کو جی کھول کر عام کیا۔

مدرسوں کے قومی نظام قائم ہونے کے ساتھ ہی یہ ضرورت بھی محسوس ہوئی کہ ان کے تدریسی معیاروں میں ایک حد تک یکسانیت پیدا کرنے اور اس یکسانیت کو برقرار رکھنے کے لیے نگرانی کا کام کسی مرکزی ادارے کے ہاتھوں میں ہو۔ اس طرح مختلف ملکوں میں انسپکٹر مدارس یا سپرنٹنڈنٹ مدارس کا عہدہ وجود میں آیا۔ اس عہدہ دار کا کام یہ ہے کہ مدرسے کی ہر سطح پر تدریسی کام کی خوبی کا جائزہ لے اور اس کی افادیت کو بڑھانے کی کوشش کرے۔

یہ بجا ہے کہ ایسے استاد ہمیشہ موجود رہے ہیں جو کسی قسم کی نگرانی کے بغیر بھی تدریسی کام نہایت خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام دے سکتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسے استادوں کی بھی کمی نہیں رہی جن کی اپنی کارکردگی پر اسی صورت میں بھروسہ ہو سکتا تھا جب کوئی دوسرا شخص اس پر مہر تصدیق ثبت کر دے۔ غرض نگرانی کا اپنا الگ منصب اور مقصد ہے۔ تدریس کی سمت متعین کرنا، اس کی سطح کا جائزہ لینا اور اس کو لگاتار بلند تر سطح پر لانے کے

ذرائع سوچنا تعلیمی نگرانی کے اہم فرائض ہیں۔ ہر مدرس کامیابی کے ساتھ ان فرائض کو خود انجام نہیں دے سکتا۔

پرانا تصوّر

تعلیمی نگرانی کا پرانا تصور قدرتی طور پر اسی معاشی نظام کے سانچے میں ڈھلا تھا جس نے اسے ادنیٰ اور اعلیٰ جنم دیا تھا۔ پچھلی صدی کے آخر بلکہ موجودہ صدی کے پہلے عشرے تک آجر اور محنت کش کا باہمی رشتہ آقا و بندہ کا رشتہ تھا۔ آقا لاکھ رحم دل اور فراخ دل ہوتا، اس کی شانِ آقائی میں اس سے بال بھر فرق نہ آتا۔ وہ اپنے اور اپنے ملازموں کے درمیان بُعد کو ایک طبعی چیز خیال کر کے اسے بہرصورت قائم رکھتا۔ اس معاشی نظام میں مزدور کو بھی اپنا مقام اچھی طرح معلوم تھا۔ اس نے اس مقام کو قدرتی سمجھ کر بخوشی قبول کر لیا تھا۔ اپنے قدرتی مقام سے ہیچ بھر پیچھے ہٹنا نہ آقا کو گوارا تھا اور اپنے مقام سے انچ بھر آگے بڑھنا نہ محنت کش کے تصور میں آ سکتا تھا۔

نگران اور استاد کے باہمی رشتے کا بھی بالکل یہی حال تھا۔ حال ہی میں نیو ایجوکیشن فیلوشپ نے اپنے ایک کتابچے میں نگرانی کے اس روایتی تصور کی تصویر ان جامع الفاظ میں کھینچی ہے:۔ نگرانی کے پرانے تصور کے مطابق نگران بالکل وہی کردار ادا کرتا ہے جو بھیڑوں کے گلے میں نگرانی کرنے والا کتا۔ معمولی حالات میں یہ کتا چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔ مگر خطرے کی معمولی سی بھنک پڑ کر غیظ و غضب میں بھونک بھونک آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔ قریباً قریباً یہی حال پرانی وضع کے انسپکٹروں اور سپرنٹنڈنٹوں کا تھا۔

نگرانی کا یہ پرانا تصور مدتوں دنیا کے مدارس پر حکمران رہا۔ ترقی یافتہ ملکوں میں پہلی عالمی جنگ نے ہی اس فرسودہ تصور کے خلاف شدید ردِ عمل پیدا کر دیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ نے اس کے فرسودہ پن اور عدم کفایت کو اور بھی زیادہ واضح طور پر واضح کر دیا ہے۔ اس کے باوجود پسماندہ ایشیائی ملکوں میں آج بھی ایسے نگرانوں کی کمی نہیں جو نگرانی کے پرا اور از کار رفتہ کی بجا رواتری میں پورا یقین رکھتے ہیں۔

پرانے تصور کی عدم معقولیت

تعلیمی نگرانی کا سب سے پہلا منصب یہ ہونا چاہیے کہ وہ استاد کی تخلیقی قوتوں کو اس طور پر آزاد کر دے کہ وہ لگاتار بڑھتی پھولتی رہیں اور اس طرح ان کا تدریسی کام خوبی کے لحاظ سے بلند سے بلند تر سطح کی طرف بڑھتا جائے۔ استاد بالیدگی کے کسی ایک نقطے پر رُک نہ جائیں۔ بلکہ ان کی نگاہ کے سامنے نئے سے نئے اُفق پیدا ہوتے رہیں اور ان افق

عبور کرنے کا عزم کبھی سرد نہ ہونے پائے۔ پرانی وضع کی نگرانی اس اہم فرض کی بجاآوری میں جس بری طرح ناکام رہتی ہے وہ اب ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نگرانی کا یہ تصور نگران کو ایک جھوٹی شخصیت اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے جس سے اس کی اپنی بالیدگی رک جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص دوسروں کے دلوں میں بالیدگی کی امنگ پیدا نہیں کرسکتا۔

نگرانی کا یہ تصور نگران کو جس قسم کی لغویات پر آمادہ کرسکتا ہے اس کا حال ایک استاد کی زبانی سنیے۔ یہ صاحب کچھ عرصہ اے۔ ڈی۔ آئی رہ کر اب مدرسے میں کام کر رہے تھے۔ ان کی تدریسی قابلیت چنداں قابل رشک نہ تھی۔ ایک روز رفقائے کار نے پوچھا حضرت! آپ تو ایک عرصے تک دوسروں کے تدریسی کام کی نگرانی کرتے رہے ہیں خود آپ کا کیا حال ہے؟ بولے حضرات نگرانی کرنا کون سا مشکل کام ہے؛ گردن اکڑائے، ماتھے پر بل ڈالے مدرسے میں جا دھمکے۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ بگڑ کر بولے اور یوں اپنی تنک مزاجی کی دھاک بٹھا کر واپس چلے آئے۔ مدرسے کا کام آئندہ چھ ماہ تک خود بخود ٹھیک ٹھاک چلتا رہا۔ یہاں کمرۂ جماعت میں معاملہ بہت مختلف ہے۔ پچاس ساٹھ لڑکوں کو مطمئن کرنا ہوتا ہے۔ کچھ بتائے بغیر یہ کام نہیں چل سکتا۔ پھر کمبخت الٹے سیدھے سوال پوچھنے لگتے ہیں، اور ڈانٹ ڈپٹ کر انہیں اس بات سے روک بھی دیا جائے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان نالائقوں کے ذہنوں میں کام کی باتیں کس طرح ڈالی جائیں، دوسرے استادوں کے ساتھ مقابلہ ہے جو نہ معلوم کس طور پر لڑکوں سے کام لینا جانتے ہیں۔ غرض نگرانی کا کام پڑھانے کے مقابلے میں بے حد آسان ہے۔

راقم کو ایک سرمعلم کی تصویر کبھی نہیں بھولے گی۔ یہ بزرگوار استادوں کی ایک تنظیم کے کرتا دھرتا اور روحانی نگران ہونے کے دعویدار تھے۔ روحانی کرامات کا دعویٰ اس امر پر مستزاد تھا۔ صبح مدرسے کے پھاٹک سے صحن مدرسہ میں داخل ہوتے تو اس شان سے کہ گردن تنی ہوئی ہے اور آنکھیں زمین پر گڑی ہیں۔ اسی انداز میں خراماں خراماں دفتر کے برآمدے تک پہنچتے۔ استادوں کا گروہ جو برآمدے میں میز کے گرد بیٹھا ہوتا یکدم تعظیم کے لیے اٹھتا۔ مگر کیا مجال جو سرمعلم صاحب کا کبر و ناز اس بات کی اجازت دے کہ ان حقیر کیڑوں مکوڑوں کی طرف ایک آنکھ بھی دیکھیں۔ بڑی بے اعتنائی کے عالم میں بایاں ہاتھ ذرا ماتھے کی طرف اٹھتا جو اس بات کا اشارہ ہوتا کہ مابدولت ان بندگان کی کورنش کو شرف قبولیت بخشتے ہیں۔ اتنے میں چپڑاسی دفتر کے دروازے کی چک دونوں ہاتھوں سے اٹھا دیتا اور سرمعلم استادوں کو ہیبت زدہ چھوڑ کر دفتر میں جا براجمان ہوتے۔ اب مختلف لوگوں کو باریابی بخشی جاتی اور وہی زبان جس نے ایک منٹ پہلے استادوں کے سلام کا جواب دینا بھی ایک ناقابل برداشت بوجھ خیال کیا تھا اب اس شدت کے ساتھ لسانی بمباری میں مصروف ہو جاتی کہ باہر بیٹھے ہوئے لوگوں کے کانوں کے پردے پھٹنے لگتے۔

اس قسم کی نگرانی حقیقت میں نگرانی کا ایک بہت بڑا نقص ہے۔ اس سارے ڈرامے میں مینجر صرف یہ ہے کہ ایک نفسیاتی طور پر مریض شخص جو دیکھنے کو عجب و پندار کا شکار ہے مگر اندرونی طور پر عدم سلامتی کا شدید احساس رکھتا ہے، دوسرے لوگوں کی شخصیتوں کو چھوٹے سے چھوٹے بہانہ پر سخت بے رحمی کے ساتھ روندنے پر تلا رہتا ہے۔ اس کے نزدیک نظم و ضبط اور نگرانی کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے ماتحت کام کرنے والوں کی شخصیتوں کو اس حد تک کچل دیا جائے کہ ان میں سے کبھی کوئی سر نہ اٹھا سکے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر کسی نے سر اٹھایا تو اس کی اپنی سلامتی نہیں۔

رکھوالے کتے کا سا یہ کردار اور کچھ بھی فوائد رکھتا ہو اس کی ایک کمی بالکل بدیہی ہے۔ یہ ایک روح کش اور دم گھٹنے والی فضا کو جنم دیتا ہے جس میں تخلیقی قوتوں کا پرورش پانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ روایتی نگرانی ظاہری حرکات میں ضبط و درستی پیدا کر سکتی ہے۔ دل و دماغ کی رنگا رنگ تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لانے میں سخت ناکام رہتی ہے۔

نئے عالمی نظام کے تقاضے

نگرانی کا یہ فرسودہ مفہوم اس دنیا کے لیے حسب حال تھا جس میں معاملات کی باگ ڈور خواص کی چھوٹی سی جماعت کے ہاتھ میں تھی۔ اس دنیا میں عوام کی تخلیقی قوتوں کو دبائے رکھنا ہی نگرانی کا کمال خیال کیا جاتا تھا۔ جن مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار کا ڈنڈا تھا ان کا خیال تھا کہ دنیا کی قسمت ہمیشہ انھی کے ہاتھوں میں رہے گی۔ مگر پہلی عالمی جنگ نے بعض ایسی عوامی قوتوں کو جنم دیا جنہوں نے یہ خواب ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

جدید سائنسی تہذیب کی ساری بنیاد معاشی قوت پر ہے۔ جزائر برطانیہ نے اس تہذیب کو جنم دیا تھا۔ یہ چھوٹا سا ملک سائنس اور ٹکنالوجی کی دوڑ میں ساری دنیا سے آگے تھا۔ تقریباً ساری دنیا اس کی معاشی قوت کی گرفت میں تھی۔ اس کا تعلیمی نظام سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ایسے رہنما پیدا کرتا تھا جو انسانوں سے بھی اسی طرح کام لینا جانتے تھے جس طرح مشینوں سے۔ جرمنی نے برطانیہ کے نقش قدم پر چل کر اسے صنعتی اور معاشی میدان میں پچھاڑنے کی کوشش مگر اپنے صنعتی گروہ سے ایسی منہ کی کھائی کہ مدت تک پاؤں نہ سنبھلے۔

اوقیانوس کے اس پار برطانیہ کا ایک اور صنعتی حریف ریاست ہائے متحدہ امریکہ بڑی تیزی، مگر خاموشی سے اپنی صنعتی قوت بڑھا رہا تھا۔ اسے نئی دنیا کے بے پناہ قدرتی وسائل میسر تھے، مگر ان وسائل سے بڑھ کر اس انداز فکر تھا۔ ہر چند کہ یہ قوم برطانیہ ہی کا کٹا ہوا ایک عضو تھی، مگر اس نے اوقیانوس پار کرتے وقت برطانوی بنیاد

سمندر ہی میں ڈبو دیا تھا۔ نئی دنیا میں آباد ہونے کے ساتھ ہی اس نے زندگی کی نئی راہیں بھی معلوم کرنا شروع کر دی تھیں، ایسی راہیں جو فرسودہ روایات سے کوسوں دور تھیں۔

امریکہ کو اپنی کوششوں میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اس نے تقریباً نصف صدی کے عرصے میں نہ صرف ایک صنعتی نظام قائم کر لیا جو ہر لحاظ سے برطانوی صنعت کا ہم پلہ تھا بلکہ اس صنعتی نظام کی آبیاری کے لیے ایک ایسی قوتِ محرکہ معلوم کر لی جو برطانیہ میں ناپید تھی۔ امریکی زندگی کو ایسی روایات عطا کی گئیں جو عوامی جوہروں کی دریافت اور ان کی نشو و نما کی ضامن تھیں۔ ان روایات کی بدولت بھاری صنعتوں اور انبوہی پیداوار کی وہ مرکزی تکنیکیں وجود میں آئیں جنہوں نے مشینی پیداوار کے میدان میں برطانیہ کو مکمل شکست دی۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد صنعتی میدان میں برطانیہ کے کچھ اور حریف بھی تھے۔ جاپان ایک مشرقی ملک ہونے کے باوجود اپنے مغربی استادوں کے کان کتر رہا تھا۔ جرمنی کی کمر شکست نے توڑ دی تھی۔ مگر نازیوں کی رہنمائی میں وہ بجلی کی سرعت کے ساتھ دوبارہ پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ روس نے انقلاب سے پیدا شدہ مسائل سے نپٹنے کے بعد ساری توجہ بھاری صنعتوں کی ترقی پر مرکوز کر رکھی تھی۔ ملک کی اس صنعتی تعمیر میں اس نے ایسی تکنیکیں وضع کی تھیں جو عوامی جوہروں کو زیادہ سے زیادہ ابھارنے کی ضامن تھیں، جب دوسری عالمی جنگ کی کڑی آزمائش آئی تو جرمنی اور جاپان پٹ گئے۔ اس سے روسی معیشت کے معماروں کا یہ یقین اور بھی پختہ ہو گیا کہ مضبوط قومی تعمیر کے لیے بڑی اہم چیز یہ ہے کہ عوامی جوہروں کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لایا جائے۔

دوسری عالمی جنگ کا جو سبق بڑی طاقتوں کے لیے سب سے زیادہ آنکھیں کھولنے والا تھا وہ یہ تھا کہ خواہ صنعت ہو یا تجارتی کاروبار یا زندگی کا کوئی دوسرا شعبہ اس کی بنیاد صحت مند اور خوش گوار انسانی مراسم پر رکھے بغیر کامیابی محال ہے۔ انسانوں کو انسان سمجھے بغیر جو زندگی تعمیر کی جائے گی وہ نئے عالمی نظام میں ٹھہر نہیں سکے گی دوسری عالمی جنگ نے دنیا کو ایک انقلابی کروٹ دے دی تھی۔ اس نے ایک ایسے عالمی نظام کو جنم دیا تھا جس میں "آقا و بندہ" قسم کے انسانی مراسم کا نباہ مشکل تھا۔ یہ اسی احساس کا صدقہ تھا کہ برطانیہ نے خود بخود اپنی وسیع قلمرو کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو تاج برطانیہ کے یہ چمکیلے ہیرے اگلی آزمائش کے موقع پر اتنے بوجھل ثابت ہوتے کہ تاج ہی کو لے ڈوبتے۔ فرانس کو ابھی یہ احساس پوری طرح نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ

غالباً یہ ہے کہ دور تون جنگلوں میں وہ خود اپنا بچاؤ نہیں کرسکا بلکہ اس کے طاقتور ساتھی اسے موت کے بعد زندگی عطا کر دیتے رہے۔ اگر برطانیہ کی طرح فرانس نے بھی بچاو کی لڑائی اپنے بازوؤں کی قوت سے لڑی ہوتی تو وہ اپنی محکوم قوموں کے بارے میں زیادہ حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرتا۔

نئے عالمی نظام کے معاشرتی تقاضے بالکل واضح ہیں۔ اگر کوئی قوم آبرومند زندگی چاہتی ہے تو اسے خود اپنے ہی اندر بٹ کر نہ رہنا چاہیے۔ اس کے افراد کے درمیان خوش گوار انسانی مراسم قائم ہونے چاہئیں۔ آقا و بندہ کے رکھ رکھاؤ کی جگہ آزاد غیر رسمی مراسم قائم ہونے چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں روایتی قسم کی نگرانی کے لیے زہر قاتل کا درجہ رکھتی ہیں۔ لہٰذا نئے عالمی نظام میں فرسودہ قسم کی تحکم پسند نگرانی کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ نئے عالمی نظام میں بھی نگرانی اسی طرح ناگزیر ہے جس طرح پہلے تھی مگر یہ نگرانی تخلیقی قسم کی ہونی چاہیے۔ ایسی نگرانی جس کے قیامت تک رہنے والے اُجلے نقوش کوئی چودہ سو برس پہلے دنیا نے یثرب میں دیکھے تھے۔

نگرانی کا نیا تصور

نگرانی کا نیا تصور تخلیقی رہ نمائی کا تصور تھا۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ یہ تصور جدید صنعت و ٹکنالوجی کے تقاضوں کی پیداوار ہے، اس لیے اول اول اسے صنعت اور کاروبار ہی میں اپنایا گیا۔ امریکہ اور روس میں ان گنت کارخانے کانیں اور کاروباری ادارے ایسے ہیں جہاں یکے بعد دیگرے انسانوں کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک کیا گیا۔ انہیں بھروسے میں لیا گیا۔ انہیں انتظامی امور میں شریک کار بنایا گیا۔ انہیں اپنی اجرتیں گھٹانے بڑھانے کا مجاز تک بنا دیا گیا۔ ان تمام صورتوں میں بجائے اس کے کہ معاملات بگڑ جاتے یا پیداوار میں کمی واقع ہوتی۔ ہر دفعہ نتیجہ بالکل اس کے برعکس نکلا۔ پیداوار ایک دم اچھل کر کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ کارخانے کی ساری فضا میں ایک خوش گوار تبدیلی پیدا ہو گئی اور اس میں کام کرنے والے تمام انسانوں کی زندگیوں میں ایک نئی بہار نظر آنے لگی۔

صنعت اور تجارتی کاروبار کی مثال کو دیکھ کر تعلیم نے بھی نگرانی کا نیا تصور اپنایا۔ اور چند سالوں کے اندر اندر ترقی یافتہ ملکوں میں تعلیمی رہ نمائی کا مفہوم بالکل بدل گیا۔ بجائے اس کے کہ نگران استادوں کے کام پر بجا و بے جا نکتہ چینی کرے اور ترش روئی کی بدولت ان کے اور اپنے درمیان فاصلہ پیدا کرے۔ جدید تعلیمی رہ نمائی اپنے ذمہ یہ لیتی ہے کہ وہ استادوں کے لیے ایسی اجازت دہ، روح پرور اور محبت بھری فضا پیدا کرے جس میں اس کو اپنے

بھروسہ پیدا ہوا۔ ان کے دلوں میں لگاتار بالیدگی حاصل کرنے کی اُمنگ چٹکیاں لینے لگے اور وہ اپنے کام کو بہت ضروری اور اہم خیال کرنے لگیں۔

تعلیمی رہنمائی اس نکتہ کو خوب سمجھتی ہے کہ ہر بالیدگی کے لیے قوت بخش آب و ہوا کی ضرورت ہوا کرتی ہے یہ کلیہ ذہنی بالیدگی کے لیے بھی ایسا ہی درست ہے جس طرح جسمانی بالیدگی کے لیے۔ ذہنی نشو و نما کے لیے حوصلہ افزا اجازت دہ ذہنی ماحول اہم ترین شرط ہے۔ جس طرح ہم بچوں کے لیے مدرسے میں ایسی فضا چاہتے ہیں جو نہ صرف جذباتی تناؤ سے خالی ہو بلکہ محبت، افہام و تفہیم اور اشتراکِ عمل کے جذبات سے بھرپور ہو بالکل اسی طرح استادوں کا بھی حق ہے کہ وہ اپنے لیے اسی قسم کی فضا کا مطالبہ کریں۔ جو فضا ان پسندیدہ عناصر سے خالی ہوگی اس میں بالیدگی کا گذر محال ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں استاد بالعموم اپنے نگران سے جس قسم کی توقعات رکھتے ہیں اس کا کچھ اندازہ ایک خط کے اقتباس سے ہوگا جو ایک استانی نے ایک سپرنٹنڈنٹ مدارس کو لکھا۔ وہ اس میں لکھتی ہے :- آپ کی رہنمائی میں ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ لیکن بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن کی طرف آپ کی توجہ اور زیادہ ہونی چاہیے۔ ہم استاد بھی عام لوگوں کی طرح انسان ہیں۔ بعض اوقات ہمیں اپنی ہمت پر شبہ ہونے لگتا ہے اور ہم اپنی محنت کے نتائج کے متعلق یقین کھو بیٹھتے ہیں۔ ہماری اس افسوس ناک کمی کا علاج آپ ہی کرسکتے ہیں، یہ جادو آپ ہی کے ہاتھ میں ہے کہ ہمارے دلوں میں اپنی کوشش اور محنت کے متعلق یقین کے جذبات پیدا کردیں۔ آپ کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں کہ آپ کی قدرشناسی اور حوصلہ افزائی ہماری ہمتوں کے لیے کس قدر جادو اثر ہے۔ کام کے لیے معقول اجرت کا ملنا اگر معاشی بقا کے لیے ضروری ہے تو اس کی قدر و قیمت کی تحسین ذہنی زندگی کے لیے ضروری ہے۔

ہماری حالت

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں کے استاد اپنے سرعلموں، انسپکٹروں اور سپرنٹنڈنٹوں سے کس قسم کی توقعات رکھتے ہیں۔ یہ توقعات اکثر صورتوں میں پوری ہوتی ہیں، اب اس صورت حال کا مقابلہ ذرا اس روایتی قسم کی نگرانی سے کیجیے جس سے ہمارے استادوں کو عموماً سابقہ پڑتا ہے۔ ہمارے استادوں کی بھاری اکثریت دیہی رقبوں میں چھوٹے چھوٹے پرائمری اور مڈل سکولوں میں بکھری پڑی ہے، ان کی رہنمائی کا کام اے۔ ڈی۔ آئی علاقہ کے

سپرد ہوتا ہے۔ اے۔ ڈی۔ آئی صاحبان تعلیمی رہ نمائی کا یہ کام جس طور پر انجام دیتے ہیں اس کا کوئی جامع مطالعہ تو دستیاب نہیں ہوا، البتہ عام قیاس یہی ہے کہ ان میں سے بہتوں کو تحقیقی رہ نمائی کے تصور تک کی خبر نہیں۔ راقم کے ایک واقف کار ہوے۔ ڈی۔ آئی ہیں، ایک روز خود اپنے کام کے متعلق سخت نالاں تھے اور فرما رہے تھے کہ تعلیمی رہ نمائی کی بجائے اب دن بدن ہمارے ذمے اس قسم کی خدمات لگائی جا رہی ہیں جو ایک شستہ انسان کے لیے بے حد ذلیل کن ہیں۔ ظاہر ہے جہاں بے چارہ نگران خود ایک دم گھٹنے والے ماحول میں جوں توں کرکے وقت کاٹ رہا ہو وہاں استادوں کے لیے کسی زندگی بخش ذہنی فضا کا پیدا ہونا بعید از قیاس ہے۔

ہمارے ثانوی مدرسوں کی نگرانی انسپکٹر مدارس سے متعلق ہوتی ہے۔ مگر انسپکٹر صاحب کی نگرانی بالکل ایک رسمی اور برائے نام شے ہے، وہ سال دو سال بعد ایک دو دن کے لیے مدرسے میں چکر لگا کر چلے جاتے ہیں، اور ہر استاد کے کام کے متعلق وہی رائے بیان کر جاتے ہیں جو سر معلم نے بتائی ہو۔ خواہ معائنے کے وقت اس کا کام کیسا ہی ثابت ہوا ہو۔ انسپکٹر صاحب کسی استاد کو ذاتی طور پر نہیں جانتے، اس لیے اس کے مسائل کو سمجھنے اور اس کی رہ نمائی کرنے کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ثانوی مدرسوں میں نگرانی کا کام عملاً سر معلموں کے ہاتھ میں ہے ان میں سے کوئی ایسا نہیں جس نے تعلیمی رہ نمائی کے لیے خصوصی تربیت حاصل کی ہو۔ ہر ایک نے مدتِ ملازمت یا اتفاقی حادثات کی بنا پر سر معلمی کی کرسی حاصل کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بعض لوگ فطری صلاحیتوں یا ذاتی اوصاف کی بنا پر اس کام کو عمدگی سے نباہتے ہیں، یعنی وہ ایسے خوش گوار انسانی مراسم کی فضا پیدا کر لیتے ہیں جو استادوں کی شخصیتوں کو سہارا دینے والی اور ان کے جوہروں کو ابھرنے میں مدد دینے والی ثابت ہو۔ مگر اکثر صورتوں میں معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ راقم کو ایک سر معلم کا تجربہ ہے۔ جو انجمن معلمین کے جلسہ میں بار بار یہ اعلان کیا کرتے تھے کہ اگر کوئی استاد محنت اور دیانت داری کے ساتھ کام کرتا ہے تو محض اس بنا پر اسے مجھ سے کسی مدد کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ کیوں کہ اسے اپنے فرض منصبی کی ادائے گی کے لیے تنخواہ ملتی ہے، وہ اگر تنخواہ کے ماسوا کسی اور فائدے کی تمنا رکھتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ سر معلم کو ذاتی طور پر ممنون کیا جائے"۔ استادوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو اس اعلان پر ایمان لاتے ہوئے نہ صرف دامے۔ درمے۔ قدمے اور سخنے ان کی نجی خدمات میں لگے رہتے تھے، بلکہ ان کی بازاری گالیاں

کو بھی مسکراہٹ کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ تاہم ایک مختصر سا گروہ ایسا بھی تھا جو مدرسے کے کام کو محنت اور دیانت کے ساتھ کرنے کے علاوہ اور کسی شے کا قائل نہ تھا۔ مگر اس گروہ کے ایام تلخ سے تلخ تر بنانے کی کوشش جاری رہتی تھی۔ اس قسم کے گھٹیا اور ذہنی تناؤ سے بھرپور ماحول میں بھلا یہ صلاحیت کہاں سے آئے کہ استادوں کو بالیدگی کا موقع دے۔ ایسے ماحول میں نہ چاپلوسی کرنے والوں میں ذہنی بلندی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ خودداری قائم رکھنے والوں کو اس کا موقع دیا جاتا ہے۔ بالیدگی کے راستے دونوں پر بند کر دیئے جاتے ہیں۔

تحقیقی رہ نمائی میں نگران کے لیے ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ ہر اچھے کام اور تعمیری خدمت کی نیک نامی استادوں کو دے اور ہر کوتاہی کے لیے خود ذمہ داری قبول کرے۔ روایت پرست نگران اس کے بالکل الٹ کرتے ہیں۔ وہ مدرسے کی ہر کامیابی اور حسن کارکردگی کا سبب اپنی ذات کو ٹھہراتے ہیں اور اس کی ہر کوتاہی کا الزام استادوں کے سر تھوپتے ہیں۔ راقم کو اس قسم کا ایک واقعہ کبھی نہیں بھولے گا جب اس سرِ معلم نے جس کا ذکر ابھی اوپر ہوا ہے ایک حقیر سی تعریف کا حق دار اپنے آپ کو ٹھہرانے کے لیے ایک جماعت کے سامنے بہت بڑا جھوٹ بولا۔ سرِ معلم نے محض دکھاوے کے لیے پانچویں جماعت میں تدریس انگریزی کے دو پیریڈ فی ہفتہ رکھ رکھے تھے۔ مگر عملاً اس نے سال بھر میں چند پیریڈوں سے زیادہ اس جماعت میں قدم نہ رکھا تھا۔ اس جماعت کی انگریزی میرے پاس تھی۔ سالانہ معائنہ کے موقع پر انسپکٹر صاحب نے اس جماعت کی انگریزی خود دیکھی اور اس کی پڑھائی۔ لکھائی اور بات چیت سے خوش ہو کر چند تعریفی الفاظ کہے۔ اس پر سرِ معلم کی رال فوراً ٹپک پڑی اور بولے۔ جناب! اس جماعت کو انگریزی بات چیت کا ڈھنگ میں خود سکھا رہا ہوں۔ ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

جو لوگ اس قسم کی تعلیمی رہ نمائی کے قائل ہیں انھوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ایک نہایت گھٹیا اور محدود قسم کے ذاتی اطمینان کی خاطر وہ ملک اور قوم کے وسیع تر مفاد کے ساتھ کتنی بڑی دشمنی کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کسی درس گاہ کے استادوں کی تخلیقوں کو مفلوج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ درس گاہ کی ذہنی اور تعلیمی سطح کو پیچھے کی طرف کھینچا جا رہا ہے۔ کسی درس گاہ میں پڑھنے والے سیکڑوں بچوں اور نوجوانوں پر اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا کہ انھیں ایک فرد کے جھوٹے پندار اور تنگ مفاد کی تشفی کی خاطر بلند تر اور پاکیزہ تر ذہنی آب و ہوا سے محروم کر دیا جائے۔

تحقیق کیا کہتی ہے!

معاشرتی اور نفسیاتی سائنسوں نے یہ حقیقت ثابت کی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی کے لیے انسانی مراسم کی ماہیت کا علم بہت اہم ہے۔ مگر اس کی اہمیت ایسے لوگوں کے لیے غیر معمولی طور پر زیادہ ہے جنہیں دوسرے لوگوں سے کام لینا ہو۔ استادوں کے کام کی نگرانی واضح طور پر اسی قسم کے کاموں میں سے ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں اس بات پر بہت سا وقت، روپیہ اور توجہ صرف کی گئی ہے کہ مدرسوں کے نگرانوں میں کیا اوصاف ہونے چاہئیں اور ان اوصاف کی پرورش کے لیے کس قسم کی تربیت کا انتظام ہونا چاہیے۔ ابھی تحقیق کا یہ کام جاری ہے۔ ایک ماہر تعلیم نے اس کام کی نوعیت پر تبصرہ کرتے ہوئے حال ہی میں کہا تھا کہ مدرسوں کی نگرانی کوئی آسان کام نہیں۔ اسے ہر شخص کامیابی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتا۔

امریکہ کی کیلاگ فاؤنڈیشن نے پچھلے پانچ سالوں میں کوئی سات لاکھ ڈالر اس بات پر صرف کیے ہیں کہ مدرسوں کے نگرانوں کی تسلی بخش تربیت کے لیے قابل اعتماد معیار معلوم کیے جائیں۔ اس تحقیقی مطالعہ نے جو مفید انکشافات کیے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ نگران مدرسہ کا کام عمارت اور ساز و سامان کی دیکھ بھال سے بہت آگے جاتا ہے۔ اسے استادوں والدین اور علاقے کے لوگوں کو بھروسے میں لے کر بہت سے فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ اس مشکل کام میں کامیابی کے لیے نگران کو انسانی مراسم قائم کرنے، دوسروں کا تعاون حاصل کرنے، مل جل کر منصوبہ بندی کرنے اور ذمہ داری دوسروں کو سونپنے کی مہارتوں پر خوب عبور ہونا چاہیے۔

نگرانی کے کام کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی کبھی کمی نہیں رہی جو نگران مدرسہ بننا چاہتے ہوں۔ امیدواروں کی اس فراوانی کے باوجود یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ جن لوگوں کو اس کام کے لیے چنا گیا ماضی میں ان میں سے بہت تھوڑے ہی تخلیقی قسم کی تعلیمی رہنمائی کے قابل ثابت ہوئے۔ جو نوجوان پیشہ معلمی میں قدم رکھتے ہیں، ان میں سے بہتوں کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کمرۂ جماعت میں پڑھانے کی بجائے انہیں نگرانی کی خدمت سونپ دی جائے۔ گو اس بات کی کوئی قطعی شہادت موجود نہیں کہ جو آدمی اچھا استاد ہو وہ لازمی طور پر اچھا نگران بھی ثابت ہوگا۔ اس کے باوجود کسی آدمی کو نگران مدرسہ بناتے وقت اس کی مدت ملازمت اور تدریسی تجربے کو ضرور دیکھا جاتا ہے۔ بسا اوقات یوں ہوا کہ ایک اچھے استاد کو نگران مقرر کر کے مدرسے کو اس کی تدریسی خدمات سے محروم کر دیا گیا، مگر نگرانی کے کام میں اس نے

کسی غیر معمولی قابلیت کا ثبوت نہ دیا۔ بہر کیف جب تک نگران کو استاد کے مقابلے میں زیادہ تنخواہ یا زیادہ مراعات حاصل رہینگی اس وقت تک ہر استاد کے لیے نگران بننے کی کشش باقی رہے گی۔

تحقیق کی جمع کردہ شہادت کا ایک اہم فیصلہ یہ ہے کہ نگران کے لیے مخصوص تربیت لازمی ہے۔ قبل از ملازمت حاصل کردہ معلمی کی تربیت ہرگز کفایت نہیں کرتی۔ اس مخصوص تربیت کے بارے میں ابھی اختلاف باقی ہے۔ بعض یونیورسٹیاں اور کالج محض نظری تعلیم دینے پر کفایت کرتے ہیں جبکہ بعض نظری تعلیم کے پہلو بہ پہلو عملی تربیت کا سامان بھی کرتے ہیں عملی تربیت کی عام صورت یہ ہے کہ امیدوار کو کسی نگرانی مدارس کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ جہاں اسے حقیقی ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے۔ اس طرح وہ نگرانی کے چند در چند مسائل کا مطالعہ حقیقی رنگ میں کرتا ہے۔ ایک نقطۂ نگاہ یہ بھی ہے کہ ہر نگران کو پہلے آزمائشی طور پر مقرر کیا جانا چاہیے اور تخلیقی رہنمائی کا تسلی بخش ثبوت دینے کی صورت میں اسے اس عہدہ پر مستقل کیا جانا چاہیے۔ یہ صورت کار نظری طور پر بہت اچھی ہے۔ مگر اس کی راہ میں بہت سی عملی دشواریاں حائل ہیں۔

امتحان میں ناجائز ذرائع کا استعمال

شاہد اشرف

ہماری تعلیم کے مختلف درجوں پر طلبہ کی کارکردگی کو جانچنے اور انہیں اگلے درجے میں ترقی دینے کے لیے تحریری امتحان لیے جاتے ہیں۔ جب سے ایک بچہ مدرسے کی فضا میں قدم رکھتا ہے، اس وقت سے لے کر یونیورسٹیوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے تک اسے ہر مرحلے پر امتحانوں کی چھلنی میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے کئی ایک امتحان خود ان مدرسوں اور کالجوں کے داخلی امتحان ہوتے ہیں، جن میں طالب علم پڑھ رہا ہوتا ہے اور کئی ایک امتحان کسی خارجی ادارے کی طرف سے منعقد کیے جاتے ہیں۔ مثلاً پرائمری مدرسوں کے آخری درجے پر اے۔ ڈی۔ آئی علاقہ امتحان لیتا ہے۔ بالخصوص ایسے بچوں کا جو وظیفے کے لیے مقابلہ کرنا چاہیں۔ آٹھویں جماعت کے آخر میں محکمہ تعلیم کا امتحان ہے۔ میٹرک اور ایف اے کا نصاب ختم ہونے پر بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن امتحان لیتا ہے اور مابعد کے تمام نصابوں کے آخر میں یونیورسٹی امتحان لیتی ہے۔

ناجائز ذرائع کی وسیع کشمکش

یہاں امتحانوں کے مروجہ طریق کی تمام اچھائیوں اور برائیوں پر بحث کرنا مقصود نہیں، جب تک سرکاری ملازمت اور کاروباری اداروں میں داخلے کے لیے کسی مرکزی امتحانی ادارے کی سند کی ضرورت رہے گی اس وقت تک خارجی امتحانوں کا موجودہ سلسلہ بھی کسی نہ کسی صورت میں باقی رہے گا۔ خارجی امتحانوں کی یہ خدمت ناقابل انکار ہے کہ وہ بڑی حد تک ذاتی آلائش سے بالا ہو کر اپنے مقررہ تعلیمی معیاروں کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ ان امتحانوں میں ناجائز طریقے استعمال کرنے کی خواہش کو کلی طور پر ختم کرنا ناممکن ہے۔ امتحانی اداروں نے ناجائز ذرائع کا استعمال امکانی حد تک مشکل بنا رکھا ہے۔ پھر ان ذرائع کو استعمال کرنے والوں کے لیے بہت کڑی سزائیں مقرر ہیں۔ مگر ان تمام احتیاطوں پیش بندیوں اور تہدیدوں کے باوجود ہر سال ہر امتحان میں درجنوں امیدوار ناجائز ذرائع استعمال کرتے پکڑے جاتے اور سزائیں پاتے ہیں

اگرچہ کوئی ایسے اعداد و شمار موجود نہیں جن سے کشتگان ناجائز ذرائع کی سالانہ تعداد کا تخمینہ ہو سکے۔ مگر یہ یقین کرنے کے لیے قوی وجوہ موجود ہیں کہ ان کی تعداد بہت خاصی ہے۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن اور یونیورسٹی ہر سال سیکڑوں نوٹس اس بات پر صرف کرتے ہیں کہ جن امیدواروں کے خلاف ناجائز ذرائع کے استعمال کی شکایتیں موصول ہوئی ہیں ان کے متعلق تحقیقات کی جائے اور جرم کی مناسبت سے سزا تجویز کی جائے۔ جرم و تعزیر کا یہ سلسلہ سالہا سال سے جاری ہے۔ مگر اس بات کی بظاہر کوئی علامت نظر نہیں آتی کہ کشتگان ناجائز ذرائع کی تعداد میں کوئی کمی واقع ہو سکے گی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جو دولت اور محنت جرائم کی تحقیقات کرنے اور ان کی سزائیں تجویز کرنے پر صرف ہو رہی ہے۔ اسے ان اسباب کا کھوج لگانے پر صرف کیا جائے جو نوجوان امیدواروں کو ناجائز ذرائع کے استعمال پر اکساتے ہیں، ناجائز ذرائع محض مرض کی ظاہری علامات ہیں۔ ان علامات کے پیچھے لٹھ لیے پھرنا اور اصل مرض کی تشخیص سے غافل رہنا یقیناً ہوش مندی کا راستہ نہیں۔

جن لوگوں کو مختلف امتحانوں کے انتظام کرنے کا عملی تجربہ ہے ان کی عام رائے یہ ہے کہ امیدواروں میں ناجائز ذرائع استعمال کرنے کی خواہش پہلے سے بہت زیادہ ہے اور یہ خواہش دن بدن ترقی پر ہے۔ اس بارے میں کسی قطعی شہادت کے بغیر بھی اس رائے کی صحت میں شک کرنا مشکل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ماضی میں مدرسوں اور کالجوں کی تعداد بہت محدود ہوا کرتی تھی۔ ان کے طلبہ کا امتحان صرف چند بڑے بڑے مرکزوں میں لیا جاتا تھا جہاں مؤثر نگرانی چنداں مشکل کام نہ تھا، دور دور کی درس گاہوں کے طلبہ کو ان امتحانی مرکزوں میں جمع ہونا پڑتا تھا اجنبی ماحول اور غیر مانوس ساتھیوں کے درمیان چالاک سے چالاک امیدوار کو بھی یہ حوصلہ کم ہوتا تھا کہ کوئی قابل اعتراض طریق کار اختیار کرے۔

سکولوں اور کالجوں کی تعداد کے یک دم بڑھ جانے سے صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ اس وقت ایسے سکولوں اور کالجوں کی کمی نہیں جن کے اپنے طلبہ کی تعداد ہی ایک مرکز کو پُر کرنے کے لیے کافی بلکہ بعض اوقات کافی سے بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ان امیدواروں کا امتحان مرکز خود ان کی اپنی درس گاہ کے ہاں یا کسی قریبی عمارت کو قرار دے دیا جاتا ہے۔ نگرانی کرنے والے عموماً ان کے اپنے استاد ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال ناجائز ذرائع استعمال کرنے کی خواہش کو خواہ مخواہ اکساتی ہے۔

امتحانی مرکزوں کی اوپر بیان کی گئی ہیئت ترکیبی نے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ ناجائز ذرائع منظم طور پر استعمال کیے جائیں۔ استاد، والدین اور امیدوار بہت سی صورتوں میں پہلے سے کوئی منصوبہ طے کر رکھتے ہیں اور اس پر ایسی چابکدستی سے عمل کرتے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یہ ہتھکنڈے ورنیکلر فائنل، میٹرک اور ایف۔ اے کے امتحانوں میں نسبتاً زیادہ کامیابی کے ساتھ استعمال ہو سکتے ہیں کیوں کہ یہاں امیدواروں کی تعداد بہت زیادہ ہونے کے سبب امتحانی مرکز دور دراز مقامات تک پھیلے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ امتحانی مرکز سب سے زیادہ بدنام ہیں۔

بعض دفعہ یوں ہوتا ہے کہ مدرسے والے کوشش کرکے اپنے امتحانی مرکز کے لیے اپنی پسند کا ناظم مقرر کرا لیتے ہیں۔ کوئی ایسا شخص جو اپنے ماتحت نگرانوں کی حرکتوں سے چشم پوشی کرے۔ چونکہ یہ ماتحت نگران عموماً سب مدرسے کے استاد ہوتے ہیں۔ اس لیے کمرۂ امتحان میں ناجائز ذرائع کھلے بندوں استعمال ہوتے ہیں۔ ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں امتحانی کاپیاں جانچنے والوں نے کاپیوں کے مندرجات دیکھ کر یہ شکایت کی کہ اس مرکز میں کم و بیش تمام امیدواروں یا بیشتر امیدواروں نے نقل کی ہے۔

اس سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا نظر آئے گا کہ اگر امتحانی مرکز کا ناظم پوری دیانت داری سے اور آنکھیں کھول کر کام کرنے والا ہو تو ناجائز ذرائع کے پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے ناکام ہو سکتے ہیں۔ یہ نتیجہ صرف ایک حد تک درست ہے۔ وجہ یہ کہ ناظم خواہ کتنا ہی دیانت دار اور ہوش مند ہو وہ آخر انسان ہے۔ اگر اسے کسی اجنبی جگہ پر جا کر کوئی امتحانی مرکز سنبھالنا پڑے تو وہ لامحالہ اپنے قیام کے انتظام کے لیے مقامی ماتحت نگرانوں کی مدد کا سہارا لے گا۔ ان میں سے بعض لوگ اتنے کائیاں ہوتے ہیں کہ محض اس ذرا سی بات سے پُراسرار طریق پر کئی ناجائز فائدے اٹھا لیتے ہیں۔ پھر اگر امتحانی مرکز کئی ایک کمروں پر مشتمل ہے تو ناظم اپنی بہترین کوششوں کے باوجود ہر وقت ہر کمرے پر نگاہ نہیں رکھ سکتا۔ اسے ناگزیر طور پر بعض اہم کاغذوں کی طرف بھی توجہ کرنی ہوتی ہے اور یار لوگ ذرا سی مہلت سے کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ غرض جہاں ماتحت نگرانوں امیدواروں اور ان کے سرپرستوں نے پہلے سے مل کر کوئی منصوبہ تیار کر رکھا ہو اسے پوری طرح ناکام بنانا صرف ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔

راقم کو اس سال ایف۔ اے کے ایک امتحانی مرکز میں بطور ناظم کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ جو لوگ نگرانی کے لیے زد تھے ان میں سے سوائے ایک کے اور کوئی بھی حاضر نہ ہوا۔ مجبوراً جو لوگ فوری طور پر دستیاب ہو سکتے تھے ہیں اس کام پر لگایا گیا۔ یہ اصحاب ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی نیم بیکاری کا علاج بورڈ اور یونیورسٹی کے دفتر کا اف کر کے کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو پیشہ ور نگران کہا جا سکتا ہے۔

امتحان کا پہلا دن خیریت سے گزر گیا۔ دوسرے دن قرائن سے فوراً معلوم ہو گیا کہ نگران حضرات میں سے ایک بعض مخصوص امیدواروں میں دل چسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ ایک دن کے وقفے نے غالباً بعض امیدواروں اس بات کا موقع دے دیا تھا کہ کسی نگران کے ساتھ روابط قائم کر لیں۔ چناں چہ ان نگرانوں کی جگہ فوراً بدل دی گئی اور الته ہی انہیں تنبیہہ کر دی گئی کہ اس حرکت کا اعادہ ان کی فوری برطرفی کا موجب ہوگا۔ چوں کہ کمرۂ امتحان صرف ے ہال پر مشتمل تھا اور نگران اصحاب ایسے تھے جنہیں زیر امتحان امیدواروں سے کوئی سابقہ لگاؤ نہ تھا۔ اس لیے ورت حال پر پوری طرح قابو پانا ممکن ہو گیا۔ ان سازگار اسباب کی عدم موجودگی میں یقیناً زیادہ مشکل پیش آتی۔

منظم طور پر ناجائز ذرائع استعمال کرنے کے علاوہ اس بات کی انفرادی کوششیں بھی کافی عام ہیں۔ ایف۔ اے ے اس امتحانی مرکز میں امتحان کا دوسرا دن تھا، اس روز انگریزی کا عام پرچہ تھا۔ ایک امیدوار کی جیب سے اسا کاغذ پکڑا گیا جس پر ایک   مضمون لکھا تھا۔ اس کی پوری رپورٹ بورڈ کو کر دی گئی۔ اگلے روز سے اسے ظم کی میز سے بالکل متصل بٹھایا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے باقی تمام پرچے تقریباً کورے کے کورے رکھے۔ بمشکل تمام ب گھنٹہ ہال میں گزارتا اور چلتا بنتا۔ معلوم ہوا کہ یہ پچھلے دو تین سال سے فیل ہو رہا ہے۔ دیکھنے کو اچھا بھلا صحت مند ند خوش پوش تھا۔ غالباً بعض دل چسپیوں نے اس کی توجہ پڑھائی سے ختم کر رکھی تھی اور ناکامی کے یقین نے اسے "ہر چہ دبادا" کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔ رپورٹ ہو جانے کے بعد بھی اس کے سرپرستوں یا اساتذہ میں سے کسی نے ظم کو کچھ کہنے سننے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا فعل بالکل ایک انفرادی فعل تھا۔

صل اسباب

جب کسی مدرسے کے استاد اور امیدوار اکٹھے مل کر ناجائز ذرائع استعمال کرنے کا منصوبہ پہلے سے یار کرتے ہیں تو بدیہی طور پر ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مدرسے کا نتیجہ اچھا ہے۔ تاکہ جس روز نتیجے کا اعلان ہو اس اخبا

مسٹر کلم بڑے فخر کے ساتھ طلبہ کے مجمع میں یہ اعلان کر سکے کہ اپنی روایات کو قائم رکھتے ہوئے مدرسے نے اس دفعہ پھر اتنے ہی عمدہ نتیجہ دکھایا ہے یا یہ کہ اس سال کا نتیجہ پچھلے تمام سالوں سے بہتر رہا ہے۔ غالباً بہت سے مسٹر معلم اس بات کے خواہاں ہوتے ہیں کہ نتیجے کے اعتبار سے ان کے مدرسے کی امتیازی شان کا ڈھنڈورا اتنی شد و مد سے پیٹے کہ مقامی آبادی کا کوئی گھر اس کے چرچے سے خالی نہ رہے اور حکام مجاز میں سے کوئی ایسا نہ ہو جس کے کان تک یہ شور نہ پہنچے۔

اچھا نتیجہ دکھانے کی دھن کوئی بری شے نہیں اور اس کی تشہیر کو بھی آخری انسانی کمزوری سمجھ کر ایک حد تک جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر ناجائز ذرائع کے استعمال کی سند کہاں سے حاصل کی جائے گی؟

اچھے نتائج دکھانے کی دھن استادوں کو ہمیشہ رہی ہے۔ پہلے وقتوں کے استاد اس دھن میں اپنے آپ کو بھلا کر کام کرتے تھے۔ وہ ہر طالب علم کے ساتھ اس حد تک ذاتی مراسم بڑھاتے تھے کہ اس کی مشکلات کو سمجھ کر اس کے حسب حال دستگیری کریں۔ یہ انہماک اور خلوص طلبہ کے دلوں کو اتنا متاثر کرتا تھا کہ وہ بھی پوری یکیہ سے استاد کی حسب توقع کام کرتے تھے۔ یہ صورت حال بہترین نتائج کی ضامن ہوا کرتی تھی۔ اس صورت حال کی مثالیں آج بھی ہمارے بعض دیہاتی مدرسوں میں مل جائیں گی۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ مغربی تہذیب کے مؤثرات نے ہمارے استاد کے کردار پر بڑا انوکھا اثر کیا ہے۔ یہ مغرب کی ایجاد کردہ مشینوں اور انوکھی طریقہ ہائے پیداوار نے انسانی شفقت اور اوقات کار کو بے حد گھٹا دیا ہے۔ اس کے باوجود مغرب نے سستے انوکھی طریقہ ہائے کار کو اپنے مدرسوں میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ وہاں آج بھی ایسی دل سوزی اور انفرادی توجہ کا نقشہ قائم ہے جو ہمارے پرانے استادوں کا امتیازی نشان تھا۔ مگر اس کے بالکل برعکس ہمارے استادوں نے سستے کاروباری طریقوں کو مدرسوں میں رائج کرنے میں حیرت انگیز مستعدی کا اظہار کیا ہے۔ جہاں پہلے استاد اپنے آپ کو بھول کر کام کرنا جانتے تھے۔ وہاں ہمو استادوں نے اخلاقی اقدار کو بھول بھلا کر کام کرنے میں کمال حاصل کیا ہے۔ ریاضی کا ایک گریجوایٹ استاد کمرۂ امتحان میں پہلے سے طے شدہ اشاروں کے ذریعہ اپنے شاگردوں کو سوالوں کے جواب بتاتا ہے اور اس چالاکی پر پھولا نہیں سماتا۔ وہ شاگردوں میں ہر دل عزیزی حاصل کرتا ہے کیوں کہ وہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر

لمحہ تک ان کی مدد کرتا ہے۔ سر معلم اس کی حسن کارکردگی پر نہال ہو جاتا ہے۔ شہر میں اس کی قابلیت کا ڈنکا بج رہا ہے ایک اور سن رسیدہ استاد امتحان ختم ہونے سے پہلے ہی چند روپے فی طالب علم وصول کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ رقم تمہارے پرچوں کی پیروی پر خرچ کی جائے گی۔ نتیجہ نکلنے کے دن تک وہ لاہور اور دوسرے مقامات کے چکر لگا کر جھوٹی سچی باتیں منتظر امیدواروں اور ان کے سرپرستوں کو پہنچاتا رہتا ہے۔ امیدوار اور ان کے والدین یکساں طور پر بڑے میاں کے خلوص اور دل سوزی کے گن گاتے نظر آتے ہیں۔ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

اخلاقی اقدار سے انحراف دنیا کے ہر خطے اور زندگی کے ہر میدان میں کسی نہ کسی حد تک کہیں نہ کہیں ضرور نظر آ جاتا ہے۔ اس پر کسی تعجب کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ امر بے حد افسوسناک ہے کہ ہمارے جدید معاشرے میں امتحانی نتیجے کو عموماً اخلاقی ترازو سے بالاتر شے سمجھا جانے لگا ہے اور بڑے بڑے متقی بزرگ اس کی خاطر عام اخلاقی اقدار کو روند ڈالنا کوئی عیب خیال نہیں کرتے۔ راقم کو ایک عرصہ تک ایک ایسے سر معلم کے ساتھ کام کرنا پڑا جو اپنی شب بیداری اور تہجد گزاری کا ڈھول پیٹتے نہ تھکتے تھے۔ دراصل ان کی پارسائی کا بہت کچھ بھرم مدرسے کے اچھے نتیجوں کے طفیل قائم تھا۔ ایک سال بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر امتحانی مرکز میں نگرانی کے لیے معلم ریاضی کی بجائے راقم کو بھیجا گیا۔ طلبہ کو خلاف دستور ریاضی کے پرچے میں کچھ مدد نہ مل سکی۔ نتیجے کا اعلان ہوا تو مدرسے کا نتیجہ متوقع بچانوے چھیانوے فی صد کی بجائے کوئی ساٹھ فی صد کے لگ بھگ رہا۔ اس "پارسا" سر معلم کے فرط غضب کی حد نہ رہی جگہ جگہ شکایت کرتے پھرے کہ ہم نے فلاں استاد کو نگران مقرر کر دیا تھا۔ مگر اس نے کمرۂ امتحان میں مدرسے کے مفاد کا "خیال" نہیں رکھا۔

اگر ناجائز ذرائع کے استعمال کی ایک وجہ استادوں کا سستے کاروباری ذرائع اختیار کرنا ہے تو اس کی دوسری بڑی وجہ عام طالب علموں کا جدید قسم کی لغویات میں وقت ضائع کرنا ہے۔ مغربی تہذیب نے تفریح و دل لگی کے نام پر جگہ جگہ سستی اور بیہودہ ہی کھیل تماشوں کے انبار لگا رکھے ہیں۔ شہروں اور قصبوں کی عام فضا ان زرق برق کھیل تماشوں سے اتنی مسموم ہے کہ ایک اوسط طالب علم عنفوان شباب کی حد کو پہنچنے سے پہلے ہی ان کا شکار ہونے لگتا ہے۔ اس کا زیادہ وقت سینما دیکھنے، فلمی ستاروں کے متعلق پڑھنے اور ان پر تبصرہ کرنے، شہر کی بارونق سڑکوں کا طواف کرنے

اور گپ شپ کی محفلوں میں گذرنے لگتا ہے۔ افسوس کہ نئی تہذیب نے کوئی ایسا ٹیکہ ایجاد نہیں کیا جو مقررہ نصابوں کا ماحصل ذہن میں داخل کر دیا کرے۔ لہٰذا نئی تہذیب کی یہ کسر ناجائز ذرائع کی بدولت پوری کی جاتی ہے۔

یہاں یہ بات صاف ہو جانی چاہیے کہ اخلاقی اقدار اور سخت کوشی سے منہ موڑنے کا الزام مغربی تہذیب پر دھرنا درست نہیں کیوں کہ یہ کوتاہیاں اس تہذیب کے صرف برے پہلو کو اختیار کرنے کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ جدید سائنسی تہذیب کا ایک بے حد روشن پہلو بھی موجود ہے۔ یہ پہلو ہے اَن تھک کوششوں اور لگاتار جستجو کا۔ افسوس کہ ہمارے نوجوان مغربی زندگی کی جو تصویر فلم کے پردے پر دیکھتے ہیں وہ اس کی اصل تصویر نہیں بلکہ مغربی معاشرے کی تلچھٹ کی تصویر ہوتی ہے۔ ان خام فکروں کو مغرب کے ان لکھو کھہا کسانوں، کاری گروں اور تحقیق و تجربات کے میدانوں میں کام کرنے والوں کی تصویر نہیں دکھائی جاتی، جن کی شبانہ روز محنت کی بنیادوں پر جدید سائنسی تہذیب کی بلند و بالا عمارت کھڑی ہے یہ امر بے حد ناقابلِ فہم ہے کہ حکومت ایسی غیر ملکی فلموں کی درآمد پر زرِ مبادلہ کیوں ضائع کرتی ہے، جن کا سب سے بڑا کارنامہ ہمارے نوجوانوں کے اخلاقی شعور کی جڑیں کھوکھلی کرنا ہے۔

صحیح علاج

امتحانوں میں ناجائز ذرائع کا استعمال ایک ایسی بنیادی معاشرتی بیماری کی علامت ہے جس کی تباہ کاریاں بہت ہمہ گیر ہیں۔ ایک عام بچہ پرائمری سکول کے درجہ پر ہی دیکھنے لگتا ہے کہ خارجی امتحان کے موقع پر استاد خود اس بات کی حوصلہ افزائی کرتا بلکہ بس چلنے پر اس بات میں ان کی مدد بھی کرتا ہے کہ وہ نقل کریں۔ مدرسے کے اگلے درجوں پر بھی اسے یہ کھیل بکثرت نظر آتا ہے۔ آغازِ بلوغت میں اس کے ماحول کی زنگارنگ اور بھڑکیلی اکساہٹیں اسے ایک ایسی زندگی کا متوالا بنا کر رکھ دیتی ہیں جس میں ہر طرح کی آسائش اور فراوانی ہو۔ مگر محنت اور سخت کوشی کا اس میں گذر نہ ہو۔ ان حالات میں ناجائز ذرائع استعمال کرنے والوں کو عبرت ناک سزائیں دینا اصل بیماری کا کوئی علاج نہیں۔ سزا پانے والے بجا طور پر یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ شجرِ ممنوعہ کے لیے موزوں زمین اور غیر معمولی طور پر موافق آب و ہوا مہیا کرنے والوں کو اس بات کا کیا حق پہنچتا ہے کہ اس درخت کے برگ و بار کو سزا کا مستوجب ٹھہرائیں۔

اس مرض کا صحیح علاج یہ ہوگا کہ کوئی کمیشن معاملے کے تمام پہلوؤں کی چھان بین کر کے اس معاشرتی اسباب پر انگلی رکھے جو استادوں اور طلبہ میں اخلاقی ذمہ داری کے احساس کو کمزور کر رہے ہیں جب تک ان اسباب کو معلوم کر کے ان کا راستہ مؤثر طور پر روکا نہیں جاتا۔ اس وقت تک دوسری تمام پیش بندیاں عملاً بے کار رہیں گی۔

ہم معلم کیوں بنیں؟

حسن عزیز   مسلسل نمبر ۲

استاد کے پاس بہت سے ایسے مواقع ہوتے ہیں کہ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کے دل و دماغ میں کردار کے ایسے نمونے پیدا کر سکتا ہے جو کہ ان کی آئندہ زندگی کے لیے مشعل راہ کا کام دے۔ اور استاد کے لیے یہ بات کتنی اہم ہے کہ اسے اس کا احساس ہو کہ اس پر لڑکوں کی آئندہ زندگی کا دار و مدار ہے۔

استاد کے پاس یہ موقع ہوتا ہے کہ وہ لڑکوں میں ایسا ولولہ اور جوش پیدا کر دے کہ وہ اپنی قوم کے لیے اہم کام کر سکیں۔ بعض اوقات آپ ان نمایاں شخصیتوں کے متعلق پڑھتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے استاد کی امداد اور اثر سے اپنی ایسی شخصیت بنالی کہ اس خدمت کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ہر بڑا آدمی کبھی ایک شوخ اور نادان بچہ ہوگا، جس کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے استاد نے بہت وقت صرف کیا ہوگا اور اس کی ان مشکلات کا ایک صحیح حل نکالا ہوگا۔ حقیقتاً جو اطمینان استاد بچوں کے سلسلے میں اس قسم کے مشاہدے سے حاصل کرتا ہے بہت قدر و قیمت رکھتا ہے۔

ویسے تو زندگی میں ہر شخص ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے پر مجبور ہے۔ مگر استاد پر فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک لڑکے سے ایک سی نرمی۔ رحم دلی اور ہمدردی کا برتاؤ کرے اور اس کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ کسی غریب یا امیر لڑکے میں تمیز کرے اس کے علاوہ استاد کو بچے کی نسل۔ مذہب۔ اس کی سماجی اور مالی حیثیت کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنانا چاہیے۔

استاد کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا

اکثر لوگوں کی تمنا ہوتی ہے کہ دوبارہ جوان ہو جائیں۔ استاد کا زیادہ وقت بچوں میں گذرتا ہے۔ اور اس روزانہ کے میل جول سے نوجوانوں کی روح چھلک کر استاد کی روح کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے علاوہ دوسرے پیشے مثلاً ڈاکٹر۔ وکیل۔ نرس وغیرہ کا تعلق صرف اس قسم کے افراد تک محدود رہتا ہے جو بیمار ہوں۔ بوڑھے ہوں

یا مصیبت زدہ ہوں۔

اگرچہ نوجوانوں میں بھی ایسے مسائل ہوتے ہیں جن سے استاد کا تعلق ہوتا ہے۔ لیکن اگر زندگی کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو جوانی اور بڑھاپے کی زندگی میں بڑا فرق ہے۔ ذہنی اور سماجی طور پر نوجوان طلبہ اتنے توانا ہوتے ہیں کہ زندگی کے ہر میدان میں وہ استاد کو چیلنج کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ لکھتے پڑھتے اور کھیلتے ہیں اور اس طرح آپ کے ذہن کو اپنی سادہ مسرت اور احترام سے بھرپور کر دیتے ہیں۔ اس طرح استاد ذہنی طور پر کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔

والدین کی دلچسپیاں بڑھایئے

استاد کے پاس اس کا بھی موقع ہوتا ہے کہ وہ طلبہ کی تربیت میں والدین کی امداد کر سکے اور ماہرین تعلیم یہ جانتے ہیں کہ بچوں کی تعلیم میں استاد اور گھر کا برابر کا حصہ ہے۔ بہت سے والدین یہ چاہتے ہیں کہ وہ اساتذہ سے مفید معلومات حاصل کریں اور اپنے بچوں کو صحیح تعلیم دینے کی کوشش کریں۔ استاد کا یہ بھی ذاتی فرض ہے کہ وہ والدین کو اس قسم کا مواد مہیا کرے۔ بعض والدین اپنے بچوں کی تعلیم میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ بلکہ وہ اپنا زیادہ تر وقت کاروباری زندگی۔ کلب یا فیشن پرستی میں لگا دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں استاد کا فرض ہے کہ وہ والدین کی دلچسپیوں کو وسعت دینے کی کوشش کرے۔ تاکہ وہ اپنے بچوں کی طرف زیادہ توجہ دے سکیں۔

اپنی دلچسپیاں بھی بڑھایئے

کسی قوم کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے سکول ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ استاد کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ سکول قوم کے تعمیری کام میں پورا پورا حصہ لیتا ہے یا نہیں اور اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اس کام کو پورا کرنے کے لیے خود بھی مستعد ہو جائے۔ جماعت کے باہر بھی استاد کو اپنی دلچسپیاں بڑھانے کا پورا پورا موقع ہوتا ہے۔ بہت سی انجمنیں استاد کی امداد لیتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض کا مقصد قومی زندگی کو بہتر بنانا ہو۔ اور بعض روپے پیسے خاطر کام کر رہی ہوں۔ اب استاد کو یہ دیکھنا ہے وہ کس کے ساتھ منسلک ہے تاکہ وہ اس انجمن کی پوری پوری امداد کر سکے۔

استاد کے لیے خدمت کے بھی ان گنت مواقع ہیں جب جب تک وہ ان مواقع کو پڑھائی کے دوران

جانچتا ہے۔ اس کا انحصار اس کی امنگ، قابلیت اور قوتوں کے صحیح استعمال پر منحصر ہوتا ہے۔

دوسروں کے ساتھ میل جول

استاد کو دوسرے استادوں اور شاگردوں کے علاوہ دوسرے لوگوں سے ملنے کے بھی بہت مواقع ہوتے ہیں والدین اور سماج کے افراد مختلف برادریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور عام طور پر وہ مختلف جماعتوں، ذاتوں اور مذہبی عقیدوں کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ان کی عمریں پیشے اور مشغلے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی صحبت استاد کے لیے معلومات کا خزانہ ہے۔ استاد کو ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اور ان کی امداد سے اپنے علم اور ہمدردیوں کو وسیع کرنا چاہیے۔

استاد کو چاہیے کہ وہ والدین اور مقامی سماج سے تعلقات پیدا کرے، اس طرح وہ اپنے فرائض کو بہتر طریق پر سرانجام دے سکتا ہے۔ ان تعلقات کو بنانے کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ عام لوگوں کے مشاغل اور دلچسپیاں معلوم کی جائیں اور دوسروں کے ساتھ ان پر بحث و مباحثہ کیا جائے۔ اس میل جول میں آپ کئی قسم کے لوگ پائیں گے مثلاً ڈاکٹر، وکیل، مولوی، نرس، انجینیئر، تاجر، کسان وغیرہ وغیرہ۔ آپ کو ان سب کے ساتھ میل جول رکھنا ہوگا اور ان کی امداد حاصل کرنی ہوگی۔ ان کی زبان اس زبان سے مختلف ہوگی جس میں آپ بچوں کو تعلیم دیتے ہیں اور جس کے آپ عادی ہو چکے ہیں۔ آپ پر فرض ہوگا کہ ان سے مشکل الفاظ اور محاوروں کی بجائے سادہ اور آسان زبان میں گفتگو کریں آپ کو ہر شخص کے لیے اس جیسا بن کر دکھانا ہوگا۔ تاکہ آپ ان کے بچوں کو اچھے شہری بنانے میں کامیاب ہو سکیں۔

ان ملاقاتوں کے ذریعے آپ اپنے مشاغل کو بڑھا سکتے ہیں۔ اور انسانی فطرت کو زیادہ واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اس طرح آپ اپنے خیالات کو ذہن کی کال کوٹھڑی میں بند رکھنے کی بجائے پھلنے پھولنے کا موقع دیتے ہیں۔ آپ ایک تعمیری ہستی کی حیثیت سے اپنی مستعدی کو بڑھاتے ہیں۔ اور اس طرح آپ سماج کے ایک سمجھ دار اور ہوشیار استاد بن جاتے ہیں۔

اقتصادی تحفظ

اقتصادی تحفظ تعلیمی پیشے کی ایک اہم خصوصیت ہے، یہ درست ہے کہ اساتذہ کی آمدنی دوسرے پیشوں کی نسبت کم ہے، اور دوسرے پیشوں کی نسبت انہیں کام بھی زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے۔

کہ تعلیمی پیشہ باقی تمام پیشوں کی نسبت زیادہ دیرپا ہوتا ہے اور اسے زیادہ سالوں تک جاری رکھا جا سکتا ہے۔ اکثر پیشہ کے لوگ ۵۰ سال کے بعد اپنے پیشے کا کام ختم کر دیتے ہیں۔ لیکن استاد اس عمر میں سبک دوش ہو جانے کے بعد بھی کام جاری رکھ سکتا ہے۔ کیوں کہ جب تک بچے موجود ہیں، اس وقت تک استاد کی ضرورت رہے گی۔ اگر ہماری جمہوریت بنیادیں تباہ بھی ہو جائیں تب بھی سکول تمام چیزوں کی تباہی کے بعد ختم ہوں گے، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم میں اقتصادی تحفظ اپنے آپ موجود ہے۔

کردار سازی

آپ نے برتن بنانے والے کو تو ضرور دیکھا ہوگا جو معمولی مٹی سے کیا خوب صورت کھلونے تیار کر لیتا ہے اور سمجھتے ہیں کہ وہ بڑا فن کار ہے اور وہ ہے بھی ایک بڑا فن کار۔ اگرچہ اس کی یہ فن کاری بے جان مٹی تک ہی محدود ہے۔ آپ بھی بحیثیت ایک استاد کے فن کار ہیں۔ لیکن آپ کی فن کاری جانداروں سے متعلق ہے اور آپ کے اندر اتنی اہلیت موجود ہے کہ آپ اس خام مواد کو نسل انسانی کا بہترین نمونہ بنا سکتے ہیں۔ جب آپ بچوں کے رویے کو بہترین بنانے کی کوشش کریں گے تو بعض اوقات آپ دیکھیں گے کہ آپ کا قیمتی وقت اور یہ خام مواد ضائع ہو رہا ہے۔ لیکن پھر بھی آپ اٹلی کے مشہور بت تراش مائیکل اینجیلو کے قول کو نہیں بھولنا چاہیے۔ جس نے خود اپنے مجسمے کے بارے میں کہا تھا "ہاں میں سنگ مرمر کو تراش تراش کر ردی میں پھینکتا جا رہا ہوں لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ مجسمے کے خدوخال کیسے نکھرتے ہیں۔"

آپ کا یہ مجسمہ پروان چڑھتا رہے گا۔ جوں جوں آپ بچوں کے کردار کو درست کرتے جائیں گے آپ ہشاش بشاش، مستعد اور جمہوری رجحان والے شہری پیدا کرتے جائیں گے۔

جب آپ کے سر پر ذمہ داری کا فرض عائد ہو گا۔ اس وقت آپ یہ سوچیں گے کہ اپنے شاگردوں کو پڑھانے کون سا منصوبہ اختیار کریں۔ اور ساتھ ساتھ آپ کو وہ طریقہ بھی سوچنا ہوگا جس میں آپ ان کو تعلیم دیں گے۔ آپ کو یہ یاد رکھنا ہوگا کہ آپ آئندہ کے لیے کردار کے مثالی نمونے پیدا کر رہے ہیں۔ اور آپ کو ہمیشہ یہ بھی ذہن میں رکھنا ہوگا ان بچوں کے کردار کو کن اصولوں پر تعمیر کریں گے۔ کیوں کہ نرم شاخ کو جدھر موڑا جاتا ہے ویسے ہی مڑ جاتی ہے۔ اگر کردار مضبوط تعمیر ہو گئیں تو اس پر بننے والی عمارت بھی آئندہ کے طوفان کا مقابلہ کر سکے گی۔

مثالی شخصیت بن کر دکھائیں: بچوں میں نمونے کا کردار پیدا کرنے کے لیے آپ کے پاس لاتعداد امکانات ہیں۔

بہترین چیز یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو شاگردوں کی نظر میں ایک نمونے کی شخصیت بنا کر دکھائیں. آپ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ آپ بچوں کو خوش باش اور ہوشیار شہریوں کے سانچے میں ڈھال دیں. آپ پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ آپ ان کے علاوہ دوسرے پہلوؤں میں بھی مثالی نمونہ بن کر دکھائیں. مثلاً آپ کی پرمسرت زندگی. دوسروں کی خوش حالی کے مسائل میں دلچسپی. ان کی امداد اور خلوص کی مثالی تصویر ہو.

ہماری کمزوریاں

ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں ہی نہیں. بلکہ امریکہ میں بھی استاد اپنے فرائض سے بے خبر ثابت ہو چکے ہیں. امریکہ میں ایک تحقیقات کے ذریعہ یہ معلوم ہوا ہے کہ سکول چھوڑ کر کالج میں داخل ہو جانیوالے طالب علموں کا اپنے سکول کے اساتذہ کے متعلق کیا خیال ہے. اس کے لیے انہوں نے ۴۷ خوبیاں انتخاب کیں اور یہ معلوم کرنا چاہا کہ استاد اور عام افراد ان ۴۷ خواص میں کس کس پر پورا اترتے ہیں. اسے تحقیقات سے معلوم ہوا کہ مسرت. فراخ دلی. شخصی. متقنا طیسیت اور رحم دلی کا مادہ تو ان میں برائے نام ہی موجود تھا. اگر اب اساتذہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ مستند ہو جائیں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کمزوریوں پر غالب آجائیں. اور ان کمزوریوں پر غالب آنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے سامنے ایک مثالی نمونہ بن کر دکھائیں. یاد رکھیے آپ کا یہ عمل بچوں میں ایک روشن مستقبل تعمیر کرنے کا جذبہ پیدا کرنے میں امداد دے گا.

ذہنی دلچسپی

بہت سے پیشوں میں فرد کو ایسے محرکات ملتے ہیں جن کی بنا پر وہ ذہنی لحاظ سے زندہ نہیں رہتے. اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی ان کے لیے ایک مشکل اور کٹھن کام بن جاتی ہے. تعلیم میں ذہن کو بیدار رکھنا نہایت اہم سمجھا جاتا ہے. بچے میں قدرتی طور پر تجسس کا جذبہ ودیعت کیا گیا ہے جوں جوں وہ چیزوں کی چھان بین کرتا ہے اس کی ذہنی قوت بڑھتی جاتی ہے. اور جوں جوں اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اس کے دماغ میں پیدا ہونے والے نئے نئے سوالات استاد کے لیے تعلیم و تربیت کے نئے دروازے کھول دیتے ہیں. اور انسانی ندرت کا مطالعہ بچے کی تربیت اور پڑھائی کا منصوبہ استاد کے دل میں ہر وقت ایک نیا ولولہ پیدا کرتا رہتا ہے.

علمی لحاظ سے استاد کو ایک چلتی پھرتی لائبریری نہیں بن جانا چاہیے. لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ بچوں کو تعلیم کے

ہر پہلو کی جانب رہنمائی کرے۔ اور اس کا کام کتاب پڑھا دینے اور الفاظ رٹا دینے پر ہی موقوف نہ ہو۔ ایک رہنما کا عملی پس منظر ویران نہیں بلکہ باغ و بہار ہونا چاہیے۔ اور اس کی معلومات میں برابر اضافہ ہوتے رہنا چاہیے اور اس نوعیت کا ہونا چاہیے کہ وہ بچے کی ہر ضرورت کو پورا کر سکے۔

بعض ہیڈ ماسٹر اور انسپکٹر صاحبان کا خیال ہے کہ سکول کے نظام کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ سٹاف کا ہر ممبر ملازمت کے دوران میں بھی ٹریننگ حاصل کرے۔ یہ پروگرام اس مقصد کے لیے ہوتے ہیں کہ استاد کے ذہن کو ہر وقت بیدار اور مستعد رہنا چاہیے کیونکہ اس وجہ سے بچوں کی تعلیم اور زیادہ سودمند ہو سکتی ہے۔

انسانی فطرت کو سمجھیے

استاد کے لیے انسانی فطرت کو سمجھنا بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ ایک عام فہم بات ہے۔ مگر انسانی فطرت کو سمجھنے کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ اگر آپ انسانی فطرت کو سمجھنے کے عمل میں ایک مقام پر پہونچ جاتے ہیں تو اس کے بعد اس کے آگے ایک اور نیا میدان نظر آتا ہے۔ ہر بچے والدین، قوم کے ہر فرد کی شخصیت بالکل مختلف ہوتی ہے اور ان کی شخصیت کو ایک فرد کی حیثیت سے بھی دیکھنا چاہیے۔ ان مختلف اقسام کے لوگوں کی دلچسپیوں اور ضروریات کے متعلق ایک عام پس منظر قائم کرنا بھی ذہن کو بیدار رکھنے کا بڑا دلچسپ ذریعہ ہے۔

ایک بڑے پیشے کا ممبر ہونا

متمدن دنیا میں تعلیم کا پیشہ دنیا میں سب سے بڑا پیشہ ہے۔ اور اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہر ۱۵۰ افراد کے لیے ایک ٹیچر ہے۔ آئندہ سالوں میں یہ تعداد بڑھتی رہے گی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بچوں کی تعداد برابر بڑھتی جائے گی، دوسرے بچوں میں یہ رجحان ہو جائے گا کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت سکول میں خرچ کریں۔ تیسرے سکول کا نظام بھی جماعتوں اور سالوں کے لحاظ سے برابر بڑھ رہا ہے۔ کنڈرگارٹن اور نرسری سکولوں کو آج کل بچہ سکول کے مشاہدات کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ تجارت اور صنعت میں بھی تعلیم یافتہ لوگوں کی زیادہ ضرورت ہے تعلیم بالغاں کو فروغ دینے کے لیے بھی نئی کوششیں ہو رہی ہیں۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ بالغوں کا زیادہ سے زیادہ آسانیاں دی جائیں۔ تاکہ ان کو آئین کا احترام رکھنے والے خوش اخلاق شہریوں میں تبدیل کر دیا جائے آج کل ٹیکنیکل ترقی کی وجہ سے کارخانوں میں کام کرنے کا وقت کم اور فالتو وقت میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے چنانچہ

ان اساتذہ پر جو تعلیم بالغاں کا کام کرتے ہیں یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان نوجوانوں کو اس قسم کے ہنر سکھائیں جن سے وہ اپنے فالتو اوقات کو کسی اچھے سے اچھے کام میں صرف کر سکیں۔

آپ دنیا میں خواہ کہیں ہوں آپ کو اپنے پیشے کا آدمی ضرور مل جاتا ہے اور دوسروں سے واقفیت پیدا کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آپ ایسی دلچسپیاں تلاش کریں جو مشترکہ ہوں۔ اور اس کے ذریعے آپ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا مزاج شناس اور دوست بنا سکیں۔

ایک استاد کی حیثیت سے آپ کو کئی معاشری جلسوں میں شرکت کرنی ہوگی۔ آپ کو مقامی اساتذہ کی انجمن کا ممبر بھی بننا پڑے گا۔ آپ کو کل ملکی انجمن میں بھی شریک ہونا پڑے گا۔ ان ملاقاتوں کے ساتھ آپ ان لوگوں کے ساتھ واقفیت حاصل کریں گے۔ اور جن کے ساتھ مل کر آپ کو کام کرنا ہوگا، یہ وہ لوگ ہوں گے جو کہ جغرافیائی لحاظ سے دور دراز مالک کے رہنے والے ہوں گے۔ اور جن کا مقصد جمہوری نظام کے اولین فرض تعلیم و تعلّم کی تکمیل ہوگا۔

گھر اور خاندان

آپ کی یہ خواہش ہوگی کہ آپ کا ایک گھر ہو اور آپ کے بچے بھی ہوں۔ آپ کی یہ خواہش بھی ہوگی کہ آپ کا گھر خوشی کا نمونہ ہو۔ آپ اپنے بچوں کو بہترین شہری بنانے میں ہر ممکن کوشش کریں گے اور اپنے بچوں کو ان کے اخلاق بلند کرنے میں امداد دیں گے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا مستقبل کی منصوبہ بندی میں بڑا دخل ہے۔

آپ تعلیمی سلسلے میں کوئی مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں تو اس مشاہدے کے دوران میں سب سے ضروری بات یہ ہوگی کہ اس کے دوران میں آپ کو اپنے مقصد سے ہمیشہ باخبر رہنا ہوگا۔ تعلیم تو ایک دوسرے کے ساتھ موثر تعلقات کا نام ہے۔ اور خاندان ہمارے سماج کا بنیادی معاشری گروہ ہے۔ اگر کوئی سمجھدار شخص یہ جانتا ہے کہ ایک مثالی گھر بنانے کے لیے کن کن باتوں کا ہونا ضروری ہے تو اس کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ گھر کا تصور محض میاں بیوی کے میل جول تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ حلقۂ احباب کو بھی وسیع کیا جائے۔

استاد کے پاس اتنا موقع ضرور ہوتا ہے کہ وہ اپنے طلبہ کے والدین کی خوبیوں کا جائزہ لے سکے۔ یہ بات ان کے بچوں کے کردار سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ استاد کو چاہیے کہ بچوں سے میل جول کے دوران میں بچوں کی دلچسپیوں ان کی ضروریات۔ خواہشات اور مسائل کا جائزہ لینے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کرے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ گھر کا ماحول

بچے کی نشوونما اور تعلیم و تربیت پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ سکول اور گھر کے تعلقات سے بھی باخبر ہوتا ہے
چناں چہ اس سوجھ بوجھ اور تجربے کی بنا پر وہ اپنے بچوں کے لیے ایک اچھا باپ بن سکتا ہے۔

شادی شدہ استانیاں

دوسری جنگ عظیم کے بعد شادی شدہ خواتین نے تعلیم کے پیشے کو نسبتًا زیادہ اپنانا شروع کیا ہے، اس سے پہلے شادی ان کے اس پیشے میں داخل ہونے کے لیے رکاوٹ تھی۔ چنانچہ اس وجہ سے وہ شادی شدہ عورتیں جو اس کام کے لیے بہت مناسب تھیں اس پیشے کو اپنا نہ سکیں اور ان کی جگہ ایسی غیر شادی شدہ عورتوں نے لے لی جن کا تعلیم سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اگرچہ شادی شدہ استانیوں کو ایک ہی وقت میں دو فرائض سرانجام دینے پڑتے ہیں۔ لیکن پھر بھی منصوبہ بندی ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعے وہ اپنی مشکلات پر قابو پا سکتی ہیں۔ اور ایک اچھی استانی اور ایک اچھی بیوی دونوں کی خدمات سرانجام دے سکتی ہیں۔

گوناگوں مواقع

اگرچہ تعلیمی عمل کا محور تو استاد ہی ہے لیکن اس کے علاوہ اس میں اور بہت سے لوگ بھی شریک ہیں۔ مثلاً:-

تاجر۔ ڈاکٹر۔ نرس۔ اساتذہ کو تعلیم دینے والے پروفیسر اور اسی قسم کے دوسرے لوگ۔

تعلیم ایک وسیع و عریض میدان ہے جس میں آپ اپنی دل چسپیوں اور اہلیت میں برابر اضافہ کر سکتے ہیں۔ ایک استاد کی حیثیت سے جوں جوں آپ مشاہدات کرتے رہتے ہیں، آپ کی دل چسپی ایک جماعت سے دوسری جماعت تک منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اور آپ کو ہر روز نت نئی دل چسپیوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

تعلیم بعض اوقات دوسرے پیشہ ورانہ کاموں کے لیے بھی مفید ہوتی ہے۔ عام طور پر پرانے اساتذہ کو صنعتی کاروبار میں اس لیے رکھ لیا جاتا ہے کہ اچھے رہنمائی کرنے والے۔ ریسرچ کرنے والے اور بہت اچھے کام کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے بہت سے ایسے کام بھی ہیں جن کا تعلیم سے گہرا رشتہ ہے۔ مثلاً دیہی امداد کا پروگرام انجمن امداد باہمی کا کام۔ بچوں کے اسکاؤٹنگ۔ عوامی شعبوں کا کام وغیرہ۔ بعض استاد ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہ ان کاموں میں خاصی مہارت حاصل کر لیتے ہیں:۔

(باقی)

ثانوی تعلیم کے مقاصد کیا ہوں؟

نذیر احمد

عملی تعلیم کے بنیادی عوامل

جان ڈیوی کے مشہور الفاظ میں عملی تعلیم کے بنیادی عوامل دوگونہ ہیں۔ (ا) ایک خام، غیر ترقی یافتہ شخصیت اور (ب) بعض معاشرتی مقاصد، معانی اور قدریں جو بالغوں کی پختہ زندگیوں میں رسی بسی ہوتی ہیں۔ عملی تعلیم ان دونوں عوامل کے مناسب تعامل باہمی کا نام ہے۔ ایک دوسرے کے مقابلے میں ان دونوں کا ایسا تصوّر جس سے دونوں کے درمیان مکمل ترین اور آزاد ترین تعامل کو سہولت ملے اس تصوّر کو نظریۂ تعلیم کا خلاصہ سمجھنا چاہیے۔

تعلیم کا یہ نظریہ کوئی نیا نہیں۔ پسماندہ سے پسماندہ معاشروں نے بھی تعلیم کو اپنی بقا کا ذریعہ بنایا ہے۔ ہر معاشرہ ایک مخصوص قسم کی اجتماعی زندگی کو جنم دیتا ہے۔ اس زندگی کے اپنے جداگانہ آداب ہوتے ہیں۔ ان آداب کی بنیاد مخصوص قسم کے اخلاقی، مذہبی اور رواجی اعتقادات پر ہوتی ہے۔ یہ اعتقادات اور رسم و رواج مخصوص قسم کے اجتماعی اداروں کو جنم دیتے اور ایک مخصوص قسم کے معاشی نظام کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں مل کر قومی زبان ادب اور رہنے سہنے کے طریقوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتی ہیں۔ ہر معاشرہ ان چیزوں کو بے حد عزیز جاننے لگتا ہے۔ یہ چیزیں اس کی قدریں کہلاتی ہیں۔

غیر مہذب معاشروں کو بھی اس بات کی بڑی فکر رہی ہے کہ نئی پود ان کی قدروں کو سمجھنے اور ان کی حفاظت کرنے کے قابل ہو جائے۔ آج بھی افریقہ کے وحشی اور نیم وحشی قبیلے اس بات کا بڑا اہتمام کرتے ہیں کہ ان کے بچے شکار کرنے کے طریقے اور خبیث روحوں کے گزند سے بچنے کی تدبیریں اچھی طرح سیکھ جائیں۔ یہ غایت حاصل کرنے کے لیے کسی رسمی تعلیم کا بندوبست نہیں کیا جاتا۔ تاہم گھر اور معاشرہ دونوں مل کر اپنی بنیادی قدریں غیر رسمی طور پر نئی پود کے حوالے کر دیتے ہیں۔ افراد کی طرح ہر معاشرہ بھی زندگی کا بڑا حریص ہوتا ہے۔ اس کی بقا کا انحصار محض افراد کی جسمانی بقا پر موقوف نہیں (گو یہ بھی ایک ضروری شرط ہے) بلکہ اس کی بقا کے لیے افراد کی جسمانی بقا کے ساتھ اس کی مخصوص قدروں کی

بقا بھی لازمی ہے۔

غیر مہذب معاشروں میں جو کام کلی طور پر گھر اور معاشرہ مل کر انجام دیتے تھے، مہذب معاشروں میں وہی کام گھر، معاشرہ اور مدرسہ مل کر انجام دیتے ہیں۔ گھر اور مدرسے کی تعلیم غیر رسمی تعلیم ہے۔ مگر مدرسے کی تعلیم رسمی ہے۔ تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ مدرسے کی حیثیت اور اس کے کردار کو اس قدر اہمیت حاصل ہوئی ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں نئی پود کو معاشرتی قدریں سونپنے کا کام بڑی حد تک مدرسوں کے ہاتھوں انجام پانے لگا ہے۔ گھر اور معاشرہ اپنا کردار ادا کرنے کے لیے مدرسے ہی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

غرض ہر مہذب معاشرے میں مدرسہ ایک کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ کوئی ہوش مند معاشرہ اس بات سے بے خبر رہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ اس کے مدرسے کس قسم کی تعلیم دے رہے ہیں۔ مثلاً جو معاشرہ تحکم پسندی کے تصور پر قائم ہو، اگر وہ اپنی حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے تو وہ اپنے مدرسوں کو جمہوریت کی تعلیم دینے کی اجازت نہیں دے گا۔ اسی طرح جمہوریت پسند ملک اس بات کو لحظہ بھر کے لیے برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے مدرسوں میں اشتراکیت کی تعلیم دی جائے۔ ان دنوں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں میکارتھی اور اس کے ساتھی یہی نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ وہ امریکی مدرسوں اور یونیورسٹیوں کو ان تمام استادوں سے پاک کر دینا چاہتے ہیں جو اشتراکیت کی طرف ذرا بھی میلان رکھتے ہوں۔ وجہ بالکل ظاہر ہے۔ امریکی طرز زندگی کی ساری عمارت نجی ملکیت اور بے روک ٹوک مسابقت کے تصورات پر کھڑی ہے۔ جو تعلیم ان نظریات کی جڑیں ہلائے گی وہ لا محالہ امریکی طرز زندگی کو خطرے میں ڈالے گی۔ جو معاشرے سیاسی غلامی کے باعث یا معاشی بدحالی کے زیر اثر یا کسی اور سبب کی بنا پر اپنی بنیادی قدروں کا بچاؤ نہیں کر سکتے اور اپنی نئی پود کو اس قسم کی تعلیم دینے پر مجبور ہوتے ہیں جو ان کے بنیادی تصورات سے ٹکراتی ہو وہ بہت جلد معاشرتی افراتفری اور ذہنی بے مقصدیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کی معاشرتی زندگی جس طویل بحران کا شکار رہی اس کا بڑا سبب یہی تھا کہ غالب قوم نے محکوم قوم کی تعلیم میں بعض ایسے عناصر داخل کر دیے تھے جن کو اس کی ثقافتی روایات کے ساتھ چنداں مناسبت نہ تھی۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم

جس طرح ہر ماہر ورکر کو بعض اوزاروں کی ضرورت ہوا کرتی ہے جن کے بغیر وہ کچھ کام نہیں کر سکتا، بالکل اسی

تعلیم کے حصول کے لیے بھی کچھ اوزار ضروری ہیں۔ تعلیم دراصل نام ہے نوع انسان کے صدیوں کے تجربوں اور مشاہدوں کے نچوڑ کا۔ انسان نے جب سے اس دنیا میں قدم رکھا ہے اس نے اپنے آپ کو ایک پُرعظمت اور لامحدود ایک پُرہیبت نظام کائنات سے گھرا پایا ہے جس کے مقابلے میں خود اس کا اپنا وجود بہت ہی حقیر اور بے حد مختصر نظر آتا ہے۔ لیکن اس حقیر سے جسم کے اندر ایک بے پناہ فکری قوت موجود ہے۔ ایک ایسی قوت جو ساری کائنات کو اپنی مرضی کے تابع کر لینا چاہتی ہے۔ تاہم قدرت کے ان دیو قامت عناصر کو سمجھنا اور ان پر قابو پانا کوئی سہل کام نہ تھا۔ انسانی ذہن اس جہاد میں اس وقت سے لگا ہے جس وقت سے اس میں شعور کی روشنی پیدا ہوئی۔ یہ جہاد اب تک پوری شدت کے ساتھ جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔ تاہم انسان فطرت کے چہرے سے بہت سے نقاب اٹھا چکا ہے اور نظام کائنات میں اپنے مقام کے متعلق بھی ایک واضح فہم پیدا کر چکا ہے۔ پہلا کام مختلف علوم اور سائنسوں نے کیا ہے اور دوسرا کام مذاہب اور فلسفوں نے۔

انسانی ذہن و فکر نے صدیوں لمبی دوڑ دھوپ سے مادی کائنات اور روحانی و ذہنی زندگی کے جو گوشے بے نقاب کیے ہیں وہ نوع انسان کی مشترکہ میراث ہیں اور وہی تعلیم کا موضوع ہیں۔ ہم نے ان کو مختلف علوم کے نام دے رکھے ہیں۔ مگر علوم کے ان خزانوں کے دروازے کھولنے کے لیے کچھ چابیوں کی ضرورت ہے۔ علم کی یہ چابیاں جو علمی اوزاروں کے نام سے بھی موسوم ہیں۔ لکھائی۔ پڑھائی اور معمولی حساب ہیں۔ ایک اوسط انسان ان علمی اوزاروں کو حاصل کیے بغیر علم کے خزانوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں جب خواندگی کو ذریعہ بنائے بغیر بھی تعلیم دی گئی۔ مگر یہ مثالیں بے حد شاذ اور مافوق العادت حالات کی پیداوار تھیں۔ عام حالات میں خواندگی تحصیل علم کی طرف پہلا قدم ہے۔

ابتدائی تعلیم کا پہلا مقصد علمی اوزار عطا کرنا ہے۔ چوں کہ یہ اوزار ہر طالب علم کے لیے ناگزیر ہیں اس لیے ہر ایک کے لیے ان کا حاصل کرنا لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی جماعتوں میں اختیاری مضامین کی گنجائش نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بیشتر ملکوں نے آج ابتدائی تعلیم اپنے تمام شہریوں کے لیے لازمی قرار دے رکھی ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر ملک کم سے کم اتنا چاہتا ہے کہ اس کا ہر شہری ان اوزاروں سے ضرور لیس ہو جن کی مدد سے نوع انسان کے ثقافتی خزانوں کے دروازے کھل سکتے ہیں۔

ثانوی درجے پر پہنچ کر تعلیم کا مقصد مختلف ہو جاتا ہے۔ اب طالب علم وہ اوزار حاصل کر چکا ہوتا ہے جو مختلف علمی خزانوں کے کھولنے میں کام دیں۔ مگر آج انسان کی علمی میراث اس قدر وسیع و عریض ہے کہ کوئی انسان ساری عمر صرف کر کے بھی اس کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اسے مجبوراً صرف چند علوم کو خاص توجہ کے لیے چننا پڑتا ہے۔ تاکہ ان میں کافی گہری دست رس حاصل ہو جائے۔ ثانوی تعلیم کا ایک مقصد اس انتخاب میں مدد دینا ہے۔ اسی مناسبت سے ثانوی درجے پر طلبہ کی اجازت ہونے لگتی ہے کہ مضامین کے ایک محدود دائرے میں سے اپنی افتادِ طبع کے مطابق کوئی مضمون پسند کر لیں۔

ثانوی تعلیم کے مقاصد کے متعلق زیادہ تفصیلی بحث تو آگے آئے گی۔ یہاں اس افسوس ناک صورت حال کا ذکر کرنا مقصود ہے جس سے ہماری ثانوی تعلیم مدت سے دوچار رہی ہے۔ انگریزی دور کی مخصوص ضرورتوں کے مطابق ثانوی تعلیم اس لیے وضع کی گئی تھی کہ وہ یونی ورسٹی تعلیم کے لیے تیاری کا کام دے۔ ہر چند کہ اس طریق کار کے برے نتائج اس صدی کے شروع میں ہی ظاہر ہونے لگ گئے تھے اور مختلف گوشوں سے یہ آوازیں اٹھنے لگی تھیں کہ ثانوی تعلیم کو یہ بھی چاہیے کہ طلبہ کو عملی زندگی کے لیے تیار کرے۔ مگر ان آوازوں کی طرف کوئی کان نہ دھرا گیا۔ ثانوی تعلیم کے خاتمے پر طلبہ کی بھاری اکثریت زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔ مگر ثانوی تعلیم اس زندگی کے لیے کسی تیاری کا اہتمام نہیں کرتی۔ وہ خالصتہً کالج میں داخلے کی تیاری کراتی ہے۔ اس افسوس ناک صورت حال نے ہماری ثانوی تعلیم کو چاروں طرف سے اعتراضات کا نشانہ بنا رکھا ہے۔

یہ ماننا پڑے گا کہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی اوّل اوّل ثانوی تعلیم کی تقریباً یہی نوعیت تھی۔ اس کا مقصد طلبہ کو یونی ورسٹی کے اعلیٰ علمی کام کے لیے تیار کرنا تھا۔ اسے عملی زندگی سے چنداں سروکار نہ تھا بلکہ عملی کاموں کو عالمانہ شان کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ترقی یافتہ ملکوں میں یہ صورت حال مدت ہوئی ختم ہو گئی۔ ان ملکوں نے بہت جلد یہ نکتہ سمجھ لیا کہ قومی معیشت کو مضبوط بنائے بغیر کوئی ہمہ جہتی ترقی ممکن نہیں اور یہ مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک ثانوی مدرسے کے نصاب کو زندگی کی سی وسعت نہ دی جائے۔ جوں جوں گنے چنے بچوں کی بجائے ثانوی مدرسوں میں تمام بچے آنے لگے۔ یہ احساس شدت کے ساتھ زور پکڑتا گیا کہ ثانوی نصاب کو وسیع تر ہونا چاہیے۔ اسے ان طلبہ کی ضرورتیں ضرور پوری کرنی چاہئیں جو یونی ورسٹیوں میں اعلیٰ علمی کام

کرنے کے خواہاں ہیں۔ اسے طلبہ کی اس روزافزوں تعداد کا خیال بھی رکھنا چاہیے جو مدرسہ ختم کر لینے پر کالج کی بجائے زندگی میں داخل ہونا چاہتی ہے۔

ہمہ گیر ثانوی مدرسہ

ثانوی مدرسے کا یہ وسیع تر تصور اول اول ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پیدا ہوا۔ اس کے زیرِ اثر نصاب میں کشادگی آنے لگی۔ یہ احساس دن بدن زور پکڑتا گیا کہ اگر ثانوی تعلیم ہر شہری کے لیے لازمی ہے تو اس کے نصاب کی وسعت پوری زندگی پر حاوی ہونی چاہیے تاکہ ہر بننے والا شہری زندگی میں قدم رکھتے وقت ایک خاطر خواہ عملی تیاری سے لیس ہو۔ اس احساس اور اس سے پیدا ہونے والے عوامی مطالبے نے امریکی ثانوی مدرسے کے نصاب میں ایسے ایسے مضامین اور عملی مشاغل شامل کیے جن کا تصور بھی روایت پرست مدرسے کے لیے مشکل تھا۔ آج اس نصاب میں لباس تیار کرنا۔ کھانا پکانا۔ کار چلانا۔ بال تراشنا۔ کاروباری حساب۔ کاروباری انگریزی۔ لکڑی۔ دھات اور بجلی کا کام گھریلو زندگی اور اس قسم کے کئی دوسرے مشاغل اور مہارتیں بطور مضامین شامل ہیں۔

ثانوی نصاب کے اس بدلے ہوئے تصور نے اس امریکی مدرسے کی کایا پلٹ دی۔ پرانے علمی مضامین کو بھی باقی رکھا گیا۔ تاکہ جو طلبہ خالص علمی ذوق رکھتے ہوں اور اس کی تشفی کے لیے یونیورسٹیوں میں جانا چاہتے ہوں مدرسے میں انہیں تیاری کرائی جا سکے۔ مگر ان معدودے چند علمی مضامین کے ساتھ ساتھ وہ درجنوں غیر علمی مشاغل اور مہارتیں بھی عملی زندگی کی تیاری کے لیے داخل نصاب کی گئی ہیں۔ ان کی آمد نے مدرسے کی روایتی فضا کا خاتمہ کر کے اس میں زندگی کی رنگا رنگی اور ہماہمی پیدا کر دی ہے۔ اس نئی وضع کے ثانوی مدرسے کو ہمہ گیر مدرسے کا نام دیا گیا ہے کیوں کہ یہ مدرسہ اس اصول پر قائم کیا گیا ہے کہ اس کے نصاب میں ہر قابلیت اور ہر افتادِ طبع کے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ کشش ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمہ گیر مدرسہ نہ صرف درجنوں مضامین اور مہارتوں کے سکھانے کا اہتمام کرتا ہے بلکہ ایک نہایت بھرپور اجتماعی زندگی بھی پیدا کرتا ہے۔ اس میں بیسیوں کلب اور انجمنیں قائم ہوتی ہیں۔ ہر طالب علم اس قسم کی کئی تنظیموں میں سرگرم حصہ لیتا اور ذمہ داری سنبھالنے اور اپنے اوپر خود ضبط قائم کرنے کی عملی تربیت حاصل کرتا ہے۔ غرض ہمہ گیر مدرسے میں ہر قابلیت اور ہر دلچسپی کے حسبِ حال کچھ نہ کچھ سامان ضرور موجود ہے۔ تاکہ ہر استعداد سطح پر آنے اور ترقی پانے کا موقع ملے۔

ہمہ گیر مدرسہ ایک مخصوص امریکی پیداوار ہے۔ یہ مدرسہ اہل امریکہ کے اس جمہوری نظریہ کا نتیجہ ہے کہ ہر فرد اپنی مخصوص انفرادیت رکھتا ہے جس کا احترام ہونا چاہیے۔ معاشرے کو کوئی حق نہیں کہ اس پر بہ جبر کسی قسم کی یکرنگی ٹھونسے۔ آلاتی مضامین سکھانے کے بعد اگر کوئی مضامین سب کے لیے لازمی قرار دیے جا سکتے ہیں تو یہ مادری زبان، معاشرتی علوم اور عام سائنس و حفظان صحت ہی ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہر چیز کو طالب علم کی افتاد طبع اور دلچسپیوں پر چھوڑ دینا چاہیے۔ غرض ہمہ گیر مدرسہ چھوٹے پیمانے پر ایک جمہوری معاشرہ ہے جہاں ہر طالب علم کی انفرادیت کا امکانی حد تک احترام کیا جاتا ہے اور اسے امور مدرسہ کی ذمہ داری میں شریک کیا جاتا ہے۔

ہمہ گیر مدرسہ اوقیانوس کے اس پار برطانیہ میں کافی دیر کے بعد پہنچا ہے۔ انگلستان میں ابھی ابھی معدودے چند ہمہ گیر مدرسے قائم کیے گئے ہیں۔ شاید یورپ میں بھی کوئی ہمہ گیر مدرسے قائم ہوئے ہوں۔ ایشیائی ملکوں میں بھی ہمہ گیر مدرسے کا تصور مقبول ہو رہا ہے۔ گو ابھی اس کے کامیاب عملی تجربے بہت کم کیے گئے ہیں۔

برطانیہ میں بھی ۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم کی رو سے ثانوی تعلیم ہر بچے کے لیے لازمی قرار دی گئی تھی۔ اس قانون پر عمل بھی خوب سرگرمی سے کیا گیا ہے۔ مگر انگریز قوم نے اپنے تمام بچوں کو ثانوی تعلیم دینے کے لیے ہمہ گیر مدرسے کی بجائے ایک اور طریقے سے کام لیا ہے۔ گیارہ برس پورے ہونے تک تمام بچے ابتدائی مدرسوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ اس زمانے کی تکمیل پر ان کا ایک امتحان ہوتا ہے۔ اس امتحان میں ایک مطلوبہ درجے کی قابلیت کا ثبوت دینے والے بچوں کو گرامر سکول میں بھیجا جاتا ہے۔ گرامر سکول برطانوی نظام تعلیم کے وہ سرمایہ افتخار مدرسے ہیں جنہوں نے مدت تک برطانوی شرفا کے بچوں کو استعماری ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیار کیا ہے۔ ان مدرسوں کا نصاب زیادہ تر پرانی وضع کا علمی نصاب ہے اور ان کی عام زندگی میں رکھ رکھاؤ کا بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جو بچے اس امتحان میں معیار پر پورے نہیں اترتے ان میں سے اکثر کو ثانوی جدید مدرسوں (سیکنڈری ماڈرن سکولز) میں بھیج دیا جاتا ہے اور کچھ کو ٹیکنیکل مدرسوں میں۔ ثانوی جدید میں علمی مضامین کے علاوہ اس قسم کے عملی مضامین اور مہارتیں داخل نصاب ہیں جو زندگی میں عملی افادیت رکھتی ہیں۔ ٹیکنیکل مدرسوں کے نصاب کی نوعیت ان مدرسوں کے نام سے ظاہر ہے۔

برطانیہ نے ثانوی نصاب کو وسعت دینے کے لیے ایک ہی مدرسے میں تمام قسم کے مضامین اور مہارتوں کی تعلیم کو یکجا نہیں کیا، بلکہ تین قسم کے ثانوی مدرسوں کے ذمے مخصوص کام لگائے ہیں۔ پرائمری مدرسہ کے بعد بچوں کو تین مد

ں بانٹ دیا جاتا ہے۔ اور یہ تینوں ندیاں الگ الگ بہتی ہوئی ثانوی منزل کو طے کرتی ہیں۔ اس طریق کار کے لیے خواہ کچھ
ی فائدے گنوائے جائیں اب تک برطانوی والدین کی پہلی پسند یہی رہی ہے کہ ان کے بچے گرامر سکولوں میں لے لیے
ائیں۔ بین الاقوامی معاشی جنگ نے برطانیہ کو مجبور کیا ہے کہ صنعت و حرفت کی عملی تعلیم کو زیادہ مقبول کرنے کے لیے
سے والدین اور طلبہ کے لیے زیادہ پُرکشش بنائے۔

قانون اور تعلیم

اب تک ہم نے صرف یہ دیکھا ہے کہ نوجوانوں کے دلوں میں ثقافتی قدروں کے لیے سرگرمی کے جذبات کو ترقی دینے
ور انہیں اچھے اور موثر شہری بنانے کے لیے ثانوی تعلیم کیا خدمت سرانجام دے سکتی ہے اور ترقی یافتہ ملکوں میں آلاتی
مضامین پر قدرت دلائی جاتی ہے۔ ثانوی درجے پر ان آلات کی مدد سے ان میں ایک مخصوص قسم کی نظریاتی نگاہ پیدا کی جاتی
ہے اور انہیں ملک کے معاشی نظام میں موثر حصہ لینے کے قابل بنایا جاتا ہے۔ اس طرح ثانوی تعلیم کو کسی اور چیز کا واسطہ
بنانے کی بجائے اسے بذات خود ایک مکمل منزل قرار دیا جاتا ہے۔ معاشرہ تعلیم سے یہ دوگانہ خدمت اس لیے لیتا ہے کہ
اس کی روحانی سالمیت برقرار رہے اور اس کی معاشی قوت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے۔

معاشرہ یہ خدمت تعلیم کے علاوہ ایک اور ذریعے سے بھی لیتا ہے اور وہ ذریعہ ہے قانون۔ ہر ریاست کی قہرمانی
قوت اس کی حکومت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ حکومت اس قوت کو اپنے قوانین نافذ کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ عام
مہذب شہری اس قوت کا مظاہرہ شاذونادر ہی دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود بخود اکثر ملکی قوانین کا لحاظ رکھتے ہیں
لیکن جب کبھی قانون کو حقیقی خطرہ نظر آئے ریاست کی قہرمانی قوت اس کے نفاذ کے لیے پوری غضب ناکی کے ساتھ آن
موجود ہوتی ہے۔

مغربی پاکستان میں جو نیم سیاسی اور نیم مذہبی تحریک ۱۹۵۳ء میں چلی تھی، اس میں حصہ لینے والوں کو
دیر تک یہ غلط فہمی رہی کہ اب وہ ایک آزاد ملک کے شہری ہیں اس لیے قانون کے ساتھ بھی کھیل سکتے ہیں۔ لیکن
جب قانون کی پشت پناہی کے لیے پُرہیبت اور بے حد سخت گیر فوجی قوت میدان میں اتر آئی تو انہیں اچانک یہ ناخوشگوار
احساس ہوا کہ اس قانون کی پشت پر ایک کچل دینے والی قہرمانی قوت بھی موجود ہے۔ حاصل کلام یہ کہ ہر معاشرے میں
قوانین کا وجود بھی اسی طرح ناگزیر ہے جس طرح تعلیم کا، مگر قانون کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ اس کے پیچھے ریاست کی

قوت قاہرہ ہر وقت موجود رہتی ہے۔ عام حالات میں یہ قوت محسوس ہوتی ہے اس قوت کا مظاہرہ بجلی کی تیزی اور رعد کی سی ڈرانے والی گرج کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

معاشرتی زندگی کی سالمیت برقرار رکھنے اور اسے ایک مقررہ سمت عطا کرنے کے لیے قانون ہمیشہ ایک زبردست حربہ رہا ہے۔ قرون وسطیٰ اور قرون اولیٰ کے فاتح اور جابر حکمران ملکوں اور قوموں کی معاشرتی زندگی کا رنگ بدلنے کے لیے قانون کے حربے سے ہی کھول کر کام لیتے تھے۔ فرعون نے بنی اسرائیل کو ہمیشہ کے لیے پاؤں تلے دبا رکھنے کے لیے یہ قانون بنایا کہ ان کی نرینہ اولاد ذبح کر دی جائے اور ان کی بیٹیاں زندہ رہنے دی جائیں۔ سولھویں صدی میں مسیحی سورماؤں نے ہسپانیہ کے مسلمانوں پر فیصلہ کن سیاسی غلبہ حاصل کر لیا تو اس ملک سے صدہا سال پرانے اسلامی اثرات مٹانے کے لیے وحشیانہ قانون بنائے گئے اور انہیں پوری بربریت کے ساتھ نافذ کیا گیا۔ اسلامی طرز بود و باش اور اسلامی لباس سنگین جرم قرار دیے گئے۔ اس پر لاکھوں مسلمان دیس چھوڑ کر نکل گئے۔ لاکھوں نے بظاہر عیسائیت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ مگر چھپ چھپ کر گھروں میں اسلامی شعائر کو زندہ رکھنے لگے۔ مسیحی حکمرانوں کو اس کا علم ہوا تو عربی زبان کو ہی خلاف قانون قرار دے دیا۔ اس طرح ہزاروں گھرانے جنہوں نے صدیوں تک توحید کی گود میں پرورش پائی تھی ایک دو پشتوں تک مکمل طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تثلیث کی آغوش میں چلے گئے۔ ریاست کا قانون اپنی قہرمانی قوت کے بل پر ایک پوری قوم کے قلب و نگاہ کو بدلنے میں کامیاب ہو گیا۔

دور حاضر میں قانون کو اجتماعی زندگی کا نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے زندگی کی بنیادی قدریں بدلنے کے لیے کھلم کھلا استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جدید صنعتی تہذیب نے جس عالمگیر معاشی نظام کو جنم دیا ہے۔ اس سے صدیوں کے سوئے ہوئے عوام کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اب ثقافتی اور ذہنی زندگی کی حدود میں قانون کے ڈنڈے کو حتی الامکان برداشت نہیں کرتے۔ نیز عالمگیر رسل و رسائل کے برق رفتار ذرائع نے یہ بات بہت مشکل بنا دی ہے کہ کوئی جابر قوت کسی قوم یا ملک کی ثقافتی زندگی پر بہت دیر تک اپنی آہنی گرفت قائم رکھ سکے۔ دوسری عالمی جنگ میں جرمنی نے اپنے ٹینکوں اور چھپٹیلے بمباروں کی مدد سے یہ کوشش کی کہ یورپ کے باقی ملکوں پر فسطائی نظریہ زندگی ٹھونس دے۔ لیکن یہ کوشش بری طرح ناکام رہی۔ جوں ہی محکوم ملکوں کو باہر سے ذرا سہارا ملا انہوں نے فوراً سر اٹھایا اور اپنے جرمن حکمرانوں کو تہس نہس کر دیا۔ یہ اسی تلخ حقیقت کا نتیجہ ہے

اضر کی ہوشیار قومیں جب دوسری قوموں پر سیاسی یا معاشی بالادستی حاصل کرتی ہیں تو ان پر بہ جبر اپنی
زندگی اور اپنا نظریہ حیات نہیں ٹھونستیں بلکہ رفتہ رفتہ یہ کام تعلیم اور پروپیگنڈے کی مدد سے انجام دیتی ہیں
پنی دوستی اور معاشی امداد کی ایک قیمت یہ بھی وصول کرتی ہیں کہ تعلیمی اور طبی خدمت کے نام پر مدد لینے والے
ں کے دروازے اپنے پادریوں پر کھول دیتی ہیں۔ تاکہ ایک اجنبی ثقافت کے جسم میں ایک ایسا خارجی
اصل کر دیا جائے جو رفتہ رفتہ اور غیر محسوس طور پر کام کرتا رہے اور وقت پاکر جابرانہ قوانین سے بھی زیادہ حسب منشا
ج پیدا کر دے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں اسی نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

فرعون بیچارے کو ایک ایسا زمانہ نصیب ہوا تھا، جب اسے کالج کی سوجھ ہی نہ سکتی تھی۔ اس کے
س ایسٹ انڈیا کمپنی کو جب پہلی بار اپنی ہندوستانی رعایا کو تعلیم دینے کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی تو اس کے
نے بڑا سوال یہ تھا کہ یہ تعلیم کس قسم کی ہو۔ ملک میں ادنیٰ مدرسوں سے لے کر اعلیٰ ترین درس گاہوں کا پورا انتظام
سے موجود تھا۔ ان کے یہاں ذریعہ تعلیم ملکی زبانیں تھیں۔ کمپنی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ موجودہ درس گاہوں کی
پستی کرے یا انگریزی تعلیم کے لیے نئی درس گاہیں قائم کرے۔ دوسری صورت میں یہ خطرہ موجود تھا کہ محکوم
حاکموں کی قومی تاریخ اور سیاسی فلسفہ سے اثر قبول کر کے خود مختاری کا مطالبہ نہ کرنے لگ جائے۔ لیکن
کے مقابلے میں دوسرا خطرہ یہ تھا کہ ملکی درس گاہوں کا وجود ہندوستانیوں کو مستقلاً فرنگی نظریہ حیات سے
ں رکھے گا۔ سیاسی بیداری تو بہرنوع ناگزیر تھی۔ لہٰذا میکالے نے اپنے تاریخی فیصلہ کی رو سے ہندوستانیوں کے لیے
یزی تعلیم ہی کو ضروری سمجھا۔

زیادہ حالیہ زمانے میں دوسری عالمی جنگ کے بعد شکست خوردہ جرمنی اور جاپانی مثالیں ہمارے
منے ہیں۔ شکست کے بعد یہ دونوں ملک اتحادیوں کے قدموں پر تھے۔ روس تو آدھے جرمنی کو آہنی پردے
پیچھے چھپا کر قانع ہو گیا۔ مگر باقی نصف جرمنی اور پورا جاپان امریکہ کے رحم و کرم پر تھا۔ جرمنی میں فاتح اور مفتوح
رمیان مذہب اور نسل کی قدریں مشترک تھیں۔ مگر جاپان میں دونوں کے درمیان مکمل مغائرت تھی۔ امریکہ نے

جاپان پر کئی سال تک پورا فوجی قبضہ جمائے رکھا۔ لیکن اس کی زندگی اپنی زندگی سے قریب تر لانے کے لیے جبری قوانین کی بجائے تعلیم اور اشاعت مسیحیت سے کام لیا۔ جاپانی مدرسوں اور یونی ورسٹیوں کے نصاب امریکی ماہرین تعلیم کی نگرانی میں بدلے گئے۔ ولی عہد جاپان اور دوسرے شاہی افراد کو انجیل پڑھائی گئی۔ جنرل میکارتھر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جب اس نے اپنے عہدے کا چارج چھوڑا تو ٹوکیو میں مسیحی یونی ورسٹی قائم ہو چکی تھی۔

اس ساری بحث سے مراد یہ بتانا ہے کہ تعلیم کے مقاصد میں سے اکثر قانون کی وساطت سے بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ان کا حصول بظاہر جلد تر اور زیادہ نظر فریب معلوم ہوتا ہے۔ مگر ان نتائج پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر قانون کی گرفت لمبی مدت تک جاری نہ رہے تو غالب امکان یہ ہے کہ یہ نتائج جلد مٹ جائیں گے اس کے مقابلے میں تعلیم کے نتائج بظاہر دھیمی رفتار سے آتے دکھائی دیتے ہیں، مگر وہ بہت پائدار ثابت ہوتے ہیں تعلیم کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسی خاموش اور ایسے پُراسرار طریقوں سے کام کرتی ہے کہ کسی مخالفت کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ یہ ان نفسیاتی حقائق کا نتیجہ ہے کہ عصر جدید میں تعلیم اور پروپیگنڈے کو قانون سے زیادہ طاقت ور ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔

ثانوی تعلیم کے مقاصد

تعلیم کی اس غیر معمولی اہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ثانوی تعلیم کے مقاصد طے کرنا کس قدر ضروری ہے۔ بے مقصدیت اس تعلیم کی ساری تاثیر کو خاک میں ملا سکتی ہے۔ تعلیم کی بے مقصدیت کا ایک صاف مطلب یہ ہے کہ حکومت کے سامنے کوئی بنیادی مقصد موجود نہیں۔ ہر ملک کی حکومت کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ اپنے معاشرے کی بقا کا انتظام کرے۔ حکومت جس قسم کے معاشرے کو باقی رکھنا چاہے گی اس کا ایک صاف نقشہ مدرسوں میں دی جانے والی تعلیم میں دیکھا جا سکے گا۔

ظاہر ہے کہ ثانوی تعلیم کے مقاصد کا مدار اس بات پر ہو گا کہ کسی ملک کی حکومت کس قسم کے معاشرے کو پسند سمجھتی ہے۔ کیا وہ ایک جمہوری معاشرے کو جنم دینا اور برقرار رکھنا چاہتی ہے یا تحکم پسند معاشرے کی شیدائی ہے۔ وہ ایسا معاشرہ چاہتی ہے جو معاشی طور پر مضبوط اور خود کفیل ہو یا ایک ایسا معاشرہ جو دوسروں کے طفیل زندہ رہنے پر مجبور ہو؟ چوں کہ پاکستان ایک اسلامی جمہوریت ہونے کا دعویدار ہے۔ اس لیے اس کے ثانوی مدرسوں کے پیشِ

ایسے مقاصد ہونے چاہئیں جو اسلامی اور جمہوری طرز زندگی کو ترقی دینے والے ہوں۔ امریکی ایجوکیشن پالیسی کمیشن نے بڑی سوچ بچار کے بعد ثانوی تعلیم کے مندرجہ ذیل سات مقاصد بیان کیے تھے۔

(۱) **صحت** ۔ ہر زمانے کے ماہرین تعلیم نے جسمانی صحت کو تعلیم کی اہم ذمہ داری قرار دیا ہے۔ یونانیوں کا قول تھا کہ ایک تندرست ذہن ایک تندرست جسم کے اندر ہی موجود رہ سکتا ہے۔ تعلیم کے اسلامی تصور میں جسمانی صحت پر بڑا زور دیا گیا ہے اور اسے اللہ کا ایک ایسا فضل قرار دیا گیا ہے جو ہر مسلمان کا حصہ ہونا چاہیے۔ قرآن نے طالوت کو بادشاہی دیے جانے کی دو وجوہ بیان کی ہیں :۔ (۱) علم (۲) جسم ۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں والدین کو یہ تاکید کی ہے کہ بچوں کو تعلیم دیں وہاں یہ وضاحت بھی فرمائی ہے کہ اس تعلیم کے اجزا کیا ہوں چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ والدین پر فرض ہے کہ اپنی اولاد کو تیرنا اور تیر چلانا سکھائیں۔ تیرنے کی مہارت آج بھی ایسی ہی ضروری ہے جیسی اسلام کے دور اول میں، مگر تیر اندازی کی بجائے آج بندوق چلانے کی مہارت تعلیم کا ضروری جزو سمجھی جائے گی۔ غرض ثانوی تعلیم کا جو نصاب جسمانی صحت کی ترقی کو پوری توجہ نہیں دیتا وہ کسی اسلامی جمہوریہ کی ملکی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا۔

(۲) **بنیادی مہارتوں میں دسترس** ۔ ہر زمانے میں موثر زندگی گزارنے کے لیے بعض مہارتیں بنیادی درجہ رکھتی ہیں۔ اچھی تقریر اور اچھی تحریر کی مہارت ہر زمانے میں قیمتی خیال کی گئی ہے۔ قرآن حکیم میں حضرت داؤد علیہ السلام پر جو خدائی احسان جتلائے گئے ہیں ان میں سے ایک ان کی سحر کار خطابت بھی ہے۔ اسی طرح ہادی کامل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان صحابیوں کو نظر خاص سے نوازا جو مختلف بنیادی مہارتوں میں غیر معمولی کمال رکھتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اسد اللہ اور حضرت خالد بن ولید کو سیف اللہ کے لقب سے نوازا گیا۔ یہ اس زمانے کا حال ہے جب بازو کی قوت اور جانوروں کی طاقت ہی تمام کاروبار کی اساس تھی۔ آج یقینی طور پر ان لوگوں کو ملی اعزاز کا حق دار سمجھا جائے گا جو مشینوں کے استعمال اور ان کی ایجاد و اختراع میں دوسروں پر بازی لے جائیں۔ جو تعلیم ایسا نہیں کرتی وہ اسلامی نقطہ نگاہ سے صریحاً ادھوری تعلیم ہے

(۳) **گھر والوں سے خوش معاملگی** ۔ ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین بار پوچھا کہ دین کیا ہے آپ نے جواب دیا "اخلاق"۔ اس مقولہ کے مطابق کہ بخشش کا آغاز گھر سے ہونا چاہیے

احادیث میں اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔ ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ۔ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے اور میں تم سب میں اپنے گھر والوں کے ساتھ زیادہ اچھا ہوں" ثانوی تعلیم پر یہ فرض شدت کے ساتھ عائد ہونا چاہیے کہ وہ نوجوان طلبہ اور طالبات کو گھر والوں کے ساتھ خوش معاملگی کی مؤثر تربیت دیں۔ یہ تربیت ایک ایسے زمانے میں اور زیادہ ضروری ہو جاتی ہے جب مغربی مؤثرات کا سیلاب روایتی خاندانی بندھنوں کو کمزور کر رہا ہو۔

(۴) پیشہ:۔ "الکاسبُ حبیب اللہ" (پیشہ ور آدمی اللہ کا دوست ہے) اسلامی ثقافت کی وہ شاندار روایت ہے جس پر عمل کرنا اورنگ زیب جیسے بلند مرتبہ شہنشاہ نے بھی اپنے لیے باعث سعادت سمجھا۔ تاریخ کا یہ ایک افسوسناک المیہ ہے کہ جو چیز کل تک ہمارے اسلاف کے لیے باعث افتخار تھی آج مغربی تعلیم کے زیر اثر وہ ہمارے نوجوانوں کے لیے باعث عار بن کر رہ گئی۔ اس پر دوہرا المیہ یہ ہے کہ خود مغرب میں ہاتھ سے کام کرنے کو باعث عزت خیال کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس بدعت کی ابتدا انگریزی مدرسوں سے بہت پہلے ہمارے نام نہاد دینی مدرسوں میں ہو چکی تھی، یہ وہ مدرسے تھے جہاں سے فارغ ہونیوالے لوگ ہر جمعہ کے روز قوم میں یہ خدائی پیغام نشر کرتے تھے:۔ "جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں بکھر جاؤ اور اللہ کا فضل (کام کاج کر کے روزی) تلاش کرو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم نجات پاؤ"

پیشہ کی تیاری کے سلسلے میں ہماری ثانوی تعلیم نے جو مجرمانہ کوتاہی برتی ہے وہ ہماری تعلیم کی غالباً سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ جب تک یہ صورت حال قائم ہے اس وقت تک اسلامی جمہوریہ پاکستان کی قومی تعمیر کا خواب پورا نہیں ہو سکے گا۔ بے کاری اور معاشی بدحالی نے قوم کو ذہنی اور روحانی طور پر نیم مفلوج کر رکھا ہے۔ قومی صحت کی بحالی کے لیے اس پرانے مرض کا علاج پہلی شرط ہے۔

(۵) شہریت:۔ شہریت کے صحت مند شعور سے مراد یہ ہے کہ انسان اجتماعی زندگی کے ہر درجے پر اپنے حقوق اور فرائض کو اچھی طرح پہچانتا ہو۔ وہ قومی امور میں سوجھ بوجھ اور ذمہ داری سے کام لینا جانتا ہو۔ اپنے اندر یہ صفات پیدا کرنے کے لیے اسے اپنی تنگ خود غرضیوں سے بلند ہو کر وسیع تر وفاداریاں پیدا کرنی چاہئیں۔ قرآن اپنے پیروؤں کو تنگ ذاتی اغراض سے جس حد تک بلند دیکھنا چاہتا ہے اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے: "جو قوم ا

اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہے، تم دیکھو گے کہ اسے ایسے لوگوں کے ساتھ محبت نہیں جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ جنگ کرتے ہوں۔ خواہ یہ لوگ۔ ان کے اپنے باپ، بیٹے، بھائی یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔

اللہ اللہ ذاتی اغراض سے اونچا ہونے اور وفاداریوں میں موزوں تقدیم و تاخیر قائم کرنے کا کس قدر بلند اور پاکیزہ تصور ہے! یہ محض کوئی دلکش تصور نہیں۔ جنگ بدر نے ان الفاظ کی وہ زندہ جاوید عملی شرح پیش کی تھی جو دنیا کی تاریخ کے سنہری بابوں میں سے ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے ایک صاحبزادے جو اس جنگ تک ایمان نہیں لائے تھے، دولت اسلام سے مالا مال ہونے کے بعد ایک روز باپ سے کہنے لگے۔ ابا جان۔ آپ بدر کے دن کئی بار میری تلوار تلے آئے مگر ہر بار خونی رشتے نے میرا ہاتھ روک لیا۔ اس پر اسلام کے خلیفہ اول نے پُرعزم آواز میں کہا: خدا کی قسم! اگر اس روز تو ایک بار بھی میری تلوار تلے آجاتا تو، تو جان سلامت نہ لے جاتا۔

اسلام کا یہ سنہری سبق آج غیروں کی میراث ہے۔ آنجہانی رامزے میکڈانلڈ جن دنوں برطانیہ کے وزیراعظم تھے ان سے ایک اخباری نمائندے نے پوچھا کہ آپ اپنے بیٹے میلکم کو وزارت میں کیوں نہیں لے لیتے؟ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ میرا بیٹا اس وقت تک انتظار کر سکتا ہے جب میں اس کی تقرری کا ذمہ دار نہ ہوں گا"۔ سر ونسٹن چرچل نے برطانوی قوم کی کشتی کو تاریخ کے مہیب ترین طوفان میں سے بچا کر کنارے لگایا۔ لیکن جنگ جیت لینے کے فوراً بعد قوم نے قیادت کی باگ ڈور اس کے ہاتھوں سے چھین کر اٹیلے کو سونپ دی۔ یہ ہے وہ بے لاگ اور بے پناہ شہری شعور جس کی آج اسلامی جمہوریہ پاکستان کو سخت ضرورت ہے۔ یہ شعور پیدا کرنا ثانوی تعلیم کی اہم ذمہ داریوں میں سے ہے۔

(۶) **اوقات فراغت کا صحت مند استعمال:**- پہلے زمانوں میں کسب معاش کے دھندے اتنے محنت طلب اور طویل ہوتے تھے کہ بالغوں کو تفریح طبع کے مواقع تقریباً میسر ہی نہ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جاہلیت کے دور میں میلوں ٹھیلوں کی بھرمار دیکھتے ہیں۔ ان دنوں میں جو سال میں چند بار آتے تھے، لوگ چند گھنٹوں کے لیے پیٹ کے دھندوں کو بھول بھال پورے طور پر رنگ رلیوں میں کھو جاتے تھے اور بعض اوقات بدمستیوں اور خرافات کے وہ مظاہر کرتے تھے جو انسانیت کے لیے کسی طرح قابل فخر نہ ہوتے تھے۔ اسلام نے ان تمام خرافات کو یک قلم ختم کر دیا۔ اس کے

مقررکردہ سالانہ تہواروں پر ہنگاموں اور طوفانِ آرائیوں کی بجائے انسانوں کی گردنیں خالقِ حقیقی کے حضور میں جھکتی ہیں۔ اسی طرح روزانہ کام کاج سے فراغت کے مختصر اوقات میں بھی تھکے ہوئے انسانی اعصاب کا تناؤ کم کرنے کے لیے یہی نسخہ تجویز کیا گیا ہے۔ ہر محنت کش بالغ پر یہ فرض ہے کہ علی الصبح بارگاہِ ایزدی میں حاضری دینے کے بعد روزانہ دھندے کی طرف متوجہ ہو۔ دوپہر کے وقت جب کھانے کا وقفہ آئے اور کام تھوڑی دیر کے لیے بند کیا جائے تو سورج کے ڈھلتے ہی دوسری بار خدا کے حضور میں حاضری دی جائے۔ سورج ڈوبنے سے تھوڑی دیر پہلے جب دن کا کام ختم ہو جائے یا ختم ہونے کے قریب ہو تو وہی عمل تیسری بار دہرایا جائے۔ سورج ڈوبنے کے ساتھ ہی جب دن کے ہر طرح کے دھندے ختم ہو جائیں تو دن کی چوتھی نماز ادا کی جائے اور رات کو سونے سے پہلے پانچویں بار پھر اپنے رب اور خالق کے ساتھ جی کھول کر بات چیت کر لی جائے۔

پنجگانہ نمازوں میں معلمِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے اوقاتِ فراغت کو پُر کرنے کا وہ نسخہ تجویز فرمایا ہے جس سے بہتر نسخہ انسانی ذہن کے تصور میں نہیں آ سکتا۔ مغربی تہذیب نے سکونِ اعصاب اور تفریحِ طبع کے لیے بیسیوں نسخے ایجاد کیے ہیں مگر وہ سب کے سب اعصاب کو سکون دینے کی بجائے ان میں مزید ہیجان پیدا کرنے والے ثابت ہوئے ہیں۔ افسوس کہ ہم نے مغرب کی اندھا دھند تقلید کر کے اپنے کیمیا اثر نسخے کو چھوڑ دیا اور اس کی جگہ ان گھٹیا قسم کی تفریحات کو رواج دینے کی کوشش کی جن کی بدولت مغرب کی استحصالی تجارت تو خوب چمکی مگر خود ہمیں دنیا اور آخرت دونوں میں خسارہ ہوا۔

مشینوں کی ایجاد نے انسانی محنت کی بہت بچت کر دی ہے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر روزانہ اوقاتِ کار کی نسبت گھٹ گئے ہیں۔ اوقاتِ فراغت کی یہ فراوانی سائنس اور ٹکنالوجی کی ہر پیش قدمی کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ مغرب میں یہ مسئلہ خاصا ٹیڑھا بن چکا ہے کہ لاکھوں انسانوں کے اوقاتِ فراغت کو بامعنی طور پر کیوں کر پُر کیا جائے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما اور اسی قسم کی دوسری تفریحات بڑے بڑے محنت کاروں کی جیبیں بھرنے کے لیے تو خوب ہیں۔ لیکن عوام کو ان سے ایک سطحی خوشی اور ایک پائیدار احساسِ نامرادی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔ پہلے وقتوں میں جب ایک کاریگر لگاتار کئی گھنٹوں یا دنوں کی محنت کے بعد کوئی چیز مثلاً ایک جوتا یا ایک برتن تیار کرتا تھا تو اس کی محنت کی یہ پیداوار بذاتِ خود اس کی خودی کو بڑا سہارا دینے والی ثابت ہوتی تھی کیوں کہ اس میں

انفرادیت کا عکس موجود ہوتا تھا۔ مشینی پیداوار نے اس بات کا خاتمہ کر دیا ہے۔ کارخانے میں کام کرنے والے کاریگر کی اجرت خواہ کتنی ہی ہو مگر اس کا کام پُرمعنی نہیں۔ اسے سارا وقت محض مشین کے کسی ایک حصے کو چلتا رکھنے میں کٹنا ہے۔ وہ آخری پیداوار میں اپنی انفرادیت کا کوئی عکس نہیں دیکھتا۔ اس کی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار آنے کا کوئی موقع نہیں ملتا اس سے ایک شدید قسم کا احساس نامرادی پیدا ہوتا ہے۔

تفریحی سرگرمیوں کی غایت اعصاب کی تھکان کو دور کرنا اور روح کو بشاشت عطا کرنا ہونی چاہیے۔ جدید انبوہی تفریحات اس مقصد میں بُری طرح ناکام رہی ہیں۔

اس سے یہ کہنا مقصود نہیں کہ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم خطرناک چیزیں ہیں۔ سائنس کے ان عطیوں سے بڑی خدمت لی جا سکتی ہے۔ مگر یہ خدمت مؤثر طور پر وہی قوم لے سکتی ہے جسے اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ کا سبق یاد ہو۔ پاکستان میں ثانوی تعلیم کا ایک اہم فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ نوجوان طلبہ کو جدید انبوہی تفریحات سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ذکرِ الٰہی کی لذت سے بھی آشنا کرے تاکہ وہ اس ذہنی نامرادی سے بچے رہیں، جو خالی لہو و لعب کے پیچھے بھاگنے والوں کا ابدی حصہ ہے۔ عبادات کی روحانی لذت سے آشنا کرنے کے علاوہ طلبہ میں مطالعہ کتب کا ایسا پاکیزہ ذوق بھی پیدا کرنا چاہیے جو انہیں اس قابل بنا دے کہ علم و ادب کی معیاری کتابوں کے مطالعہ سے اپنے فکر کو ہمیشہ تر و تازہ رکھیں۔

(۳) **اخلاقی کردار:** - مغرب کی سائنسی تہذیب کی بنیاد صنعتی ترقی پر اٹھائی گئی تھی۔ صنعت و حرفت کی اس انقلاب آفرین پیش قدمی نے مغربی تہذیب کو دنیا میں ایسی بالادستی عطا کی کہ مغرب نے جلد ہی فنی کمال کو ہی انسانیت کا کمال سمجھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ فنی کمال اور خصوصی مہارت کو تعلیم کی سب سے بڑی کامیابی سمجھا گیا اب اس کج فکری کے خلاف ردِ عمل شروع ہو چکا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ہلاکت آفرین ایجادوں نے مغرب کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ یہ جہاں سوز ہتھیار مشینوں کی طرح سوچنے والے انسانوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اخلاقی کردار رکھنے والے انسانوں کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں۔

اسلامی تعلیمات میں اخلاقی کردار کو ہمیشہ اولیت دی گئی ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان رسمی تعلیم سے کچھ زیادہ بہرہ ور نہ تھے مگر ان کا اخلاقی کردار اس حد تک بلند کر دیا گیا تھا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی تہذیبیں بھی ان کے سامنے

نہ ٹھہر سکیں۔ جدید تعلیمی تناظر اب یہ ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگا ہے کہ تعلیم کو بلند تر مقاصد کے حصول کا ذریعہ بننا چاہیے اور وہ بلند تر مقاصد محض اخلاقی مقاصد ہی ہو سکتے ہیں۔ کسی چیز کا علم یا کسی شے کی مہارت انسان کو اس قابل نہیں بنا سکتی کہ اس کے اعمال بھی اچھے ہوں۔ پسندیدہ اعمال کے لیے ضروری شرط صحیح قسم کے جذباتی تعلقات کی تربیت ہے۔ جب تک جذبات کی حرارت علمی ادراک اور فنی مہارت کا ساتھ نہ دے اس وقت تک علم و فن اپنے اصل مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اسلامی تعلیمات کا سب سے بڑا کمال کردار کی اخلاقی تربیت ہوا کرتا تھا۔ یہ اسی بات کا صدقہ تھا کہ اس قوم کے افراد دنیا میں جہاں بھی نکل جاتے تھے انہیں سایہ رحمت سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہماری تعلیم اپنے اندر یہ خوبی پیدا کرے۔

۱۹۳۸ء میں نیشنل ایجوکیشن ایسوسی ایشن ریاست ہائے متحدہ کے ایجوکیشن پالیسی کمیشن نے اس ملک میں تعلیم کی مندرجہ ذیل اغراض متعین کی تھیں۔

ا۔ حصول خودی کی اغراض

(۱) ایک متجسس ذہن: تعلیم یافتہ آدمی کو سیکھنے کی ہمیشہ پیاس رہتی ہے۔

(۲) قوت بیان:۔ تعلیم یافتہ انسان اپنی مادری زبان میں مؤثر طور پر بات چیت کر سکتا ہے۔

(۳) قرأت:۔ پڑھا لکھا انسان اپنی مادری زبان کو مؤثر طور پر پڑھ سکتا ہے۔

(۴) تحریر:۔ پڑھا لکھا آدمی اپنے حساب کتاب کی ضرورتیں خود پوری کر سکتا ہے۔

(۵) سماعت اور بصارت:۔ پڑھا لکھا آدمی بات کو غور سے سننے اور مشاہدہ کرنے میں خوب ماہر ہوتا ہے

(۶) حفظان صحت کا علم:۔ پڑھا لکھا آدمی تندرستی اور بیماری کے متعلق بنیادی حقائق کو سمجھتا ہے۔

(۷) صحت بخش عادات:۔ پڑھا لکھا آدمی اپنی اور اپنے لواحقین کی صحت کو صحت بخش عادات سے محفوظ رکھتا ہے۔

(۸) صحت عامہ:۔ پڑھا لکھا آدمی صحت عامہ کو ترقی دینے کے لیے کام کرتا ہے۔

(۹) تفریح:۔ پڑھا لکھا آدمی طرح طرح کی کھیلوں اور تفریحات میں حصہ بھی لیتا ہے اور ان کا تماشائی بھی ہوتا ہے۔

(۱۰) ذہنی دلچسپیاں :- فارغ اوقات گزارنے کے لیے پڑھے لکھے آدمی کے پاس ذہنی ذرائع موجود ہوتے ہیں۔

(۱۱) جمالیاتی دلچسپیاں :- پڑھا لکھا آدمی خوبصورت چیزوں کے حسن سے لذت اندوز ہوتا ہے۔

(۱۲) پڑھا لکھا آدمی اپنی زندگی کی باگ ڈور ذمہ داری کے ساتھ سنبھالے رہتا ہے۔

(ب) انسانی مراسم کی اغراض

۱) انسانیت کا احترام :- پڑھا لکھا آدمی انسانی مراسم کو پہلا مقام دیتا ہے۔

۲) دوستیاں :- پڑھا لکھا آدمی ایک پُربہار اور رنگارنگ مجلسی زندگی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

۳) تعاون :- پڑھا لکھا آدمی دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنا جانتا اور منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔

۴) مروت :- پڑھا لکھا آدمی مجلسی آداب کا لحاظ رکھتا ہے۔

۵) گھر کی قدر و قیمت :- پڑھا لکھا آدمی کنبے کو معاشرتی زندگی کا ایک ادارہ سمجھ کر اسے قیمتی خیال کرتا ہے۔

۶) گھر کی بقا :- پڑھا لکھا آدمی گھریلو زندگی کی مثالی اغراض کو زندہ رکھتا ہے۔

۷) خانہ داری :- پڑھا لکھا آدمی امور خانہ داری میں ماہر ہوتا ہے۔

۸) گھر میں جمہوریت :- پڑھا لکھا آدمی گھر میں جمہوری مراسم قائم رکھتا ہے۔

ج) معاشی قوت کی اغراض

کام :- پڑھا لکھا آدمی اچھی کاریگری سے اطمینان حاصل کرنا جانتا ہے۔

پیشہ ورانہ معلومات :- پڑھا لکھا آدمی مختلف پیشوں کی ضروری شرائط اور ان کے مواقع سے متعلق معلومات رکھتا ہے۔

پیشے کا انتخاب :- پڑھا لکھا آدمی اپنے پیشے کا انتخاب خود کرتا ہے۔

پیشہ ورانہ قابلیت :- پڑھا لکھا آدمی اپنے پسندکردہ پیشے میں کامیاب ثابت ہوتا ہے۔

پیشہ ورانہ ہم آہنگی :- پڑھا لکھا آدمی اپنی پیشہ ورانہ قابلیت کو نہ صرف برقرار رکھتا ہے بلکہ اسے ترقی دیتا رہتا ہے۔

پیشہ ورانہ استحسان :- پڑھا لکھا آدمی اپنے کام کی معاشرتی قدر و قیمت کا اندازہ رکھتا ہے۔

ذاتی معاشیات :- پڑھا لکھا آدمی اپنی زندگی کی معاشیات کا منصوبہ خود تیار کرتا ہے۔

(۸) صارفانہ رائے :۔ پڑھا لکھا صارف اپنے اخراجات کی رہنمائی کے لیے معیار قائم کرتا ہے۔

(۹) دانشمندانہ خریداری :۔ پڑھا لکھا صارف ایک باخبر ہوشیار خریدار ہوتا ہے۔

(۱۰) صارفانہ مدافعت :۔ ایک پڑھا لکھا صارف اپنے مفاد کی نگہداشت کے لیے موزوں قدم اٹھاتا ہے۔

(د) شہری ذمہ داری کی اغراض

(۱) معاشرتی انصاف :۔ پڑھا لکھا شہری انسانی حالات کی ناہمواریوں کے بارے میں حساس ہوتا ہے۔

(۲) معاشرتی سرگرمیاں۔ پڑھا لکھا شہری غیر تسلی بخش حالات کی اصلاح کے لیے کام کرتا ہے۔

(۳) معاشرتی فہم :۔ پڑھا لکھا شہری معاشرتی تانے بانے اور معاشرتی تحریکوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۴) تنقیدی رائے :۔ پڑھا لکھا آدمی پروپیگنڈے سے بچنا جانتا ہے۔

(۵) رواداری :۔ پڑھا لکھا شہری دیانتدارانہ اختلاف رائے کا احترام کرتا ہے۔

(۶) تحفظ :۔ پڑھا لکھا شہری قومی وسائل کا بہت پاس کرتا ہے۔

(۷) سائنس کا معاشرتی استعمال :۔ پڑھے لکھے شہری کے نزدیک سائنسی ترقی کا پیمانہ یہ ہے کہ اس عوامی بہبود میں کیا حصہ لیا ہے۔

(۸) عالمی شہریت :۔ پڑھا لکھا آدمی عالمگیر بھائی چارے میں مل جل کر کام کرنے والا فرد ثابت ہوتا ہے

(۹) قانون کی پابندی :۔ پڑھا لکھا شہری معاشیات کی سوجھ بوجھ رکھتا ہے اور قانون کا احترام کرتا ہے

(۱۰) سیاسی شہریت :۔ پڑھا لکھا شہری اپنی شہری ذمہ داریوں کو قبول کرتا ہے۔

(۱۱) جمہوریت کے ساتھ لگاؤ :۔ پڑھا لکھا شہری جمہوری مقاصد کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری کا ثبوت

ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی مخصوص اغراض

تعلیم کی عام اغراض کی یہ فہرست مرتب کرنے کے علاوہ کمیشن نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لیے بعض مخصوص بھی بیان کی ہیں۔ ذیل میں ثانوی تعلیم کی اغراض درج کی جاتی ہیں۔ ان اغراض کو نوجوانوں کی ناگزیر تعلیمی ضرورت نام بھی دیا گیا ہے۔ یہ تعداد میں دس ہیں۔

(۱) تمام نوجوانوں کو اپنے اندر ایسی مہارتیں پیدا کرنے کی ضرورت ہے جن کی بازار میں قیمت پڑے۔ انہیں ا

فہم اور طرز عمل حاصل کرنے کی ضرورت ہے جو انہیں معاشی زندگی میں باشعور اور بار آور حصہ دار بنا دے۔ یہ غایت حاصل کرنے کے لیے بیشتر جوانوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ نہ صرف اپنے پیشے کے متعلق علم اور مہارت حاصل کریں بلکہ مناسب نگرانی میں کام کا عملی تجربہ بھی۔

(۲) تمام نوجوانوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ جسمانی قوت اور تندرستی کو ترقی دیں اور اسے برقرار رکھیں۔

(۳) تمام نوجوانوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک جمہوری معاشرے کے شہریوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کو سمجھیں وہ مستعد اور قابل ہوں اور مقامی آبادی اور ملک و قوم کے شہریوں کے طور پر اپنے فرائض انجام دیں۔

(۴) تمام نوجوانوں کے لیے ضروری ہے کہ اپنی ذات اور معاشرے کے لیے کنبے کی اہمیت کو سمجھیں اور ان شرائط کا فہم بھی پیدا کریں جو کامیاب خانگی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔

(۵) تمام نوجوانوں کے لیے ضروری ہے کہ اشیاء اور خدمات کو سوجھ بوجھ کے ساتھ خریدنا اور استعمال کرنا سیکھیں اور یہ فہم پیدا کریں کہ کس قسم کے صرف سے ان کی ذات کو کیا فائدہ پہنچتا ہے اور معاشرے کے لیے صحیح نتائج کس قسم کے ہیں۔

(۶) تمام نوجوانوں کو یہ فہم پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ سائنس کے طریقہ ہائے کار کیا ہیں۔ انسانی زندگی پر سائنس کا کیا اثر ہے اور سائنس نے انسان اور کائنات کی فطرت کے متعلق کن حقائق کا انکشاف کیا ہے۔

(۷) تمام نوجوانوں کو یہ موقع ملنا چاہیے کہ علم و ادب، موسیقی اور فطرت کے حسن سے لذت اندوز ہونے کی صلاحیتوں کو ترقی دیں۔

(۸) تمام نوجوانوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ اپنے فارغ اوقات اچھی طرح استعمال کرنے کے قابل ہو جائیں۔ وہ اس کے استعمال میں ایسی دانش مندی کے ساتھ توازن پیدا کریں کہ ذاتی اطمینان اور معاشرتی بہبود پیدا کرنے والی سرگرمیاں یکساں توجہ حاصل کریں۔

(۹) تمام نوجوانوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ دوسروں کے لیے اپنے دلوں میں احترام پیدا کریں۔ اخلاقی اقدار اور اصولوں کے بارے میں بصیرت پیدا کریں اور دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنے اور کام کرنے کے قابل ہو جائیں۔

(۱۰) تمام نوجوانوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ معقولیت کے ساتھ سوچنے، اپنے خیالات کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنے اور سوجھ بوجھ کے ساتھ پڑھنے اور بات سننے کی قابلیت پیدا کریں۔

تعلیمی مقاصد کی تعیین کا سائنسی طریق

ثانوی تعلیم کے جو مقاصد اوپر بیان کیے گئے ہیں ان میں سے بیشتر ہمارے لیے بھی بالکل ایسے ہی حسب حال ہیں جیسے کسی اور ملک کے لیے۔ یہ مقاصد فلسفیانہ نظریوں کی پیداوار نہیں بلکہ مطالعہ و تجزیہ کے سائنسی طریقے کا نتیجہ ہیں۔ تعلیم کے کسی درجے پر مقاصد و اغراض کی تعیین مندرجہ ذیل اقدام کے بعد جاتی ہے۔

(۱) طلبہ کی دل چسپیوں، سرگرمیوں، مہارتوں اور کمزوریوں کا تجزیہ۔

(۲) بالغوں کی دل چسپیوں، سرگرمیوں اور کمزوریوں کا تجزیہ۔

(۳) مختلف پیشوں میں کام آنے والی مہارتوں کا تجزیہ۔

(۴) اہل الرائے لوگوں کے خیالات کا مطالعہ۔

(۵) نصابی سواد کا تجزیہ۔

یہ مقاصد طے ہو جانے کے بعد اگلا قدم یہ ہوتا ہے کہ تعلیم کے عام مقاصد کو نصاب کے مخصوص مضامین میں کیوں کر منتقل کیا جائے۔ جو براہ راست مقاصد تعلیم کے عملی برگ و بار کا درجہ رکھتے ہوں۔

تدریس عربی (مفید ہدایات)

مختار فاروقی

مسلسل نمبر ۲

عربی کی اعلیٰ جماعتوں کے لیے پڑھنے کے اسباق میں مندرجہ ذیل باتیں ہونی چاہئیں:-

(۱) چوں کہ طلبہ کے پاس خاصہ سرمایۂ الفاظ ہو گیا ہے۔ اور وہ لغات سے کام لے سکتے ہیں، اس لیے ان سے کہا جائے کہ وہ عبارت گھر پر تیار کریں اور نئے اور مشکل الفاظ کے معنی خود ہی معلوم کریں۔

چوں کہ انہیں زبان کی سادہ اور عام ساختیں آ گئی ہیں، اس لیے استاد زیادہ تر توجہ مضمون کی تفصیل و توضیح کرنے معنوں کی باریکیاں ظاہر کرنے اور غیر معمولی ساختوں اور صنعتوں کے سمجھانے پر مبذول کرے۔

(۲) ترجمہ کی بجائے تحویل (ادلا بدلی) کرائی جائے۔ یوں کہیے کہ عربی جملے کی ترکیب اور ترتیب کلمات میں تبدیلی کر کے جملے کا اردو یا متبادل عام فہم مقامی زبان میں ترجمہ کرائیے یا الفاظ کو گھٹا بڑھا کر پوچھیے اور جانچ کرتے رہیے کہ آپ کا شوقین خوشہ چین کہاں تک آپ کی پیروی کر رہا ہے اور مفہوم سمجھ رہا ہے۔ مثال کے طور پر هٰذَا رَجُلٌ (یہ ایک آدمی ہے) هٰذَا الرَّجُلُ (یہ آدمی) کے متعلق بتایئے کہ پہلا مرکب مبتدا اور خبر سے مل کر جملہ اسمیہ ہوا اور دوسرا مرکب ناقص اسم اشارہ اور مشار الیہ سے مل کر بنا ہے۔ کوشش کریں کہ طلبہ یہ فرق خود معلوم کر لیں۔ آپ مرد

(۴) ادنیٰ جماعتوں کی طرح پڑھنے کی عبارت کو زبانی انشاپردازی کی بہت سی مشقوں کی بنیاد مقرر کیا جائے۔ لیکن یہاں یہ مشقیں زیادہ مشکل طرز کی ہوں، مثلاً ایسے جملے بنوانا جن سے ان استعاروں کا استعمال ظاہر ہو جو درسی کتاب میں آئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

سبق کے مدارج اور ہدایات

استاد اور طلبہ کی تیاری:۔ (۱) سبق دینے سے پہلے استاد عربی کو۔ عبارت کا احتیاط سے مطالعہ۔ اسے مناسب طوالت کے حصوں میں تقسیم۔ تلفظ کی مشکلات۔ اور اپنے طرز تشریح کا فیصلہ کر لینا چاہیے

(۲) طلبہ سے کہنا چاہیے کہ گھر پر عبارت کو تیار کریں۔ نئے الفاظ اور غیر معمولی اجزائے جملہ کی فہرست بنا لیں۔ اور لغات سے

نئے الفاظ کے معانی معلوم کرلیں۔ عربی لغات دیکھنے کے لیے کم از کم ابواب پر مختصر لیکن مفید عبور حاصل ہونا ضروری ہے (کسی آئندہ اشاعت میں عربی لغات دیکھنے کا طریقہ لکھا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز) طلبہ کو عبارت سمجھنے میں مدد دینے کے لیے پہلا حصہ پڑھو، اور پھر اس کے معنی نکلوانے کی غرض سے سوالات کرو۔

عبارت کی تشریح :- (۱) یاد رکھو کہ لفظ کے معنی اکثر ربط کلام پر منحصر ہوتے ہیں۔ لہٰذا الگ الگ الفاظ کی بجائے اجزائے جملہ لو۔

(۲) خود کوئی تشریح کرنے سے پہلے بذریعہ سوالات معلوم کرو کہ تشریح کی ضرورت بھی ہے، جن اجزائے جملہ کو طلبہ پہلے سے جانتے ہیں ان کے سمجھانے میں وقت ضائع نہ کرو۔

(۳) جن معنی کا سیاق عبارت متقضی ہے، وہی سکھاؤ۔ اور بس تمہارا منشا یہ ہے کہ طلبہ عبارت کا مطلب سمجھ سکیں اور اسے ادراک کے ساتھ پڑھ سکیں۔ ادعیہ نہیں ہے کہ لفظ کے جتنے معنی ہوں وہ سب کے سب سکھا دیے جائیں۔

(۴) ہر جزو جملہ کے معنی صرف بتا دینے پر قناعت نہ کرو۔ اسے توضعت مرکبہ یا لفظی کے ذریعہ سے خوب سمجھاؤ اور طلبہ سے اسے جملوں میں استعمال کراؤ۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ آپ کی تشریح سمجھ گئے ہیں۔

(۵) کنایوں اور اشاروں کی تشریح بذریعہ بیانات بلاواسطہ کرو، یعنی انہیں خود بتاؤ۔

(۶) تمہاری تشریحات ضروری اور برمحل ہی نہ ہوں، بلکہ مختصر بھی ہوں۔

پڑھنے کی مشقیں :- (۱) مدرس کو ایک دفعہ میں کتاب کی تقریباً چار سطریں پڑھنی چاہئیں۔ مناسب تجزیہ عبارت صحیح تقسیم تاکید اور قدرتی تغیر لحن (موزوں آواز کا زیر و بم) میں بہت زیادہ احتیاط برتنی چاہیے۔ اپنی کتاب میں اجزائے جملہ اور الفاظ تاکیدی پر نشان کر لینے چاہئیں۔ تاکہ ہمیشہ ایک جیسا اور عمدہ نمونہ دے سکے۔

تاکید کے تین بڑے قاعدے ہمیشہ یاد رکھنے چاہئیں۔

(۱) جملے کے اجزائے اعظم پر زور دینا چاہیے۔

(۲) غیر معمولی مقام کے الفاظ پر زور دینا چاہیے۔

(۳) متضاد خیالات ظاہر کرنے والے الفاظ پر زور دینا چاہیے۔

طلبا کی تقلید :- طلبہ کو نمبر وار پڑھنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ بلکہ کبھی کسی سے پڑھوانا چاہیے اور کبھی

لسی سے۔ پہلے اچھے قاری (لڑکے) سے پڑھوانا چاہیے اور پھر کمزور سے لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ دینی مکاتب میں منتہی طالب علم گھر پر تیاری کرکے آتے ہیں۔ بلا اعراب و حرکات عبارتوں کو عام طور پر صحیح پڑھ جاتے ہیں، یہ سب کچھ ان کے محنتی ہونے اور بڑھے ہوئے تعلیمی شغف کی دلیل ہے۔

تصحیح اغلاط :۔ اس غرض سے کہ طلبہ سبق میں برابر متوجہ ہوں۔ قاری کی غلطیاں ان طلبہ سے پوچھنی چاہئیں جو پڑھ نہیں رہے ہیں، مگر ان ماہینی (آپس کی) اصلاحوں سے تربیت ذہنی کا فائدہ عموماً بہت کم ہوتا ہے۔ کیونکہ طلبہ اکثر کتابی الفاظ کے حذف یا تبادلے کی غلطیاں بتایا کرتے ہیں اور لب ولہجہ اور تلفظ کی غلطیاں ان کی نظر سے رہ جاتی ہیں۔ یہ اصلی غلطیاں استاد ہی کو بتانی اور درست کرنی پڑتی ہیں۔ اس کام کے بخوبی سرانجام دینے کے لیے استاد کو پہلے ہی سے اغلب غلطیاں احتیاط کے ساتھ نوٹ کرلینی چاہئیں اور سوچ لینا چاہیے کہ ہر ایک غلطی کا کس طرح فیصلہ کرنا چاہیے۔ تلفظ کے نقص مقابلہ و مشابہت سے درست کرنے چاہئیں۔ مخرج کے نقص آلاتِ آواز کے مقام پر توجہ دینے سے اور لب ولہجہ کے نقص عبارت کے معنی سمجھانے اور اسے پھر بطور نمونہ پڑھنے سے۔

مشقیں:۔ ان کا یہ مدعا ہے کہ طلبہ عبارت کی گرامری (قواعد صرف ونحو کی) ساختوں سے اچھی طرح واقف ہو جائیں مثلاً فارسی و عربی میں صِلاتِ افعال۔ ضمیر متصل۔ ترکیب اضافی و توصیفی۔ کلمات متقابلہ و مترادفہ۔ ترتیب ارکان جملہ مسند و مسند الیہ۔ مبتدا و خبر و متعلق خبر۔ جملہ اسمیہ۔ جملہ فعلیہ (فعل۔ فاعل۔ مفعول) فعل مجہول۔ نائب فعل۔ حروف مشبہ بالفعل اور ان کا عمل۔ افعال ناقصہ اور ان کا عمل۔ حروف شمسی و قمری کی تمیز۔ اسم نکرہ۔ معرف باللام۔ کلمات استفہام۔ اسمائے موصولہ افعال ماضی۔ مضارع و امر اور ان کے اقسام کی گردانیں وغیرہ خاص دھیان کے لائق ہیں، یہ ترکیبیں بتانی چاہئیں۔ تختہ سیاہ پر لکھ کر سمجھانی چاہئیں اور جملوں میں استعمال کرکے ان کی خوب توضیح کرنی چاہیے۔

اعادہ:۔ عبارتِ سبق کی بڑی بڑی باتیں پوچھیے۔ تشریح کردہ اجزائے جملہ کے معنی پر سوال کیجیے۔ طلبہ سے جملے بنوائیے جن سے نئے الفاظ۔ قواعد کی ساختوں وغیرہ کا استعمال ظاہر ہو۔

قواعد عربی سکھانے کے لیے ہدایات

(۱) جب عربی قواعد سکھانے جائیں تو ایسا نہ ہو کہ شاگردوں کے ہاتھ میں کتابیں دیدیں اور ان سے کہہ دیں کہ تعریفیں جنہیں وہ ابھی سمجھے بھی نہیں ہیں طوطے کی طرح رٹ لیں۔ اگرچہ مشہور تو یوں ہے ؎

صرفیاں را مغز بایہ چوں سگاں ❖ نحویاں را مغز بایہ چوں شہاں

یعنی صرف کی ابتدائی اور بنیادی گردانیں یاد کرنے کے بغیر چارہ کار نہیں۔ لیکن تدریج تین تین چار چار صیغے یاد کرنے
سے نہ تو دماغ پر بوجھ پڑتا ہے اور نہ ہی متنفر طبیعتیں اس سے مانوس ہوئے بغیر رہیں گی۔ ایسا صرف۔ مکمل گردان
یک وقت سکھانے سے ہوگا۔ باقی رہا یہ کہ اگر آپ عربی کا شوق پیدا کر چکے ہیں۔ اور طلبہ امتحان کی مصیبت کاٹنے
کے لیے نہیں بلکہ دل سے مانوس ہو گئے ہیں تو پھر آپ کی کامیابی واضح ہے۔ نحو میں آگے ہی جملے کی ترکیب و تجزیہ سے
بحث ہوتی ہے اور اس میں حقیقتاً شاہانہ غور و فکر ہی درکار ہے۔ نحو اخفش کی طرح رٹ لینا اور قواعد کا اجرا نہ کر سکنا
یہی سب سے بڑی خامی ہے جو ہمارے دینی مدارس اور نجی مکاتب میں پائی جاتی ہے ورنہ ان کی سعی قابل داد و فوز
جب تک آپ کے متعلمین عربی کے معمولی قاعدوں اور ساختوں پر خوب عادی نہ ہو جائیں ہر ایک تعریف اور ا
بغیر کتاب کے زبانی سکھائیے۔

(۲) ہر ایک قاعدہ بذریعہ استقرا سکھائیے۔ کچھ جملے جو آپ کے متعلمین زبانی یا درسی کتاب میں سیکھ چکے ہیں تختہ
لکھیے اور ان کا مقابلہ کر کے قاعدہ دریافت کرنے میں طلبہ کی رہنمائی کیجیے۔

(۳) کام کی احتیاط کے ساتھ تدریج کریں۔ شروع سال میں ہی پہلے دو سال کے اسباق کی فہرست تیار کریں۔ اول
آسان باتیں لیں۔ مثلاً وحدت و جمع۔ تذکیر و تانیث۔ ترکیب اضافی و توصیفی۔ اسمائے مشتقہ۔ ضمائر مرفوع منفصل
موصولہ اشارہ قریب و بعید۔ اسم نکرہ و معرفہ وغیرہ۔ یاد رکھیں کہ آپ کے طلبہ قومی زبان کی صرف و نحو کی واقفیت
باعث صرف و نحو کسی قدر سمجھتے بھی ہیں۔

(۴) جملوں کی تحلیل پر اسباق کی بنیاد رکھیں اور تحلیل و ترکیب ساتھ ساتھ ہوتی جائے اور درسی کتاب میں پڑ
پڑھاتے ہی اس کا کبھی کبھی (اگر وقت اجازت دیتا ہو) اجرا ہو تو برا نہ ہوگا۔

(۵) قدم قدم پر عربی صرف و نحو کا مقابلہ اپنی زبان یا انگریزی زبان کی صرف و نحو سے کر کے مشابہت واضح
نکلوائیے۔ یہ صرف اس صورت میں ہوگا جب آپ نے انگریزی زبان کی قواعد پر کم از کم اس لیے عبور حاصل کیا
کہ آپ عربی زبان کی امدادی حیثیت واضح کر سکیں اور اپنے خوشہ چین کو پڑھانا چاہیں۔ کیوں کہ طلبہ ایسی حالت
طرف خاص طور پر متوجہ ہو کر رہیں گے۔ مشابہت معلوم کرنے سے رفتہ رفتہ کچھ ایسے اصول طالب علموں کو ا

نام زبانوں میں مشترک ہیں. اختلاف سے عربی کے محاورات واضح ہو جائیں گے. اور عزیز شاگردوں کی لوحِ خاطر
نقش ہو جائیں گے. الغرض دونوں ترکیبوں سے نئی واقفیت آسانی سے سمجھ آجائے گی اور فوراً یاد ہو جائے گی۔
اختلاف کی چند باتیں جو اس طرح نکلوا سکتے ہیں ذیل میں درج ہیں۔

رکب توصیفی :- مثالیں

مذکر کے صیغے		مؤنث کے صیغے	
نیک لڑکا (ایک)	طِفْلٌ صَالِحٌ	نیک لڑکی (ایک)	طِفْلَةٌ صَالِحَةٌ
نیک لڑکے (دو)	طِفْلَانِ صَالِحَانِ (تثنیہ)	نیک لڑکیاں (دو)	طفلتانِ صالحتانِ (تثنیہ)
نیک لڑکے (جمع)	اطفال صالحُوْن (جمع)	نیک لڑکیاں (جمع)	طفلاتٌ صالحَاتٌ (جمع)

ان مثالوں سے واضح ہے کہ اردو میں تذکیر و تانیث - وحدت و جمع کو ظاہر کرنے کے لیے صفت میں تبدیلی
واقع ہوتی ہے. مگر عربی میں صفت موصوف کے مطابق آتی ہے (وحدت جمع تثنیہ؛ مذکر و تانیث. تعریف و تنکیر
اعراب وغیرہ میں) نیز عربی فارسی میں موصوف صفت پر مقدم ہوتا ہے بخلاف اردو کے ۔ اور اردو کے مرکبات توصیفی
میں صفت پہلے آتی ہے ۔

ترکیب اضافی :- مثالیں

زید کی کتاب	كِتَابُ زَيْدٍ	بہنوں کے پاؤں	أَرْجُلُ الْأَخَوَاتِ
زینب کا قلم	قَلَمُ زَيْنَبَ	ماؤں کی آنکھیں	عُيُونُ الْأُمَّهَاتِ

قاعدہ :- عربی میں مضاف پہلے مضاف الیہ بعد میں، اور حرف اضافت کوئی نہیں آتا .
حرف اضافت کی جگہ کسرۂ اضافت کام دیتا ہے. اردو میں ترتیب ایسی نہیں بلکہ مرکب اضافی کے اجزا
مضاف الیہ (۱) حرف اضافت (۲) مضاف ہیں ۔

فعل کی مثالیں

لڑکا خط لکھتا ہے ۔	كَتَبَ زَيْدٌ كِتَابًا (زید نے خط لکھا)
لڑکی خط لکھتی ہے ۔	كَتَبَتْ كِتَابًا ـ كَتَبُوْا كِتَابًا (انھوں نے خط لکھا)

لڑکیاں خط لکھتی ہیں ۔

كَتَبَتِ النِّسَاءُ كِتَابًا ۔ عورتوں نے خط لکھا۔

قاعدہ ۔ فعل تذکیر و تانیث وحدت و جمع اور صیغے میں اپنے فاعل سے مطابقت رکھتا ہے ۔

قاعدہ :۔ اگر فعل اسم ظاہر ہو۔ اسم ضمیر نہ ہو تو فعل فاعل کے واحد تثنیہ ۔ جمع ہونے کی تمام صورتوں میں واحد کا صیغہ آتا ہے لیکن جب فاعل اسم ضمیر ہو تو فعل اس کے مطابق ہوتا ہے ۔

تقابل جملہ اسمیہ

(۱) خدا ایک ہے — اَللّٰهُ وَاحِدٌ

(۲) علم دو ہیں ۔ دین کا علم اور اجسام کا علم ۔ — اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ عِلْمُ الْأَدْيَانِ وَعِلْمُ الْأَبْدَانِ

(۳) دو آدمی کرم کرنے والے ہیں — اَلرَّجُلَانِ كَرِيمَانِ ۔

(۴) آدمی عورتوں کے سرپرست ہیں — اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ ۔

(۵) زینب نیک ہے ۔ — زَيْنَبُ صَالِحَةٌ

(۶) خالدہ اور نجمہ دو نیک لڑکیاں ہیں — خَالِدَةُ وَنَجْمَةُ بِنْتَانِ صَالِحَتَانِ ۔

(۷) عورتیں شیطان کے پھندے ہیں ۔ — اَلنِّسَاءُ حَبَائِلُ الشَّيْطَانِ ۔

قواعد :۔ اردو میں جملہ اسمیہ کلمہ ربط یا فعل ناقص مبتدا، اور خبر اور متعلقات خبر سے مل کر بنتا ہے، وحدت و جمع تذکیر و تانیث میں خبر مبتدا کے مطابق آتی ہو

قواعد :۔ جملہ اسمیہ میں مبتدا و خبر وحدت و جمع و تثنیہ تانیث وغیرہ میں ایک دوسرے کے مطابق ہوتے ہیں نیز ہمیشہ معرفہ ہوتا ہے ۔

تقابل جملہ فعلیہ

(۱) نعیم نے ٹھنڈا پانی پیا — شَرِبَ النَّعِيمُ مَاءً بَارِدًا ۔

(۲) ہم صبح و شام خدا کی عبادت کرتے ہیں ۔ — نَعْبُدُ اللّٰهَ صَبَاحًا وَمَسَاءً ۔

(۳) خالد نے زید کو پیٹا — ضَرَبَ خَالِدٌ زَيْدًا ۔

(۴) قاضی چھری کے بغیر ہی ذبح ہوگیا ۔ — ذُبِحَ الْقَاضِيْ بِغَيْرِ سِكِّيْنٍ ۔

نتائج (۱) فعل متعدی ہر حالت میں ماضی مطلق سے بنتا ہے ۔

(۱) عربی میں فاعل کی کوئی مستقل علامت نہیں ۔ البتہ آخری حرف پہ رفع (پیش) آتی ہے ۔

ناس علامت (نے) سے ظاہر کیا جاتا ہے ۔

(ا) جب جب کہ مفعول کے ساتھ علامت "کو"
ی ہو تو فعل ہمیشہ صیغہ واحد مذکر کی صورت میں
تا ہے ۔

ب) فعل مفعول کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے
بب کہ اس کے ساتھ علامت "کو" نہ ہو

(۲) مفعول کے لیے کوئی مستقل کلمہ بطور علامت استعمال نہیں ہوتا لیکن ہر ایک مفعول منصوب ہوتا ہے ۔
مفعول پانچ ہیں ۔ بہٖ ۔ لہٗ ۔ معہٗ ۔ مطلق اور فیہ

(۳) (ا) فعل مجہول کا فاعل تو ہو نہیں سکتا ۔ البتہ نائب فاعل کے آخری حرف پر بھی رفع (پیش) ہوتی ہے ۔

(ب) ماضی مجہول کا آخری سے پہلا حرف مکسور (زیر والا) اور پہلا حرف مضموم (پیش والا) ہوتا ہے ۔

(ج) مضارع مجہول میں علامتِ مضارع (ی - ا - ت - ن) مضموم اور آخری سے پہلا حرف مفتوح ہوتا ہے۔

خیال رکھیں کہ مستثنیات بتلانے سے پہلے قاعدے بخوبی آجائیں۔ شروع شروع میں اول الذکر کو ضمناً سکھائیں جب وہ پڑھنے کے سبق میں آجائیں۔ قاعدے کے ساتھ ہی مستثنیات بتانا جرم عظیم ہے۔ طلبہ اس طرح جلد ہی گھبرا جائیں گے ۔

اصطلاحات کا استعمال بہت کم کرو۔ بدرجہ غایت تقسیم در تقسیم کرتے چلے جاؤ۔ نہایت سیدھی سادھی تقسیم کافی ہوتی ہے۔ بہت سے مصنف یہ اپنا فرض منصبی سمجھ لیتے ہیں کہ ہر اصطلاح جو انہیں ملے استعمال کی جائے۔ لہٰذا ان کی تقسیم قواعد منطق کے خلاف۔ غیر علمی۔ پریشان کن اور فضول ہوتی ہے ۔

دیکھ لیں، کہ آپ تعریفیں قواعد منطق کے مطابق بنا رہے ہیں۔ الفاظ کو اشیاء سے گڈ مڈ نہ کریں۔ آپ کی بتائی ہوئی تعریفات مختصر اور عام فہم ہوں اور ان مثالوں سے قدرتی طور پر نکالی گئی ہوں، جو طلبہ کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ مطالعہ کرتے کرتے اگر کوئی سادہ اور صحیح تعریف مل جائے تو اسے بیاض میں لکھ لیجیے۔

نیا قاعدہ سکھلاتے ہی طلبہ سے حاصل کردہ علم کو مشقوں کے حل کرنے میں استعمال کرائیں۔ طلبہ اپنی کتابوں میں کسی پیرے سے قاعدے کی مثالیں جنہیں (عربی سے اپنی زبان میں یا قومی زبان سے عربی میں جملوں کا ترجمہ کریں)

جب طالب علم زبان کی ابتدائی اور عام ساختوں پر قادر ہو جائے تو پھر قواعد عربی کی کتاب اس کے ہاتھ میں

دے سکتے ہیں. مگر اسے حوالہ کی کتاب سمجھے یعنی بطور ایسی کتاب کے جس کی مدد سے طالب علم اپنی مشکلات ساخت حل کر
یاد رکھیے گا. باوجود ان تمام باتوں کے صرف و نحو کے سبق کا اصلی فائدہ ان اعمال استدلال میں سے ہے، جن کے
ذریعے سے طالب علم قاعدے تک پہنچتا ہے اور اسے استعمال کرتا ہے. قاعدے کے بولنے یا لکھنے میں بہت کم ممد کار آمد
ہیں. ان سے معیاریں طالب علم کے ہاتھ لگ جاتی ہیں. جن پر وہ اپنے جملوں کی صحت کو پرکھ سکتا ہے. لیکن زبان استعما
کرنے کا ملکہ صحیح بولنے والوں اور قلم برداشتہ لکھنے والوں کو زیادہ تر تقلید اور مشق کے ساتھ ہی حاصل ہوتا ہے. لہٰذ
اپنے تعلیم کے طریقوں پر خاص توجہ کریں. مثالیں خود منتخب کریں. مگر نتائج مقابلہ کرا کے طلبہ سے نکلوالیں. صرف اس
طریق سے اسباق صرف و نحو کا منشا پورا ہو سکتا ہے. ہر ایک سبق میں استدلال استقرائی و استخراجی دونوں کی مشق
ہونی چاہیے. استدلال استقرائی سے مراد ایسا عمل ہے کسی چیز کے چند افراد پر کوئی تجربہ کر کے اس کے کل افراد پر بھی ا
قاعدہ مقرر کرلیں اور استخراج کا یہ مطلب ہے قاعدہ مقررہ کی تحقیق کے لیے کسی چیز کے چند افراد پر تجربہ کر کے دیکھیں کہ آیا ی
صحیح ہے یا نہیں ؎

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

برطانوی استادوں کی تنخواہوں میں اضافہ

برطانوی استادوں کی قومی یونین نے تنخواہوں سے متعلق نئی تجاویز کو قبول کرلیا ہے، اس فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ ٹائمز لکھتا ہے کہ اس کی بجائے کچھ اور فیصلہ کیا جاتا تو وہ حد درجہ احمقانہ ہوتا کیونکہ استادوں کے حلقوں سے باہر ان تجاویز کو فیاضانہ خیال کیا گیا ہے۔ اگر استاد ان تجاویز کو ٹھکرا دیتے تو انہیں رائے عامہ کی تائید حاصل نہ رہتی۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ خود استادوں کے حلقوں میں ان تجاویز کے متعلق ملے جلے خیالات کا اظہار کیا گیا۔ یہ بات قدرتی تھی، جب اجرت کا معاملہ زیر بحث ہوا اور اس کے متعلق تجاویز پیش کی جائیں تو عام کسانوں کی طرح استاد بھی اس بات کا جائزہ لیتا ہے کہ نئی تجاویز اس پر کس طرح اثر انداز ہوں گی۔ اس جائزے کے وقت وہ دوسرے لوگوں کی طرح یہ بات کہنے کا مجاز ہے کہ اس کا کام سب سے زیادہ معاوضہ کا حق دار ہے۔ استاد خواہ ثانوی مدرسوں میں کام کرتے ہوں خواہ ابتدائی مدرسوں میں، خواہ وہ شہروں میں ملازم ہوں، خواہ دیہی قصبوں میں، وہ وزنی دلیلوں کے ذریعہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ان کا کام بے حد اہم ہے۔ پھر ان کی تنخواہوں اور لیکچراروں کی تنخواہوں کے درمیان کچھ نہ کچھ مناسبت ضرور ہونی چاہیے۔ استادوں کی تنخواہیں بڑھنے پر لیکچرار یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کی تنخواہیں استادوں سے بہر حال زیادہ ہونی چاہییں۔ غرض تنخواہوں کو فیصلہ کرنے والی کمیٹی کا کام بے حد پیچیدہ محنت طلب اور غیر تحسین آمد ہوا کرتا ہے۔

برن ہم کمیٹی کو یہ تجاویز مرتب کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ ان تجاویز کو مجموعی طور پر اطمینان بخش کہا جا سکتا ہے۔ تاہم ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو بنیادی پیمانہ ہائے تنخواہ کے مختلف ہونے سے پیشۂ معلمی کو وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ یہ اعتراض بنیادی طور پر غلط ہے۔ اگر معلمی کو صحیح معنوں میں ایک پیشہ کا مقام حاصل کرنا ہے تو اس میں اجرتوں کے مختلف پیمانوں کا ہونا ناگزیر ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ نئی تجاویز کے مطابق استادوں کی تنخواہیں بڑھ جانے سے بہتر قابلیت کے لوگ اس

پیشے کی طرف کھینچنے لگیں گے اور اس طرح اس کا مقام زیادہ وقیع ہو جائے گا۔

موزوں آدمیوں کی کمی

ہمارے ملک میں بیروزگاری زوروں پر ہے۔ مگر انگلستان کے آجروں کو شکایت ہے کہ انہیں موزوں قسم کے نوجوان کافی تعداد میں نہیں مل رہے ہیں۔ ملک میں یوتھ امپلائے منٹ سروس ادارہ موجود ہے جس کا فرض یہ ہے کہ تعلیم سے فراغت پانے والے نوجوانوں کو ملازمت حاصل کرنے میں مدد دے۔ والدین اور آجر اس ادارے کی افادیت کے متعلق شک ظاہر کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ملک کے سامنے مسئلہ یہ نہیں کہ نوجوانوں کے لیے روزگار تلاش کیا جائے بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مختلف کاموں کے لیے موزوں قسم کے لڑکے اور لڑکیاں فراہم ہوں۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ طلبہ اور طالبات فارغ التحصیل ہو کر یوتھ ایمپلائے منٹ سروس سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمیں فلاں کام دلوایا جائے۔ والدین کو حالات سے پوری آگاہی نہیں ہوتی اور نوجوان عموماً وقتی ترنگ کے زیر اثر ایسے فیصلے کر لیتے ہیں جن پر وہ بعد میں قائم نہیں رہ سکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پیشے کے انتخاب کے ا میں یوتھ ایمپلائے منٹ سروس نوجوانوں کی درست رہنمائی کرے۔

نگاہ کی تربیت

برطانوی کونسل برائے بصری تعلیم نے بچوں کے لیے مضمون نویسی کا ایک انعامی مقابلہ منعقد کیا ہے۔ جواب کا موضوع ہے "خوبصورت عمارتیں جو میں نے دیکھی ہیں" اس مقابلے کا مقصد یہ ہے کہ بچوں میں ایسی نگاہ کی جائے جو عمارتوں کے حسن و قبح کو جانچ سکے۔ اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے ایک برطانوی ماہر تعمیرات اپنے ایک حالیہ خطبے میں کہا ہے کہ عوام جس فہم اور دلچسپی کے ساتھ اپنے روزمرہ کے لباس کے متعلق با کرتے ہیں، اس طور پر اپنے مرکز بلدیہ کے متعلق بحث نہیں کر سکتے۔ حالانکہ بلدیہ کی عمارت ان کی زندگیوں پر گ ڈالتی ہے۔ اس صورت حال کے تدارک کے لیے مقرر نے یہ تجویز کی کہ بچوں کو ایام مدرسہ میں اپنے مدر عمارت اور اس کی ترتیب کو تنقیدی طور پر سمجھنے اور اس کا موازنہ دوسری عمارتوں کے ساتھ کرنے کے قابل

استاد اور نفسیات

علم التعلیم کے لیے نفسیات ایک بنیادی سائنس ہے۔ لہٰذا استادوں کی تربیت گاہیں اپنے نصاب

لیے اہم جگہ مخصوص کرتی ہیں۔ برطانوی تربیت گاہوں میں اب تک نفسیات کی جو کتابیں مروج رہی ہیں وہ سب کی سب سر پرسی نن کی مشہور تصنیف "تعلیم اس کے حقائق اور اولین اصول" پر مبنی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ میں تعلیمی نفسیات پر جتنی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں ان سب کی بنیاد یہی کتاب ہے۔ حالاں کہ پرسی نن کی کتاب کے بعد سے نفسیات نے بہت پیش قدمی کی ہے۔ تعلیمی نفسیات کے میدان میں تحقیق نے کئی انقلاب آفرین انکشافات کیے ہیں۔ حال ہی میں ایک برطانوی پروفیسر ای۔ اے۔ پیل نے ایک کتاب لکھ کر اس کمی کی تلافی کر دی ہے۔ اس کتاب کا نام "تعلیم کی نفسیاتی بنیادیں" ہے۔ اس کتاب کو سمجھ کر پڑھ لینے سے ہر استاد ان پیچیدہ نفسیاتی حقائق میں مستغرق ہو جاتا ہے جو تعلیم کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

مجلسی زندگی کے مراکز

انگلستان میں مجلسی زندگی کو بہتر طور پر منظم کرنے اور اسے زیادہ سے زیادہ بھرپور اور نفع رساں بنانے کے لیے "مجلسی زندگی کے مراکز" کی تحریک جاری ہے۔ ہر مقامی آبادی کے لوگ فارغ اوقات کو بہتر طور پر گزارنے کے لیے ایک مرکز تعمیر کر لیتے ہیں جہاں وہ مل کر بیٹھتے ہیں۔ تفریحی مشاغل کا اہتمام کرتے ہیں۔ تعلیم بالغاں کی ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں۔ غرض تمام وہ عملی کوششیں کرتے ہیں جو اجتماعی زندگی کی صحت اور اس کے حسن کو بڑھانے والی ہو۔ مثال کے طور پر ایک چھوٹی سی بستی میں معماروں نے اپنے فارغ اوقات میں ایک پرانی عمارت کی تجدید کر کے اسے معاشرتی مرکز کی شکل دے دی اور یہ عمارت مقامی مجلسی زندگی کی تعمیر نو کا مرکز بن گئی۔

ایک چھوٹے سے برطانوی قصبے میں ایک اٹھارہ سالہ نوجوان سے معاشرتی مرکز کا مفہوم پوچھا گیا۔ اس نے جواب دیا:۔ یہاں بہت سے لوگ جمع ہوتے ہیں وہ جو کچھ کہنا چاہیں کہتے ہیں پھر وہ چلے جاتے ہیں اور اپنے تخمینوں کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔

ان مجلسی مرکزوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے فارغ اوقات کو موزوں طور پر استعمال کرنا سیکھیں۔ پہلے وقتوں میں فارغ وقت ایک بہت ہی کم یاب شے تھی۔ پیٹ کے دھندے صبح سے شام تک سارا وقت کھا جاتے تھے کبھی کبھار کسی تہوار کے موقع پر جب ان دھندوں سے ذرا مہلت ملتی تو بے تحاشہ بے ضبطی کے عالم میں خوشیاں منائی جاتیں۔ مشینوں نے انسان کے لیے اوقات فراغت کی ریل پیل کر دی ہے۔ اس لیے موجودہ زمانے کا ایک بڑا اہم

سوال یہ ہے کہ فارغ اوقات کو صرف کرنے کی ایسی صورت کیا ہے جس سے انفرادی زندگی بھی زیادہ حسن اور بالیدگی حاصل کرے اور اجتماعی زندگی بھی۔

مجلسی مرکزوں کی تحریک کوئی ایک چوتھائی صدی سے جاری ہے۔ اول اول اس کا آغاز اس وقت ہوا جب گنجان آباد رقبوں سے لوگوں کو لے جا کر انہیں دیہی زمینوں میں آباد کیا گیا۔ ہر چند کہ یہ ماحول بڑا ہی صاف ستھرا تھا مگر یہاں مجلسی زندگی کا فقدان تھا۔ لوگ عموماً ایک دوسرے کو نہ جانتے تھے صحت مند مجلسی زندگی کی داغ بیل ڈالنے کے لیے یہاں مجلسی مرکز قائم کیے گئے۔ جنہیں سرکاری مدد دی گئی۔ یہ تحریک زور پکڑتی گئی تا آنکہ مجلسی مرکز پرانی آبادیوں میں بھی قائم ہو گئے۔ آج ان کی تعداد ۱۶۳۲ کو پہنچتی ہے۔ بعض مرکزوں کے پاس اپنی عمارتیں نہیں بلکہ وہ کسی مدرسے یا گرجے وغیرہ کی عمارت سے کام لے رہے ہیں۔

برطانوی وزارت تعلیم نے مجلسی مرکز کے مقاصد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔ اس کا فوری مقصد یہ ہونا چاہیے کہ کسی بستی کی مجلسی اور ثقافتی ضرورتوں کو پورا کر کے مجلسی احساس کو تقویت دے۔ اس بات کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے کہ رسمی ماحول کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ ماحول جوانوں اور بوڑھوں دونوں کو ناگوار گذرتا ہے۔ لیکن یہ عمر رسیدہ لوگوں کے لیے بخصوصیت کے ساتھ ناقابل برداشت ہے۔ ان لوگوں کے لیے معاشرتی سہولتوں کی ضرورت زیادہ شدید ہے۔ ان لوگوں کو مادی مدد کی ضرورت نہیں بلکہ خوش گوار صحبت اور دل نواز سرگرمیوں کی ہوتی ہے تاکہ زندگی میں ان کی دلچسپی قائم رہے۔ جب کوئی مرکز مجلسی احساس کو ترقی دینے لگ جائے تو اس کے بعد وہ اس مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے لگ جاتا ہے جس کو ہم نے نہائی مقصد قرار دیا ہے۔ وہ نہائی مقصد یہ ہے کہ اوقات فراغت کے دانش مند اور پرمسرت استعمال میں دلچسپی پیدا کی جائے۔

مجلسی مرکز تین قسم کی سرگرمیوں کو ترقی دیتے ہیں:۔ (۱) معاشرتی (۲) تفریحی (۳) تعلیمی۔ ان سہ گانہ سرگرمیوں کے درمیان حد قائم کرنا مشکل ہے۔ پہلی دو قسم کی سرگرمیوں کے ذیل میں ناچ، کھیلیں، ضیافتیں وغیرہ، تمثیل کاری، ڈراموں کا پڑھنا، عوامی ناچ، موسیقی اور مباحثے، تعلیم کے وسیع تر معانی کے تحت آتے ہیں۔ لیکچر، مذاکرے اور دست کاری واضح طور پر تعلیمی مشاغل ہیں۔

مجلسی مرکز کی ایک نمایاں خدمت یہ ہے کہ یہ اراکین کو ان تمام تعلیمی اور ثقافتی سہولتوں سے آگاہ کر

...وجوار میں موجود ہوں۔ مختلف گروپ مرکز کی انتظامی کونسل میں نمائندگی رکھتے ہیں۔ مرکز وقتاً فوقتاً مقامی فن کاروں کی ...یروں کی نمائش بھی کرتا رہتا ہے بعض اوقات ان نمائشوں میں قومی عجائب خانوں سے آرٹ کے مشہور شاہکار ...ادھار لے کر رکھ دیے جاتے ہیں۔

مجلسی مرکزوں کی ایک اہم خصوصیت ان کی خود مختاری ہے وہ اگر چاہیں تو لندن میں واقع مرکزی دفتر ...ی کے سفری نمائندوں سے مشورہ حاصل کر سکتے لیکن انہیں اس بات کی پوری آزادی ہے کہ مقامی ضرورتوں ...سب حال اپنا لائحہ عمل خود مرتب کریں۔ مثال کے طور پر ایک صنعتی علاقے کے مرکز میں تمام سرگرمیاں شام کے ...اوقات میں منظم کی جاتی ہیں۔ مگر ایک دیہاتی مرکز میں تمام سرگرمیاں بعد دوپہر ہی شروع ہو جاتی ہیں، مختلف سرگرمیوں ...انتظام مختلف ماتحت کمیٹیوں کے سپرد ہوتا ہے۔ اس طور پر عملی جمہوریت کی جو تربیت ملتی ہے اس کی قدر و قیمت ...بہت بڑی ہے۔ مرکز کے اراکین کو جلد یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ مرکز کی کامیابی اور قدر و قیمت کا انحصار خود ان پر ہے۔

...تعداد طلبہ کی قانونی حدبندی

برطانوی پارلیمنٹ میں ایک ممبر دعوررکن مسٹر ہیرالڈ ڈیوس نے اس مطلب کا ایک مسودہ قانون پیش کرنا چاہا ...ہر جماعت میں زیادہ سے زیادہ تعداد طلبہ قانوناً مقرر کردی جائے۔

تحریک پیش کرتے ہوئے مقرر نے کہا۔ میں چاہتا ہوں کہ ۱۹۵۸ء تک کمرۂ جماعت کی تعداد بذریعہ قانون ...۳۰ مقرر کردی جائے۔ یہ تعداد خارج از امکان نہیں ہے۔ اس وقت ثانوی جدید مدرسوں میں جو تعداد مقرر ہے یہ ...اس سے بقدر پانچ زیادہ ہے اور جونیئر اور پرائمری مدرسوں میں جس تعداد کی اجازت ہے اس سے بقدر پانچ کم ہے ...اس وقت حالت یہ ہے کہ پرائمری درجوں میں ۴۰ فی جماعت اور ثانوی جدید مدرسوں میں ۳۰ فی جماعت کی اجازت ہے ...اور ۴۷ فی صد جماعتوں میں تعداد طلبہ مقررہ حد سے زیادہ ہے۔ کل ۱۷۸۰۰۰ جماعتوں میں سے ۷۱۰۰۰ جماعتیں حد سے ...زیادہ بڑی ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں کی تعداد ۷۰ لاکھ کو جا پہنچے گی جو انتہائی تعداد ہوگی۔ اس ...افسوسناک بھیڑ کے علاج کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ اسلحہ کے اخراجات میں معمولی سی کمی کر کے ہم نئی تعمیرات کے لیے ...روپیہ فراہم کر سکتے ہیں۔

تقریر جاری رکھتے ہوئے محرک نے کہا کہ تعلیم پر بلا ضرورت روپیہ خرچ کرنے کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے وہ

بالکل غلط ہے۔ ۱۹۳۸ء میں ہم تعلیم پر دس کروڑ پونڈ خرچ کر رہے تھے۔ اس وقت ہم بمشکل اس سے سہ چند رقم خرچ کر رہے ہیں۔ حالاں کہ پونڈ کی قیمت بہت گر چکی ہے اور بچوں کی تعداد بقدر ۳۰ لاکھ بڑھ چکی ہے۔ وزارت تعلیم کے جاری کردہ گشتی مراسلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خرچ کی موجودہ شرح پر مدرسوں کی عمارتوں کو برقرار رکھنے کی توقع کی جا رہی ہے۔ ایسا ہونا بالکل ایک معجزہ ہوگا۔

ایک قدامت پرست رکن پارلیمان نے تحریک کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ محرک کی نیت کی عمدگی میں شبہ نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو طریق کار وہ تجویز کر رہا ہے وہ درست ہے۔ جماعتیں اس وجہ سے بڑی نہیں ہیں کہ وزیر تعلیم لاپرواہ ہے یا دارالعوام لاپرواہ ہے یا مقامی حکومتیں لاپرواہ ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شرح پیدائش میں جو بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے اس سے عہدہ برا ہونا بالکل ناممکن ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مسودہ قانون کو غیر پسندیدہ نتائج کے بغیر بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔ حالات جس طرح پر جا رہے ہیں ان کے مطابق چند سالوں بعد پرائم مدرسوں میں تعداد طلبہ گھٹنے لگے گی بمشکل ثانوی مدرسوں میں پیدا ہوگی۔ لہٰذا اگلے دس سالوں میں تعمیری ذرائع اور اسا کو ایک طرف سے دوسری طرف منتقل کرنا مناسب نہیں۔ مسٹر ڈیوس کی تحریک ۱۵۱ آراء کے مقابلے میں ۱۸ آرا

استاد اور ہوٹلوں کی ملازمت

لندن کی تعلیمی کونسل نے اپنے استادوں کو اس بات کی اجازت دیدی ہے کہ وہ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں کام کر کے یہ کام سیکھ لیں۔ استادوں کو یہ تربیت حاصل کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مدرسوں میں اب ہوٹل چلانے کا کام بھی سکھایا جانے لگا ہے۔

بڑے بڑے ثانوی مدرسوں کو ہر جگہ ایسے استاد حاصل کرنے میں دقت پیش آ رہی ہے جو ہوٹلوں کے متعلق تربیت دے سکیں اور اس کاروبار کے جدید تقاضوں سے اچھی طرح باخبر ہوں۔ جو استاد اس غرض کے لیے ملازم رکھے ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں گھریلو سائنس کا عملی تجربہ ہے اور جن کی مدت ملازمت خاص لمبی ہے۔ جدید نصاب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تعلیمی کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ وزارت تعلیم کی منظوری سے چیدہ چیدہ استادوں کو چھ ماہ ہوٹلوں اور ریستورانوں کے باورچی خانوں میں کام کرنے کے لیے چھٹی دی جائے تاکہ وہ واپس آ کر طلبہ کو موزوں تربیت دے سکیں۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ہی تعلیمی رسالے ہیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ہیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاہوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ہیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ میں چھپتے ہیں اور کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو منیجر کو بھیجنا چاہئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ہونگی تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر
پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش
۲ کچہری روڈ - لاہور (پاکستان)

آموزش

[ستمبر ۹۵٦] لاهور اره ٦]

اس شماره میں

ریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم - اے - مخدومی }

معاونین { عبدالغفور چوهدری
فضل احمد }

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

ستمبر ۱۹۵۶ء

جلد ———— ۹

شمارہ ———— ۶

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ۔ لاہور سے شائع کیا

رسم الخط کا مسئلہ

ایم۔ اے مخدومی

پچھلے دنوں حلقۂ ارباب ذوق کے سالانہ جلسے میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ اُردو کو عربی حروف کی بجائے لاطینی حروف میں لکھا جائے۔ اس کے جواز میں بڑی دلیل یہ دی گئی کہ لاطینی حروف کی مدد سے پڑھنا لکھنا سیکھنا نسبتاً آسان ہے، ان کی مدد سے خواندگی کی رفتار تیز تر ہو جائے گی۔ ملک میں کتابوں اور رسالوں کی مانگ بڑھے گی اور یوں ادیبوں اور شاعروں کی معاشی حالت بہتر ہو جائے گی۔ تجویز پیش کرنے والے نے ترکی اور انڈونیشیا کی مثالیں بطور ثبوت پیش کیں۔

یہ پہلی بار نہیں کہ اردو کے لیے لاطینی رسم الخط کی وکالت کی گئی ہو۔ ملک کے اہل الرائے لوگ بارہا ان دلیلوں کا اعادہ کر چکے ہیں جو لاطینی رسم الخط کی حمایت میں پیش کی جاتی ہیں۔ اس صحبت میں ہم صرف اس مسئلہ کے تعلیمی پہلو پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

تجویز پیش کرنے والے کے خیال میں اس ملک میں خواندگی کا تناسب اس لیے کم ہے کہ عربی حروف اس کی راہ میں حائل ہیں۔ مروجہ رسم الخط میں حروف کی شکلیں ہر صورت میں ایک سی نہیں رہتیں، اس سے قاری کو مشکل پیش آتی ہے اور وہ بد دل ہو کر پڑھائی چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے برعکس لاطینی حروف سے ایک بار شناسا ہو جانے سے لکھنا پڑھنا آجاتا ہے کیوں کہ ان کی شکلیں تبدیل نہیں ہوتیں۔

بادی النظر میں یہ دلیل کافی وزنی نظر آتی ہے مگر اس کی پشت پر سائنسی حقائق کا کتنا وزن موجود ہے؟ عربی حروف اور ان کی مختلف شکلیں عموماً ہمارے مدرسوں کی پہلی جماعت میں سکھا دی جاتی ہیں۔ بہر حال ابتدائی مدرسہ چھوڑنے تک ایک بچہ ان پر پوری طرح حاوی ہو چکا ہوتا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے ابھی تک کوئی ایسا سائنسی مطالعہ

نہیں کیا گیا جس سے یہ ثابت ہو کہ پہلی جماعت میں داخل ہونے والے بچوں میں سے اتنے فی صد نے مدرسہ محض اس لیے چھوڑ دیا کہ عربی حروف کی مختلف شکلیں ان کے لیے ذہنی الجھنیں پیدا کر رہی تھیں۔ بہت اغلب ہے کہ اس قسم کے نیچے موجود ضرور ہوں لیکن جب تک ان کا تناسب صحیح طور پر معلوم نہ کر لیا جائے اور یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ان کی ذہنی الجھنوں کے سائنسی حل کی کوئی صورت نہیں اس وقت تک محض ایک مفروضہ کی بنا پر رسم الخط جیسے اہم مسئلہ کے ساتھ کھیلا نہیں جا سکتا۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تجویز پیش کرنے والے کے ذہن میں مدرسوں کے بچوں کی بجائے بالغ قاری تھے تو بھی لاطینی رسم الخط کی تاثیر بہت یقینی نظر نہیں آتی۔ ہماری ان پڑھ آبادی کی غالب اکثریت دیہات میں آباد ہے۔ ان میں سے سینکڑوں ایسے ہیں جو قرآن مجید پڑھنا جانتے ہیں لیکن اردو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے، عربی حروف اور ان کی شکلیں ایسے لوگوں کے لیے کوئی دشواری نہیں رکھتیں۔ ایسی صورت میں عربی حروف کا باقی رکھنا خواندگی میں مد ہو سکتا ہے اس کی راہ نہیں روک سکتا۔

لاطینی رسم الخط کے حامی جس اہم نکتہ سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں وہ ہماری قومی زندگی کی اساس ہے۔ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے دستور کی بنیاد قرآن اور سنت کو قرار دیا گیا ہے۔ جو پود خالص لاطینی رسم الخط کے ماحول میں پلے گی وہ قرآن سے کس حد تک واقف ہو گی؟ اگر مدرسوں میں لاطینی اور عربی ہر دو رسم الخط کے سکھانے کا اہتمام کیا جائے گا تو آخر الذکر کی دشواری بدستور اپنی جگہ باقی رہے گی، اس سے سہولت کیا پیدا ہو گی؟

لاطینی رسم الخط کی تائید میں سب سے دل چسپ استدلال ترکی اور انڈونیشیا کی مثال ہے۔ مثال دینے والے یہ نہیں دیکھتے کہ ترکی میں جس چیز نے خواندگی کو عام کیا وہ فقط لاطینی رسم الخط نہ تھا بلکہ اس میں زیادہ دخل کمال اتاترک کی ان تھک ذاتی کوششوں کو تھا۔ اور پھر کمال اتاترک کا فیصلہ ایک انقلابی ریلے کی پیداوار تھا۔ آج خود بہت سے ترک اس فیصلے کی صحت کے قائل نہیں۔ ترکی کی موجودہ پود اپنے صدیوں کے جمع کردہ ثقافتی ترکہ سے بڑی حد تک محروم ہے۔ اس تمام ترکہ کو لاطینی رسم الخط میں منتقل کرنے کے لیے بہت وقت چاہیے۔

انڈونیشیا کی مثال ہمارے لیے چنداں حسب حال نہیں۔ یہ ملک سولھویں صدی کے نصف اول ہی میں مغربی استعمار کی گرفت میں آ گیا تھا، جب اسلام ابھی ملک کے اندرونی حصوں میں پھیل رہا تھا۔

لاطینی رسم الخط کی حمایت میں آخری دلیل طباعت کی آسانیاں ہیں مگر یہ آسانیاں ہم بھی نستعلیق کی بجائے نسخ اختیار کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ نسخ کا اختیار کرنا ہمیں اپنے فارسی اور عربی بولنے والے ہمسایہ ملکوں سے بھی قریب تر لا سکتا ہے۔"

عزت نفس

فضل احمد

آموزش کے اس شمارے میں جناب بہاول خاں صاحب ناگرہ کا بیان کردہ ایک مختصر مگر سبق آموز واقعہ درج کیا جا رہا ہے۔ صاحب موصوف ایک عرصہ تک محکمہ تعلیم پنجاب کے ایک ذمہ دار انتظامی افسر کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں اور اس وقت جماعت اسلامی پاکستان کے شعبہ تعلیم کے نگران ہیں۔

واقعہ زیر بحث ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ نیک نیتی ہی سب کچھ ہے۔ نیک نیتی کامیابی کی ایک ضروری شرط ہے، مگر اسی قدر ضروری حقائق کا صحیح علم ہے۔ جو نیت واقعات و حقائق کو نظر انداز کر کے قائم کر لی گئی ہو۔ وہ کتنی ہی پرخلوص کیوں نہ ہو اس سے بعض اوقات انتہائی افسوس ناک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ واقعہ زیر بحث میں ایک صدر معلم صاحب نے مدرسے کے نادار طلبہ کی مدد کے خیال سے انہیں ایک خاص قسم کی وردی بنوا دی تھی۔ طلبہ کو حکم تھا کہ سالانہ معائنہ کے دن یہ وردی پہن کر آئیں۔ ذہنی پس منظر میں غالباً یہ خیال بھی ہوگا کہ اس طرح انسپکٹر صاحب کو مدرسے کی ریڈ کراس سوسائٹی کی کارکردگی کا ایک نمایاں ثبوت نظر آ جائے گا۔ یہ فیصلہ صدر معلم کی ذاتی رائے پر مبنی نہ تھا بلکہ مدرسے کے تمام استادوں کے صلاح مشورے سے کیا گیا تھا۔ جب ایک صاحب نظر دوست نے صدر معلم کو اس فیصلے کے شر انگیز نتائج کی طرف متوجہ کیا اور یہ بتایا کہ اس طرح مدد لینے والے طلبہ کی عزت نفس کو سخت دھکا لگے گا تو بات فوراً ان کی سمجھ میں آ گئی اور انہوں نے اپنا فیصلہ منسوخ کر دیا۔

انگریزی میں ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ "جہنم کو جانے والے راستے پر اچھے ارادوں کا فرش لگا ہوا ہے۔" یہ وہی اچھے ارادے ہیں جو ناکافی شہادت یا بے خبری کی بنا پر استوار کیے گئے ہوں۔ مگر ان ارادوں کا خلوص اپنے مالکوں کو تباہی کے گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتا۔ گویا بے خبری بھی اتنا ہی بڑا گناہ ہے جتنا بدنیتی۔ مشرق کی یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ اس نے صدیوں سے خلوص نیت ہی کو سب کچھ سمجھ رکھا ہے۔ یہ اسی یک چشمی کا نتیجہ ہے کہ آج یہاں [illegible] ایسے بزرگ ملتے ہیں جن کی نیتیں کندن سونے کی طرح خالص ہیں مگر جن کی

بے خبری نے قوموں کی قوموں کو رسوائے عالم بنا رکھا ہے ۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ۔

جدید نفسیات کا احسان

جدید نفسیات کے میدان میں تحقیقاتِ انسانی کا سہرا مغرب کے سر ہے ۔ اس صدی کے آغاز تک سائنسی تہذیب کے گہواروں میں بھی بچوں کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک نہ ہوتا تھا ۔ مسیحیت کا یہ عقیدہ کہ انسان گناہ کی پیداوار ہے مغرب کے علمی فکر پر مدتوں چھایا رہا ۔ جسم کو اذیت دینا بہت بڑی نیکی شمار ہوتا تھا ۔ ان خیالات کی گرفت بیسویں صدی کے شروع تک بڑی حد تک باقی تھی ۔ ان غلط عقیدوں کو کلی طور پر ختم کرنے کا کام جدید نفسیات نے انجام دیا ۔

موجودہ صدی کی پہلی دہائی میں نفسیات نے یہ بات قطعی طور پر ثابت کر دی کہ مختلف بچوں کی استعداد میں بہت نمایاں اختلافات موجود ہیں ۔ ان کی دلچسپیاں بھی اتنی ہی مختلف ہوتی ہیں جس قدر مختلف ذہنی پس منظر سے کہ وہ مدرسے میں آتے ہیں ۔ اس صورت میں ان سب پر ایک سی تعلیمی رفتار کا ٹھونسنا ان پر بہت بڑی زیادتی ہے ۔ جو بچہ ذہنی طور پر پست ہو ۔ جب اس کا مقابلہ ایک غیر معمولی ذہانت کے بچے کے ساتھ کرایا جاتا ہے ، پھر اس مقابلے میں پچھاڑے جانے پر اسے برا بھلا کہنا ستم بالائے ستم ہے ۔ اس سے اس کی شخصیت کو ایسا سخت دھکا لگتا ہے جس سے وہ سنبھل نہیں سکتا ، اس کی عزت نفس پس کر رہ جاتی ہے ۔ وہ استاد ، ہمجولیوں اور ماں باپ کی نگاہوں میں گر جاتا ہے ۔ حتیٰ کہ اسے اپنے آپ پر سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے اور وہ عمر بھر ایک مفلوج شخصیت کا بوجھ اٹھائے پھرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔

ان نفسیاتی حقائق کے انکشاف نے بچے کو روندے جانے سے بچا لیا ۔ استادوں اور والدین کو دفعتہً یہ احساس ہوا کہ اب تک وہ بچے کی بھلائی کے نام پر بہت سی ایسی چیزیں کیا کرتے رہے ہیں جو فی الحقیقت اس کے ساتھ دشمنی کا ہم معنی تھیں ۔ بچے کی عزت نفس کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہیے ۔ علم التعلیم پر یہ جدید نفسیات کا بہت بڑا احسان ہے ۔ یہ وہ احسان ہے جس کی بدولت جدید مدرسہ بچے کے لیے خوش گوار ترین جگہ بن گیا ہے ۔ ہمارے بچے عموماً بادل نخواستہ مدرسے کا رخ کرتے ہیں ۔ مغرب میں کیفیت کبھی اس سے بھی بدتر تھی ۔ مگر مغرب نے نفسیات کے انکشافات سے فائدہ اٹھا کر اپنے مدرسے کا ماحول اس حد تک بدل دیا ہے کہ آج وہاں کا مدرسہ بچے کے لیے قریباً قریباً ویسی ہی کشش رکھتا ہے جتنی گھر ۔

تنفر کی جگہ شوق | جو مدرسہ بچے کی عزت نفس کو دھکا لگائے گا وہ لامحالہ اس کے لیے ایک ناپسندیدہ جگہ بن جائے

اس کے استاد اس کی نگاہ میں غیر پسندیدہ لوگ بن کر رہ جائیں گے۔ اس صورت حال کے مقابلے کے لیے اس کے سامنے دو ہی راستے کھلے رہ جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ بالکل ہتھیار پھینک دے اور پنجرے میں بند پرندے کی طرح قید کے دن پورے کرے۔ اس صورت میں اس کا جذبۂ عمل بالکل سرد پڑ جاتا ہے۔ اس کے ایسے جوہر بھی ماند پڑنے لگتے ہیں جن کا مدرسے کے کام کے ساتھ براہ راست کچھ تعلق نہ ہو۔ ایک روح کش احساس نامرادی اس کی تمام ہستی کو دبوچ لیتا ہے۔

اس کا دوسرا ردعمل یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مرنے مارنے پر اتر آئے اور کھلم کھلا یا خفیہ طور پر بغاوت کر دے۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ کی پرواہ کرنا چھوڑ دے اور یا سینہ تان کر اس کے مقابلے کے لیے کھڑا ہو جائے۔ بغاوت کی یہ دونوں صورتیں طرح طرح کے جرائم کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ بچے چوری کرنے لگتے ہیں، جھوٹ بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ مدرسے یا گھر کا سامان توڑنے پھوڑنے لگتے ہیں۔ استادوں اور ساتھیوں کو ستانے میں مزہ لینے لگتے ہیں۔ بعض اوقات نوبت مار پیٹ تک جا پہنچتی ہے۔ وہ مدرسے اور گھر سے بھاگ جاتے ہیں اور کبھی کبھار ان سے نہایت سنگین قسم کے جرم بھی سرزد ہو جاتے ہیں۔

بغاوت کی یہ تمام صورتیں معاشرے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان شرارتوں سے گھر اور مدرسے کو مالی نقصان پہنچتا ہے، بلکہ وہ ایسے کردار کی تربیت کرتی ہیں جو معاشرے کے لیے مستقل دردِ سر بن جاتا ہے۔ اس عظیم نقصان کے روکنے کے لیے مدرسے جو احتیاطیں بھی برتیں کم ہیں۔

لیکن ردعمل کی پہلی صورت بھی کچھ کم نقصان دہ نہیں۔ جو طلبہ پنجرے میں بند پرندے کی طرح دن کاٹنے کے عادی ہو جاتے ہیں وہ اس قابل نہیں رہتے کہ آگے چل کر کسی سچائی کی حمایت یا جھوٹ کی مخالفت میں آواز اٹھائیں۔ وہ ان بدنصیبوں کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں جن کے کانوں، آنکھوں، اور دلوں پر اللہ نے مہریں لگا رکھی ہیں۔ وہ اپنے طور پر سوچنے کی صلاحیت ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ معاشرے کے لیے بدترین شہری ثابت ہوتے ہیں۔ ان کا وجود ہر معاشرتی و ملی ترقی کا راستہ روک دیتا ہے۔

اگر سب استادوں کو اس بات کا احساس ہو کہ ان کی معمولی سی چوک کس قدر تباہ کن قومی نقصان پیدا کر سکتی ہے تو ان میں سے اکثر اس خیال سے تھرا اٹھیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ اکثریت کو اس امر کا ہرگز کوئی احساس ہی نہیں۔

وہ اپنی دانست میں بچوں کے لیے بڑی دل سوزی سے کام کرنے میں لگے ہیں، مگر اس کام کے بیشتر نتائج بچوں کے لیے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

تھوڑی سی بصیرت اور دل سوزی کے ساتھ اس بڑے قومی نقصان کو روکا جا سکتا ہے۔ مدرسے کو ایسی جگہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے جسے بچے پسند کریں اور جس کے استاد ان کی محبت کا مرکز بن سکتے ہوں۔

بوسٹن کے گنجان شہر میں ایک مدرسہ ایسا بھی ہے جہاں وہ بچے آتے ہیں جن سے باقی مدرسے عاجز آ چکے ہوں۔ جو بچے دوسرے مدرسوں میں بھاگنے کے عادی تھے یہاں آ کر پابندِ وقت ہو گئے۔ اس کی بڑی وجہ اس مدرسے کی عام فضا ہے۔ یہاں استادوں کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ جو بچہ ناقابلِ اصلاح قرار دیا جا چکا ہو اس کی خوبیوں کو ڈھونڈو۔ ایسا بچہ کوئی نہیں ہو سکتا جسے فطرت نے ہر خوبی سے محروم رکھا ہو۔ اب اسے ان خوبیوں کی دادِ تحسین دی جائے۔ استاد کا یہ قدم فوراً بچے میں عزتِ نفس کا احساس پیدا کرنے لگتا ہے۔ اسے یقین ہونے لگتا ہے کہ یہ بات اس کے کان میں غلط طور پر ڈالی گئی تھی کہ وہ کسی کام کا نہیں بلکہ اس میں بھی کچھ قابلِ قدر جوہر موجود ہیں جن کی بدولت وہ اپنے لیے جگہ پیدا کر سکتا ہے۔ امید کی یہ کرن نامرادی کے اندھیرے میں چراغِ راہ کا کام دیتی ہے۔ سویا ہوا جذبۂ عمل جاگ اٹھتا ہے۔ جو رجحانات بغاوت کے لیے سر اٹھاتے تھے وہ سختی سے کچل دیے جاتے ہیں۔ یہ سارا کرشمہ عزتِ نفس کو ابھارنے سے انجام پاتا ہے۔

ہر بچے کا حق

خوش و خرم مدرسے کی زندگی ہر بچے کا جائز حق ہے جو مدرسہ اس جائز حق کو چھینتا ہے وہ بچوں کو ان تمام جرائم پر ابھارتا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ گذرا۔ بوسٹن کے جس مدرسے کا ذکر کیا گیا ہے اس کی صدر معلمہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کی کامیابی کا بڑا راز کیا ہے؟ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ اصل راز ان کاموں میں نہیں جو ہم کرتے ہیں بلکہ ان باتوں میں ہے جو ہم نہیں کرتے۔ استادوں کو اس بات کی اجازت نہیں کہ گرج گرج کر طلبہ کو ڈانٹیں۔ ضبط کی بنیاد ڈر پر نہیں رکھتے اور نہ ہی اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ہر طالب علم ایک پہلے سے طے شدہ راہ چلے۔ حال ہی میں ایک لڑکا مدرسے میں داخل ہونے آیا۔ وہ انگریزی اور ہسپانوی زبانوں میں بول نہیں سکتا تھا۔ ہم نے کہا کہ ہم پہلا کام یہ کریں گے کہ تم سے ہسپانوی زبان چھڑا دیں۔ اس پر لڑکے کی باچھیں کھل

اور اس نے پوچھا کیا تم سچ سچ کہہ رہی ہو۔ اسے یقین دلایا گیا کہ مدرسہ کسی پر اس کی بساط سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ یہ لڑکا اسی روز سے ایک نئے جذبے کے ساتھ کام میں لگ گیا اور جلد ہی انگریزی میں معیار پر آگیا"۔

زندگی کے مسائل سے عہدہ برآ ہونا انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت آج بھی ایسی ہی شدید ہے جیسی آغاز دنیا میں تھی۔ یہ ضرورت ہر اس انسان کو پیش آتی ہے جو دنیا میں قدم رکھے اور سالم ہوش و حواس کا مالک ہو تعلیم کا واحد نصب العین یہی ہے کہ ہر بچے کو اس ذمہ داری سنبھالنے کے قابل بنایا جائے۔ زندگی کے مسائل کو سمجھنا اور ان پر قابو پانے کی صلاحیت حاصل کرنا ایک کٹھن کام ہے۔ اسے انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کم سے کم اپنی ذات کے ساتھ برسرپیکار نہ ہو۔ اسے اپنی پوری ہستی کی تائید حاصل ہو۔ یہ تائید حاصل کیے بغیر وہ اس کام کو ہاتھ بھی نہیں ڈال سکتا، اور یہ مقصد عزت نفس کے بغیر حاصل ہونا ناممکن ہے۔ جس بچے یا بالغ کو اپنی ذات پر بھروسہ نہیں۔ جسے ہمیشہ یہ ذہن نشین کرایا گیا ہو کہ وہ کسی کام کے قابل نہیں، وہ بچہ یا وہ بالغ کبھی یہ امید نہیں کرسکتا کہ وہ زندگی میں کوئی مقام پیدا کرسکے۔ وہ ایک بے دست و پا اپاہج کی طرح یاس و حسرت کی تصویر بنے اپنے آپ اور دوسروں کو کوستا کوستا زندگی بسر کر جاتا ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے ماحول میں کسی پسندیدہ شے کی داغ بیل نہیں ڈال سکتا۔

اگر بچپن میں اس کا یہ حق تسلیم کرلیا جاتا کہ وہ بھی عزت نفس کا ایسا ہی حق دار ہے جیسا کوئی دوسرا انسان تو اس کی یہ گت کبھی نہ بنتی۔ ہر انسان کا ایک بنیادی حق یہ ہے کہ اسے اپنے آپ کو پانے کا موقع دیا جائے۔ جب وہ اپنے آپ کو پالے گا تو دوسرے امور کا اخذ کرنا بہت سہل ہوجائے گا۔ صوفیوں کے مشہور قول مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جدید نفسیات اور نئی تعلیم کا مطالبہ بھی یہی ہے کہ ہر بچے کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ اسے اپنے آپ کو پانے کے مواقع ملنے چاہئیں۔

کامیابی کا احساس

مدرسہ کے سامنے ایک اہم سوال یہ ہے کہ جن بچوں کی عزت نفس کو صدمہ پہنچ چکا ہے ان کی عزت نفس کو بحال کیوں کر کیا جائے؟ جو بچے والدین یا سابق استادوں کی طرف سے ناقابل اصلاح قرار پاچکے ہیں ان کی ذہنی بحالی کی کیا صورت ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عزت نفس کی سمت میں پہلا قدم کامیابی کا احساس ہے۔ ایسے بچوں کا

بہترین علاج یہ ہے کہ ایسی چیزیں معلوم کی جائیں جو وہ کر سکتے ہوں اور جن کے کرنے میں انہیں قوت محسوس ہوتی ہو، ان چیزوں کو لپیٹ اور ناپسندیدہ قرار دینے کی بجائے انہیں توجہ کا مرکز بنائے۔ کامیابی کا یہ نیا تجربہ عام استعداد کشادگی پیدا کرے گا۔ اب رفتہ رفتہ مطلوبہ مضامین پڑھاتے جائیے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہی بچہ جو ناقابلِ علاج قرار دیا جاتا تھا دیکھتے دیکھتے اچھا بھلا سنجیدہ طالب علم بن جائے گا۔

یہ نفسیاتی طریقہ علاج انسانی تاریخ میں کوئی انوکھی شے نہیں۔ ہمارے اسلاف اس سے بڑی کامیابی کے ساتھ کام لے چکے ہیں۔ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتی سرزمین ہند میں اشاعت اسلام کے لیے آئے تو انہیں ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا جو کفر و شرک میں ناقابلِ علاج حد تک کھوئے ہوئے تھے۔ توحید کا سبق ان کے لیے بے حد کٹھن سبق تھا۔ بظاہر اس سبق کو اخذ کرنے کی صلاحیت سے یکسر عاری تھے۔ مگر استاد صاحبِ بصیرت تھے انہوں نے دیکھا کہ ان لوگوں کا مر... مشغلہ بتوں کے سامنے حمد و ثنا کے ترانے گانا ہے اور وہ گانے میں مزہ محسوس کرتے ہیں چنانچہ حضرت خواجہ نے توحید کے ترانے وضع کیے وہ ان لوگوں کی اس فطری دلچسپی کو زینہ بنا کر اپنا سبق ان کے دلوں میں اتارنے میں کامیاب ہو...

فی الحقیقت یہ وہ بنیادی نفسیاتی نکتہ ہے جو ہر مبلغ کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ معلم کامل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب ایک تبلیغی وفد یمن کو بھیجا تو اس کے اراکین کو تاکید فرمائی کہ تبشرا ولا تنفرا - تیسرا ولا ... (ان لوگوں کو ایسی باتیں بتانا جو ان کے لیے خوش خبری کا درجہ رکھتی ہوں۔ ایسی باتیں نہ بتانا جن سے وہ بدکیں) جدید ... اسی نکتہ کو تدریس کا پہلا قدم قرار دیا ہے، جب تک سیکھنے والے کو سبق میں اپنے لیے کوئی خوش خبری نظر نہ آئے جب تک وہ اسے اپنے لیے سہل خیال نہ کرے۔ اس وقت تک اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ اسے اخذ کر سکے ... نے جو نکتہ ایک چھوٹے سے جملے میں بیان فرما دیا تھا آج جدید نفسیات نے لمبی چوڑی تحقیق کے بعد اس کا سراغ پایا اور اسے علم التعلیم کی بنیادوں میں سے قرار دیا ہے۔

عملی نتائج

یہ نفسیاتی حقائق کوئی نظری شے نہیں۔ اس کے عملی نتائج اس کی سچائی کی پوری پوری تائید کرتے ہیں۔ ماساچوسٹس کے قید خانوں کے ایک افسر نے تخمینہ لگایا ہے کہ جو لوگ جیل خانوں میں آباد ہیں ان میں سے کم ۷۵ فی صد ایسے ہیں جو بچپن میں مدرسوں سے بھاگا کرتے تھے عزت نفس کی جس کمی نے نہیں مدرسے سے ...

زیادہ تھا وہ آگے چل کر انہیں مجرم بنا نے کا موجب بنا ۔

اس کے برعکس بوسٹن کے اس مدرسے کی کارکردگی کا ریکارڈ ہے جس کے تمام کے تمام طلبہ باقی مدرسوں کے لیے لاعلاج ثابت ہو چکے تھے ۔ اس کے فارغ التحصیل طلبہ میں سے صرف ۹ فی صد ایسے ہیں جو آگے چل کر قید خانوں میں پہنچے ۔ اس مدرسے میں ایک پندرہ سالہ طالب علم لایا گیا ۔ وہ مدرسے سے بھاگ جانے کا عادی تھا ۔ اس کے ماں باپ کے درمیان سخت نا چاقی ہو چکی تھی وہ الگ الگ رہتے تھے ۔ لڑکا ماں کے پاس تھا جو محنت مزدوری سے بمشکل پیٹ پالتی تھی ۔ مدرسے نے دیکھا کہ اس لڑکے کی پہلی دلچسپی تھوڑی بہت آمدنی پیدا کرنا ہے تاکہ ماں بیٹا پیٹ بھر کر کھا سکیں ۔ اس پہ مدرسے کی مدد سے اسے ایک دوکان میں جز وقتی کام مل گیا ۔ اس کام کی خاطر مدرسہ اسے ایک گھنٹہ پہلے چھٹی دے دیتا تھا ۔ استادوں کی توجہ اور مہربانی سے لڑکا پڑھائی میں بھی پیچھے نہ رہنے پاتا تھا ۔ اسی طرح کام کرتے کرتے اس نے مدرسے کا نصاب ختم کیا ۔ پھر یونی ورسٹی سے اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور بعد ازاں ایک مشہور اخبار کے ادارتی عملے میں منسلک ہو گیا ۔

اسی طرح ایک ماں اپنے کم ذہین بچے کا حال بیان کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ ہمیں اس کے بارے میں بڑی تشویش لاحق تھی ۔ جب اس کی عمر ساڑھے سات برس کی ہوئی تو اسے مقامی کنڈر گارٹن مدرسے میں بھیجا گیا ۔ مدرسے میں طلبہ کی تعداد کافی زیادہ تھی ، اس لیے والدین کو اس بات کا یقین نہ تھا کہ بچے کو انفرادی توجہ مل سکے گی ۔ ایسی توجہ کے بغیر اس کا پڑھائی میں جی لگانا محال تھا ۔

حسن اتفاق سے بچے کو ایک غیر معمولی بصیرت کے استاد سے سابقہ پڑا ۔ جماعت میں کل ۲۶ بچے تھے ۔ استاد کو ان تمام ننھے منوں کو کام میں لگائے رکھنا پڑتا تھا ۔ اسے ان کے طرح طرح کے سوالوں کے جواب دینے پڑتے تھے ۔ اس کے باوجود اس نے آتنا وقت نکال لیا کہ خود مرد کی شرح رفتار کا درست اندازہ کرے ۔ اس نے اس کے حسب حال کچھ کام تجویز کر دیا ، اسے پوری طرح سمجھایا کہ استاد کس قسم کی کارکردگی کی توقع رکھتا ہے ۔ بعد ازاں اسے پورے طور پر اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ۔ تاکہ وہ اپنی ہمت کے مطابق اپنی دھیمی رفتار پر چلتا رہے ۔ اب بچہ ہر قسم کے دباؤ اور ہر قسم کی تناؤ سے یکسر آزاد تھا ۔ اس فضا نے اس کے ارادے کو بلندی اور اس کے اعضا کو مستعدی عطا کی ، وہ پورے انہماک کے ساتھ کام میں لگ گیا ۔

استاد کو جلد معلوم ہو گیا کہ ذہنی کمزوری کے باعث بچے کی مدت توجہ بہت تھوڑی سی ہے: وہ چند منٹوں کے انہماک سے تھک جاتا اور سستانے کے لیے ادھر اُدھر گھورنے لگتا۔ استاد نے بچے کی اس طبعی کمزوری کو قبول کیا۔ اسے قبول نہ کرنا ایک ٹھوس حقیقت سے آنکھیں بند کرنا ہوتا۔ بچہ کسی شرارت یا کھیل کود کے شوق سے نہیں بلکہ اپنی تھکان دور کرنے کے لیے بار بار اٹھتا تھا۔ استاد نے اسے اجازت دے دی کہ جب جی چاہے باہر ٹہلنے کے لیے نکل جائے۔ اس اجازت نے بچے کی عزت نفس کو اور سہارا دیا۔ وہ کسی قسم کی ناراضگی کا نشانہ بنے بغیر آسانی سے ایک طبعی ضرورت کو پورا کر سکتا تھا۔

ان تمام رعایتوں کے باوجود بچے کی کارکردگی دوسروں کے مقابلے میں کہیں پست تھی۔ جب دوسرے ساتھی اچھی خاصی تصویریں تیار کر لاتے تو یہ کاغذ پر بے معنی رنگین دھبوں کا ایک جمگھٹا تیار کر کے استاد کے سامنے لا رکھتا۔ اگر کوئی پھوہڑ قسم کا استاد ہوتا تو اس کی اس کارگزاری کو طرح طرح کی چبھتی ہوئی طنزوں کا نشانہ بناتا۔ وہ اس کی کاپی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی چھوڑ دیتا۔ استاد کی تقلید میں باقی بچے بھی اس غریب کی زندگی حرام کر دیتے۔ اس کی عزت نفس کو ایسا شدید دھکا لگتا جو اس کی معمولی سی ذہانت کا بھی گلا گھونٹ کر رکھ دیتا۔ مگر استاد ایک صاحب نظر ماہر فن تھا۔ وہ اس کی کمزور ذہانت کو تھپک تھپک کر ابھارنا چاہتا تھا۔ لڑکا جب ساتھیوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا رنگین دھبوں کا انبار اس کی میز پر لا دھرتا تو استاد حوصلہ افزا مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھتا اور کہتا: واہ واہ تم تو دن بدن خوب ترقی کر رہے ہو یہ تصویر پہلے سے بہت اچھی ہے۔ اس پر لڑکا اپنے رنگین دھبوں کی شرح بیان کرنے لگتا: —

"دیکھیے ماسٹر صاحب! اب کے میں نے گھوڑے کی گردن کا خم کیسی اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ ذرا سوار کی ٹوپی ملاحظہ فرمایئے" اگرچہ استاد کی آنکھ کو رنگ برنگ دھبوں کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہ دیتا لیکن وہ پھر بھی شیریں لہجے میں کہتا: "ہاں بھئی اب تو تم کمال پیدا کرنے لگے ہو"

استاد کی اس مثال کا اثر دوسرے بچوں پر بھی پڑا۔ یہ ننھے آئینے بھی بالکل استاد کے طرز عمل کی عکاسی کرنے لگے۔ کیا مجال جو کوئی اس لڑکے کی مہمل تصویر کشی پر کوئی حجت کسے یا اسے اپنے سے فروتر سمجھے۔

اب استاد کو ایک اور دقت پیش آئی۔ یہ بچہ قدرتی طور پر جماعت کی سرگرمیوں میں باقی ساتھیوں سے پیچھے تھا۔ دوسرے تمام بچوں کو کسی نہ کسی سرگرمی میں رہنمائی کا نمایاں مقام حاصل ہو جاتا تھا مگر اس بچے کا مقام ہر جگہ آخر میں

استاد نے دیکھا کہ یہ چیز بچے کی عزت نفس کو نقصان پہنچانے والی ہے۔ اس کا تدارک ہونا چاہیئے۔ اس بچے کو بھی کسی نہ کسی جگہ رہنمائی کا مقام حاصل ہونا چاہیے۔ اس کی تلاش کرنے والی نگاہ نے فوراً اس مشکل کا جواب معلوم کر لیا۔ یہ بچہ دوپہر کے کھانے کی میز پر رہنما بنا دیا گیا۔ اس کی رہنمائی اس بات تک محدود تھی کہ باقی بچے آرام سے میز پر بیٹھے رہیں اور یہ دودھ کے گلاس اور بسکٹ ہر ایک کے آگے دھرے۔ اس کے علاوہ لکھائی پڑھائی کے میدان میں بھی استاد نے اس کے لیے رہنمائی کا ایک مقام پیدا کر دیا۔ جو کہانی پچھلے روز پڑھی ہوتی یہ لڑکا اس کے متعلق دوسروں سے سوال پوچھتا۔ ان دونوں تدبیروں نے اس کی عزت نفس کو قوی تر کر دیا۔ اسے یہ احساس ہونے لگا کہ بعض باتوں میں وہ بھی دوسروں سے ممتاز ہے۔

کچھ عرصہ بعد جماعت میں موسیقی کے اسباق شروع ہو گئے۔ اس میدان میں اس بچے نے حقیقی ذہانت کا ثبوت دیا۔ استاد نے مصنوعی طور پر اس کی خودی کو سہارا دے رکھا تھا اور وہ یہاں خوب آڑے آیا۔ اس کی بدولت یہ بچہ موسیقی میں چوٹی پر پہنچ گیا۔ اس سے اس کے ساتھیوں کے دلوں میں حقیقی احترام پیدا ہو گیا۔

یہ ایک ایسے بچے کا حال ہے جو نہ صرف ضعیف العقل تھا بلکہ ضعیف البدن بھی۔ اس کے ہاتھ اس حد تک کمزور تھے کہ اسے بٹن بند کرنے میں بھی مشکل پیش آتی تھی۔ مگر مدرسے کی روح پرور فضا نے اس کی نحیف و نزار شخصیت کو سہارا دیا۔ اس کا اثر اس کے ذہن کے ساتھ ساتھ اس کے بدن پر بھی پڑا۔ اب اس کے ہاتھ پہلے سے زیادہ پھرتیلے بن گئے۔

جب اس کے استاد سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ غیر معمولی کامیابی کیوں کر حاصل کی تو اس نے بتایا کہ اس میں دو باتوں کو بڑا دخل ہے۔ پہلی بچے کے والدین کی دیانتداری جنہیں یہ غلط فہمی کبھی پیدا نہ ہوئی کہ ان کا بچہ ذہانت کے کس درجہ پر ہے۔ انہوں نے ہمیشہ یہ اعتراف کیا کہ بچہ پیدائشی طور پر اس قدر کمزور ذہن اور ضعیف البدن ہے کہ اسے سکھانا پڑھانا آسان نہیں۔ دوسری وجہ والدین کا تعاون تھا۔ بچہ کو داخل کرانے سے پہلے انہوں نے استاد کو گھر پر بلایا۔ بچے کے ساتھ اس کا تعارف کرایا اور اسے اس کے تمام کوائف سے آگاہ کیا۔ اس سے استاد اس قابل ہو گیا کہ پہلے سے اس بچے کے متعلق منصوبہ بندی کر سکے۔

اس واقعہ سے ان پاکستانی استادوں کو سبق سیکھنا چاہیے جو بچوں کی ذرا سی لغزش کو بھی طنز کا نشانہ

بتلانے سے نہیں چوکتے، وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ہر بچہ احسن الخالقین کی کاری گری کا ایک نمونہ ہے۔ وہ اس کی نگاہ میں عزیز ہے، اس نے اپنی صنعت کے اس نمونے میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور رکھی ہے۔ ایسے استاد اس خدائی حکم سے بے خبر ہوتے ہیں کہ "اے ایمان والو کوئی جماعت دوسری جماعت کا مضحکہ اڑائے، شاید وہ ان سے بہتر ہوں...... نہ ہی اپنے لوگوں کو برا بھلا کہا کرو اور نہ ہی انہیں حقارت آمیز ناموں سے یاد کیا کرو۔"

جو استاد اس خدائی حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ نہ صرف اللہ کے مجرم ہیں بلکہ قوم کے بھی۔ وہ قوم کی عزیز ترین متاع یعنی اس کی نئی پود کی صلاحیتوں کو ملیا میٹ کرنے کے قصوروار ٹھہرتے ہیں۔

قدرتی اختلافات

فطرت کے بے مثال حسن کا بڑا راز اس کی رنگا رنگی میں ہے۔ اگر یہ کارخانہ سراپا یک رنگ ہوتا تو اس میں کچھ جاذبیت نظر نہ آتی۔ فطرت نے ایسی ہی رنگا رنگی انسانی طبائع میں رکھی ہے۔ قرآن حکیم نے دنیا کو پہلی بار اس اہم نکتہ سے ان الفاظ میں آگاہ کیا تھا۔ "اگر اللہ چاہتا تو سارے لوگوں کو ایک ہی قوم بنا دیتا۔ لیکن ان کے اختلافات باقی رہیں گے کیوں کہ اللہ تعالے نے انہیں پیدا ہی اس غرض سے کیا ہے۔"

جدید نفسیات نے اس نکتے کی نقاب کشائی اس صدی میں آکر کی ہے۔ اس نے یہ بتایا ہے کہ جس طرح ایک جماعت کے تمام بچوں کو ایک ہی ناپ کے تمام کپڑے پورے نہیں آتے بالکل اسی طرح انہیں ایک ہی قسم کی ذہنی غذا راس نہیں آسکتی۔ جس طرح ہم ایک گلہری کو اس لیے لعنت ملامت نہیں کرتے کہ وہ کتے کی طرح اڑ نہیں سکتی اور نہ ہی الّو کو اس لیے "بدذوق" قرار دیتے ہیں کہ اسے دن کے وقت نظر نہیں آتا بالکل اسی طرح ہمیں کوئی حق نہیں کہ ایک ہی کمرے میں بیٹھنے والے لڑکوں میں سے چند ایک کو اس لیے سزا دیں کہ وہ کسی مضمون میں تھوڑے نمبر حاصل کر سکے ہیں یا ناکام رہ گئے ہیں۔ جس طرح یہ ایک اتفاقی امر ہے کہ ایک جنگل میں مختلف قسم کے جانور رہتے ہیں بالکل اسی طرح ایک اتفاقی امر ہے کہ ایک کمرۂ جماعت میں مختلف ذہانتوں اور دلچسپیوں کے مالک طلبہ بیٹھے ہیں۔ کوا چڑیا کی نسبت بہت زیادہ کرخت آواز سے گلا پھاڑتا رہتا ہے۔ اس کے لیے ہم اسے کسی انعام یا سزا کا مستحق قرار نہیں دیتے۔ بھینس گائے کی نسبت آہستہ اور بھدی رفتار سے چلتی ہے۔ اس کے لیے اسے کبھی سزا نہیں دی جاتی اور نہ ہی گائے کو کوئی انعام دیا جاتا ہے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے۔ مقابلہ ہمیشہ یکساں استعداد

کے افراد کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ جہاں فطری صلاحیتوں میں فرق موجود ہو وہاں مقابلے کا نام لینا حماقت کا ثبوت دینا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ تعلیمی میدان میں ہم اس حماقت کا نہ صرف ثبوت دیتے ہیں بلکہ اس پر اصرار بھی کرتے ہیں۔

بے شک استاد کا یہ کام ہے کہ طلبہ کی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ابھارے لیکن اس کا طریقہ یہ نہیں کہ ایک کم ذہن طالب علم کو ایک غیر معمولی ذہانت کے طالب علم کے مقابلے میں کھڑا کر دیا جائے اور وہ بے چارہ پٹ جائے تو اس کی مرمت بھی ہونے لگے۔ تمام والدین یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے تنومند بن جائیں مگر اس کے لیے وہ یہ نہیں کرتے کہ انہیں کسی پہلوان کے ساتھ کشتی لڑنے پر مجبور کریں اور جب وہ پچھاڑا جائے تو اس شکست کے لیے اسے سزا دیں۔ ایسا کرنا اس کی جسمانی نشوونما کو تباہ کرنے کے برابر ہے۔ بالکل یہی حال ذہنی نشوونما کا ہے۔ اس نشوونما کے لیے بھی ضروری ہے کہ مقابلہ برابر کے ساتھیوں سے ہو نہ کہ دیو ہیکل لوگوں سے۔ اگر برابر کے ساتھی موجود نہ ہوں تو بچے کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیے اور اس کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے کہ وہ اپنی طبعی رفتار کی انتہا کو پہنچ جائے۔ اس کے برعکس ہر عمل عزت نفس کو تباہ کرنے والا اور اس کے ساتھ ہی خداداد جوہروں کا گلا گھونٹنے والا ثابت ہوگا۔

روایت پرست تعلیم کی غلطی

روایت پرست تعلیم کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس کے خیال میں بچوں کی عمر کے ساتھ ساتھ ان کی ذہانت بھی یکساں رفتار سے ترقی پاتی ہے اس مفروضے کے ماتحت یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہم عمر بچوں کی کسی جماعت کے تمام افراد کم و بیش ایک ہی ذہنی سطح پر ہوتے ہیں۔ چنانچہ مختلف مضامین کی چھوٹی چھوٹی اکائیاں تیار کر دی جاتی ہیں۔ ہر طالب علم کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ وہ ان اکائیوں کو مقررہ مدت کے اندر اندر ختم کرے۔ اگر کوئی طالب علم ایسا کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اس بات کو اس کی بے توجہی اور کاہلی کا ناقابل تردید ثبوت خیال کیا جاتا ہے جس کے لیے استاد اور والدین دونوں اسے سزا کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی طالب علم مقررہ اکائیوں کو مقررہ اوقات سے پہلے ختم کر لیتا ہے یا ان میں غیر معمولی فہم پیدا کر لیتا ہے تو اس بات کو غیر معمولی محنت اور تندہی کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ والدین اور اساتذہ دونوں اسے انعام کا مستحق سمجھتے ہیں۔

چونکہ بنیادی مفروضہ ہی سرے سے غلط ہے۔ اس لیے اس کے دونوں نتائج بھی بے سرو پا ہیں جو

جو طالب علم امتحان میں ناکام رہتا ہے یا تھوڑے نمبر لیتا ہے عین ممکن ہے کہ اس کی صلاحیتیں پوری رفتار پر کام کرنے کے باوجود اس سے بلند تر سطح پر نہ جا سکتی ہوں۔ ایسی صورت میں اسے سزا دینا یا برا بھلا کہنا پرلے درجے کا ظلم ہوگا۔ اس کے برعکس جو طالب علم امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے یا اس میں اول رہتا ہے عین ممکن ہے کہ اس کی فطری صلاحیتیں اسے اس سے بھی زیادہ بلند مقام پر لے جانے کے قابل ہوں اور وہ محض تن آسانی اور لاپرواہی کے طفیل اس پست تر مقام پر اٹک کر رہ گیا ہو۔ ایسی صورت میں اسے مبارک باد دینا یا انعام کا حق دار قرار دینا اس کے سوا اور کیا نتیجہ پیدا کر سکتا ہے کہ وہ پوری رفتار سے کام نہ کرنے کی عادت میں اور پختہ ہو جائے اور اس طرح اس کے خداداد جوہروں کی غیر معمولی چمک کبھی بھی منظر عام پر نہ آ سکے۔

روایت پرست تعلیم کا یہ بنیادی مفروضہ سراسر لغو ہے کہ کسی جماعت کے تمام بچے تقریباً یکساں ذہانت کے مالک ہوتے ہیں، اس لیے ان کی کارکردگی کی پیمائش ایک ہی گز سے ہونی چاہیے۔ تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم عمر بچوں کے ایک عام گروہ میں ذہنی پختگی کے اعتبار سے عموماً تین چار سال کا فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً اگر بچوں کی عمریں گیارہ بارہ سال کے درمیان ہیں تو ان میں سے چند ایسے ہوں گے جو ذہنی پختگی کے اعتبار سے تیرہ چودہ برس کے ہم پلہ ہوں گے اور چند ایسے جو محض آٹھ نو برس کے بچوں کے ہمسر۔ باقی تمام بچے کم و بیش گیارہ بارہ برس کی ذہنی پختگی کی سطح پر ہوں گے۔ ایک ایسے گروہ کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا کس طرح روا قرار دیا جا سکتا ہے! ایسا کرنے کے نتائج بہت سی حالتوں میں زخم خوردہ عزت نفس یا خود فریب پندار کی شکل میں نکلتے ہیں۔

بے خبری کوئی عذر نہیں

جدید تعلیم نے اپنی بنیاد جن حقائق پر رکھی ہے وہ اتنے عام فہم اور معقول ہیں کہ کوئی استاد ان کی صحت کے متعلق شک میں نہیں رہ سکتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مغربی استادوں نے اپنے طریقوں کو ان حقائق کے مطابق ڈھال لیا ہے مگر ہمارے استاد ابھی روایتی لکیروں کو پیٹتے جا رہے ہیں؟ اس کی وجہ وہ عظیم الشان بے خبری ہے جو ہمارے استادوں کا خاصہ بن چکی ہے۔ ان میں سے اکثر یہ معلوم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے کہ جدید نفسیات نے تعلیم کی کیا رہنمائی کی ہے۔ جن نوجوان استادوں کو دوران تربیت میں جدید نفسیات کا مطالعہ امتحانی ضرورتوں کے ماتحت کرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے بھی بہت ایسے ہوتے ہیں جو کبھی اس کی عملی کارفرمائیوں کے متعلق سوچنے کی تکلیف گوارا

نہیں کرتے اور مدرسوں میں جا کر پرانی لکیروں میں دھنس کر رہ جاتے ہیں۔

بہت سے استاد ایسے ہیں جو محض بے خبری کی بنا پر ان لکیروں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ ان کی نیت نہایت پاکیزہ ہے مگر جیسا آغاز مضمون میں عرض کیا گیا تھا بے خبری بذات خود ایک بڑا گناہ ہے۔ قرآنی الفاظ ملاحظہ ہوں:۔ "کیا جاننے والے لوگوں کے برابر وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو نہیں جانتے؟" یہ بے خبری اس صورت میں اور بھی زیادہ سنگین جرم کی شکل اختیار کر جاتی ہے جب جاننے کے مواقع قدموں کے ارد گرد بکھرے پڑے ہوں۔ نشر و اشاعت کے اس دور میں کوئی شخص پڑھا لکھا ہونے کے باوجود بے خبر اسی صورت میں رہ سکتا ہے جب وہ آنکھوں پر پٹی باندھ لے اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسا جرم نہیں جو مواخذہ سے بچ جائے۔

دوران ملازمت بالیدگی۔

اس مجرمانہ بے خبری کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے استادوں نے دوران ملازمت بالیدگی کے دروازے اپنے اوپر بند کر رکھے ہیں۔ ملازمت میں داخل ہونے کے بعد نوجوان استادوں کی ایک خاصی تعداد ایسی ہوتی ہے جو مزید امتحانات پاس کر کے بلند تر مقام یا بیش تر معاوضے کی امید رکھ سکتی ہے۔ اس امید میں ان میں سے اکثر نوجوان یونی ورسٹی کے دو ایک امتحان پاس کر لیتے ہیں۔ زاں بعد ذہنی اور فنی بالیدگی کے دروازے عموماً ہمیشہ کے لیے بند کر دیے جاتے ہیں۔ ان کی ذہنی اور فنی بالیدگی کی کشتی "جس جگہ پہ جا لگی وہی کنارہ ہو گیا" کے مصداق ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی کنارے پر اٹک کر رہ جاتی ہے۔ اس فنی جمود کا خمیازہ نئی پود کو بھگتنا پڑتا ہے۔

دوران ملازمت عدم بالیدگی کی ذمہ داری محکمہ تعلیم پر بھی عاید ہوتی ہے جس نے ترقی اور پیش قدمی کے بیشتر مواقع طول ملازمت کے ساتھ وابستہ کر رکھے ہیں۔ طول ملازمت اور سابقہ تجربہ کو آڑ بنا کر ایسے لوگوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جنہوں نے فنی بالیدگی کا ثبوت دیا ہو۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کی قدر و قیمت نہ ہو اس کے حصول کا جذبہ خواہ مخواہ سرد پڑ جائیگا۔

ترقی یافتہ ملکوں میں معاملہ بہت مختلف ہے۔ وہاں طول ملازمت بذات خود کوئی شے نہیں۔ اگر کوئی سالہا سال تک پڑھاتا یا انتظامی کام انجام دیتا ہے اور اس سارے عرصے میں کوئی ایسا کام انجام نہیں دیتا جو اس کی مسلسل فنی بالیدگی پر دال ہو تو یہ طول ملازمت اس کے لیے وجہ ترقی بننے کی بجائے وجہ تنزل بننا چاہیے۔ تعلیم نام ہے بالیدگی کا اور استاد کا کام بچوں کے لیے بالیدگی کی راہیں کھولنا ہے۔ جس شخص نے اپنے اوپر یہ راہیں بند کر رکھی ہوں وہ دوسروں کو

ان کا راستہ کیوں کر دکھا سکتا ہے ؛ جب تک محکمۂ تعلیم ایسے طریقے نہیں ڈھونڈے گا جن پر چل کر استادوں کو مسلسل بالیدگی پہنچایا جا سکے اس وقت تک استادوں کی بے خبری کے خلاف جہاد کیے بغیر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ ہمارے بچے جدید نفسیاتی انکشافات سے اسی طرح مستفید ہونے لگیں گے جس طرح مغرب کے بچے ایک عرصہ سے مستفید ہو رہے ہیں۔

استادوں کی طرح یہ ذمہ داری والدین پر بھی عائد ہوتی ہے۔ بہت سے ایسے والدین ہیں جن کی اپنی تربیت غلط طور پر ہوئی۔ وہ انہی دردکش طور طریقوں کو معیاری تربیت کے گر سمجھ کر نادانستہ طور پر اپنے بچوں کی عزتِ نفس کو ناقابلِ تلافی حد تک صدمہ پہنچاتے ہیں۔ بنیادی نفسیاتی حقائق سے واقفیت ہر ترقی پسند ملک میں استادوں اور والدین کی پہلی ضرورت ہے۔

علوم جدیدہ کی شرعی حیثیت

منظور احسن عباسی

سوال یہ ہے کہ علوم حاضرہ اور سائنس کے تعلیم و تعلم کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟

اس سوال کا جواب موقوف ہے حصول علم کی غرض و غایت اور اس کی افادی حیثیت کی تعیین پر۔ علم کے معنی ہیں جاننا اور حصول علم مستلزم ہے کسی امر مجہول کے تصور کو جس کے جان لینے کو حصول علم کہتے ہیں۔ تعلیم و تعلم ایک ذریعہ ہے حصول علم کا اور ان ذرائع کو استعمال میں لانے کے لیے جس آلہ کی ضرورت ہے اسے قرآن حکیم نے "قلم" سے تعبیر فرمایا ہے۔ قلم ایک وسیع المعنے اصطلاح ہے جس کے مفہوم میں سرکنڈے کے ایک ٹکڑے سے لے کر چھاپہ کی کوہ پیکر مشینوں تک ہر چیز شامل ہے۔

اب ان آیات پر غور کیجیے۔

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۙ

پڑھ! تیرا رب نہایت ہی کریم ہے جس نے حصول علم کے لیے قلم کو واسطہ بنایا اور تب انسان کو وہ کچھ معلوم ہوا جو وہ نہ جانتا تھا۔

ان آیات میں اجمالی طور پر علم۔ تعلیم۔ معلم۔ متعلم۔ آلۂ تعلیم اور مَا لَمْ یَعْلَمْ (مجہولات) ہر چیز کا ذکر ہے۔ اور اسی سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ تمام مخلوقات میں سے انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کو بواسطۂ قلم علم بالتعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت بخشی ہے۔

حصول علم کے اور ذرائع بھی ہیں جن میں بے شمار مخلوق انسان کی شریک ہیں۔ بذریعہ حواس خمسۂ ظاہری بطریق استقراء یا بواسطۂ وجدان فطری نہ صرف حیوانات بلکہ تحقیق حال کے بموجب غالباً نباتات کو بھی بعض باتوں کا علم یا احساس ہے، یہاں تک کہ بعض طیور و دواب آنے والے حادثات اور چند اشیاء کے نامعلوم خواص کو ان کے اسباب و علامات سے کچھ اس طرح جان لیتے ہیں کہ انسان اس ترقی یافتہ دور میں بھی اب تک ان سے نابلد ہے۔ لیکن اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ قلم انسان کے سوا اور کسی مخلوق کا ذریعہ حصول علم نہیں ہے۔ اس قلم

اور اس کی تحریر کو، اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر اس امر کی شہادت میں پیش فرمایا ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم فاتر العقل نہیں ہیں۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۙ مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ۚ

قلم اور اس کی تحریریں شاہد ہیں تو خدا کے فضل سے دیوانہ نہیں ہے۔

یعنی منکرین خدا اور رسول کے علی الرغم حصولِ علم کا ہر ذریعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذی عقل و شعور ہونے پر دال ہے۔ چناں چہ قرآن حکیم یا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے انکار کرنے والوں کو قرآن حکیم نے جاھلون یا لا یعلمون یا لا یعقلون کا مصداق قرار دیا ہے۔ اور شارعؑ نے علم کو دین کا مترادف اور کفر کو جہل کا ہم معنے گردانا ہے۔

مردگی جہل و زندگی دین است ✦ آنچہ گفتند تو ان این است

واضح ہو کہ یہ علوم جو "قلم" کے واسطہ سے انسان کو حاصل ہوتے ہیں وہ یہی علوم متداولہ و متعارفہ ہیں جو انسان کتابوں سے اپنی اکتسابی صلاحیتوں کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ فطری اور اذعانی علوم عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کے مفہوم سے خارج ہیں اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا صرف یہی علم انسانی علم کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھیں علوم مکتسبہ کو جو انسانی کتابوں کے ذریعہ مکاتب و مدارس میں حاصل کرتا ہے، غیر مادی طریقہ سے منجانب اللہ کسی کو حاصل ہو جائے جیسا کہ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (ن ؛ ع ۱۷) کا مفہوم ہے کہ اے پیغمبر ہم نے تجھے (بلا واسطۂ آلات) مجہولات کا علم بخشا۔ ایسی صورت میں ہم اس کو معجزہ کہیں گے یا امرِ خارقِ عادت تصور کریں گے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علومِ مکتسبہ نطق کے خواص میں سے ہیں جس میں کوئی مخلوق انسان کی سہیم و شریک نہیں حتیٰ کہ ملائکہ بھی علومِ مکتسبہ کی صلاحیت سے عاری ہیں اور صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہ ان کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ کیوں کہ ان کا علم ان کی ماہیت میں داخل اور ذاتی خصوصیات میں سے ہے کہ اگر وہ منفک ہو جائے تو ان کا وجود باقی نہیں رہ سکتا۔ برخلاف انسان کے کہ انسان کا علم اس کی ماہیت کا جزو نہیں کہ اس کے موجود و معدوم ہونے پر خود نوعِ بشر کی بقا و فنا کا انحصار ہو۔

ملائکہ تسبیح و تہلیل جانتے ہیں اور مچھلی تیرنا جانتی ہے۔ لیکن چوں کہ یہ علومِ مکتسبہ یا بواسطۂ قلم حاصل شدہ نہیں ہیں اس لیے کسی فرشتہ کا اپنی تہلیل و تسبیح سے عاری ہونا یا کسی مچھلی کا تیرنے سے ناواقف ہونا ممکن ہی نہیں

ہ اگر یہ علم نہ ہو تو فرشتہ رہ سکتا ہے اور نہ مچھلی کو مچھلی کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی بہت سی
فطری یا وجدانی طور پر جانتا ہے۔ مثلاً سانس لینا یا ارادہ کرنا۔ یہ علوم ماہیت انسانی کا ایک جزو ہیں۔ لیکن
علاوہ انسان کے پاس علوم مکتسبہ کا ایک لامحدود ذخیرہ ایسا ہوتا ہے جو اگرچہ اس کی بقائے نوعی کے لیے
ی نہیں لیکن بشر کے سوا کسی اور مخلوق کا خاصہ نہیں ہے۔ یہی وہ علم ہے جس نے انسان کو ملائکہ پر امتیاز
ا۔ علم اسمائ جس کا ذکر قرآن میں ہے وہ انسان کی اسی صلاحیت کا بیان ہے جس سے فرشتے محروم ہے۔
لّمَ اٰدَمَ اَسْمَآءَ کُلَّھَا (یعنی ہم نے تمام اشیاء کے نام آدم کو سکھلا دیے) میں جس
ذکر ہے اس میں تمام علوم مکتسبہ شامل ہیں جو اجمالی یا بنیادی طور پر آدم کو بذریعۂ وحی اور بنی آدم کو بذریعہ
بت اکتسابی حاصل ہوئے اور جن کو بواسطہ قلم و تحریر سیکھا اور سکھایا جاتا ہے اور جس سے فرشتوں نے لاعلمی کا
ف کیا۔

مَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا یعنی علم اسماء کے باب میں جب فرشتوں سے سوال کیا گیا تو انھوں
ہا۔ خدایا ہم تو اس علم سے نابلد ہیں۔ ہمارا علم تو بس اسی فطری علم تک محدود ہے جو تو نے ہمیں سکھایا چونکہ
ان کا علم ان کی فطرت و ماہیت سے خارج کوئی امر نہ تھا اس لیے انسانی علوم سے بیگانگی کا اظہار کیا۔

اب ظاہر ہے کہ یہ تمام علوم جو انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے مختلف الانواع اور لامحدود گوشوں کو
ہوئے ہیں۔ یا جن کا تعلق تہذیب اخلاق اور تدبیر منزل و سیاست مدن اور ان کی بے شمار شاخوں سے ہے۔
میں سے کوئی ایک علم بھی ایسا نہیں جو ملائکہ بہائم یا کسی اور مخلوق کو حاصل ہوا اور نہ ان کی خلقی و نوعی صلاحیتیں
امر کی متقاضی ہیں کہ ان میں سے کسی علم کا حاصل کرنا انھیں ضروری ہے۔ اس کے برعکس انسان کا خلقی ضعف و احتیاج
ضی ہے کہ وہ امن و بقا کے لیے علوم مکتسبہ سے رہنمائی حاصل کرے۔ مثلاً اسے خوراک چاہیے۔ جس کے لیے
نے بونے۔ پیداوار حاصل کرنے۔ پیسنے۔ پکانے اور پھر کھانے کا علم ہونا چاہیے۔ پھر ان میں سے ہر علم بہت سے
ت علوم کا متقاضی ہے۔ مثلاً ایک جوتنے کے لیے آلات کشاورزی کی ضرورت ہے اور ہر آلہ کے لیے علوم نجاری
ارگی سے لے کر موجودہ علوم میکانکی کی تمام فنی مہارت کا حصول اور ادھر زمین کی خواص اور اس کی صلاحیتوں کا زیادہ
زیادہ جاننا ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسانی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل ہو ہی نہیں سکتی۔ یقیناً یہی صورت حال کو

کسی اور مخلوق کے فطری تقاضوں سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ انسان کی اکتسابی صلاحیتوں کی دسترس کہاں تک ہے
اس کا اندازہ لگانا سخت مشکل ہے۔ البتہ آیات قرآنی پر تدبر کرنے سے واضح ہے کہ انسان کا مخصوص علم اشیا ہے
یعنی آدم کو وہ امتیاز بخشتا ہے جو ملائکہ کو ان کی تسبیح و تقدیس میں بھی متصور نہیں ہے۔ چناں چہ جب ملائکہ
آدم کے مقابلہ میں نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ کہہ کر اپنی تسبیح و تقدیس کو خلافت الٰہیہ کے استحقاق
کے طور پر پیش کیا تو اس کو بارگاہ احدیت میں شرف قبول حاصل نہ ہوا۔ بلکہ ان سے کہا گیا کہ تمہارا دعویٰ استحقاق
سچا جبھی ہو سکتا ہے کہ پہلے علم اسماء سے واقف ہونا ثابت کرو۔

اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ یعنی تمہارا دعویٰ سچا ہے تو ان اشیاء کے نام بتاؤ۔

دوسری جانب آدم کو حکم ہوا۔

يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ یعنی اے آدم ان اشیاء کے نام انہیں بتا
فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اب آدم نے سب چیزوں کے نام بتا
اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ تو اللہ نے فرمایا کہ دیکھا! میں نہ کہتا تھا
غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ آسمان و زمین کے اسرار (تمہیں نہیں بلکہ)
کو معلوم ہیں۔ مدعا یہ کہ میں ہی جانتا ہوں کہ استحقاق خلافت کس کو ہے۔

ان آیات سے نہایت واضح طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانی فضل و شرف کا مدار علم اسماء ہے، تسبیح
و تقدیس نہیں ہے۔ اب سمجھنا چاہیے کہ علم اسماء کے کیا معنی ہیں؟ اس لفظ کی تفسیر میں قرآن حکیم کے اولین
حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو دنیا بھر کی چیزوں یہاں تک
کہ پیالہ پیالی وغیرہ تک کے ناموں کا علم دیا۔ غالباً یہ اشارہ ہے بنی آدم کی اکتسابی علوم کی لامحدود صلاحیت
طرف۔ کیوں کہ "تمام" اشیا کا نام جان لینا موجودات عالم کے مخفی سے مخفی گوشہ کا سراغ لگا لینے کے مترادف
ہے۔ اس لیے کہ اسم کا علم مسمّٰی کے علم علوم و متصور نہیں ہو سکتا اور مسمّٰی کا تصور اس کے لوازمات و متعلقات
بغیر ممکن نہیں۔ پس علم اشیاء علم ماہیت و خواص اشیا کو بھی لازم ہے۔ ہم پیالہ کا یہ نام جب جان سکتے

پیالہ کو جانیں اور پیالہ کا جاننا۔ اس کی صورت۔ ہیولیٰ۔ مادہ۔ اور تمام دوسری علل اور اس کے خواص کی واقفیت پر مبنی
ہے۔ اب یہاں پھر یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ علم اسماء الاشیا کا یہ احاطہ انسان کے سوا اور کسی مخلوق کی تقدیر
نہ تھا۔ اسی صلاحیت کو نطق۔ عشق۔ امانت وغیرہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی کو تکلیف کا منشا قرار دیا گیا ہے۔
ں کہ بنی آدم کی اس صلاحیت کو جو اسے ابوالبشر سے ورثہ میں ملی ہے انسان کی دوسری صلاحیتوں کی طرح
رخ انقلاب نہیں رکھا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی ذہن و فراست کو ان تمام علوم مکتسبہ کی لامحدود وسعتوں میں ہر جگہ اور
ں کے ہر گوشے میں جولانی دکھلانے اور سیر و گذر کا حق ہے۔ بلکہ اس خاصہ کو جس نے انسان کو من حیث النوع اشرف
لاقات۔ ملائکہ سے افضل اور ان کا مسجود بنا دیا بعض جھوٹی دنیا انسانیت کی سطح سے نیچے گر جانے کے مترادف ہے لیکن۔
جملہ علوم مکتسبہ کی حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ علوم کو نافع اور غیر نافع یا علم دین و علم دنیا میں تقسیم کر دینا
ں اعتباری ہے۔ حقیقی نہیں ہے۔ کیونکہ علم من حیث العلم نہ مفید ہے نہ مضر اور نہ کوئی علم دین یا دنیا کے لیے مخصوص
جا سکتا ہے۔ بلکہ کسی علم کو مفید یا غیر مفید بنانا یا کسی علم کو دین یا دنیا کے اغراض میں استعمال کرنا کلیۃً ابنائے نوع کے
پنے ارادوں اور ان کی انفرادی نیتوں پر منحصر ہے۔ ہر انسان میں اکتساب علم کی قوت علی اختلاف الاحوال اسی طرح
یت فرمائی گئی ہے جس طرح دوسری قوائے فکر و عمل ہیں کہ انسان ان کو بھلائی یا برائی کے کاموں میں ہر طرح استعمال
سکتا ہے۔ آنکھوں کی بصارت ہو یا علم کی بصیرت دونوں نافع بھی ہیں اور غیر نافع بھی۔ آنکھوں پر یہ پابندی
ں لگائی جا سکتی کہ وہ صرف پھولوں کو دیکھیں اور غلاظت کے ڈھیر کو نہ دیکھیں۔ ایسی صورت میں غلاظت سے دامن
کیوں کر ممکن ہو گا۔ اسی طرح یہ کہنا بھی غلطی ہو گا کہ کلام الٰہی کی معرفت حاصل کی جائے اور دشمنان دین کی تشلیمات سے
خبر ہی رہا جائے۔ ایسی صورت میں خائد سے نجات کس طرح ممکن ہو گی۔ جن لوگوں نے علم کی تقسیم نافع اور غیر نافع
کی ہے ان کا مقصد بھی اس کے سوا نہیں کہ علوم مکتسبہ کو مصالح نفسی و آفاقی میں بکار لانا مفید اور نافع ہے۔ اس کے
ف مضر یا غیر نافع ہے کیا ہم نہیں دیکھتے کہ علم قرآن جیسا دین اور نافع علم بھی صاحب علم کی غلط کاریوں سے خلاف دین
ر نافع ہو جاتا ہے ۔ حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے
دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را

یہاں فقط قرآن جیسے خالص دینی علم کو زندگی دے خواری سے زیادہ قابلِ مذمت بتایا گیا ہے۔ اس کا سبب علم فہمیں اہلِ علم کی بدعنوانی ہے۔ اس کے مقابلہ میں احتساب اور سراغرسانی کے علوم مشتمل ہیں، بے شمار جرائم نفق مجموعہ اور ارتکاب معاصی کے طریقوں کی معلومات پر لیکن اس کی غرض چوں کہ معاشرہ کو اہلِ جرائم کے ہتھکنڈوں سے امن اپنا مخلوق کو بچانا اور ایسے ناپسندیدہ عناصر کا پتہ نکال کر ان کی بیخ کنی کرنا ہے۔ اس لیے یہ علم نہایت نافع ہے اور اگر نیک نیتی سے حاصل کیا جائے تو بلاشبہ علم دین کہلانے کا مستحق ہے لہٰذا فلسفۂ یہ کہہ دینا کہ۔

علم قرآن است و تفسیر حدیث

ہر کہ خواند غیر ازیں باشد خبیث

بہت بڑی زیادتی ہوگی۔ مسلمانوں کے نیک نفس افراد کا ایک طبقہ جن کی نیتوں پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ علوم متداول حاضرہ میں سے اکثر علوم کے حاصل کرنے اور اس میں انہماک کو نہ صرف یہ کہ غیر ضروری تصور کرتا بلکہ دینی مصالح اا انسانی وظائفِ حیات کے منافی خیال کرتا ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ جس طرح ہم نے علوم و تفسیر و حدیث وغ (جن کو اصطلاح میں علوم دینیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے) کے حاصل کرنے کی غایت اور اس کا مقصد متعین کر لیا ہے دُوسر علوم حاضرہ مثلاً ریاضی، طبیعیات و معدنیات وغیرہ کی غایت متعین نہیں کی۔ اس کا مقصد احکام عبادات و شرائع مجرد واقفیت اور نتیجتہً اس پر عمل کرنا ہے۔ لیکن اس کا مقصد ابتداً صرف امتحان پاس کرنا اور بالآخر نوکری یا تجارا وغیرہ ہے۔ ان میں سے کوئی مقصد براہِ راست احیائے دین اصلاحِ عقائد و اعمال، شوکتِ اسلام، تہذیب نفس یا تربیت اخلاق وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اور غالباً اسی لامقصدیت کا نتیجہ ہے کہ علوم جدیدہ کے فارغ التحصیل علماء مذہبی یا اخلاقی زندگی کا کوئی اعلیٰ نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ پس جس علم کا مقصد ہی بلند نہ ہو وہ علم بلند کیوں نہ ہو۔ اگر ہم علوم حاضرہ کے مقاصد کو اخلاقی، ملی یا ملکی مصالح سے وابستہ کر سکیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ بزرگ علوم جدیدہ کی اہمیت کا احساس نہ کریں اور اس میں انہماک کو بھی اتنا ہی ضروری تصور نہ کریں جتنا کہ دوسرے علوم دینیہ کو۔ علم مجرد کی مثال ایک لازوال دولت کی سی ہے کہ اسے اچھے مقاصد میں بھی صرف کیا جا سکتا ہے اور بُرے کاموں میں بھی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض علمی مشاغل بذاتہٖ مضرت رساں اور قابلِ مذمت ہیں۔ لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو

بلکہ لاعلمی اور گمراہی کے ادارے ہیں۔ ان اداروں سے ہماری مراد وہ ادارے ہیں جہاں طالبان علم
پہنچائی جائیں۔ علم کا خاصہ انسان کو حقائق سے قریب تر کر دینا ہے۔ اگر کوئی علم ہم کو حقائق سے دور کرتا
دوسرے سے علم کہنا ہی غلط ہوگا۔ علم شعبدہ بات وکہانت وغیرہات۔ وملاعب یا وہ علوم جن کا
ت کا احیاء۔ عقائد حقہ کا ابطال اور انسانی ذہن وفراست کو صحیح راستے سے ہٹا کر غلط راستوں پر ڈالنا
ہو یا جن کا مدعا اخلاقی اقدار کی قلب ماہیت اور بہیمی یا سفلی رجحانات کی حوصلہ افزائی ہو۔ یا ایسی تاریخ
یا جائے جو ہماری ملی روایات کے خلاف اور دینی شعائر کی تضحیک پر منتج ہوں، یہ سب مشاغل قابل
یہ سب علم کی تعریف میں نہیں آتے۔ ان کے علاوہ وہ تمام علوم جن کی بنیاد ادراک حقائق پر ہو کسی
ح بھی غیر مستحسن نہیں ہیں بلکہ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ایسے ہر علم کے حصول کو جو اپنے حقیقی مفہوم
ت مفید ومنفعت بخش بلکہ منشاء دین کے مطابق اور فریضۂ الٰہی تصور کیا جائے۔ طلب العلم
ل مسلم ومسلمۃ اور اطلبوا العلم ولو کان بالصین وغیرہ احادیث میں جو علم کا لفظ
و مخصوص اقسام علوم میں محدود کر دینے کی بھی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، ضرورت صرف اس کی ہے کہ
ی صلاحیتوں کو انسانی خصائل کے تحفظ اور اس کے نشوونما میں صرف کیا جائے کہ یہی عین دینداری
ہے کہ علوم کے مختلف شعبوں میں ان کی افادی حیثیت کے اعتبار سے ایک درجہ بندی یا ترتیب
ے کہ بعض کو مفید اور بعض کو مفید تر یا بعض کو اصل اور بعض کو فرع قرار دیا جائے۔ پھر یہ بھی کہ بعض علوم
ی اور بعض بالواسطہ مقصود رہیں۔ چنانچہ انھیں دینی مکاتب میں جہاں قرآن وحدیث وفقہ کی
، وہاں صرف ونحو ادب ومنطق کی تعلیم بھی ہوتی ہے۔ کیوں کہ موخر الذکر کے بغیر اصل علوم کی تکمیل
ی حالت میں یہ تعین دشوار ہے کہ ان میں سے کس کو ضروری سمجھا جائے اور کس کی طرف سے
تا ہے۔ اسی طرح علم فرائض (علم تقسیم وراثت) ایک ایسا علم ہے جس کو احادیث میں جملہ
ہ میں سے نصف علم کہا گیا ہے۔ لیکن اس کا حاصل کرنا علم حساب (ریاضی) کے بغیر ناممکن ہے
جاننا بھی اتنا ہی ضروری ہوا جتنا کہ نماز کے لیے وضو ضروری ہے۔
یکھا جائے تو اس وقت تک جس قدر علوم جدید وقدیم کا احاطہ کیا جا سکتا ہے ان سب کی علت غائی

ن نہ کسی اخلاقی معاشری انفرادی یا اجتماعی۔ نفسی یا اخلاقی مصالح سے وابستہ کی جا سکتی ہے، اور پھر ہم ان
م علوم کو دین سے ہی تعبیر کر سکتے ہیں، خواہ اس کی تعلیم مدارس دینیہ میں ہوتی ہو یا سرکاری سکولوں اور کالجوں
ں حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کا بیشتر حصہ ایسے علوم پر نظر غائر رکھنے کی ہدایت کرتا ہے جن کی طرف ہمارے مذہبی
ماقین اور دینی علماء نے بہت کم توجہ دی ہے۔ آسمان وزمین کی تخلیق، لیل ونہار کا اختلاف، بحر وبر کے عجائبات
شتی اور دوسری سواریوں کی کیفیت۔ علم سیارگان، پانی کے خواص۔ زمین کی سرسبزی وشادابی۔ سبزہ واشجار کی روئیدگی
باؤں کے اقسام۔ بارانی ہواؤں کا التزام۔ بادلوں کا ہجوم۔ نہروں کی روانی، پہاڑوں کے فائدے، شب وروز کے
لام اوقات۔ اوقات کی تقویم وتقسیم۔ دواب وبہائم وحشرات کی طبعی ونوعی خواص، ان کی موت وزندگی۔ نور اور سایہ
در بالآخر خود انسان کی اپنی ہستی اور اس کے عجائبات اس کی صلاحیتیں اور امکانات۔ اعضاء وجوارح کی تشریح وتفصیل
سان کے تخلیقی وتولیدی مدارج۔ اس کی روح اور نیند اور بیداری وغیرہ امور جن پر غور وفکر کی قرآن حکیم جا بجا دعوت دیتا
ہے، یہ سب وہی عنوانات تو ہیں تو تمام علوم جدیدہ کے موضوعات ہیں۔ اب کس طرح ممکن ہے کہ ہم ان علوم کے
اصل کرنے کو دینی یا قرآنی ہدایات کے خلاف تصور کریں، اس کے برعکس قرآن حکیم ان علوم سے بے خبر ہونے پر
ہدید فرماتا ہے۔

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت ۵ والی السماء کیف رفعت والی الجبال کیف نصبت ۵ والی الارض کیف سطحت

یعنی (کیسے بے خبر لوگ ہیں) کیا نہیں دیکھتے کہ ہم نے اونٹ کو کیسا عجیب جانور بنایا ہے۔ آسمان کیسا اونچا کیا گیا۔ پہاڑ کیسے جمائے گئے اور فرش زمین کو کیسا بچھایا گیا۔

ان آیات میں صرف اہم اشارات پر اکتفا فرمایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک اونٹ ہی
ایسا جانور ہے جس کے خلقی عجائبات کا علم خالق کی لامحدود قدرت وحکمت کا ایک محیر العقول مرقع پیش کر دیتا ہے
اہل نظر جس قدر بھی عجائبات قدرت کے مطالعہ میں دلچسپی لیتے جائیں گے اس کی بے پایاں وسعتیں نگاہ کے سامنے
آتی جائیں گی۔ پھر کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ علم نباتات۔ یا علم الطیور کی درس گاہیں لادینی یا غیر نافع ادارے ہیں
یا وہ لوگ جو تتلیوں بھنگوں اور کیڑے مکوڑوں کے عمیق مطالعہ اور ان کے خواص وخصائل کی تفتیش میں سرگرم

ہیں کوئی غیر نافع یا خلاف شرع شاغل میں پڑے ہوئے ہیں۔ کلام الٰہی کی بعض آیات کا منشا تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ حال کے جدید ترین علوم کا مطالعہ فرض ہے۔ مثلاً

وَاعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (انفال ع ۷)

یعنی ان دشمنان دین کے مقابلہ کا جہاں تک تم سے بن پڑے تہیہ کرو۔ شلاً اپنی جنگی قوتوں کو بڑھاؤ اور گھوڑے باندھو تاکہ ان پر جو خدا کے اور تمہارے دشمن ہیں اور ان کے علاوہ وہ دشمن جنہیں تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے ان سب پر تمہاری دھاک بیٹھ جائے۔

اب ان آیات کا یہ منشا تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اگر دشمن تیر۔ تفنگ۔ گولہ بارود مشین گنوں اور بموں سے لیس ہے تب بھی ہم صرف گھوڑوں کے باندھنے جوڑنے پر اکتفا کریں اور کیا ایسے ناقص اقدامات سے دشمنوں پر دھاک بندھ سکتی ہے۔ دراصل یہاں گھوڑے کے مفہوم میں اور ما استطعتم کی تصریح سے دشمن کے مقابلہ میں ہرگونہ جنگی سازو سامان سے لیس ہونے کا ذکر ہے۔ اگر تہیہ جنگ میں مشین گنوں جو زہریلی گیسوں اور جوہری بموں سے قطع نظر کر لیا جائے تو یقیناً یہ فریضہ الٰہی سے روگردانی اور سخت نادانی ہوگی۔ قرآن حکیم نے ہرگونہ جنگی قوت کے مقابلہ میں تا بمقدور اُس سے بڑھ کر قوت کے مظاہرہ کا حکم دیا ہے اور یہ جبھی ممکن ہے کہ مسلمانان عالم زمانہ حال کے علوم طبیعات اور روزمرہ ہونے والی نو بہ نو معلومات و ایجادات سے خود کو باخبر رکھیں اور دشمن اقوام سے گوئے سبقت نکال لے جانے میں حسب منشا قرآن ہمہ تن معروف ہو جائیں۔ اس فریضہ سے غفلت دین گمراہی کے مترادف ہے اور ہم بے تکلف کہہ سکتے ہیں کہ اس مقصد اور منشاء کلام الٰہی کے پیش نظر جو علوم حاصل کیے جائیں وہ کسی طرح علوم دینیہ (اصطلاحی) سے کم درجہ پر نہیں رکھے جا سکتے۔ اور نہ ایسی درسگاہیں جہاں مثلاً جوہری قوت کی تحقیقات کی جائے اور اُس کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں، ہماری خانقاہوں اور دینی درسگاہوں سے کم تر تسلیم ہوں گی۔ فی الواقع نہ ان علوم کی شرعی حیثیت علوم دینیہ (اصطلاحیہ) سے کم ہے اور نہ ایسے اداروں کا مقام دینی مدارس سے فروتر۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خود سوچنے کی صلاحیت

عزیز احمد

جو چیز انسان کو حیوانی سطح سے اونچا کرتی ہے وہ سوچنے کی قوت ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے نظام کائنات میں انسان ہی وہ مخلوق ہے جسے قوت فکر عطا کی گئی ہے۔ کائنات کا کارخانہ کس قدر بڑا اور پر ہیبت ہے اس کے مقابلے میں انسان کا وجود کتنا چھوٹا اور حقیر نظر آتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس چھوٹے سے جسم کے اندر ایک طوفانی قوت موجیں مار رہی ہے جو ہر لمحہ یہ پیغام سناتی ہے کہ انسان اپنی ساری مجبوریوں کے باوجود ساری کائنات پر قابو پا سکتا ہے۔ یہ بے پناہ قوت ذہن انسانی ہے اور اسی نے انسان کو اشرف المخلوقات کا مقام عطا کیا ہے۔

جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے ہوش ربا کرشمے اور علوم و فنون کے کوہ پیکر انبار سارے کے سارے انسانی فکر ہی کا پھیلاؤ ہیں۔ مگر ان تمام فکری فتوحات کے باوجود دنیا میں کتنے انسان ایسے ہیں جو حقیقی طور پر اپنے ذہن سے سوچتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ایسے لوگوں کا تناسب کیا ہے جو اکثریت کی پسند کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی سوچنے کی قوت کو معطل کر بیٹھتے ہیں؟

ایک دلچسپ تجربہ

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے حال ہی میں ایک امریکی یونیورسٹی کے چند اساتذہ نفسیات نے مل کر ایک تجربہ کیا۔ تجربہ بالکل سادہ تھا۔ انہوں نے ایک سفید کاغذ پر ایک عمودی لکیر کھینچی۔ پھر ایک اتنا ہی بڑا دوسرا کاغذ لے کر اس پر تین لکیریں کھینچیں۔ ان تین میں سے ایک لکیر پہلے کاغذ کی لکیر کے بالکل برابر تھی اور دوسری دو لکیریں اس کے برابر نہ تھیں۔ دونوں کاغذوں کو ساتھ ساتھ رکھ کر ہر شخص آسانی کے ساتھ بتا سکتا تھا کہ دوسرے کاغذ کی کونسی لکیر پہلے کاغذ کی لکیر کے برابر ہے۔

اب انہوں نے آٹھ طلبہ کا ایک گروہ لیا اور انھیں ان دونوں کاغذوں کے متعلق سب کچھ سمجھا کر کہا جب آزمائش شروع ہو تو پہلی دو مرتبہ درست جواب دینا۔ اس کے بعد جتنی دفعہ بھی پوچھا جائے جواب غلط دینا اور اسی پر

رار کیے جاتا۔

اب ایک ایک کرکے ایسے طالب علموں کی آزمائش شروع ہوئی جنہیں پہلے سے تجربے کے متعلق کچھ معلوم تھا۔ باہر سے ایک نیا طالب علم آتا اور دکھائے گئے گروہ میں آن بیٹھتا۔ اب دونوں کاغذ گروہ کے سامنے رکھ دیے تے اور پوچھا جاتا کہ دوسرے کاغذ کی کونسی لکیر پہلے کاغذ کی لکیر کے برابر ہے۔ اس کی پہچان چنداں مشکل نہ تھی۔ نووارد لڑکا صحیح جواب دیتا۔ چونکہ پہلی دو مرتبہ گروہ بھی یک آواز یہی جواب دیتا۔ اس لیے نووارد کو اپنے جواب کی ت کا مزید یقین ہو جاتا۔ تیسری دفعہ پوچھنے پر گروہ اپنا جواب بدل لیتا۔ نووارد یک دم اپنے آپ کو ایک اور نوکی اقلیت پاتا۔ گروہ اپنی غلطی پر برابر اڑا رہتا۔ نووارد کو بیک وقت دو متضاد قوتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک طرف اس کا اپنا ادراک سے درست جواب تیار ہوتا اور دوسری طرف متحدہ رائے عامہ۔

اس طور پر کل ۱۲۳ طلبہ کی آزمائش کی گئی۔ ان میں سے تین چوتھائی طلبہ نے اپنی پہلی رائے بدل کر گروہ کی آواز کے سامنے سر جھکا دیا۔

ذہنی کیفیت

آزمائش کے دوران میں تمام نوواردوں نے واضح بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ کا ثبوت دیا۔ تجربے کے خاتمے پر ہتھیار ڈال دینے والوں پر جرح کی گئی تو ان میں سے بہتوں کا جواب یہ تھا کہ "میں گروہ سے کٹ کر الگ تھلگ ل کر رہ سکتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دوسروں کی نگاہوں میں احمق نظر آؤں۔ مجھے یہ احساس ضرور تھا کہ میں غلط ہا ہوں..... مگر آخر کار گروہ کو نہ چھوڑنے کی خواہش مجھ پر غالب آگئی۔"

جو لڑکے اپنے درست جواب پر ڈٹے رہے جب بعد میں ان کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ بھی ہتھیار ڈالنے کی حد تک بالکل قریب تھے۔ مثلاً ان میں سے ایک نے کہا "میرے دل میں یہ خطرہ تھا کہ شاید ری نگاہ غلطی کھا رہی ہے۔ میں شاید ایسے زاویہ نگاہ سے دیکھ رہا ہوں جو اوروں سے مختلف ہے..... شاید ری نظر دوسروں سے کمزور ہے۔ بہرصورت دوسروں کے ساتھ ہم نوا ہونا دل کو زیادہ بھلا معلوم ہوتا تھا۔" ایک نے کہا "مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ کئی دفعہ میرے جی میں آیا کہ اپنی ہٹ چھوڑ کر دوسروں کے ساتھ جاؤں..... اگر ان لکیروں کی بجائے جن کو آنکھ واضح طور پر دیکھ سکتی تھی، زندگی کا کوئی عملی سوال ہوتا تو

میں یقیناً اکثریت کے ساتھ مل جاتا۔"

نتائج کی استواری

ان نتائج کے بعد تجربے کے بنیادی خدوخال میں کچھ ردوبدل کر دیا گیا۔ مثلاً یہ کہ سکھلائے ہوئے گروہ نے پہلے غلط جواب دیا اور بعد میں درست جواب دینے لگا۔ اس تبدیلی سے نووارد کے ردّعمل میں کچھ فرق نہ آیا۔ اب گروہ کی تعداد رفتہ رفتہ گھٹائی جانے لگی۔ جب تک گروہ تین اور ایک کی اکثریت میں رہا اس وقت تک نووارد بدستور اس کے آگے جھک جاتا رہا۔ جب گروہ محض دو افراد پر مشتمل رہ گیا تو اس کا دباؤ یک دم گھٹ گیا۔

اب نووارد کو سہارا دینے کے لیے گروہ میں سے ایک کو کہا گیا کہ وہ نگاتار اس کا ہم نوا رہے۔ ایسا کرنے سے نووارد کی قوت مدافعت بہت بڑھ گئی۔ تاہم گروہ کے سامنے گردن خم کر دینے کا کلّی طور پر خاتمہ نہ ہو سکا۔

زاں بعد ہم نوائی کرنے والے رکن سے کہا گیا کہ پہلے آدھے وقت میں نووارد کا ساتھ دے پھر گروہ کے ساتھ مل جائے۔ خیال یہ تھا کہ نووارد کو گروہ کے سامنے ڈٹ جانے کی جو مشق ہو جائے گی وہ اسے باقی آدھے وقت میں مدد دے گی۔ مگر تجربے نے اس امید کو غلط ثابت کر دکھایا۔ جونہی گروہ کے ہم نوا رکن نے ہاتھ کھینچ لیا اور گروہ کی تائید شروع کی نووارد نے بھی اس کے ساتھ ہی پلٹا کھایا اور وہ بھی گروہ کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔

عملی سبق

تعلیم کے لیے اس تجربے کا عملی سبق بے حد اہم ہے۔ زیر نظر تجربے میں موضوع ایسا واضح اور کھلا تھا جس کے متعلق حواس کو کوئی مغالطہ نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود ۳۷ فی صد طلبہ اپنی رائے پر بھروسہ نہ کر سکے اور عوامی رو میں بہ گئے۔ زندگی میں جہاں قدم قدم پر نظریے اور قدریں دست و گریباں ہیں، کتنے لوگ ہیں جو کسی درست رہنمائی کو قبول کر سکتے ہیں؟ انسانی طبیعت کی یہ کمزوری آمروں اور اجتماعیت پسندوں کے ہاتھ میں ایک بے پناہ حربہ بن جاتی ہے۔ وہ ایک گروہ کو خرید کر عوام کو آسانی سے اس کی غوغا آرائی کے ریلے میں بہا لے جاتے ہیں۔

اس تجربے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سیدھی راہ معلوم کر لینے کے بعد اس پر قائم رہنا کتنا کٹھن کام ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا انعام بھی بہت بڑا رکھا گیا ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوا

وَلَا تَحْزَنُوا ..... ترجمہ: جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا پروردگار ہے، پھر وہ اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مت ڈرو اور نہ ہی غم کھاؤ۔ ہم اس دنیا میں اور آخرت میں تمہارے دوست ہیں۔ جو کچھ تم چاہو گے ملے گا۔ اور جس چیز کے لیے آواز دو گے وہ حاضر ہو جائے گی۔"

رائے عامہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے راہ حق کو اختیار کرنا انسان کو چوٹی کے انعام کا مستحق بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے سابقون الاولین کے درجے کو کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکتا۔

یہ اعلیٰ مقامات ہی حقیقی انسانی شرف کے مظہر ہیں، ان کے حصول کی صلاحیت پیدا کرنا تعلیم کی بنیادی غرض ہے۔ مگر آج تعلیم اس مقصد میں کس حد تک کامیاب ہے؟ اس سوال کا جواب کم از کم ہمارے ملک میں بہت مایوس کن ہے۔ تعلیم کی بدولت لوگ اغیار کے آراء و افکار کو پڑھنا اور انہیں طوطے کی طرح دہرانا تو سیکھ لیتے ہیں، مگر اپنے طور پر سوچنا نہیں سیکھتے۔ نتیجہ ایک خوفناک احساس کہتری کی صورت میں ہر ایک کے سامنے ہے کہ ہر ایک کی تمنا یہ ہے کہ قومی مسائل کے بنے بنائے حل درآمد کر لیے جائیں۔ خود حل تیار کرنے کی زحمت شاید کسی کو گوارا نہیں۔

تاہم قومی نجات کی اصل راہ یہی ہے کہ ہم نئی پود کو اپنے طور پر سوچنے کا ملکہ عطا کریں۔ انہیں عملی مثالوں اور تجربوں سے بتائیں کہ انبوہ کی غوغا آرائی میں بہ جانا کس قدر عام اور آسان چیز ہے۔ مسائل زندگی میں یہ امکان اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے کیونکہ ان کی بنیاد بسا اوقات جذبات اور معتقدات پر رکھی گئی ہوتی ہے جن کی ضعیف نظریاتی حدیں اکثر نگاہ کو دکھائی نہیں دیتیں۔

آزاد جمہوری زندگی کے قیام اور بقا کے لیے صحت مند قوت فکر کی آبیاری بے حد ضروری ہے۔ اس کی پہلی شرط آزادیٔ فکر و عمل ہے۔ افراد اور جماعتوں کو آزادی ہونی چاہیے کہ اپنے طور پر مسائل کے حل سوچیں اور ان پر عمل پیرا ہوں، جو گروہ یا افراد اکثریت سے مختلف راہ اختیار کریں، انہیں دلیل و شہادت سے قائل کیا جائے نہ کہ دباؤ اور تخویف سے۔

غیر تدریسی فرائض

ادریس احمد

تدریس کو موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ استاد اس کو پوری توجہ دے سکے۔ نہ صرف یہ کہ وہ پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اسباق تیار کرکے لائے بلکہ اس منصوبے کو بلا روک ٹوک عملی شکل بھی دے سکے۔ آج کل غیر نصابی سرگرمیوں کا بہت چرچا ہے۔ بجا طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ طلبہ کو معلومات سکھا دینا ہی کافی نہیں بلکہ ان میں پسندیدہ عادات و اطوار بھی پیدا ہونے چاہئیں۔ مدرسے کو اس کام کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔ بالغ زندگی میں کام دینے والی چیز عادات و اطوار ہیں کیوں کہ یہ پائدار نوعیت رکھتی ہیں۔ معلومات کا بوجھ حافظے سے زود یا بدیر اتر جاتا ہے۔ نیز نشر و اشاعت کے اس دور میں معلومات کا بوقت ضرورت فراہم کرلینا کوئی مشکل بات بھی نہیں۔ اگر کوئی شخص کردار، محنت، جرأت، عمل، ہمت اور استقلال جیسے اوصاف کا مالک ہے تو وہ زندگی میں جہاں بھی جائے گا کامیاب ہوگا۔

غیر نصابی سرگرمیاں

اس نظریے کے تحت تعلیم کے نصاب کو بے حد کشادہ کر دیا گیا ہے۔ علمی مضامین کے علاوہ اس میں طرح طرح کی مہارتوں اور عملی سرگرمیوں کی گنجائش پیدا کی گئی ہے۔ جدید مدرسہ صرف اس بات پر بس نہیں کرتا کہ طلبہ کو لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب سکھا دے یا انہیں تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ریاضی، ادبیات جیسے علمی مضامین پر قدرت عطا کر دے۔ وہ ان چیزوں کے علاوہ اور بہت سی سرگرمیوں کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ وہ طرح طرح کی کھیلوں، مباحثوں، ڈراموں، سیاحتوں کا بندوبست کرنے کے علاوہ مدرسے میں کئی ایک مجالس، انجمنیں اور کلب قائم ہوں۔ ہر طالب علم بیک وقت ان میں سے کئی ایک کا رکن ہو اور ان کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے۔ والدین اور عوام ایسے مدرسے کو پسند کرتے ہیں جو ان غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ یہ ایک پسندیدہ علامت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم کے وسیع تر مفہوم کو قبول کیا جانے لگا ہے۔

ایک ٹیڑھا سوال | یہاں تک تو بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ان لگاتار

عملی سرگرمیوں کے لیے وقت کہاں سے آئے ؟ مروجہ نصاب میں جو مضامین شامل ہیں وہ مدرسے کا سارا دن پُر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ غیر نصابی سرگرمیوں کے لیے وقت نکالنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ مدرسے کا دن زیادہ لمبا کر دیا جائے دوسری یہ کہ مضامین کو پہلے سے کم وقت دیا جائے۔ مگر ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کو بھی اختیار نہیں کیا گیا پہلی صورت اس لیے قابل قبول نہیں کہ گرمیوں میں موسم اتنا شدید ہوتا ہے کہ اوقات مدرسہ کو زیادہ لمبا کرنا کسی کو پسند نہیں اور سردیوں میں دن اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ غروب آفتاب تک کام جاری رکھے بغیر اوقات مدرسہ میں توسیع ممکن نہیں، دوسری صورت اس سبب سے ناممکن العمل ہے کہ علمی مضامین کا بوجھ ہلکا کیے بغیر ان کو تھوڑا وقت دینا محال ہے۔

اگرچہ سوجھ بوجھ کے ساتھ کثیر محنت کرنے سے ان دونوں صورتوں کے بین بین کوئی راہ ڈھونڈی جاسکتی ہے مگر عملاً ایسا نہیں کیا گیا۔ ہوتا یوں ہے کہ اوقات مدرسہ میں غیر نصابی سرگرمیاں بھی سارا دن چلتی رہتی ہیں۔ استاد متعلقہ کو جس وقت فراغت ملی اس نے اسی وقت طلبہ کو بلا کر غیر نصابی کام شروع کر دیا۔ عموماً وہ اس کے لیے صدر معلم کی اجازت بھی حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن اس سے مسئلے کی نوعیت میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ دوسرا استاد جو محنت سے سبق تیار کر کے لایا ہوتا ہے دیکھتا ہے کہ اس کے کام میں بار بار مداخلت کی جا رہی ہے۔ ایک جماعت میں ابھی وہ سبق کی تمہید ہی باندھ رہا ہوتا ہے کہ چپراسی ایک چٹ پکڑے آدھمکتا ہے۔ "مدرسے کی فٹ بال ٹیم ایک مقامی مدرسے سے میچ کھیلنے جا رہی ہے، کھلاڑی فوراً جمع ہو جائیں" یہ اعلان سنتے ہی دو چار لڑکے ڈیسکوں کو پھاندتے باہر نکل جاتے ہیں۔ استاد سر کھجلاتا ہوا حافظے پر زور ڈالتا ہے کہ سبق کہاں سے چھوڑا تھا۔

دوسری جماعت میں وہ سبق کے عین وسط میں ہوتا ہے کہ ایک لڑکا دروازے پر آن کھڑا ہوتا ہے "جناب مجھے اندر آنے کی اجازت ہے؟" استاد اشارے سے اجازت دے دیتا ہے وہ کھٹ کھٹ سے ڈیسک کی بیٹ گرا کر سب کی توجہ کو منتشر کر دیتا ہے۔ استاد غصے میں پوچھتا ہے "ارے تم کہاں سے آئے ہو؟" جواب ملتا ہے "آج مجلس تاریخ ہڑپا کی سیاحت کو جا رہی ہے، مجھے ماسٹر جی نے سیٹوں کا انتظام کرنے سٹیشن پر بھیجا تھا۔" استاد بے چارہ یہ جواب سن کر چپ ہو جاتا ہے۔ اب دوبارہ سبق کی طرف لوٹنا چاہتا ہے تو ساری سرگرمی کافور پاتا ہے۔

اگلی جماعت میں وہ سوال پوچھنے میں مگن ہوتا ہے جب دفعتاً چپراسی ایک چٹ پکڑے آن ٹپکتا ہے۔

"جن طلبہ نے اب تک فیس معافی کی درخواستیں نہیں دیں اور ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ اپنی درخواستیں اگلے پیریڈ کے ختم ہونے تک دے دیں، اس کے بعد کوئی درخواست نہیں لی جائے گی۔" چپراسی خراماں خراماں کمرے سے باہر نکل جاتا ہے مگر استاد حواس باختہ ہے کہ اس نے سوالات کا سرا کہاں چھوڑا تھا۔ "کیوں بھئی میں کیا پوچھ رہا تھا ...... ہاں تو ......"

خوش قسمتی سے اس کا اگلا پیریڈ خالی ہے تو وہ کاپیوں کا انبار سامنے رکھ کر درستی شروع کرتا ہے۔ ابھی دو تین کاپیاں دیکھ پاتا ہے کہ چپراسی بلائے جان کی طرح پھر سر پر آکھڑا ہوتا ہے اور ہیڈ ماسٹر کا یہ زبانی حکم سناتا ہے کہ فلاں صاحب ایک اضطراری ضرورت کے سبب گھنٹہ بھر کی رخصت لے گئے ہیں، آپ ان کی جماعت میں چلے جائیے۔ استاد بے چارہ جی کڑا کر کے اس کمرے کی راہ لیتا ہے۔

اس کے بعد تفریح کا وقفہ آجاتا ہے۔ لڑکے اچھلتے کودتے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ آس پاس کی دوکانوں کے سامنے جا جمع ہوتے ہیں۔ مگر غریب استاد بازار کو بھاگتا ہے کہ گھر میں فلاں فلاں چیز ختم ہے وہ خرید کر دے آؤں یا شام کے کھانے کے لیے سبزی خرید لوں۔

تفریح کے وقفے کے بعد وہ پھر کسی جماعت میں جا کر کام شروع کرتا ہے کہ دو ایک چھوکرے منہ اٹھائے کمرے میں آداخل ہوتے ہیں۔ "ابے تم دیر کر کے کیوں آرہے ہو؟" استاد قدرے غصے سے پوچھتا ہے۔ "ماسٹر صاحب ہم فٹ بال کا میچ جیت کر آرہے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں آج صبح ہم فلاں مدرسے سے میچ کھیلنے گئے تھے۔" اس پر ساری کلاس کہرام مچا دیتی ہے۔ "ارے کتنے گول سے ہرایا؟" استاد بمشکل تمام اس طوفان پر قابو پاتا ہے۔ اب جو سبق کی طرف واپس لوٹتا ہے تو ذہن سے سرا ہی غائب پاتا ہے۔ آخر یوں توں کر کے سبق کی گاڑی کو پھر آگے دھکیلتا ہے۔ ابھی پہلے انہماک کو پہنچ نہیں پاتا کہ گھنٹی کی آواز سبق کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

بے چارہ استاد سر جھکائے دوسرے کمرے میں جا داخل ہوتا ہے۔ جی کڑا کر کے یہاں پھر سبق میں گرمی پیدا کرتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد دیکھتا ہے کہ اکثر نگاہیں دروازے کی طرف اٹھی ہوئی ہیں، وہ بھی اس سمت میں دیکھتا ہے اور ایک بزرگوار کو دروازے پر کھڑا پاتا ہے۔ سبق چھوڑ کر جلد ان کی طرف لپکتا ہے اور پوچھتا ہے فرمایئے کس سے ملنا ہے؟ جواب ملتا ہے صاحب ملنا ملانا کس سے ہے صرف آپ ہی سے کچھ بات کرنا ہے۔ میرا بیٹا عبدالحمید آپ ہی کے پاس پڑھتا ہے نا! آپ ہی تو آٹھویں الف کو انگریزی پڑھاتے ہیں۔ اس کے نتیجے کی

اطلاع کچھ دن ہوئے مجھے پہنچی تھی۔ انگریزی میں ہمیشہ بہت اچھا ہوا کرتا تھا۔ نہ معلوم اس سال اس کو مدرسے میں توجہ نہیں دی گئی۔ یا شاید کچھ اور سبب ہے۔ وہ انگریزی میں بُری طرح ناکام رہا ہے۔ میں صدر معلم صاحب کے پاس آیا تھا۔ انہوں نے آپ کی طرف بھیج دیا۔

استاد غصے اور گھبراہٹ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ استغاثہ کی اس کہانی کو سنتا ہے، پھر کچھ معذرت خواہانہ کہتا ہے۔ آپ تھوڑی دیر دفتر میں تشریف رکھیں گے، میں یہ سبق ختم کر لوں پھر آپ سے کچھ تفصیلی بات چیت ہو سکے گی وہ بزرگوار جھٹ سے بول اٹھتے ہیں نہ صاحب میں تو دکان اکیلی چھوڑ کر آیا ہوں۔ آپ جانتے ہیں ہمارے پاس اتنا وقت کہاں؟۔

غرض یہ بزرگ پندرہ بیس منٹ تک استاد کا مغز چاٹ کر رخصت ہو جاتا ہے۔ استاد دروازے سے پژمردہ کمرے میں پھر داخل ہوتا ہے اور ایک آہ بھر کر پھر سبق کو ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے کہ سامنے سے چند آوازیں اٹھتی ہیں "ماسٹر صاحب اب تو صرف دو منٹ باقی رہ گئے" ابھی اس سوال پر بات چیت چل رہی ہوتی ہے کہ گھڑیال کی آواز طلبہ کے حق میں فیصلہ دے دیتی ہے۔

اب یہ آخری پیریڈ ہے، استاد صاحب گھٹے گھٹے مردہ جماعت میں داخل ہوتے ہیں۔ دن بھر کھڑے کھڑے ٹانگیں اکڑ رہی ہیں۔ لگاتار شور اور ہنگاموں نے دماغ کو نیم ماؤف کر رکھا ہے۔ مگر "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک" کے مصداق سبق شروع کرتے ہیں، اسے غیر معمولی خوش بختی سمجھیے کہ اس پیریڈ میں کوئی چیز سبق میں مداخلت نہیں کرتی۔ مگر استاد صاحب کے جوش عمل کا چراغ خود ٹمٹا رہا ہوتا ہے، کھینچ تان کر پیریڈ کو پورا کرتے ہیں۔ چھٹی کی گھنٹی بجنے پر سر جھکائے گھر کی راہ لیتے ہیں۔ اب جو نگاہ پیچھے ڈال کر دن بھر کی کارگذاری کو تولتے ہیں تو اس کا پلڑا بے حد ہلکا پاتے ہیں، اور اپنے آپ کو کوس کر کہتے ہیں۔ کیا کیا جائے؟ یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ نت نئی مداخلتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ہر روز اسباق کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

زائد فرائض

یہاں تک صرف ان مخل اندازیوں کا ذکر تھا جو محض اتفاقیہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کے متعلق کوئی استاد پہلے سے تیار نہیں ہو سکتا۔ مگر ان کے علاوہ استاد کے فرائض کی ایک اور لمبی فہرست بھی ہے جو اس کے ہوش و حواس ختم کرنے کے لیے

بذات خود کافی ہے۔

ہر استاد کو طلبہ کی حاضری کا ایک رجسٹر حوالے کیا جاتا ہے۔ اسے نہ صرف اپنی جماعت کی روزانہ حاضری اس میں درج کرنا ہوتی ہے بلکہ طلبہ سے فیسیں اور جرمانے جمع کرکے بھی اس میں درج کرنے ہوتے ہیں۔ ہر مہینے کے پہلے دس دن فیس کی وصولی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس تاریخ تک طلبہ بلا جرمانہ فیس ادا کر سکتے ہیں۔ استاد پہلی تاریخ سے یاد دہانی شروع کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ فیس ٹپکنا شروع ہوتی ہے۔ دس تاریخ کو وصولی خوب زور پر ہوتی ہے۔ ازاں بعد بیس تاریخ تک پھر تھوڑی بہت وصولی چلتی رہتی ہے، کیوں کہ اس تاریخ تک فیس ادا کرنے سے نام خارج نہیں ہوتا۔ دیر سے فیس ادا کرنے والے طلبہ کو بھی لگاتار یاد دہانی کرانا پڑتی ہے، استاد جانتا ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی لڑکے کا نام فیس نہ دینے کے سبب خارج کرنا پڑا تو صدر معلم سر ہوں گے کہ وہ آپ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ لڑکے سے وقت پر فیس منگوالیں۔ اگر بفرض محال صدر معلم کو تعداد طلبہ سے دلچسپی نہ بھی ہو تو بھی خود استاد کی اپنی بھلائی اسی میں ہے کہ کسی کا نام خارج نہ ہونے پائے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ جس کا نام خارج ہو گیا وہ غالباً کچھ دنوں بعد دوبارہ داخل ہونے آئے گا اس کو داخل کرنے سے انکار نہیں کیا جا سکے گا اور غریب استاد کو نام خارج کرنے اور داخل کرنے کی دوہری مدد سریں سے خواہ مخواہ گذرنا پڑے گا۔

رجسٹر حاضری کے علاوہ مدرسے کے چند استادوں کے پاس داخل خارج کے رجسٹر ہوں گے۔ مدرسے میں جو طلبہ داخل ہوں یا جو مدرسے چھوڑ جائیں ان سب کے ریکارڈ انہیں تیار کرنے ہوتے ہیں۔ یہ کام ایسا لمبا ہے کہ شاید کوئی دن ایسا گذرے جب کچھ لڑکے داخل یا خارج نہ ہوں۔ مدرسہ چھوڑنے والے طلبہ کے سرٹیفکیٹ اس استاد کو بنانے پڑتے ہیں جس کی جماعت میں وہ پڑھتے ہوں۔ اس طرح رجسٹر حاضری کے علاوہ ہر استاد کو داخلے اور خارج کرنے کا تھوڑا بہت کام بھی سال بھر کرتے رہنا پڑتا ہے۔

مدرسے کے ان اہم ریکارڈوں کے علاوہ کئی دوسرے اہم حسابات ہیں، جو استادوں ہی کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔ یونین فنڈ، طبی فنڈ، ریڈ کراس فنڈ اور طرح طرح کی دوسری رقوم استادوں ہی کے ہاتھوں جمع ہوتی اور خرچ ہوتی ہیں۔ ہر فنڈ کسی ایک استاد کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے۔ اسے نہ صرف اس کے آمد و صرف کا حساب رکھنا ہوتا ہے۔ بلکہ ان کے سلسلے میں اور بھی طرح طرح کے درد سر مول لینے پڑتے ہیں۔ سالانہ محاسبہ کے وقت ذمہ داری

تمام تر اس کی گنی جاتی ہے۔ اسے اپنا حساب بھی پاک رکھنا ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ صدر معلم اور دوسرے با اختیار لوگوں کے مطالبے بھی پورے کرتے ہوتے ہیں۔ دونوں میں سے کسی سمت میں کوتاہی اس کے لیے جان کی لاگو ثابت ہو سکتی ہے۔

ان گوناگوں مصروفیتوں کے علاوہ مدرسے کا کتب خانہ ہے۔ اس کے لیے کوئی الگ آدمی مقرر نہیں ہوتا۔ ہر استاد کو اپنی جماعت کے کتب خانے کا ذمہ دار خود ہونا پڑتا ہے۔ لڑکے کتابیں پڑھیں یا نہ پڑھیں ان کی طرف سے ...... کتابوں کا مطالبہ لگاتار جاری رہتا ہے۔ غریب استاد کو کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر یہ مطالبہ پورا کرنا ہی پڑتا ہے جس استاد کے ذمے مدرسے کے سارے کتب خانہ کا کام ہو اس کی پوری توجہ جذب کرلینے کے لیے صرف یہی ایک کام کافی ہے۔ ذرا سی بھول چوک اس کی عمر بھر کی کمائی کو بہا لے جا سکتی ہے ......، دوسرے استادوں کو عموماً اس کے بخل کی شکایت رہتی ہے کہ وہ طلبہ کو براہِ راست کتابیں جاری کرنے سے ہچکچاتا ہے۔ وہ غریب اپنی جگہ ہراساں رہتا ہے کہ اگر کچھ لڑکے کتابیں واپس کیے بغیر مدرسہ چھوڑ گئے تو میں ان کا کیا بگاڑ لوں گا۔

قریباً قریباً یہی حال ان استادوں کا ہوتا ہے جن کے ذمہ مدرسے کے سازوسامان اور سائر اخراجات کا چارج ہوتا ہے۔ سامان مدرسے میں پڑا رہتا ہے اور چوبیس گھنٹے ذمہ داری اس کے انچارج کی شمار کی جاتی ہے۔ سائنس ماسٹر اور ورزش ماسٹر کو اپنے اپنے سامان کی ذمہ داری سے تعلق ہوتی ہے۔ غرض مدرسے میں ماسوا صدر معلم کے کوئی ایسا استاد نظر نہیں آئے گا جس کے پاس تدریسی کام کے علاوہ بیک وقت ایک سے زیادہ قسم کا حساب کتاب نہ ہو۔ اس حساب کتاب کو ٹھیک ٹھاک رکھنا ایک ایسی مہارت چاہتا ہے جس کی تربیت نہ سکولوں کالجوں میں دی جاتی ہے اور نہ استادوں کی تربیت گاہوں میں۔ مدرسے کی زندگی میں قدم رکھنے کے فوراً بعد ہر استاد کو یہ دردناک احساس ہونے لگتا ہے کہ اس سے اس قسم کا کام بھی لیا جائے گا جس کے لیے اسے تیار نہیں کیا گیا۔ مگر یہ کام اس کے فرائض منصبی میں گنا جاتا ہے۔ کئی صدر معلم اس کام کو تدریسی کام پر بھی فوقیت دیتے ہیں۔ چارو ناچار ہر استاد کو یہ روح کش بوجھ قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ بوجھ اس کے تدریسی کمال کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔

لامتناہی مطالبے

یہ غیر تدریسی فرائض پہلے ہی کیا کم روح کش تھے مگر حالیہ سالوں میں ان کی شدت ایک ہولناک صورت اختیار کر گئی ہے جبکہ اعداد و شمار کا دور ہے۔ حکومت اپنی کارگزاری کا تصوّر دلانے کے لیے آئے دن طرح طرح کے اعداد و شمار

طلب کرتی رہتی ہے۔ صوبائی اور قومی حکومتوں کے علاوہ اب ایک عالمگیر ادارہ بھی اقوام متحدہ کے نام سے قائم ہے اس ادارے کی مختلف شاخیں تعلیم اور رفاہ عامہ کے متعلق اعداد و کوائف جمع کرتی رہتی ہیں۔ اعداد و شمار کے ان تمام چالانوں کا بیشتر بوجھ بے چارے استاد کی پیٹھ پر لادا جا رہا ہے۔

صدر دفتروں سے استفسارات کی ایک دائمی ندی ہر وقت استفسارات اگلتی رہتی ہے جو مختلف کلاسوں میں بیٹھے ہوئے کمرۂ جماعت کا رخ کرتے ہیں۔ استاد اپنی نگاہ [illegible]۔ پرنسپلوں اور غیر تدریسی ذمہ داریوں سے جو وقت بچایا جاتا تھا، اس کا بڑا حصہ اب ان کی نذر ہونے لگا ہے۔ سبق پڑھانے کی جو تھوڑی بہت مہلت اسے ملتی ہے اس کے دوران میں اس کے پاس لمبے چوڑے گشتی مراسلے پہنچ جاتے ہیں جن پر سرخ سیاہی سے لفظ "ضروری" لکھا ہوتا ہے۔ ان لمبے چٹھوں کو بار بار پڑھنے کے بعد استاد رجسٹروں اور فائلوں کے ڈھیروں میں کھو جاتا ہے اور جماعت کو اپنے حال پر چھوڑے رکھتا ہے۔

تدریسی معیاروں کو اونچا کرنے کے لیے جہاں اور قدم اٹھائے جا رہے ہیں وہاں اس مرض کا علاج بھی ہونا چاہیے۔ جب تک مؤثر تدریس کے لیے استاد کو وقت مہیا نہیں کیا جاتا اس وقت تک اعداد و شمار جمع کرنا ایسا ہی ہے جیسے گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا۔

مطالعہ زیر ہدایت اور گھر کا کام

زبیدہ بانو

تدریس میں بڑی غایت یہ ہوتی ہے کہ طالب علم خود کچھ کرنے کے قابل ہو جائے۔ جدید طریقہ ہائے تدریس اس نظریے پر قائم ہیں کہ خود طالب علم کے اندر خواہش پیدا ہو، اس کی نگاہ نئی چیزیں دیکھنے لگے اور وہ کچھ سرگرمیوں میں حصہ لے۔ یہ سرگرمیاں ایسی ہوں جو تدریس کی براہ راست پیداوار ہوں اور طالب علم کے لیے طمانیت کا سبب ہوں۔ تدریس کے تمام مؤثر طریقوں میں ان اجزا کا ہونا ضروری ہے۔

استاد کا کام

روایتی طریقہ ہائے تدریس میں یوں کہا جاتا ہے کہ استاد نے کوئی نیا طریقہ سکھایا اور اس کے بعد گھر پر کرنے کے لیے کچھ کام دے دیا۔ اس کام کے متعلق طالب علم کو کوئی عملی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ جس طرح چاہیں اور جس کی مدد سے چاہیں اس کام کو انجام دے لیں۔ اگر کوئی طالب علم اچھا ذہین اور محنتی ہے تو وہ یہ کام خود کرے گا۔ باقی لڑکے یہ کام کسی کتاب یا خلاصے کی مدد سے یا نجی استاد کی مدد سے کریں گے۔ جنھیں اس قسم کی کوئی سہولت ہاتھ نہ آ سکے۔ وہ ساتھیوں کے کام کی نقل کر لیں گے۔ ان تمام صورتوں میں چند تیز فہم طلبہ کے سوا باقی کسی کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ تدریس کی اصل غرض بالکل فوت ہو جاتی ہے۔

جدید طریقے اس بات کا لحاظ رکھتے ہیں کہ جو کام کسی طالب علم کے ذمے لگایا جائے وہ اس کی استعداد کے اندر ہو۔ نیز اسے اس کے متعلق تفصیلی ہدایات دے دی جائیں۔ تاکہ وہ خود کسی دوسرے کی مدد کے بغیر یہ کام پورا کر سکے۔ چونکہ مختلف طلبہ کی استعداد میں کافی فرق ہوتا ہے اس لیے سب کو ایک ہی کام نہیں دیا جا سکتا۔

یہ غرض پوری کرنے کی مثالی صورت تو یہ ہے کہ استاد ہر طالب علم کا انفرادی مطالعہ کرے۔ وہ اس کی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کا جائزہ لے۔ وہ اسے اپنے مقاصد طے کرنے میں مدد دے۔ وہ اس کے سامنے اس قسم کا علمی اور عملی مواد پیش کرے جو اس کی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ وہ اس کے سامنے ایسے مسائل پیش کرے

جو اس کی طبعی پیاس کو بھڑکائیں۔ وہ اس کو اس قسم کے ذاتی مراسم قائم کرنے میں مدد دے جو اس کے جوہروں کے ابھرنے کا سامان بہم پہونچائیں، وہ اسے ایسے وسائل و ذرائع ڈھونڈھنے میں مدد دے جو اس کے مقاصد کے لیے آلۂ کار بن سکیں۔ غرض جدید طریقہ ہائے تدریس استاد کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ بچوں کے ذمہ ایک کام لگا کر خود چلمن سے میٹھا رہے اور اگلے روز اس کام کی پڑتال ڈنڈے سے مسلح ہو کر کرے۔ یہ ایک منفی اور تخریبی طریق کار ہے۔ جدید طریقے استاد سے مثبت اور تعمیری کام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ اسے ہر اس سرگرمی میں برابر کا شریک دیکھنا چاہتے ہیں جو طلبہ کے ذمے لگائی جائے۔

طلبہ کا طریق کار

جب استاد وہ سب کچھ کرے جس کا مطالبہ نئے طریقہ ہائے تعلیم کرتے ہیں تو پھر مقررہ کام کو سرے تک پہنچانا طلبہ کا کام ہے۔ اس مطلب کے لیے مختلف طلبہ مختلف طریقے استعمال کریں گے تاہم استاد کو چاہیے کہ ان طریقوں سے باخبر ہو تاکہ وہ کم زور بچوں کو وقتاً فوقتاً ایسے طریقہ ہائے کار کی ترغیب دیتا رہے جو ان کے ہوشیار ساتھی استعمال کرتے ہیں ثانوی مدرسوں میں جدید طریقہ ہائے تدریس پر پڑھائے جانے والے طلبہ عموماً مندرجہ ذیل طریق کار اختیار کرتے ہیں۔

(۱) کام کو ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کا پورا فہم حاصل کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر حساب کی کوئی مشق حل کرنا مقصود ہے تو طالب علم پہلے یہ سمجھ لے گا کہ اس میں کون کون سے قاعدے استعمال ہونے والے ہیں۔

(۲) جہاں کام تحریری قسم کا ہو وہاں یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے کمل فقروں کی صورت میں ظاہر کیا جائے۔ ادھورے فقرے کسی صورت میں استعمال نہ ہوں۔

(۳) قدم آگے بڑھانے سے پہلے تمام پچھلے اقدام کا پورا فہم پیدا کر لیا جائے۔

(۴) کام میں جن کلیوں اور نقشوں سے مدد لی جائے ان کا پورا فہم حاصل ہو۔

(۵) کام کو قدرتی اکائیوں میں بانٹ لیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ جب اور جہاں جی چاہا دم لینے کے لیے رک گئے۔

(۶) پڑھتے وقت نوٹ نہ لیے جائیں، اگر نوٹ لینے ضروری نظر آئیں تو وہ دوسری قرات پر لیے جائیں پہلے ایک بار پورا فہم کر لیا جائے۔

(۷) جو قاعدے اور کلیئے اخذ کیے جائیں وہ ٹھوس مثالوں کی مدد سے حاصل ہوں۔

(۸) کام کے لیے جس سامان کی ضرورت ہو وہ سارے کا سارا پاس موجود ہو۔
(۹) پچھلے اسباق میں جو حقائق سیکھے گئے تھے وہ پیش نظر رکھے جائیں۔
(۱۰) جو کچھ پڑھایا جائے اس کے تمام نکات کا پورا احاطہ کر لیا جائے۔

زیر رہنمائی مطالعہ

ترقی یافتہ مدرسوں میں اس بات کے لیے بھی وقت نکالا جاتا ہے کہ طلبہ کی ایک جماعت بیک وقت کتب خانہ میں بیٹھ کر مطالعہ کرے۔ اس مطالعہ کے دوران میں استاد نگرانی اور رہنمائی کا کام انجام دیتا ہے۔ مگر اب اس پاسبانی کے خلاف بھی ردعمل شروع ہو چکا ہے۔ بعض ترقی پسند استاد اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ وہ پولیس کے سپاہی کی طرح طالب علموں کے سر پر کھڑے رہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ یہ خدمت بھی خود طلبہ ہی کو سونپ دینی چاہیے۔ مجلس طلبہ اس معاملے کو ہاتھ میں لے۔

یہاں یہ وضاحت کر دینی چاہیے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں طلبہ انتظام مدرسہ میں سرگرم حصہ لیتے ہیں۔ وہ آزادانہ طور پر نمائندے چنتے ہیں۔ جو "حکومت طلبہ" یا "مجلس طلبہ" کے اراکین بنتے ہیں۔ مدرسے کے تمام انتظامی امور میں ان نمائندوں کی آواز کو وزن دیا جاتا ہے۔ استادوں کا کہنا ہے کہ کتب خانہ میں جماعتی مطالعہ کی نگرانی بھی طلبہ کے ان نمائندوں کے سپرد ہونی چاہیے تاکہ مطالعہ کرنے والے کوئی خارجی دباؤ محسوس نہ کریں۔

جن مدرسوں نے یہ طریقہ اپنایا ہے انہوں نے "اعزازی قارئین" کے نام سے طلبہ کی ایک جماعت پیدا کی ہے۔ یہ وہ طالب علم ہیں جو اپنے آپ کو اس مطلب سے پیش کرتے ہیں کہ وہ استاد کی نگرانی کے بغیر اپنے ایک ساتھی کی رہنمائی میں پورے سکون و ضبط کے ساتھ مطالعہ کریں گے۔ جو طلبہ اس اعزازی گروہ میں شامل ہونا چاہیں ان کی درخواست پر استادوں اور طلبہ کی مشترکہ مجلس غور کرتی ہے۔ اگر یہ مجلس منظوری دیدے تو طالب علم "اعزازی قارئین" کی جماعت کا رکن بن جاتا ہے۔ اس جماعت کی رکنیت ایک بڑا اعزاز شمار ہوتی ہے۔

تاہم استاد تصویر سے غائب نہیں ہوتا۔ وہ پاس کے کمرے میں بیٹھا رہتا ہے۔ طالب علموں کو اجازت ہوتی ہے کہ جس نکتے کی وضاحت چاہیں استاد سے رجوع کر لیں۔ اگر استاد محسوس کرے کہ کسی نکتے کی تشریح سب کے لیے ضروری ہے تو وہ کتب خانے میں جا کر سب کو اس تشریح سے مستفید کر سکتا ہے یا سب کو ہدایات دے سکتا ہے۔

یا انہیں جماعتی مشق کرا سکتا ہے۔

بعض مدرسوں نے مطالعہ زیرِ رہنمائی کا اہتمام کتب خانے کی بجائے کمرۂ جماعت میں ہی کرنا شروع کر دیا ہے۔ طالب علم اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے یہ کام کرنے لگتے ہیں۔ اس غرض کے لیے ایک پیریڈ مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ جہاں تدریس کی کوئی اکائی اگلا تار کئی دنوں یا ہفتوں تک مسلسل چلی جائے وہاں یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ طلبہ کو موضوع پر مطالعہ زیرِ نگرانی کا موقع دیا جائے۔

اگر مطالعہ زیرِ رہنمائی سے موزوں طور پر کام لیا جائے تو اس سے طلبہ کو باشعور مطالعہ کا ڈھنگ آجاتا ہے۔ انہیں یہ پتہ چل جاتا ہے کہ کسی قاعدے کی صحت مند مشق کرنے کا طریقہ کیا ہے، وہ نامکمل کام کو پورا کرنا سیکھ جاتے ہیں، تفریح کے لیے پڑھنے کا مطلب سمجھ جاتے ہیں اور یہ جان لیتے ہیں کہ کس طرح مختلف سرگرمیوں کو ایک نظم کے تابع لایا جا سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ دیا ہوا کام ایک تخلیقی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ جب یہ منزل قریب آ پہنچے تو اس وقت کمرۂ جماعت یا سائنس کی تجربہ گاہ میں کام کرنا زیادہ سود مند ہوتا ہے۔ ان دونوں مقامات پر استاد کی رہنمائی بدستور باقی رہے گی خواہ وہ نگرانی کا کام طلبہ ہی کو سونپ دے۔

گھر کا کام کتنا ہو۔

ہر استاد کے سامنے ایک اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کو گھر کا کام کس قدر دیا جائے۔ اس سوال کا جواب عام طور پر طلبہ کی عمر اور مضمون کی نوعیت پر ہوگا۔ چھوٹے بچوں کو حتی الامکان بہت تھوڑا کام ملنا چاہیے، جبکہ سیانے بچوں پر اس کا بوجھ نسبتاً خاصا ہونا چاہیے۔ اسی طرح ایسے مضامین میں جن میں مشق چاہتے ہوں زیادہ کام دیا جائے مگر جہاں الجھے ہوئے مسائل کا حل تلاش کرنے کی ضرورت پیش آئے وہاں کام بہت ہلکا ہونا چاہیے۔ مثلاً غور کی مشق کے لیے گھر پر کام دینا الجبرے یا ہندسے کے سوالوں کے مقابلے میں زیادہ معقول طریق کار ہے۔

ان مسلمہ اصولوں کے باوجود ترقی پسند مدرسوں میں بھی گھر کے کام کے بارے میں مختلف طریقے رائج ہیں۔ بعض مدرسوں میں سیانے طلبہ کو بھی سرے سے گھر کے لیے کچھ کام نہیں دیا جاتا۔ بعض مدرسوں میں بچوں کو بھی گھر کا کام ملتا ہے۔ اسی طرح بعض موزوں میں اس کام کی مقدار بالکل برائے نام ہوتی ہے۔ مگر بعض میں یہ کام خوب بوجھل ہوتا ہے۔

بعض اساتذہ یہ احتیاط بھی نہیں برتتے کہ طلبہ کو دیے گئے کام کی علت غائی کے متعلق اچھی طرح سمجھا دیں علاوہ کہہ دیں گے کہ گھر سے کتاب کا فلاں فلاں باب پڑھ کر آنا۔ مگر وہ یہ تشریح نہیں کریں گے کہ یہ ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے۔ یا اس مطالعہ میں نگاہ خصوصیت کے ساتھ کن باتوں پر رہنی چاہیے۔

ظاہر ہے کہ ایسا کرنے سے گھر کے کام کی اصل غایت پوری نہیں ہوتی۔ یہ کہہ دینا بالکل کافی نہیں کہ اتنے صفحات گھر سے دیکھ کر آنا۔ اس کے ساتھ ہی مندرجہ ذیل باتوں کا معلوم کرنا طلبہ کے ذمہ لگانا چاہیے۔

(۱) کون کون سے نکات اہم ہیں۔

(۲) مقررہ صفحات کا مرکزی استدلال کیا ہے؟

(۳) جزئیات کو مرکزی استدلال کے ساتھ کس طرح مربوط کیا گیا ہے؟

(۴) مرکزی استدلال سے کیا نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں؟

(۵) موضوع زیر بحث سے کون کون سے نئے سوال ذہن میں پیدا ہوتے ہیں؟

(۶) نئے موضوع اور سابقہ اسباق کے درمیان کیا رشتہ ہے؟

(۷) نئی معلومات سے زندگی میں کیا کام لیا جا سکتا ہے؟

غرض گھر پر جو کچھ پڑھنے کو دیا جائے اس کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ کو طرز شدہ صفحات سے مفید باتیں اخذ کرنے کا ڈھنگ آ جائے، وہ ایسی کارآمد ذہنی عادتیں اختیار کریں کہ بعد کی زندگی میں جب کچھ پڑھیں تو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اس کے برعکس اگر طلبہ کو بلا سوچے سمجھے پڑھنے یا پڑھ کر رٹنے پر مجبور کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ اس سے الٹ ہوگا، طلبہ پڑھنے سے متنفر ہو جائیں گے۔ بعد کی زندگی میں وہ تفریحی شغل کے طور پر کوئی کتاب پڑھنا پسند نہیں کریں گے۔

امتحانوں کی نوعیت

کارِ مطالعہ کی عادت کا بہت کچھ انحصار اس بات پر ہے کہ طلبہ کو کس قسم کے امتحانات دینے پڑتے ہیں۔ اگر طلبہ کے لیے ایسے امتحانات پاس کرنا ضروری ہوا جن میں رٹنے ہی سے کام چلتا ہے تو وہ مطالعہ کرتے وقت ساری توجہ جزئیات کے اخذ کرنے پر صرف کریں گے۔ وہ ان جزئیات سے کام لینے کی طرف کوئی توجہ نہیں دیں گے۔ اگر اس کے برعکس

امتحانات اس نوعیت کے ہوں کہ مسائل کو حل کرنا پڑے اور حقائق کی جزئیات سے کام لینا پڑے تو ایسی صورت میں طلبا کی دلچسپی اس بات میں ہو گی کہ حقائق کے مابین کیا باہمی علاقہ ہے ان سے کیا عام نتیجے نکالے جا سکتے ہیں اور نتائج کی عملی اہمیت کیا ہے۔

مطالعہ کی عادات کا کچھ انحصار اس بات پر بھی ہے کہ گھر کے لیے کس نوعیت کا کام دیا جاتا ہے۔ اگر یہ کام ایسا ہے کہ آنکھیں بند کیے کیا جا سکے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ کئی طلبہ نقل کرنے پر اکتفا کریں گے۔ اس کے برعکس اگر کام ایسا ہے کہ اس میں سوچ بوجھ اور ذاتی اپچ کی ضرورت ہے تو بہت زیادہ امکان یہ ہے کہ مطالعہ کی پسندیدہ عادات پیدا ہوں گی۔

والدین کی مدد

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا والدین کو چاہیے کہ گھر کا کام کرنے میں بچوں کو مدد دیں۔ تحقیقی مطالعوں نے ثابت کیا ہے کہ اس قسم کی مدد کچھ زیادہ سود مند ثابت نہیں ہوئی۔ بعض والدین مدد کرتے کرتے بچوں کے لیے ذہنی الجھن کا موجب بن جاتے ہیں، وہ بچوں کو ان طریقوں پر کام کرنا سکھاتے ہیں جو خود ان کے اپنے زمانے میں مروج تھے۔ مدرسے میں ان سے مختلف طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔ بے چارے بچے پریشانی میں مبتلا ہو کر رہ جاتے ہیں کہ کون سے طریقے کو اپنائیں۔ بعض والدین مدد دینے کی یہ صورت اختیار کرتے ہیں کہ بچے پر غیر ضروری دباؤ ڈال کر اسے بٹھائے رکھتے ہیں۔ یہ صورت بھی پسندیدہ نہیں۔ غیر ضروری دباؤ ہمیشہ غیر پسندیدہ ردعمل پیدا کرتا ہے۔ جس بچے کو تشدد کے ساتھ کام کرنے پر مجبور کیا جائے گا، وہ اس کام سے نفرت کرنے لگے گا۔ ایسے والدین بھی موجود ہیں جو بچوں کی مدد یوں کرتے ہیں کہ مدرسے سے جو کام ملا ہو وہ خود کر دیں۔ یہ مرتگا غیر واجب ہے۔

والدین بچوں کی بہترین مدد اس طور پر کر سکتے ہیں کہ انہیں اصول اور طریقے سمجھا دیں اور پھر انہیں خود کرنے دیں۔ وقتاً فوقتاً اس کام کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہیں۔ اس حد سے آگے جانا بجائے فائدہ کے نقصان کا باعث ہے۔

ذہنی صحت

روایت پرست تعلیم کا یہ اعتقاد تھا کہ بچے جتنا عرصہ جاگتے رہیں انہیں پڑھنے لکھنے کے کام میں لگائے رکھنا چاہیے۔ اسی خیال کے پیش نظر طلبہ کو گھر کا کام اس قدر زیادہ دیا جاتا تھا کہ انہیں کسی اور طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے

لت نہ ملے۔ مختلف مضامین کے اساتذہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کام دینے کی کوشش کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا
لنت اور دیانت سے کام کرنے والے طلبہ کو گھر پر اس کام کے علاوہ کسی اور چیز کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔
ہ آرام پسند طلبہ ایسے ساتھیوں کی نقل پر بھروسہ کرتے تھے۔

یہ صورت حال ذہنی صحت کے اعتبار سے سخت نقصان دہ ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کے لیے صرف اس قدر
ی نہیں کہ وہ لکھنا پڑھنا سیکھ جائیں یا بعض معلومات اور مہارتیں اخذ کرلیں۔ انہیں تمام زندگی گردوپیش کے معاشرے
ں بسر کرنی ہے۔ انہیں اس معاشرے کا تجربہ حاصل ہونا چاہیے۔ انہیں اس بات کے مواقع ملنے چاہئیں کہ معاشرتی زندگی
ں سمجھ لیں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ موقع بھی ملنا چاہیے کہ تفریحی مشاغل میں حصہ لینے کی قدرتی خواہش کو موزوں طریقہ
ا کرسکیں۔ مثلاً اگر کنبے کے افراد چھٹی کے دن تفریح کے لیے باہر جارہے ہیں اور طالب علم کو مدرسے کے کام نے
بھا رکھا ہے تو یہ بات اس کی طبیعت پر ایک روح کش بوجھ ثابت ہوگی۔ اگر طالب علم کو پھولوں اور پودوں سے دلچسپی
ہے، مگر مدرسے سے کام ملتا ہے کہ اسے یہ شوق بجبر کچلنا پڑتا ہے تو پڑھائی کا یہ کام کوئی فائدہ مند خدمت انجام نہیں
ے رہا۔

غرض گھر کا کام دیتے وقت اس بات کا سختی سے لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ ذہنی صحت کے تقاضوں سے دوچار نہ ہو۔
ہر کام ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دیا جانا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ اس دوڑ میں ہر استاد دوسروں سے آگے بڑھ جانے
کی کوشش کرے اور مسابقت کی اس دوڑ میں بچوں اور نوجوانوں کی ذہنی صحت پس کردہ جائے۔ جو معلومات اور مہارتیں
ذہنی صحت کی قیمت پر حاصل کی جائیں وہ زندگی میں چنداں سودمند ثابت نہ ہوں گی۔ پسندیدہ تفریحی مشاغل اور تمام
سرگرمیوں کی گنجائش ہر حال میں باقی رہنی چاہیے۔

موزوں رہنمائی

ذہنی صحت کے تقاضے یہ چاہتے ہیں کہ ہر طالب علم کو صرف اتنا کام گھر پر کرنے کو ملے جو اس کی انفرادی ضرورتوں
کے مناسب حال ہو۔ ہر طالب علم کی قابلیت، دلچسپی اور گھریلو مصروفیتوں کو مد نظر رکھ کر ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اسے
کتنا اور کس قسم کا گھر کا کام ملنا چاہیے۔

بعض پڑھے لکھے والدین اپنے بچوں کو گھر پر زائد پڑھائی کا کام بھی کراتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں سے بے حد بلند

توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ اور بعض اوقات بچوں کے دلوں میں ایک چھوٹی امنگ پیدا کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کو کسی قسم کا گھر کا کام نہ ملے تو بہتر ہے۔ ان پر والدین نے اتنا تعلیمی بوجھ عائد کر رکھا ہوتا ہے جو استاد کے دیئے ہوئے کام کا کافی سے زیادہ بدل ہوتا ہے۔ اگر اس بوجھ میں مزید اضافہ ہوگا تو نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ یہ بچے مدرسے میں ذہنی طور پر تھکے ہوئے آئیں اور اسباق سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکیں جو یقیناً ایک بے حد غیر پسندیدہ صورت حال ہے۔

ان امور کو نگاہ میں رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ گھر کا کام ہر طالب علم کا انفرادی مسئلہ ہے۔ گھر کا کام درست تعلیمی افادیت کو حاصل اس وقت ہوگا جب استاد طلبہ کی انفرادی رہنمائی کا مسئلہ تسلی بخش طور پر حل کرے۔

ایک قابل غور سوال

گھر کے کام سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لیے چند شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے ان پر نگاہ ڈالنے کے بعد یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا یہ بہتر نہیں کہ اس کام کو سرے سے ختم کر دیا جائے یا اس کی مقدار بالکل محدود کر دی جائے سود مند مطالعہ کے لیے ایک پرسکون علمی ماحول اور تھوڑی بہت رہنمائی ناگزیر شرائط ہیں۔ مگر یہ شرائط ہمارے گھروں میں کہاں تک پوری ہوتی ہیں۔ اکثر کنبے تنگ اور پرہجوم مکانوں میں رہائش رکھتے ہیں۔ طلبہ گھر پر اپنے آپ کو چاروں طرف شور و غل اور گھریلو زندگی کی چہل پہل سے گھرا ہوا پاتے ہیں۔ ارد گرد چھوٹے بھائی بہن کھیلتے شور مچاتے پھرتے ہیں۔ ساتھ کے کمرے میں یا پڑوس میں ریڈیو بج رہا ہے۔ گلی میں طرح طرح کے خوانچہ فروش آوازیں لگا رہے ہیں۔ گھر میں دو ایک مہمان ڈیرہ جمائے بیٹھے ہیں۔ ماں بار بار بازار سے چھوٹی موٹی چیزیں منگوانے کے لیے آوازیں دے رہی ہے۔ ان حالات میں طالب علم طبیعت پر جبر کر کے کب تک بیٹھے گا اور اگر بیٹھے بھی تو اس بٹی ہوئی توجہ کے نتائج کیا ہوں گے؟

یہ اوسط درجہ کے گھروں کا خاکہ ہے۔ غریب گھروں میں حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہے۔ صرف ایک ہی کمرہ ہے جسے تمام خانگی ضرورتوں کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ کمرہ سامان سے اٹا پڑا ہے۔ بچوں کا کہرام کان پڑی آواز سنائی نہیں دینے دیتا۔ چولہے کے دھوئیں نے بیٹھنا حرام کر رکھا ہے۔ ان حالات میں طالب علم کے لیے کس طرح ممکن ہے کہ گھڑی بھر کے لیے بھی سکون کے ساتھ کچھ پڑھ لکھ سکے؟ اگر شوق مطالعہ بہت شدید

ہوا اور خوش قسمتی سے قرب وجوار میں کوئی باغ، کھیت یا اس طرح کی کوئی اور جگہ ہوئی جہاں طالب علم سکون سے بیٹھ سکے تو اس نے وہاں جا کر کچھ کام کر لیا ورنہ گھر میں یہ بات محالات میں سے ہے۔

ان سب باتوں پر مستزاد موسم کی شدتیں ہیں۔ گرمی میں پسینہ بہ رہا ہے مگر گھر میں بجلی کا پنکھا نہیں سردی میں جسم ٹھٹھر رہا ہے مگر تاپنے کو انگیٹھی نہیں۔ ہمارے یہاں وہ وقت ابھی تصور میں بھی نہیں آسکتا جب تمام گھر یہ سہولتیں بہم پہنچا سکیں۔ البتہ مدرسے میں کسی نہ کسی حد تک ان سہولتوں کا اہتمام ہر وقت ممکن ہے اور کچھ نہیں تو مدرسے میں بیٹھنے کے لیے موزوں جگہ اور ایک پرسکون علمی ماحول کی سہولتیں تو ہر وقت موجود ہیں ان امور کے پیش نظر اکثر ماہرین تعلیم کی حتمی رائے یہ ہے کہ ترقی پسند ملکوں کی طرح بچوں کو گھر پر لکھنے پڑھنے کا کام بالکل نہیں ملنا چاہیے۔ اگر استاد نے کچھ ایسی بنیادی معلومات سکھائی ہیں جن کا ازبر کرنا آئندہ اسباق کے لیے زینے کا درجہ رکھتا ہے تو انہیں یاد کرنے کا کام دیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ گھر پر کرنے کے لیے کوئی اور کام دینا کوئی قابل ذکر تعلیمی افادیت نہیں رکھتا۔

تجرباتی شہادت

اس موضوع پر تحقیقی مطالعوں نے دلچسپ روشنی ڈالی ہے۔ حال ہی میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بعض ترقی پسند مدرسوں نے یہ تجربہ کیا کہ گھر کا کام نہ دینے یا برائے نام طور پر دینے سے طلبہ کی تعلیمی حالت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس تجربے میں والدین کا تعاون بھی حاصل کیا گیا۔ بعض مدرسوں نے گھر کا کام دینا بالکل بند کر دیا۔ نتائج سے ثابت ہوا کہ اس سے طلبہ کی تعلیمی حالت پر رتی بھر اثر نہیں پڑا۔

ایک ثانوی مدرسے کے صدر معلم نے اس تجربے کو یہ شکل دی کہ تین مضامین میں سے ایک مضمون کا کام دینا بالکل بند کر دیا۔ باقی دو مضامین کے لیے بھی صرف ایک گھنٹہ روزانہ کے لیے کام دیا جاتا رہا۔ ہفتہ اور اتوار کی دو چھٹیوں کے لیے بالکل کچھ کام نہ دیا جاتا تھا۔ والدین سے درخواست کی گئی کہ وہ اس تجربے کے نتائج کو غور سے دیکھیں، وہ خصوصیت سے یہ اندازہ لگائیں کہ بچوں کی ذہنی کیفیت پر کیا اثر پڑا ہے۔ باقی ماندہ گھنٹہ بھر روزانہ کام کو وہ کس جذبے اور جوش کے ساتھ انجام دیتے ہیں، وہ دوسری پسندیدہ سرگرمیوں میں پہلی سی توجہ دیتے ہیں یا اس سے کم، ویش تفریحی مشاغل اور پرسکون نیند کی کیفیت اب کیسی ہے۔

یہ مطالعہ سال بھر جاری رہا۔ سال کے خاتمہ پر والدین سے تحریری رپورٹیں منگوائی گئیں۔ تین چوتھائی والدین نے بیان کیا کہ گھر کا کام کم کر دینے سے نہایت خوش گوار نتائج برآمد ہوئے۔ نوے فی صد والدین نے یہ کہا کہ وہ پہلے کے بوجھل کام کو دوبارہ رائج کرنا پسند نہیں کرتے۔

تاہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں کہ گھر پر کسی حالت میں کچھ کام کرنے کو نہ دینا چاہیے۔ اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے بہت سی باتوں کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ گھر پر کرنے کے لیے جو کام بھی دیا جائے اس کی مقدار اور نوعیت کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ مدرسے میں کس طرح کا کام کرایا جا رہا ہے۔ نصاب کس طرح مرتب کیا گیا ہے۔ بچوں کا گھریلو ماحول کیسا ہے۔ استادوں اور والدین کے درمیان کہاں تک تعاون موجود ہے وغیرہ ان اسباب کے بدلنے پر گھر پر دیے جانے والے کام میں بھی کمی بیشی ہونی ضروری ہے۔ اگر نصاب مدرسہ میں ایسی تبدیلی عمل میں آئی ہے جس کی بنا پر مدرسے میں زیادہ ٹھوس اور زیادہ وقت تک کام ہونے لگا ہے تو گھر پر کرنے کے لیے لامحالہ تھوڑا کام ملنا چاہیے۔

ہمدردی یا عزت نفس کا خون

بہادل خان ناگرہ

آموزش کے شمارہ بابت ماہ جون ۱۹۵۶ء میں "یونی فارم کا مسئلہ" کے عنوان سے ایک ادارتی تبصرہ شائع ہوا تھا۔ جناب بہادل خان صاحب ناگرہ نے اس مضمون کو بہت پسند فرمایا اور اس سے متاثر ہو کر اپنا ایک مشاہدہ اشاعت اور تبصرے کے لیے روانہ فرمایا۔ اس تعلیمی اور فنی دلچسپی کے لیے ناگرہ صاحب کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ "عزت نفس" کے موضوع پر اسی شمارے میں ایک مفصل تبصرہ بھی درج ہے۔ آموزش کے دوسرے پڑھنے والوں سے بھی گذارش ہے کہ تعلیمی اور فنی نکات پر اظہار رائے فرما کر آموزش کو زیادہ دلچسپ بنائیں۔ (مدیر معاون)

چند سال پہلے کا ذکر ہے کہ ایک گورنمنٹ ہائی سکول کے صدر مدرس صاحب کی ملاقات کے لیے ان کے دفتر میں حاضر ہوا۔ انہوں نے سکول میں اپنی کارکردگیوں کا ذکر کرتے ہوئے راقم الحروف کو بتایا کہ ریڈ کراس فنڈ سے انہوں نے فلاں قسم کا کپڑا خرید لیا ہے اور اس کپڑے سے مدرسہ کے غریب اور نادار لڑکوں کے لیے یونی فارم سلوائی گئی ہے۔ اور اس یونی فارم کی سلائی پر کوئی خرچ نہ آئے گا۔ کیوں کہ استاد صاحبان نے اپنے اپنے گھروں میں ان کی مفت سلائی کا ذمہ لے لیا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مدرسہ کا سالانہ معائنہ عنقریب ہی ہو رہا ہے۔ اس دن دوسرے لڑکے تو اپنے اپنے لباس میں آئیں گے لیکن یہ لڑکے یونی فارم پہن کر آئیں گے۔ تاکہ اس دن معائنہ کے وقت انسپکٹر صاحب کو معلوم ہو سکے کہ مدرسہ ہذا کی ریڈ کراس سوسائٹی غریب طلبہ کی امداد اس طرح کر رہی ہے۔

صدر مدرس صاحب پرانے تجربہ کار اور پی۔ ای۔ ایس کے گریڈ میں تھے، ویسے بھی بہت دیانت دار آدمی تھے۔ پرانی واقفیت کی بنا پر ہی ان سے ملنے گیا تھا۔ لیکن ان کی یہ کارکردگی سن کر میں دنگ رہ گیا، اور ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا انہوں نے اساتذہ کے مشورہ سے غریب طلبہ کی اس قسم کی امداد کا پروگرام مرتب کیا ہے، تو اس کا جواب انہوں نے اثبات میں دیا۔ اور میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ ایک ہائی سکول کے عملہ میں سے کسی ایک مدرس کو بھی ان غریب طلبہ کی عزت نفس کا خیال نہ آیا۔ اگر ہمارے ایک ثانوی مدرسہ کے اساتذہ کے سوچنے کے یہی ڈھنگ ہیں تو پھر ہمارے تعلیمی

اداروں میں غریب خاندانوں کے جو نوجوان تعلیم پا رہے ہیں، ان کا خدا حافظ۔

صدر مدرس صاحب تھے دیندار۔ جب ان سے اس خدمت کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیالات کیا گیا اور اس بات کی نشان دہی کی گئی، کہ معائنہ کے دن یہ بچے نکو بن کر رہ جائیں گے۔ مدرسہ کے باہر اور کمروں کے اندر اس دن ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی اور ان کی عزت نفس کو ٹھیس لگے گی۔ تو وہ اپنی غلطی کو مان گئے۔ لیکن پھر سوال پیدا ہوا کہ وردیاں تو بن چکی ہیں ان کا کیا کیا جائے۔ اس کے متعلق یہی طے پایا کہ وردیاں تو ان کو دے دی جائیں، لیکن ان کو ہدایت کر دی جائے کہ وہ ان وردیوں کو سکول میں پہن کر نہ آئیں، جب ضرورت ہو گھر پر استعمال کریں۔

گور کھٹے ہیں

اہد اشرف

"کھٹے انگوروں" کے دلچسپ لطیفے عام سننے میں آتے رہتے ہیں آج اس مشہور عالم لطیفے کا ایک تعلیمی ر بھی ملاحظہ فرمایئے۔ اس لطیفے کے "ہیرو" ایک غیر تربیت یافتہ استاد صاحب ہیں جو کسی دیہاتی مدرسے میں رانگریزی مدرس کام کر رہے ہیں۔ یہ صاحب صرف ایک ٹانگ کے مالک ہیں اور غالباً اسی وجہ سے سال بی۔ ٹی میں داخل نہیں کئے گئے۔

میں پنے۔ رہ ستمبر کی صبح کو بس میں لاہور آ رہا تھا۔ شیخوپورہ اڈہ پر ایک نوجوان عصا ٹیکتے ہوئے بس میں خل ہوئے اور مجھ سے پچھلی سیٹ پر آ بیٹھے۔ ان کے ساتھ جو دو آدمی بیٹھے تھے وہ ان کے جاننے والے تھے۔ چند منٹوں بات چیت کا سلسلہ چل نکلا۔ یکایک ایک نے پوچھا کیوں صاحب آپ مدرسہ چھوڑ رہے ہیں؛ اس پر دوسرے بھی کہا ہاں جی آپ کہاں جا رہے ہیں؛ میں نے کئی لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ آپ مدرسہ چھوڑ رہے ہیں؟۔

ماسٹر صاحب نے ساتھیوں کا پر اصرار سوال سنا تو گلا صاف کر کے بولے عجب بات ہے، یار لوگ بھی ذرا سی ت کو کتنا بڑھا چڑھا کر مشہور کر دیتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ مدرسے والے مجھ پر پچھلے چند مہینوں سے زور ال رہے ہیں کہ میں بی۔ ٹی میں داخلہ لے لوں۔ خبردار اس سال یہ موقع گذرنے نہ پائے۔ میں بھی ان کے دباؤ سے تاثر ہو کر دبی زبان میں "ہاں" کہہ بیٹھا۔ ہوا یہ کہ پرسوں میں لاہور سے اپنی سند لینے گیا۔ بدقسمتی سے اس روز بی ٹی کا اخلہ ہو رہا تھا۔ یار لوگوں نے فقرہ گھڑ لیا کہ میں بی ٹی میں داخل ہونے گیا ہوں۔ بس صاحب اتنی سی بات کا بتنگڑ بن گیا۔

تو کیا آپ بی ٹی میں داخلہ نہیں لے رہے؛

وبہ توبہ صاحب! خواہ مخواہ عمر بھر کے لیے نام کے ساتھ دھبہ چپکا لوں؛ میں نے عرض کیا نا کہ میں یونہی ہاں کر بیٹھا تھا۔ لعد میں میں نے معاملے پر غور کیا کہ آخر بی۔ ٹی پاس کرنے سے حاصل کیا ہوگا؛ یہی نا کہ تنخواہ میں دس بیس روپے بڑھ جائیں گے۔ مگر دوسری طرف مجھے اس کی قیمت کیا ادا کرنی پڑے گی! یہ کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مدرسی پر قناعت کرنی

وہ کس طرح ؟ کیا آپ پرائیویٹ ایم۔ اے کر کے آگے ترقی نہ کر سکیں گے ؟

نہ صاحب۔ جو شخص بی۔ ٹی پاس کرلے پھر اس کے بعد وہ دنیا جہان کے امتحان پاس کرلے تو بھی اسے کوئی شخص کالج میں گھسنے نہ دے گا۔ فوراً یہ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص تو مدرسے میں کام کرتا تھا۔ اسے کالج میں قدم رکھنے کا کیا حق ہے ؟

اوہو ! تو گویا بی۔ ٹی پاس کرلینا ایک بہت بڑی لعنت ہے ؟

تو اور کیا۔ آپ کو ابھی اتنا بھی معلوم نہ تھا ؟

مگر صاحب آپ بی۔ ٹی ہونے کی صورت میں صدر معلم بن سکتے ہیں۔

اجی صدر معلم بننے کی بھی آپ نے ایک ہی کہی، گورنمنٹ سروس میں تو اس بات کا سرے سے امکان ہی نہیں کہ جو شخص بطور مدرس بھرتی ہو وہ کبھی صدر معلم بھی بن سکے۔ رہے پرائیویٹ سکول یا بورڈ سکول۔ ان میں یہ امکان ضرور ہے کہ دس پندرہ سال کی نوکری کے بعد صدر معلمی مل جائے۔ مگر صاحب آدھی عمر گزر جانے پر معمولی سی ترقی مل جانے سے کیا حاصل ؟ اس وقت تک زندگی کا سارا ولولہ سرد پڑ چکا ہوتا ہے۔

تو آخر آپ کا ارادہ کیا ہے ؟ سکول چھوڑ دینے پر اتنے تلے بیٹھے ہیں تو اس کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے ؟

ارادہ ؟ میں ایم اے پاس کروں گا اور ایم اے بھی انگریزی میں کروں گا۔ دوسرے مضامین میں ایم۔ اے پاس کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ انگریزی کا ایم اے کرتے ہی جھٹ کالج میں جگہ مل جاتی ہے۔

مگر کالج میں بھی تو آپ کو لڑکے ہی پڑھانے پڑیں گے نا ؟

جی ہاں پڑھانے تو لڑکے ہی پڑیں گے۔ مگر پڑھانے پڑھانے میں فرق ہے۔ مدرسے میں آپ سال بھر جان مارتے رہیے۔ بعد میں اگر نتیجہ اچھا رہا تو سب کہیں گے کہ اس سال لڑکے بہت اچھے تھے۔ اور اگر خدانخواستہ نتیجہ خراب رہا تو ہر شخص آپ کی گردن پر آن سوار ہوگا کہ آپ نے پڑھایا کچھ نہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی قابل قبول حیثیت ہے کہ کام اچھا رہے تو نیک نامی پڑھنے والوں کی اور اگر کام خراب ہو تو بدنامی پڑھانے والوں کی۔

تو کیا کالج میں نتیجے کی ذمہ داری پڑھانے والے پر نہیں ہوتی ؟

نہ صاحب۔ وہاں تو بالکل مزے ہیں مزے۔ سب پاس ہوں یا سب فیل آپ کی بلا سے۔ کوئی آپ سے پوچھنے والا نہ کوئی آپ کی ترقی روکنے والا ہے۔ آپ دن میں دو تین لیکچر دے ڈالیے اور بس۔ آپ کا کام ختم ہوا۔ آگے لڑکے جانیں

یا ان کا کام۔

خوب۔ واقعی یہ زندگی تو بڑے مزے کی ہے۔

تو اور کیا! جبھی تو میں مدرسے کی زندگی پر لات مار کر کالج میں جانے کی فکر میں ہوں۔

بہت اچھا خیال ہے۔ مگر اس کی صورت کیا ہوگی؟

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ انگریزی کا ایم۔ اے پاس کروں گا۔ یہ امتحان پرائیویٹ طور پر بھی پاس کر سکتا ہوں اور کالج میں داخل ہو کر بھی۔ مجھے پرنسپل صاحب نے مشورہ دیا تھا کہ کالج میں داخلہ لے لوں۔

ہاں اچھا مشورہ ہے۔ مگر صاحب ایک بات کا خیال رکھیے۔ آج کل بے کاری کا زمانہ ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ آپ مدرسے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ جگہ ہاتھ سے جائے اور دوسری ہاتھ نہ لگے۔ سوچ سمجھ کر نوکری چھوڑیے گا۔

یہ درست ہے۔ میں زمانے کے حالات سے بے خبر نہیں۔ میرا اپنا ارادہ بھی یہی ہے کہ جب تک کالج میں جگہ نہ مل جائے اس وقت تک مدرسی کو نہ چھوڑوں۔

تدریس عربی

مختار فاروقی

مسلسل نمبر ۱

عربی گرامر کے سبق کا خاکہ

تمہید - ایک یا دو جملے تختۂ سیاہ پر لکھو اور پھرتی سے چند سوالات کر کے ان قاعدوں کو دہراؤ جن سے تم مضمون سبق ...... کو وابستہ کرنا چاہتے ہو۔

قاعدے یا تعریف کی دریافت :- مثالیں پانچ یا چار جملوں میں ہونی چاہئیں جو یا تو طلبہ زبانی سیکھ چکے ہوں یا ان عبارتوں سے منتخب کئے گئے ہوں، جو پڑھنے کی کتاب میں سیکھ چکے ہوں۔ یہ مثالیں برمحل، مختصر، عام فہم اور مختلف شکلوں میں ہونی چاہئیں۔

اُردو کی گریمر کا قاعدہ (معلوم) اس کے بعد اردو کی گریمر کا قاعدہ بیان کرانا چاہیے۔ طلبہ نے غالباً یہ سیکھ رکھا ہوگا۔ نہیں تو بہت آسانی سے سکھا سکتے ہیں۔

عربی گریمر کا قاعدہ (نامعلوم) پھر طلبہ سے سوالات کیے ذریعہ عربی کے جملوں کا معائنہ کرا کے۔ مقابل کا قاعدہ دریافت کرانا چاہیے۔ اور ان سے اپنے الفاظ میں بیان کرانا چاہیے۔ جب طلبہ قاعدہ سمجھ جائیں اور اسے اپنے الفاظ میں بیان کر سکیں تو استاد اسے گھٹا بڑھا کر مطلوبہ صورت میں لائے تختۂ سیاہ پر لکھے اور اجتماعی طور پر دہرائیے۔

قاعدے کا استعمال :- مشقیں پہلے ہی سے احتیاط کے ساتھ منتخب کرنی چاہئیں یہ مختلف طرح کی ہوں جیسا کہ ذیل میں درج ہے (۱) طلبہ سے کتابیں کھلوا کر کسی منتخب پیرے سے قاعدے یا گردان کے صیغوں کی مثالیں چنوائی جائیں (۲) جو جملے استاد عربی نے سبق کے شروع ہونے سے پہلے اس مطلب کے لیے تختۂ سیاہ پر لکھ رکھے ہوں۔ طلبہ سے ان کا دونوں طرح کے ترجمہ میں قاعدہ استعمال کرایا جائے۔ (۳) طلبہ سے ناتمام جملے مکمل کرائے جائیں۔ جملے بنوائے جائیں، جن سے قاعدہ کی توضیح ہو۔

دیسی زبان سے عربی میں ترجمہ سکھانے کے متعلق مفید ہدایتیں :- (۱) ترجمے کے سبقوں میں یہ باتیں مدنظر رکھو:

کہ طلبہ کا ذخیرہ الفاظ بڑھے اور گرامر کے سبق میں جو قاعدے وہ سیکھ چکے ہیں ان کی توضیح ہو جائے اور وہ ذہن نشین ہو جائیں (۲) اس لیے ہر ایک سبق میں ایک خاص غرض پیش نظر رکھیں۔ یعنی یا تو صرف کسی قاعدے کی یا خاص اجزائے جملہ و محاورات کے استعمال کی۔ (۳) احتیاط کے ساتھ ایسی عبارت منتخب کریں جس سے اس خاص بات کی توضیح ہو جائے جس پر آپ زور دینا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو عربی کی درسی کتاب سے ایسی عبارت دستیاب نہیں ہو سکتی۔ تو کوئی عبارت کسی اور کتاب وغیرہ سے لے کر اسے گھٹا بڑھا کر اپنے حسب مطلب بنا لیں۔ (۴) عبارت منتخبہ کے الفاظ اور گرامر پر سب سے پہلے خود پوری طرح حاوی ہوں (۵) دو طرح کے جملے تیار کیجیے، ایک طرح کے عربی میں دوسری طرح کے دیسی یعنی قومی زبان میں جو متبادل ہو۔ مثلاً اردو۔ پنجابی۔ سندھی۔ پشتو۔ بنگالی وغیرہ میں سے کوئی ایک۔ یہ جملے ایسے ہوں کہ ان میں وہی الفاظ و اجزائے جملہ آئیں۔ جو عبارت انتخاب کردہ میں موجود ہیں۔ اور ان سے اس قاعدے کی تصریح بھی ہو جائے جس کو آپ نقش کرنا چاہتے ہوں۔ ان جملوں کو سبق کے شروع ہونے سے پہلے ایک علیحدہ تختہ سیاہ پر لکھ رکھیں۔

ترجمے کے سبق کا خاکہ

تمہید:- مختصر طور پر اس قاعدے یا قاعدوں کو دہرائیں۔ جن سے طلبہ کو کام پڑے گا۔ اس مطلب کے لیے چند سیدھے سادے جملوں کا ترجمہ کرا دینا بہتر ہوگا۔

عبارت کے مشکل الفاظ۔ جس تختہ سیاہ پر ترجمے کی عبارت لکھی ہوئی ہے اسے جماعت کے سامنے پیش کریں اور یہ بات معلوم کرنے کے لیے کہ آیا طلبہ کو الفاظ کے معنی آتے ہیں یا نہیں۔ ان سے عربی کے الفاظ کا اردو میں اور اردو کے الفاظ کا عربی میں ترجمہ کرائیے۔ لفظی ترجمے کی ہرگز اجازت نہ دیجیے۔ شروع ہی سے با محاورہ ترجمہ پیش نظر رکھیے۔ کسی بھی طالب علم سے پورے جملے سے کم کا ترجمہ نہ کرائیں۔ جزو اعظم کی طرف توجہ دلائیں اور ان کا ترجمہ کرائیں۔ پھر رفتہ رفتہ متعلقات زیادہ کریں اور آخر میں تمام جملے کا ترجمہ کرائیں۔ اگر جملہ مخلوط ہے تو پہلے اس کے ماتحت فقروں کو لیں اور پھر سارے جملے کو۔ یاد رکھو اچھا ترجمہ وہی ہے، جو مکمل۔ ٹھیک۔ جچا تلا اور با محاورہ ہو۔

تصحیح اغلاط (۱) ہر ایک جملے کو تختہ سیاہ پر لکھیں۔ نحو وغیرہ کا جو قاعدہ ٹوٹتا ہے اسے طلبہ سے بیان کرائیں۔ جملہ صحیح کر کے لکھیں، اور مثالیں دے کر قاعدہ ذہن نشین کرائیں۔

جب منتخبہ عبارت کا طرز مذکورہ بالا سے ترجمہ ہو چکے تو اس تختہ سیاہ کو جس پر پہلے سے جملے لکھے ہوئے ہیں۔ طلبہ کے

پیش کریں اور ان جملوں کا زبانی ترجمہ کرائیں۔

(۱) عربی سے اردو میں (۲) اردو سے عربی میں (۳) عربی سے اردو میں اور اسی اردو عبارت سے پھر خود ساختہ عربی میں بطور مشق ترجمہ کرائیں۔

عربی ترکیب نحوی (کیسے سکھائیں گے)

ترکیب کے سبق کے مقاصد ہیں (۱) جو باتیں طلبہ قواعد کے سبق میں پڑھ چکے ہیں انہیں ان کے ذہن نشین کرانا اور استعمال کرانا۔ اور ساتھ ہی امتحان کرنا کہ وہ باتیں ان میں آگئی ہیں یا نہیں۔

طالب علموں میں استخراجی طریق سے دلیل لانے کی مہارت پیدا کرنا: ۔ اگر سبق مناسب طور سے پڑھایا جائے تو ہر لفظ کی ترکیب میں طلبہ کا ہر ایک جواب ایک قیاس کا نتیجہ ہوگا۔ مثلاً جملے کی ترکیب میں اَللّٰہُ وَاحِدٌ جب شاگرد کہتا ہے (اَللّٰہُ، وَاحِدٌ) (مبتدا + خبر) جملہ اسمیہ ہے تو اس نے فوراً اس طرح استدلال کیا ہوگا۔ جس جملے کا پہلا جزو اسم ہو۔ جملہ اسمیہ ہے۔ اَللّٰہُ اسم ہے جو جملے کی ابتدا میں آیا ہے۔ جملہ اسمیہ کے ابتدائی کلمہ کو مبتدا کہتے ہیں۔ اور جو کچھ اس کی طرف اسناد کیا جائے اسے مسند یعنی خبر کہتے ہیں بنا بریں واحدٌ خبر ہوئی۔ اَللّٰہُ - مبتدا، واحدٌ - خبر } جملہ اسمیہ

اس غرض سے کہ ترکیب کے سبق کا دوہرا کام خوبی اور خوش اسلوبی سے سرانجام پائے مشق نہایت احتیاط سے منتخب کریں۔ ہر ایک سبق میں کوئی غرض پیش نظر رکھیے اور دیکھیے کہ مشق میں انہی باتوں کا علم درکار ہے جو بتائی جا چکی ہیں اگر اس بات کا خیال نہ رکھا جائے گا تو ترکیب کے سبق سے طلبہ کو قیاسی جواب دینے کا سبق ملے گا۔ ان میں استدلال بالقیاس کا ملکہ پیدا کرنے کا تو کیا ذکر ہے۔

(۱) نچلی جماعتوں (خصوصاً مڈل) میں اس بات پر اصرار کر کے طلبہ لفظ کی جنس بتلانے سے پہلے اس کا اصل بتایا کریں (۲) اعلیٰ جماعتوں میں اس بات پر زور دیا جائے کہ جب کوئی دقت پیش آئے تو طلبہ اپنے ترجمی جوابات کی وجوہ بیان کریں (۳) زبانی مشقوں کو تحریری مشقوں پر ترجیح دیں۔ زبانی مشق کرائیں تو کام زیادہ ہوتا ہے۔ استاد کو حق حاصل ہے کہ متعلمین سے ہر ایک جواب کی وجہ پوچھ لے۔ غلطی شاگرد کو سامنے ہی بتا دے۔ اس طرح طالب عربی ترکیب و تجزیہ میں خوب مہارت حاصل کرے گا۔ لیکن ترکیب لکھنے کا ڈھنگ سکھانے کے لیے وقت بچنے پر ایک آدھ جملہ جماعت میں ہی بیاض پر لکھنے کے لیے دے دیا جائے۔ اس دوران میں استاد کو جماعت میں پھر کر نگرانی بھی کرنا ضروری ہے۔ تاکہ جلتے تیز

اصلاح بھی ہو جائے اور طلبہ ایک دوسرے سے مدد لینے سے بھی گریز کریں۔

ترکیب نحوی پر سبق کا خاکہ

طریقۂ تعلیم کے متعلق ہدایتیں:۔ (ا) تیاری (۱) طلبہ سے جملہ پڑھوائیے اور غیر معمولی الفاظ یا اجزائے جملہ کے معنی پر سوالات کریں۔ (ب) الفاظ کی ترتیب:۔ اگر جملے کے الفاظ آگے پیچھے ہیں تو طلبہ سے انہیں نثر کی معمولی ترتیب سے رکھوائیے۔ مثلاً "شہیدانِ محبت خوب آئینِ وفا سمجھے" کی ترتیب یہ ہوگی: شہیدانِ محبت آئینِ وفا خوب سمجھے۔ عربی مثال "وَانصَارُ الھُدیٰ نَحنُ" کی نثر "نَحنُ انصارُ الھدیٰ" ہوگی۔ ترکیب نیچے دیکھیے۔ (ج) جملے کی تحلیل:۔ ضروری نہیں ہے کہ تحلیل مفصل ہو۔ بلکہ ضروری یہ ہے طلبہ جملے کے اجزائے اعظم پہچانیں۔ اور معلوم کریں کہ یہ کس قسم کا جملہ ہے۔ مثلاً اوپر نمبر (ب) کی عبارت میں ہدایات کا جملہ جملۂ فعلیہ ہے اور اس کے اجزائے اعظم یہ ہیں:۔

(۱) جملۂ فعلیہ
- سمجھے .... فعل تام
- فاعل: شہیدان ..... مضاف / وفا ...... مضاف الیہ
- مفعول اول: آئین ...... مضاف / وفا .... مضاف الیہ
- خوب .... مفعول ثانی

(۲) جملۂ فعلیہ
- لَم تَکتُبُو .... فعل
- سبقَ .... فاعل
- لَنَا .... متعلق فعل

(۳) جملۂ اسمیہ
- نَحنُ .... مبتدا
- خبر: اَلصَارُ ..... مضاف / الھُدیٰ ..... مضاف الیہ

(۴) جملۂ اسمیہ
- مُحَمَّدٌ .... مبتدا
- خبر: رَسُولُ ..... مضاف / اللہ ..... مضاف الیہ

(۵) جملۂ فعلیہ
- رَضِیَ .... فعل
- اللہُ .... فاعل
- عَنہُ .... متعلق فعل

ترکیب نحوی کے یہ مثالیں نہایت احتیاط کے ساتھ درجہ بدرجہ لیں اور سمجھائیں:۔ ایک جملہ لیں اور ذہن نشین کرادیں۔ بعد ازاں اسی قسم کی مثالیں خاصی تعداد میں پیش کریں۔ بیشتر جملے درسی کتاب میں سے چنیے۔ اگر جملوں کے معانی پہلے نکلوالیں تو طلبہ آپ کی پیروی نہایت آسانی سے کرسکیں گے، جب یہ طرز دل نشین ہوجائے تو پھر دوسرا قدم اٹھائیے۔ زیادہ مشق بہم پہنچانے سے ابہام و تفہیم میں استواری پیدا ہوگی۔ یہ بہتر رہے گا کہ آپ چند مثالیں جو مسلسل

وقت میں طلبہ کر سکیں تختہ سیاہ پر لکھ دیں اور انہیں اپنی بیاضوں پر سیاہی سے قلم کے ساتھ خوش خط لکھنے کے لیے کہیں اس دوران میں آپ چل پھر کر نگرانی کریں۔ کوئی مشکل درپیش ہو تو خندہ پیشانی سے اس کا حل بتا دیجیے۔ اس طرح آپ عربی ادب کے سیکھنے کا رجحان پیدا کرنے میں کامیاب ہو کر رہیں گے۔ سب سے پہلے آپ ہدایات برائے تعلیم ترکیب نحوی میں مندرج جملہ ہی لے لیجیے۔ کہ کام خدا کے نام سے شروع ہو جائے۔ زاں بعد اوپر کی عبارت حصہ (ج) (جملے کی تحلیل) کے ماتحت مندرج جملے لے لیجیے۔ لڑکے اس طرح ترکیب نحوی بھی سیکھ لیں گے اور ساتھ ہی ساتھ توحید و رسالت کا تعارف بھی ہو جائے گا۔ مندرجہ ذیل قرآنی جملے بھی قابل توجہ ہیں۔

(۱) أَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوبِهِمْ (۲) يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ (۳) وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَحْمَةً وَعِلْمًا (۴) الْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ (۵) قَالَ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ (۶) أُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللّٰهِ (۷) إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (۸) سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ۔

ترکیب زبانی کرانی چاہیے۔ لڑکے سوچ سمجھ کر جواب دیں۔ قیاساً نہ دیں۔ بشرطِ ضرورت جوابوں کی وجوہ بھی دریافت کی جائیں۔ یہاں تک کہ ترکیب ختم ہو جائے۔

تصحیح اغلاط — جب طالب علم کسی لفظ کی ترکیب غلط کرے تو اس سے اس کے جواب کی وجہ دریافت کیجیے۔ اکثر یہ پایا جائے گا کہ طالب علم کے پاس اپنے جواب کی بہت اچھی وجہ ہے ایسی حالت میں جواب کو غلط کہہ کر رد کرنے سے طالب علم کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ طلبہ کو اس لفظ کی صحیح ترکیب سکھائیے۔ طالب علم سے جملے کے وہ جزو بیان کرائیے جس سے وہ یہ پوچھ کر کہ وہ کس جزو کلام کے ساتھ استعمال ہوتا ہے (خاص طور پر مضاف موصوف اور متعلقات کی صورت میں ہو) اس لفظ کی بجائے سادہ ہم عمل لفظ استعمال کرائیے۔ غلط تصور جس کے باعث غلطی ہوئی رفع کیا جائے۔ زبانی مشقوں کے ذریعہ قاعدہ طلبہ کے صفحۂ خاطر پر نقش کرا دیجیے تاکہ پھر ایسی غلطی نہ ہونے پائے۔

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

روحانی علاج

آرچ بشپ آف کنٹربری نے برٹش میڈیکل کونسل سے درخواست کی تھی کہ روحانی علاج کے متعلق تحقیقات کر کے کوئی فیصلہ کن رائے قائم کرے۔ کونسل نے اس مطالبہ کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جس کی رپورٹ حال ہی میں برٹش میڈیکل جرنل میں شائع ہوئی ہے۔

اس رپورٹ نے روحانی علاج کا ذکر بڑی سرد مہری کے ساتھ کیا ہے۔ مگر کمیٹی نے رائے قائم کرتے وقت اپنے پہلے سے قائم شدہ مفروضوں سے کام لیا ہے۔ اس نے ان واقعات اور شہادتوں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے جو تعویذوں کی تاثیر اور جنوں بھوتوں کے وجود کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

رپورٹ میں ایک ڈاکٹر کا بیان درج ہے جس کا کہنا ہے کہ وہ منتروں کے ذریعہ بری روحوں کو مار بھگا کر علاج کرتا ہے۔ اسی طرح ایک ہندوستانی کا حال بھی درج ہے جس کو مغربی علاج سے کچھ افاقہ نہ ہوا تھا مگر ایک دیسی طبیب کے جادو ٹونوں سے وہ اچھا ہو گیا تھا۔ ان واقعات پر رپورٹ مرتب کرنے والوں نے اس کے سوا اور کچھ تبصرہ نہیں کیا کہ ایسی صورت میں معالج کی قوت ارادی عام دواؤں کی نسبت زیادہ پر تاثیر ثابت ہوتی ہے۔

کمیٹی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ مذہبی تعلیمات اور روحانی اقدار مریض کے دل پر گہرا اثر ڈال سکتی ہیں۔ جو لوگ روحانی علاج کے دعویدار ہیں وہ خصوصیت سے اپنی ذہنی قوتوں سے کام لیتے ہیں جس طرح ایک نفسیاتی معالج۔ مگر یہ ذہنی اور روحانی قوتیں بالکل اسی طرح ایک قدرتی نظام کے تابع ہیں جس طرح بدنی قوتیں۔ گو ان قوتوں کی سائنسی شرح اب تک معلوم نہیں ہو سکی تاہم ان کے قدرتی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ان حالات میں کسی مافوق العادت روحانی قوت کو دخیل علاج خیال کرنا درست نہیں۔ یہ بجا ہے کہ انسان ابھی بہت سی ذہنی قوتوں کی کارفرمائی کو سمجھ نہیں سکا۔

ہندوستانی جعل سازوں کی گت

حال ہی میں برطانوی اخباروں میں کئی دنوں تک یہ بحث جاری رہی جب کچھ ہندوستانیوں نے جعل

پاسپورٹوں کے ذریعہ برطانیہ میں داخلے کی کوشش کی واقعیتیں ہیں کہ کچھ ہندوستانی کسانوں نے بیروزگاری سے تنگ آکر برطانیہ میں جاکر کام کاج کرنے کا ارادہ کیا۔ جب آسانی سے پاسپورٹ ملتا نہ دیکھا تو انہوں نے ہندوستانی جعل سازوں کے ان گروہوں کی طرف رجوع کیا جو جعلی پاسپورٹوں کے ذریعے لاکھوں روپے کماتے ہیں۔

جب یہ کچھ کسان برطانیہ کے ہوائی اڈہ ارلی پر اترے تو محاصل کے افسروں نے ان کی جعل سازی معلوم کرکے انہیں برطانیہ میں داخلے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر ایک عجیب و غریب صورت حال پیدا ہوگئی یہ لوگ ایئر فرانس کے جہاز میں اڑکر آئے تھے۔ اس لیے انہیں کسی ٹھکانے لگانا اسی ہوائی کمپنی کی ذمہ داری تھی۔ کمپنی کے افسران تالیس گھنٹوں تک اس مسئلہ پر غور کرتے رہے، اس اثنا میں ان نیم وحشی ہندوستانیوں نے ہوائی اڈے پر خوب تماشہ لگائے رکھا۔ انہوں نے اس سے پہلے ہاتھ منہ دھونے کے لگن اور ان میں حل کا بہتا ہوا پانی کبھی نہ دیکھا تھا، چنانچہ وہ دو دن تک ان لگنوں پر قبضہ جمائے رہے۔ آخر ایئر فرانس کا جہاز انہیں واپس ہندوستان لے گیا اور اس طرح یہ قضیہ ختم ہوا۔

اس واقعہ نے نکولاس لیوٹسکی کا مشہور واقعہ تازہ کر دیا ہے۔ یہ شخص سال بھر سے زیادہ عرصہ ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر بحر اوقیانوس کے آرپار اڑتا رہا۔ مگر کوئی ملک اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس کوئی ایسا تحریری ثبوت نہ تھا جس سے اس کی قومیت ثابت ہوتی۔ قانون کی نگاہ میں وہ دنیا کی کسی بھی ریاست کا شہری نہ تھا، وہ جس ریاست میں قدم دھرتا، قانون اس کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا۔ یہ تماشہ سال سے کچھ عرصہ اوپر جاری رہا۔ آخر جنوبی امریکہ کی چھوٹی سی ریاست ڈومنی کن جمہوریہ نے اسے شہریت کے حقوق دے کر اس افسوسناک تحقیر انسانیت کا خاتمہ کیا تھا۔

ادنیٰ ذہانت کے بچوں کی تعلیم

برائٹن کے مقام پر ادنیٰ ذہانت کے بچوں کے مدرسے کا افتتاح کرتے ہوئے مسٹر ڈینس واسپر پارلیمانی سیکرٹری برائے تعلیم نے یہ انکشاف کیا کہ گو زمانہ مابعد جنگ میں اس قسم کے بچوں کے لیے بہت کچھ کیا گیا ہے پھر بھی اب تک ۱۲۰۰۰ بچے کسی جگہ داخل نہیں کیے جا سکے۔

مسٹر واسپر نے کہا کہ حکومت تہیہ کر چکی ہے کہ اس مسئلہ کو حل کر کے چھوڑے گی۔ ہمارا پروگرام یہ ہے:—

ں وقت جن بچوں کے نام انتظاری فہرست پر ہیں ان سب کو عام مدرسوں میں جگہ دے دی گئی ہے۔ اب جب کہ بڑا
رسوں میں تعدادِ طلبہ گھٹنے لگی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ عام مدرسوں میں ہی اونچی ذہانت کے بچوں کو خاص توجہ مل سکے۔ ہم
مقامی حکومتوں کو لکھ رہے ہیں کہ اس قسم کے بچوں کی مکمل انتظاری فہرستیں بھیج دیں تاکہ ان کی ضرورتوں کا درست اندازہ
لگایا جا سکے۔

اس وقت برطانیہ میں ۵۰ ایسے مدرسے زیرِ تعمیر ہیں یا ان کی تعمیر کی منظوری دی جا چکی ہے جو اونچی ذہانت کے
بچوں کے لیے مخصوص ہوں گے۔ یہ مدرسے نو ہزار بچوں کے لیے کفایت کریں گے۔

معذور بچوں کے لیے حکومت کی تعلیمی کوششوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مسٹر واسپر نے کہا: "۱۹۴۵ء میں معذور
بچوں کے لیے علٰحدہ جماعتوں کی بہت کمی تھی۔ اس وقت سے لے کر اب تک ان کے مخصوص مدرسوں کی تعداد ۵۷۸ سے
بڑھ کر ۷۴۳ ہو چکی ہے۔ ان مدرسوں میں پڑھنے والوں کی تعداد ۳۸۲۹۹ سے بڑھ کر ۵۰۸۴۴ کو جا پہنچی ہے۔ جب کہ
ان میں پڑھانے والے ہمہ وقتی استادوں کی تعداد ۲۴۳۴ سے ۴۳۸۱ کو پہنچ چکی ہے۔"

بچوں کی حد سے بڑھی ہوئی اجرتیں

چیشائر کاؤنٹی کے یوتھ ایمپلائمنٹ افسر مسٹر ڈی۔ بی۔ برے نے اپنے عہدے کا چارج سنبھالتے ہوئے
کہا کہ نوعمروں کو مختلف پیشوں کی طرف کھینچنے کے لیے بہت زیادہ اجرتیں پیش کی جا رہی ہیں۔ اس مسئلہ کا افسوسناک
پہلو یہ ہے کہ بھاری اجرتوں کے طفیل نوجوانوں کو فنی مہارت چاہنے والے کاموں سے ہٹا کر ایسے کاموں کی طرف کھینچا
جاتا ہے جن میں فنی مہارت کی ضرورت نہیں۔ یہ صورت حال نہ تو نوجوانوں کے لیے فائدہ مند ہے اور نہ ہی صنعت کار
کے لیے۔ دوسرا قابلِ افسوس رجحان یہ ہے کہ گرامر سکولوں کی اعلیٰ جماعتوں میں پڑھنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کو سیکھنا باقی
ایسے کاموں میں ڈالا جاتا ہے جہاں آخرالامر ان کی تعلیمی قابلیت کام کے لیے غیر کافی ثابت ہونے والی ہے۔ اس
میں الزام والدین پر ہے جو اس بات کے خواہاں رہتے ہیں کہ ان کے بچے جلد سے جلد کمانے لگیں۔ انہیں طویل
نظر اختیار کرنا چاہیے۔

مسٹر برے نے آجروں پر بھی الزام دھرا۔ انہوں نے کہا کہ چھوٹی فرموں کے مالک بالخصوص ایسی فرموں کے مالک
جہاں دو ہزار سے کم لوگ کام کرتے ہیں اپنے نوجوان ملازموں کی تربیت کی طرف کچھ توجہ نہیں دیتے۔ وہ اس بات کو

بھول جاتے ہیں کہ اس قسم کی تربیت خود ان کے اپنے بہترین مفاد میں ہے۔ انہیں چاہیے کہ اپنے نوجوان ملازموں کو خود بخود چلنے والی مشینوں کے فوائد کا قائل کریں اور انہیں یہ احساس دلائیں کہ اس قسم کی مشینوں کی آمد ان کے کام کے خوش گوار تر اور سود مند تر مواقع پیدا کرتی ہے۔

ریڈنگ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈوبسن نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ نوجوانوں کو مدرسوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کا زندگی کی عملی ضرورتوں سے کچھ علاقہ نہیں۔ انہوں نے ہمبرگ کے نظام تعلیم کو بہت سراہا اور کہا کہ وہاں جو لڑکے پٹرول پمپوں پر کام کرتے ہیں یا موٹر کاروں کو چکناہٹ لگاتے ہیں انہیں یہ اجازت ہے کہ نظری اور عملی دونوں قسم کے امتحان پاس کرلیں۔

گلیوں میں گھومنے والے بچے

لندن کی گلیوں اور سڑکوں پر کل چار لاکھ چالیس ہزار بچے گھومتے پھرتے نظر آ سکتے ہیں۔ ان میں سے ڈیڑھ ایسے ہیں جنہیں ان گنجان آباد سڑکوں اور شاہراہوں سے باہر کھلی فضا میں جانے کا کبھی موقع نہیں ملتا۔ ایسے بچوں کو دیہاتوں میں سیر و سیاحت کے لیے بھیجنے کی خاطر ایک فنڈ قائم ہے مگر اس کے مالی وسائل اتنے تھوڑے ہیں کہ یہ صرف ... کے قریب بچوں کو ہر سال دیہات میں تفریح کے لیے بھیج سکتا ہے۔ خطرہ اس بات کا ہے کہ آنے والے سالوں میں یہ فنڈ ... نہیں کر سکے گا، کیونکہ اس کے مالی وسائل گھٹتے جا رہے ہیں۔

یہ تشویش ناک حقائق فنڈ کے چیئرمین آر مزگ نے اس کے سالانہ جلسے کے موقع پر بیان کیے۔ تاہم انہوں نے ا...

جنوبی امریکہ ی... احب استطاعت لوگ اس فنڈ کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنائیں گے۔ انہوں نے دیہات کے ذی استطاعت ...

کا خاتمہ کیا تھا۔

...رخواست کی کہ چھٹیوں کے موقع پر وہ لندن کے زیادہ سے زیادہ بچوں کو اپنے گھروں میں بطور مہمان قبول ک...

ادنیٰ ذہانت کی

وزیر تعلیم سر ڈیوڈ سر ڈیوڈ ایکلز بھی اس اجتماع میں موجود تھے۔ انہوں نے فنڈ کے کارکنوں کو اپنی کوششیں جا...

برا... نے پر مبارک باد دی۔

تعمیر:

فن تعمیر ایک قسم کی لازمی تعلیم ہے

برطانوی ماہرین تعمیر کی انسٹی ٹیوٹ میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر ہنری مورس نے کہا کہ فن تعمیر نہایت لطیف بیرونی تعلیم ہے۔ بطور ایک عوامی آرٹ کے فن تعمیر کے نمونے ہماری بیدار زندگیوں کے تمام عرصہ میں ہماری آنکھوں کے...

رہتے ہیں۔ اس کا یہ عوامی کردار اس فن کو انسانی زندگی میں چوٹی کی اہمیت عطا کرتا ہے۔

اپنی تقریر کو موجودہ صنعتی تہذیب کے پس منظر میں رکھتے ہوئے مسٹر مورس نے کہا ہماری صنعت اور جی نے انسانی تہذیب کے لیے ایک دشوار مستقبل پیدا کر دیا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر متوقع طور پر تیز لے انسان کو اس قابل بنا دیا ہے کہ مشقت اور افلاس پر قابو پا لے۔ مگر ترقی نے نئی قسم کے مسائل پیدا کر دیے ہیں ت میں ایک ایسا انقلاب آ رہا ہے جو دیہی زندگی کے رومانی حسن کو لٹائے جا رہا ہے، اس کے ساتھ ہی مقامی ت اور فن تعمیر بھی ختم ہو رہا ہے۔ سائنسی ترقی نے اس طرح انسان کے سامنے دو انتخاب پیش کیے ہیں؛ ـ پرانے بصری ماحول کو قائم رکھے اور یا افلاس سے نجات حاصل کرلے۔

سائنس اور ٹکنالوجی نے اوقات فراغت میں جو اضافہ کیا ہے ان کی صحت مند استعمال کی راہیں تلاش کرنا باقی ہیں۔ اس وقت جو تفریحی مشاغل عام طور پر میسر ہیں وہ کاروباری قسم کے اور بے حرکتی پیدا کرنے والے ہیں بدولت فارغ اوقات کا گلا گھونٹا جا سکتا ہے۔ ان سے کوئی تخلیقی اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ ان حالات میں دہ زندگی کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ ایسے ذرائع تلاش کیے جائیں جن کی بدولت جدید تقاضے بھی پورے یں اور مقامی زندگی کی ہم آہنگی بھی باقی رہے۔

تقریر کو جاری رکھتے ہوئے مسٹر مورس نے کہا میں اس بات کا حامی نہیں کہ فن تعمیر اپنی بیتی ہوئی روایات پس لائے، اس فن نے عہد جدید میں جو بے اندازہ ترقی کی ہے میں اس کا دلدادہ ہوں۔ اس پیش قدمی نے ن تعمیر کے سامنے ایسا تعمیری مواد اور ایسا اندازِ کار پیش کیا ہے، جس کے امکانات لامحدود ہیں۔ جدید عمارتیں سہولت کار اندرونی منصوبہ بندی کے اعتبار سے بہت بلند پایہ ہیں۔ مگر جدید فن تعمیر کو ابھی بیرونی زیب و زینت کا سبق سیکھنا باقی اسے قدیم فن تعمیر سے یہ سبق سیکھنا چاہیے کہ انسانی ماحول کو دیدہ زیب کس طرح بنایا جاتا ہے۔

مسٹر مورس نے کہا کہ جدید زندگی کے اہم مصائب اس کے غیر ذاتی، غیر انسانی اور استعماری پہلو ہیں۔ یہ پہلو زندگی کی ہر دری میں نظر آتے ہیں۔ فن تعمیر کو ان درشت بے کیف پہلوؤں سے نجات کی راہ ڈھونڈنی چاہیے۔ جدید بستیوں کی سڑکوں کے کناروں پر عمارتوں کے جو طومار ہیں۔ ان میں مقامی ثقافت کی کوئی جھلک نہیں۔ جدید فن تعمیر کو چاہیے کہ جو بستیاں آباد ہوں ان کو کسی درس گاہ یا کسی دوسرے ثقافتی ادارے کے گرد منظم کیا جائے تاکہ ان میں سے

ہر ایک کا یگانہ رنگ ہو۔ جس سے مقامی زندگی میں ثقافتی حسن پیدا ہو۔

آئرلینڈ کے استادوں کا جھگڑا

آئرلینڈ کے پرائمری مدرسین نے ہڑتال کرنے کی ٹھان لی تھی۔ آرچ بشپ آف ڈبلن کے دخل دینے پر معاملہ وقتی طور پر رفع دفع ہوگیا۔

اس جھگڑے کا سبب یہ ہے کہ بیلینیا کے مدرسے کا سر معلم نوکری سے سبکدوش ہوا تو اس کی جگہ خالی ہوگئی اس آسامی کے لیے عملے کے دو اراکین نے درخواست دی۔ جلد ہی معلوم ہوا کہ مدرسے کا نظم ونسق پادریوں کی ایک تنظیم کے حوالے کیا جارہا ہے۔ اس سے مدرسے کے استادوں میں جوش پھیل گیا۔ کیوں کہ اس اقدام سے ان کی ترقی کے امکانات ختم ہوتے نظر آتے تھے۔ استادوں کے ایک وفد نے علاقے کے بشپ سے ملاقات کی۔ اس نے کہا مجھے موجودہ عملے میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ پادریوں کے لیے ترقی کا میدان بہت محدود ہے۔ ہم نے مدرسے کا انتظام اس لیے سنبھالا ہے کہ اس سے پادریوں کے مواقع بہتر ہو جائیں گے۔ استادوں نے گرجے کے بڑے بڑے رہناؤں سے ملاقات کی اور حقوق کے بچاؤ کے لیے بڑا زور مارا مگر گلیبلہ کے بشپ نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔

بشپ کے اس طرز عمل نے تمام استادوں میں بڑا ہیجان پیدا کر دیا۔ استادوں کی قومی انجمن نے اس صورت حال پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ایک عرصے سے پادری لوگ غیر مذہبی مدرسوں پر چھائے جا رہے ہیں۔ جہاں کہیں لڑکوں کے کسی مدرسے کی سر معلمی خالی ہوئی کسی پادری کو اس جگہ پر مقرر کر دیا گیا۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسوقت بہت تھوڑے مدرسے ایسے رہ گئے ہیں جن کے سر معلم غیر مذہبی لوگ ہوں۔ کناٹ کے ضلع میں صرف دو ایسے مدرسے رہ گئے ہیں۔ غیر مذہبی استاد اس صورت حال سے بجا طور پر ہراساں ہیں۔ کیوں کہ ان کی ترقی کی راہیں بند ہوئی جارہی ہیں۔ اس افسوس ناک خطرے کے خلاف اپنے جذبات کے موثر اظہار کے لیے استادوں کی قومی انجمن نے ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر ڈبلن کے آرچ بشپ نے انجمن بشپ کو یہ مشورہ دیا کہ اس انتہائی اقدام سے پہلے پاپائے روم کو اپیل کردینا چاہیے۔ اس مشورہ پر ہڑتال سردست روک دی گئی۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

اموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اموزش

۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

آموز

[ا کتوبر ۱۶] **لاہور** [...]

اِس شمارہ میں

مدیر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم - اے - مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوہدری
فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

۹ ——————

۷ ——————

قیمت فی پرچہ دس ۱۰ آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

تعلیم کے سامنے نئے کام

ایم۔ اے مخدومی

۱۴ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو وحدت مغربی پاکستان نے اپنی زندگی کا پہلا سال ختم کرلیا۔ اس وحدت کا قیام ہماری قومی زندگی میں ایک بہت بڑا معاشرتی تجربہ تھا۔ ایک سال کا عرصہ اس عظیم الشان تجربے کے تعمیری امکانات کی پوری جانچ کے لیے کسی طرح کافی نہیں تاہم اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ یہ تجربہ کامیاب رہا۔ نہ صرف یہ کہ اس کے متعلق بعض لوگ جن خدشات کا اظہار کر رہے تھے وہ بے بنیاد ثابت ہوئے، بلکہ ایک سال کے تجربہ نے ان بہت سی تعمیری راہوں کی نشان دہی بھی کی جو قومی استحکام اور سربلندی کی طرف لے جانے والی ہیں۔ وحدت کی یکسالہ زندگی نے ان چند در چند علاقائی اختلافات کو واشگاف طور پر نمایاں کر دیا ہے جو صحت مند قومی شعور کی ترقی کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔ اب اگلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ان اختلافات کو رفتہ رفتہ ختم کرنے کے لیے قابل عمل منصوبے تیار ہوں اور ان منصوبوں کو عملی شکل دی جائے۔

پچھلے ایک سال میں تعلیم کو جن نئے مسائل کا احساس ہوا ہے وہ بے حد اہم قومی مسائل ہیں۔ انگریزی عہد سے لے کر وحدت مغربی پاکستان کے قیام تک تعلیم ایک صوبائی ذمہ داری چلی آتی تھی۔ ہر صوبہ اپنے تعلیمی مسائل کو جس طور پر چاہتا تھا طے کرتا تھا۔ اس کا طریق کار پڑوسی صوبوں کی مثال سے زیادہ متاثر نہ ہوتا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر صوبے میں ایک جداگانہ قسم کا نظام تعلیم ترقی پا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج صوبہ مغربی پاکستان کے مختلف حصوں کا نظام مدارس ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ مثلاً سابق پنجاب کے اضلاع میں پرائمری کا نصاب پانچ سالہ ہے۔ مگر سابق صوبہ سندھ کے مدرسوں میں اس کی میعاد صرف چار سال ہے۔ پھر اول الذکر صورت میں ثانوی مدرسہ کا نصاب پانچ سالہ ہے۔ مگر ثانی الذکر صورت میں سات سالہ۔ گویا صوبے کے ایک حصے میں میٹرک پاس کرنے کے لیے دس سال لگانے پڑتے ہیں۔ مگر دوسرے حصے میں گیارہ سال۔ یہ اختلاف ان طلبہ کے لیے کافی پریشانی کا موجب ہے جو صوبے کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جانے پر مجبور ہوں۔

اس سے زیادہ اہم مسئلہ زبان کا ہے۔ سابق پنجاب کے مدرسوں میں اردو آٹھویں جماعت تک ایک لازمی مضمون ہے۔ جو طالب علم پرائمری درجہ کے بعد مدرسہ چھوڑ دے وہ بھی اس قابل ہو جاتا ہے کہ اردو پڑھنے لکھنے کی معمولی استعداد پیدا کر لے۔ سابق صوبہ سندھ کے مدرسوں میں حالت یکسر مختلف ہے۔ وہاں پرائمری درجے پر اردو سرے سے پڑھائی ہی نہیں جاتی۔ جو طالب علم پرائمری درجہ پر تعلیم ختم کر دیتا ہے وہ سندھی زبان کے سوا کوئی دوسری زبان پڑھ لکھ نہیں سکتا۔ حد یہ ہے کہ ان پرائمری مدرسوں میں پڑھانے والے استادوں میں بھی کئی ایسے ہیں جو سندھی کے سوا کوئی دوسری زبان پڑھنا لکھنا نہیں جانتے۔ ثانوی درجہ پر بھی اردو ہر مدرسے کے نصاب میں داخل نہیں۔

ایک قوی قومی شعور کی ترقی کے لیے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ پڑھے لکھے شہری ایک ایسی مشترک زبان جانتے ہوں جو ملک کے ہر حصے میں بول چال اور خط و کتابت کا ذریعہ بن سکے۔ اس مشترک زبان کو پرائمری نصاب کا لازمی مضمون قرار دیے بغیر یہ غایت پوری نہیں ہو سکتی۔ اس کے ساتھ ہی صوبائی اور علاقائی زبانوں کی بقا و ترقی کا مسئلہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ایک مشترک زبان کی ترویج ہماری بنیادی قومی ضرورت ہے۔ جسے ہر قیمت پر پورا ہونا چاہیے۔ اس ضرورت کو پورا کرنا تعلیم کی ذمہ داری ہے۔

غرض وحدت مغربی پاکستان نے جہاں وحدت فکر و عمل کی کئی راہیں کھولی ہیں، وہاں اس نے ان اسباب کی نشان دہی بھی کی ہے جو وحدت فکر و عمل کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔ ان اسباب کو دور کرنے میں تعلیم کو مرکزی کردار ادا کرنا ہے۔ اس سے یہ ہرگز مقصود نہیں کہ مغربی پاکستان کے ہر حصے میں یکساں قسم کا نصاب رائج کر دیا جائے مقامی تقاضوں کی جھلک نصاب کی صحت مندی کی علامت ہوا کرتی ہے۔ اس کا تنوع جمہوری تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ مگر اس تنوع اور مقامی رنگ کے ساتھ ساتھ تمام مدرسوں کے نصاب میں کچھ جگہ اس یکسانیت کو بھی ملنی چاہیے جس کے بغیر نئی پود کی وحدت فکر و نظر عطا نہیں کی جا سکتی۔

نتائج کی پیمائش

فضل احمد

سائنس یا فن؟

علم التعلیم موجودہ صدی کے جدید معاشرتی علوم میں سے ایک ہے۔ اگرچہ تعلیم کا وجود تقریباً اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ انسانی معاشرے کا، لیکن موجودہ صدی کے آغاز تک تعلیم کو محض ایک ہنر کا درجہ حاصل تھا۔ پچھلی لمبی صدیوں میں سیکڑوں صاحب نظر استاد پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے فن اور پیشے کا نام بلند کیا۔ ان لوگوں کی مثال سے کئی لوگوں نے معلمی کی تربیت حاصل کی۔ مگر ان باکمال فن کاروں کے عملی تجربوں کا کوئی سائنسی تجزیہ نہ کیا گیا، اور نہ ہی انہیں کسی مربوط سلسلے کے تابع لانے کی کوشش کی گئی۔ قدرتی سائنسوں کے میدان میں انسان نے نسبتاً جلدی ترقی کی، مگر معاشرتی علوم کو موجودہ صدی سے پہلے سائنس کا مقام حاصل نہ ہو سکا۔

علوم کو عموماً دو بڑی اقسام میں بانٹا جاتا ہے۔ سائنسی علوم اور فنون ان دونوں کے درمیان امتیازی فرق کیا ہے؟ سائنس علم کی کسی ایسی شاخ کا نام ہے جس کی بنیاد واضح اور غیر متبدل قوانین پر ہو۔ یہ اصول اور کلیے ایسے ہوں جن کی روشنی میں مستقبل کے متعلق یقین کے ساتھ قیاس آرائی کی جا سکے۔ مگر قوانین اور کلیوں کی دریافت اسی وقت ممکن ہے جب کوئی ایسا قابل اعتماد ترازو موجود ہو جس میں مختلف واقعات اور شواہد کو تولا جا سکے۔ یوں تولے بغیر ان کی کیفیت اور کمیت کا درست اندازہ نہیں ہو سکتا اور انہیں کسی ہمہ گیر کلیے کے ماتحت نہیں لایا جا سکتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ کسی علم کے سائنسی مقام حاصل کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس نے حقائق اور واقعات کی پیمائش کے لیے کوئی تسلی بخش پیمانہ معلوم کر لیا ہو، جب تک کوئی ایسا پیمانہ یا ترازو ہاتھ نہیں لگ جاتا اس وقت تک وہ علم ظن و قیاس کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکے گا اور اسے سائنسی مقام حاصل نہ ہوگا۔

فن کی نوعیت سائنس سے مختلف ہے۔ فن ہر اس انسانی کوشش کا نام ہے جہاں کسی مطلوبہ نتیجے کے حصول کے لیے پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کیا جائے۔ ہر فن لامحالہ سائنسی اصولوں کو کام کی بنیاد بنائے گا

وہ ان اصولوں کی مدد سے اپنے لیے آلے اور اوزار وضع کرے گا، وہ اس کے لیے نقطۂ آغاز کا کام دیں گے مگر اس کے بعد فن کار کی اپنی شخصیت کا رنگ زیادہ غالب آتا جائے گا۔ فن کار اپنے کام میں اس حد تک کھو جائے گا کہ اسے سائنسی اصولوں کا احساس تک باقی نہ رہے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان اصولوں کے خلاف چل نکلے گا۔ ایسا ہونا قطعاً نا ممکن ہے۔ سائنسی اصول فطرت کے اصول ہیں اور کوئی فن کار فطرت کے خلاف قدم اٹھا کر بلندی حاصل نہیں کر سکتا۔ تاہم بڑے بڑے باکمال فن کار اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے وقت اس کے حسن میں اس حد تک کھو جاتے ہیں کہ انہیں کسی دوسری شے کی خبر نہیں رہتی۔ اس چیز کا ایک قدرتی نتیجہ یہ بھی ہے کہ کسی دو فن کاروں کا مظاہرۂ فن کلی طور پر ایک سا نہیں ہو سکتا۔

اس تجزیے کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم التعلیم ایک سائنس ہے اور تدریس ایک فن۔ استاد کے لیے دونوں میں دست رس حاصل کرنا ضروری ہے۔ علم التعلیم اسے وہ بنیادیں عطا کرتا ہے جس پر اس کے فن کی عمارت اٹھائی جائے گی۔ وہ اس کے فن کو واضح سمت عطا کرتا ہے۔ تدریس اور اس کی لگاتار مہارت ایک محنت طلب اور وقت طلب مشق ہے۔ اس فن میں مہارت لگاتار کوشش اور مشق سے حاصل ہوتی ہے۔

فن کے بارے میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ہر فن کار کا مظاہرۂ فن اس کی شخصی یگانگت کا کچھ نہ کچھ رنگ ضرور لیے ہوگا۔ جس قدر کوئی فن کار زیادہ بلند پایہ ہوگا، اسی قدر اس کی مخصوص یگانگت بھی زیادہ نمایاں ہوگی۔

علم التعلیم کا ارتقاء:

موجودہ صدی کی پہلی دہائی تک علم التعلیم کو سائنسی درجہ حاصل نہ تھا۔ وجہ یہ کہ کسی علم کے سائنسی بننے کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسا قابلِ اعتماد ذریعہ موجود ہو جس میں واقعات و شواہد کو جانچا تولا جا سکے ان کا باہمی مقابلہ اور موازنہ کیا جا سکے اور یوں عام اصولوں اور کلیوں کے اخذ کرنے کا سامان موجود ہو۔ بیسویں صدی کے آغاز تک تعلیم کے پاس ایسا کوئی پیمانہ موجود نہ تھا جو یہ خدمت انجام دے سکتا۔

۱۹۰۷ء میں فرانسیسی حکومت نے ایک کمیٹی اس مطلب کے لیے قائم کی کہ وہ ضعیف العقل بچوں کی تعلیم کے بارے میں مشورہ دے۔ اس کمیٹی میں بینے نامی ایک طبیب بھی شامل تھا۔ اس شخص کو بچوں کے ساتھ گہری ہمدردی تھی اور وہ نفسیاتی حقائق پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ضعیف العقل بچوں کی موزوں رہ نمائی کے لیے ضروری ہے کہ ان کی ذہانت کو جانچنے کا کوئی پیمانہ ڈھونڈا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں بچہ ذہنی طور پر کس

سطح پر ہے۔

بڑے غور و خوض کے بعد بنے نے ایک ایسا آلہ ڈھونڈ نکالا، اس نے بعض ایسی آزمائشیں وضع کیں جو مختلف عمروں کے اوسط درجہ کے صحت مند بچوں کے حسب حال تھیں۔ یہ آزمائشیں طرح طرح کے سوالوں اور عملی ذہنیوں پر مشتمل تھیں۔ عمر کے ہر گروہ کے لیے ان کی نوعیت الگ تھی۔ اگر کوئی بچہ اپنی عمر کی مقررہ آزمائشوں میں بخوبی کامیاب ہو جاتا تو اسے ایک عام صحت مند بچہ تصور کیا جاتا۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکتا تو وہ اوسط سے کم فہین شمار ہوتا اور اگر وہ اس آزمائش سے بلند تر ثابت ہوتا تو اوسط سے زیادہ ذہین۔

فرانسیسی طبیب کی دقت نگاہ کی بدولت تعلیم کو پیمائش کا ایک آلہ ہاتھ لگ گیا۔ ہر چند کہ یہ ترازو بہت بھدا تھا مگر اسے کوشش اور محنت سے بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ چناں چہ تعلیمی دنیا میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ بیسیوں ماہرین نفسیات اور ماہرین تعلیم نے ساری توجہ اس کی نذر کر دی۔ چناں چہ دیکھتے دیکھتے ذہنی پیمائش کا یہ آلہ خوب منجھ کر بڑی حد تک قابل اعتماد بن گیا۔ اول اول اسے ذہنی خارج قسمت کی شکل دی گئی، وہ یوں کہ ذہنی عمر کو حقیقی عمر پر تقسیم کر کے حاصل قسمت کو سو سے ضرب دے دی گئی۔ اس طرح ہر بچے کی ذہانت کا فی صد تناسب کم و بیش صحت کے ساتھ معین ہونے لگا۔ مثلاً اگر ایک دس سالہ بچہ ذہنی طور پر بارہ سال کا ہے تو اس کا ذہنی خارج قسمت ہوگا $\frac{۱۲}{۱۰} \times ۱۰۰$ یعنی ۱۲۰۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گو وہ بچہ دس سال کا ہے۔ اس کی ذہانت اسی سطح پر ہے جس سطح پر ایک اوسط درجہ کے بارہ سالہ بچے کی ہونی چاہیے۔

ذہنی خارج قسمت کے جلو میں طرح طرح کی معیاری آزمائشیں آئیں۔ بچوں کے طبعی میلانات اور ان کی علمی استعداد کو جانچنے کے لیے معیاری آزمائشیں وضع کی گئیں۔ ان کی مدد سے نہ صرف طلبہ کی موزوں درجہ بندی آسان ہو گئی بلکہ انہیں صحیح قسم کی پیشہ ورانہ رہ نمائی بھی ملنے لگی۔

تول ماپ کے ان تعلیمی پیمانوں نے علم التعلیم کو سائنس کا بلند مقام عطا کر دیا۔ بے شک یہ پیمانے سو فی صد صحت کے ضامن نہیں، لیکن یہی حال باقی تمام معاشرتی سائنسوں کا ہے۔

تعلیمی پیمائشوں کی ضرورت

تاہم اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ذہنی خارج قسمت اور معیاری آزمائشوں کی آمد سے پہلے تعلیمی پیمائش کی

ضرورت محسوس نہ کی جاتی تھی، یا اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کوئی ذرائع استعمال نہ ہوتے تھے، جب سے تعلیم وجود میں آئی ہے اس وقت سے استادوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اپنی محنت کے نتائج کا اندازہ لگائیں۔ یہ ضرورت دو وجوہ کی پیداوار تھی (۱) طلبہ کی کارکردگی یا عدم کارکردگی کا اندازہ لگایا جائے (۲) طریقہ ہائے تدریس کی خامیاں معلوم کرکے ان کی اصلاح کی جائے۔

آج سے کوئی بیس سال پہلے تک تعلیمی پیمائش کا یہ کام کلی طور پر استاد کی ذاتی رائے کا معاملہ سمجھا جاتا تھا۔ ہر استاد اپنے ذہنی پس منظر اور اپنے طے کردہ مقاصد کی روشنی میں طلبہ کی کارکردگی اور اپنی کامیابی کا جائزہ لیتا۔ وجہ یہ کہ کوئی ایسا معروضی پیمانہ میسر نہ تھا جسے ہر استاد ہر قسم کے حالات میں استعمال کر سکے۔ مغرب میں یہ صورت حال ختم ہو چکی ہے۔ وہاں ہر قسم کی ذہنی صلاحیت اور تعلیمی استعداد کی پیمائش کے لیے معیاری آزمائشیں وضع کی جا چکی ہیں، جن کی مدد سے ہر طالب علم کی استعداد اور کارکردگی کا معروضی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ آج مغرب کے ہر استاد کی تربیت کا ایک ضروری جزو یہ بھی ہے کہ وہ طرح طرح کی معیاری آزمائشوں میں سے حسب حال آزمائشیں چن کر ان سے کمرۂ جماعت میں کام بھی لے سکے۔

معروضی تعلیمی پیمائش کی ضرورت یوں تو عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی مگر موجودہ صدی کے بعض تحقیقی مطالعوں نے ان کی ضرورت کو بہت شدید رنگ میں پیش کیا۔ یکے بعد دیگرے کئی سائنسی مشاہدوں نے یہ بات ثابت کر دکھائی کہ استاد کی ذاتی رائے اور اس کا ذہنی پس منظر انفرادی جانچ پڑتال کو رنگ دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بعض صورتوں میں ذاتی پسند کا یہ عنصر ایک ہی چیز کے دو مختلف جائزوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ ان انکشافات نے رائے عامہ کو چونکا دیا اور ہر طرف سے آوازیں اٹھنے لگیں کہ تعلیمی پیمائش کے لیے معروضی پیمانے ہونے چاہئیں۔

اس عام احساس کے باوجود مغرب میں بھی معیاری آزمائشوں کے قبول کیے جانے میں وقت لگا۔ یہ آزمائشیں آج سے کوئی تیس برس پہلے منظر عام پر آنے لگی تھیں۔ استادوں اور عوام کی طرف سے اول اول ان پر نکتہ چینی ہوئی۔ رفتہ رفتہ ان کا تصور قبول کیا جانے لگا اور ان کا استعمال شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان تعلیمی پیمانوں کی کمیاں بھی واضح ہونے لگیں اور ان کی اصلاح ترمیم کا کام جاری رہا۔ ان خامیوں کو معلوم کرنے کے لیے سب سے زیادہ بے قرار وہ لوگ تھے جنہوں نے یہ آزمائشیں وضع کی تھیں۔ اس سائنسی نقطۂ نگاہ کا نتیجہ

یہ نکلا کہ یہ مفید تعلیمی پیمانے بہتر سے بہتر ہوتے چلے گئے۔ اور آج ان کی افادیت میں نہ استادوں کو کلام ہے اور نہ عوام کو۔

مختلف تصوّرات

معیاری آزمائشوں کو موجودہ مقام حاصل کرنے کے لیے مختلف مدارج میں سے گذرنا پڑا ہے۔ اس ارتقائی دور میں ان کے متعلق مختلف تصوّرات قائم کیے گئے۔ ان تصوّرات کو مندرجہ ذیل ناموں سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

(۱) آزمائش (۲) پیمائش (۳) جائزہ

وقت کی تقدیم کے لحاظ سے آزمائش کے تصوّر کو پہلا درجہ حاصل ہے۔ معروضی تول ماپ کی ضرورت کے احساس کے ساتھ ہی آزمائش کا تصوّر پیدا ہو گیا تھا۔ استاد کی انفرادی رائے کے ناقابل اعتماد ثابت ہونے سے یہ مطالبہ پیدا ہوا تھا کہ ذہانت، اور تعلیمی قابلیت کو جانچنے کے لیے معروضی آزمائشیں تلاش کی جانی چاہئیں۔

جب معروضی آزمائشوں کا استعمال عام ہو گیا اور استاد کمرہ جماعت کی محنت کے نتائج جانچنے کے لیے انہیں کثرت سے استعمال کرنے لگے تو رفتہ رفتہ یہ سوال پیدا ہوا کہ معروضی آزمائش کے نتائج سے کام کس طرح لیا جائے۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوا کہ تعلیمی کارکردگی کے ان پہلوؤں کو کیوں کر تولا جائے جو کسی طرح بھی تعلیمی ترازو میں رکھے نہیں جا سکتے۔ معروضی آزمائشیں تدریس کے بعض نتائج کو تولنے سے عاجز نظر آتی تھیں۔ یہ دور عام طور پر پیمائش کا دور کہلاتا ہے۔

حالیہ سالوں میں یہ احساس بڑھ گیا ہے کہ کاغذ قلم سے کام لینے والی آزمائشیں خواہ کتنی ہی جامع اور معروضی کیوں نہ ہوں طالب علم کی شخصیت کے بعض گوشے ان کے احاطے میں نہ آسکیں گے۔ محض ان کی مدد سے تدریس کے تمام نتائج کا درست اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کمی کے علاج کی کئی راہیں تجویز کی گئی ہیں۔ مثلاً طالب علم کے طرزِ عمل کا مسلسل ریکارڈ رکھنا۔ اس سے بالمشافہ بات چیت کرنا۔ اس سے سوالناموں کے جواب حاصل کرنا۔ اس کے کردار کے کسی خاص پہلو کا تفصیلی مطالعہ کرنا وغیرہ۔ تدریس کی قدر و قیمت کے اس جامع انداز ے کو جائزہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس تصوّر کو نفسیات کے اس جدید نظریے سے سہارا ملا ہے کہ طالب علم کی ساری ہستی کو ایک وحدت کا درجہ حاصل ہے اس کے مختلف اوصاف کو ایک ایک کر کے جانچنا اور ان اوصاف کی ایک فہرست تیار کرنا تسلی بخش طریق کار نہیں ہے۔

معروضی اور معیاری آزمائش میں ایک اور فرق بھی ہے۔ اول الذکر آزمائش استاد خود اپنے مضمون کے نتائج

جانچنے کے لیے تیار کرتا ہے۔ وہ اس کے پڑھائے ہوئے نصاب کی تمام جزئیات پر حاوی ہو سکتی ہے۔ مگر معیاری آزمائش ایک محدود تر علمی میدان کا احاطہ ہی نہیں کر سکتی ہے۔ کیوں کہ وہ کسی خاص گروہ جماعت کو نگاہ میں رکھ کر وضع نہیں کی گئی ہوتی۔ غیر رسمی معروضی آزمائشوں اور معیاری آزمائشوں میں بہت سی باتیں مشترک بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ دونوں قابل اعتماد، درست اور معروضی ہوتی ہیں۔

تعلیمی آزمائشوں کے عام خصائص

ہر انسانی کوشش میں بہترین نتائج اسی وقت حاصل ہوتے ہیں جب کام کرنے والے کو اپنے مقصد کا پوری وضاحت کے ساتھ علم ہو اور جب ایسے قابل اعتماد پیمانے موجود ہوں جن کی مدد سے وہ اپنی محنت کے نتائج کو جانچ سکے۔ تدریس کی تاثیر کے لیے بھی یہ دونوں شرائط لازمی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معیاری آزمائشیں وضع کرنے والے ماہرین تعلیم اس بات کے شاکی ہیں کہ بعض اوقات نصاب میں ایسے مبہم مقاصد بیان کیے گئے ہوتے ہیں جن کی پیمائش ناممکن ہو جاتی ہے۔ لہٰذا نصاب وضع کرنے والوں پر یہ فرض شدت کے ساتھ عائد ہوتا ہے کہ وہ اغراض و مقاصد کو بین الفاظ اور واشگاف پیرائے میں واضح کر دیں۔

جہاں اغراض و مقاصد واضح طور پر طے شدہ ہوں وہاں معیاری آزمائش کا ترازو آسانی سے کامیاب ہو سکتا اس کی مدد سے استاد دیکھ سکتا ہے کہ اس نے کام کے کس حصے کو ضرورت سے زیادہ توجہ دی ہے اور کس کو ضرورت سے کم۔ اس تجربے کی روشنی میں وہ اپنے طریق کار میں اصلاح کر سکتا ہے۔ مثلاً اگر معیاری آزمائش یہ ظاہر کرے کہ طالب علم پڑھتا تو خوب روانی سے ہے، مگر مطالب پوری طرح اخذ نہیں کرتا تو اس کا یہ مطلب ہے کہ طالب علم بلند آواز سے پڑھنے کی بجائے خاموش مطالعہ پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

پیمائش کا قابل اعتماد آلہ استاد کو اس قابل بنا سکتا ہے کہ وہ طریقہ ہائے تدریس میں نئے تجربوں کو آزما مگر یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب اس کی منزل مقصود واضح طور پر متعین ہو۔ اگر ایسا نہیں تو اس کی مثال ایک ایسے راہرو کی ہوگی جسے یہ معلوم نہیں کہ اس کی منزل کتنے فاصلہ پر ہے اور وہاں تک پہنچنے کے لیے کونسا ذریعۂ سفر زیادہ موزوں ہوگا۔

جدید تعلیمی آزمائشوں کا دوسرا بڑا خاصہ ان کی موزونیت ہے۔ روائتی تحریری امتحانوں میں طلبہ

سوال پوچھے مذر رجاتے ہیں. لیکن ان سوالوں کی نوعیت اور جائزہ لے جانے والی صلاحیت کے درمیان عموماً بہت کم مناسبت ہوتی ہے. مثلاً ہمارے مدرسوں میں انگریزی زبان کی تدریس ہی کو لیجیے. نصاب کے الفاظ میں اس کا اہم ترین مقصد طلبہ کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ بلا تکلف آسان انگریزی نثر پڑھ کر مطالب اخذ کر سکیں اور اس زبان میں سہولت کے ساتھ بات چیت بھی کر سکیں مگر امتحانی پرچے میں ترکیب نحوی اور دور از کار محاورات پوچھے جاتے ہیں. جدید تعلیمی آزمائشیں اس عدم موزونیت کا زیادہ سے زیادہ حد تک خاتمہ کر دینے کی کوشش کرتی ہیں۔

معیاری آزمائش کا تیسرا خاصہ اس کی وسیع بنیاد ہے. یہ آزمائش کسی خاص مدرسے یا طلبہ کے کسی مخصوص گروہ کو نگاہ میں رکھ کر وضع نہیں کی جاتی. بلکہ ہوتا یوں ہے کہ آزمائش کو معیاری قرار دینے سے پہلے اسے مختلف ماحول کے مدرسوں اور مختلف ذہنی پس منظر رکھنے والے طلبہ پر آزمایا جاتا ہے. اس طور پر جو معیار یا پیمانہ قائم ہو جاتا ہے اسے آزمائش کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔

معیاری آزمائش کا چوتھا خاصہ وہ اہم اصلاح ہے جو حال ہی میں وجود میں آئی ہے. وہ یہ کہ آزمائش کو مفید تر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے نتائج استاد اور طلبہ کے لیے اصلاح حال کی نشان دہی کرنے والے ہوں. چناں چہ جدید آزمائشوں کے مختلف اجزا کو اس طور پر مرتب کیا جاتا ہے کہ ان کے نتائج موزوں اصلاحی کام کی طرف واضح رہ نمائی کر سکیں۔

آزمائشوں کے متذکرہ صدر خصائص اگرچہ معیاری آزمائشوں کے ساتھ مخصوص ہیں تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معیاری آزمائشیں اکیلی استاد کی ساری ضرورتیں پوری نہیں کر سکتیں. اسے اکثر اوقات خود بھی آزمائشیں وضع کرنی پڑتی ہیں. استاد کی وضع کردہ آزمائشیں اور معیاری آزمائشیں دراصل ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ دونوں کا مقام الگ الگ ہے اور دونوں اپنی اپنی جگہ ناگزیر ہیں، خود آزمائشیں وضع کرتے وقت بھی استاد کو حتی الامکان ان تمام خصائص کا خیال رکھنا چاہیے جو معیاری آزمائشوں کا طرہ امتیاز ہیں۔

آزمائشوں کا مقام اور ان کی اقسام

تعلیمی دنیا میں امتحانوں اور آزمائشوں کا مقام بالکل مسلمہ ہے. مدرسے، استاد، طلبہ اور والدین تمام ان کی

اہمیت کے قائل ہیں۔ طلبہ کا بہت سا وقت ان کی تیاری کرنے اور ان میں بیٹھنے کی نذر ہو جاتا ہے۔ امتحانات مدرسے کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مدرسہ ان پر بہت سا وقت محنت اور روپیہ صرف کرتا ہے وہ اس لیے کہ امتحانات مدرسے اور عوام کے درمیان رابطہ قائم کرنے کا بڑا ذریعہ ہیں۔ وہ والدین اور عوام کو بتاتے ہیں کہ مدرسے کے مقاصد کیا ہیں اور مدرسہ ان میں کس درجہ کی کامیابی چاہتا ہے۔

استاد کے لیے امتحانوں کی افادیت یہ ہے کہ ان کی مدد سے وہ اپنے مخصوص مضمون کی تدریس کا جائزہ لے کر یہ معلوم کر سکتا ہے کہ مضمون کے کون سے حصوں کو ضرورت سے زیادہ توجہ ملی ہے اور کون کون سے حصے توجہ سے محروم رہے ہیں۔ اگر ساری جماعت مجموعی طور پر امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرے تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تدریس موثر طور پر ہوئی ہے اور یہ بھی کہ طلبہ کا حافظہ بہت اچھا ہے اور یا یہ کہ انہوں نے بنیادی مطالب کا پورا فہم حاصل کر لیا ہو۔ اس کے برعکس تھوڑے نمبروں کا مطلب یہ ہوگا کہ طلبہ مضمون متعلقہ کے بنیادی تصورات کا فہم حاصل نہیں کر سکے اور استاد کو یہ کام از سر نو کرنے کی ضرورت ہے۔ الغرض امتحانات اور آزمائشیں استاد کے لیے ایک مفید اور ناگزیر تدریسی ذریعہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

حالیہ سالوں میں طرح طرح کی معیاری آزمائشوں کو مغرب میں جو فروغ حاصل ہوا ہے اس سے یہ نتیجہ نہ نکال لینا چاہیے کہ معیاری آزمائشوں ہی کے ذریعہ امتحان لینے کا سارا کام انجام پا سکتا ہے۔ اس نکتے کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ معیاری آزمائشیں لابدی طور پر کسی مضمون کے ایک محدود حصے ہی کا جائزہ لے سکتی ہیں۔ کوئی استاد اپنی کارکردگی اور طلبہ کی ترقی کا مسلسل اندازہ کرنے کے لیے محض معیاری آزمائشوں پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ اس مطلب کے لیے اسے خود امتحانی سوالات وضع کرنے پڑتے ہیں۔ اسے خود آزمائشیں مرتب کرنا پڑتی ہیں۔ ان آزمائشوں کی ضرورت اس قدر عام ہے کہ مغربی مدرسوں میں استاد جن آزمائشوں سے کام لیتے ہیں ان میں سے نوے فی صد ان کی اپنی ترتیب دی ہوئی ہیں۔ استاد کی اپنی مرتب کردہ آزمائشوں کے بعد غیر رسمی معروضی آزمائشوں کا درجہ ہے۔ پچھلی دو دہائیوں میں مغرب میں ان کی مقبولیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ طلبہ کی قابلیت کے بعض گوشے ایسے بھی ہیں جن کا جائزہ غیر رسمی معروضی آزمائشیں نہیں لے سکتیں۔ اس پر مستزاد انہیں تیار کرنے کی دشواری ہے کیونکہ ان کے تیار کرنے میں ان تمام احتیاطوں کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے جو معیاری آزمائشوں کا امتیازی نشان ہیں۔

نتائج کی صحت اور یقین کے اعتبار سے سب سے اونچا مقام معیاری آزمائشوں کو حاصل ہے۔ استاد پورے بھروسے کے ساتھ ان سے کام لے سکتا ہے۔ ان کی مدد سے طلبہ کے انفرادی اختلافات اور ان کے مخصوص جوہروں کی خبر مل سکتی ہے وہ استاد کو اس قابل بنا سکتی ہیں کہ اپنے مقاصد معین کر لے۔ ان کی بدولت استاد اور ناظمین مدرسہ کو طلبہ کے متعلق ایسی گہری معلومات حاصل ہو سکتی ہیں جن کا انہیں وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ ان معلومات کی روشنی میں طلبہ کو فنی اور پیشہ ورانہ مشورہ دیا جا سکتا ہے۔ معیاری آزمائشوں کی مدد سے طلبہ کی کمیاں اور کمزوریاں بڑی وضاحت سے سامنے آجاتی ہیں ان کا علم استاد کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ مؤثر اصلاحی کام کا آغاز کر سکے۔ اس ضمن میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ معیاری آزمائشوں میں کوئی ایسا جادو موجود نہیں جو از خود طلبہ کو بہتر بنا دے۔ یہ آزمائشیں استاد کو ایسے نتائج مہیا کر سکتی ہیں جو طلبہ کی مخصوص خوبیوں اور ان کی مخصوص کمزوریوں کی نشان دہی کریں۔ ان نتائج کی بنا پر طلبہ کے انفرادی جوہروں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر اور ان کی انفرادی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے مؤثر قدم اٹھانا استاد اور انتظامی افسروں کا کام ہے۔

کمرہ جماعت میں معیاری آزمائشوں کا استعمال

استاد کے لیے ضروری ہے کہ اس نے ان کے نتائج کی توجیہہ کرنے اور بعد ازاں اس سے کام لینے کی اور ان کے نتائج کی تاویل کرنے کی تربیت حاصل کر رکھی ہو۔ وہ اس بات کے لیے تیار ہو کہ آزمائشوں سے کام لینے کے لیے جس زائد محنت اور وقت کی ضرورت ہے اسے صرف کر سکے۔

معیاری آزمائشوں کو تین بڑے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ہر مقصد ایک مخصوص زاویہ نگاہ کا آئینہ دار ہے۔

معیاری آزمائشوں کی پہلی قسم وہ ہے جو تفصیل کے ساتھ طلبہ کی قابلیتوں اور کمزوریوں کا جائزہ لیتی ہے ان سے حاصل شدہ نتائج کی روشنی میں تدریس کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ان آزمائشوں سے کام لینا کلی طور پر استاد کی ذمہ داری ہے۔

معیاری آزمائشوں کی دوسری قسم وہ ہے جن کے نتائج کو عام معلومات اخذ کرنے یا انتظامی معاملات کی ترمیم و اصلاح کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسی آزمائشیں استاد کی بجائے کسی دوسرے آدمی کی ذمہ داری ہونی چاہئیں۔ اگر کسی ایسی آزمائش کے نتائج کو طلبہ کی درجہ بندی وغیرہ کی بنا قرار پانا ہو تو اس کا اہتمام استاد اور صدر معلم دونوں مل کر کر سکتے ہیں۔

غرض آزمائش کا مقصد اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ یہ کس کی ذمہ داری ہو۔

آزمائش کا انتخاب

آج تعلیمی دنیا میں بہت سی معیاری آزمائشیں دستیاب ہیں۔ کسی آزمائش سے کام لینے سے پہلے استاد کو ایسی آزمائش کا انتخاب کرنا چاہیے جو اس کے فوری مقصد کے بالکل حسب حال ہو۔ ایک اچھی آزمائش میں مندرجہ ذیل اوصاف ہونے چاہئیں۔

(۱) استحکام۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آزمائش مسلمہ اصولوں پر پوری اترتی ہو۔

(۲) قابل اعتماد۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ آزمائش عملی نتائج کی کسوٹی پر پرکھی جا چکی ہو۔

(۳) وافی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آزمائش طلبہ کی قابلیت اور استعداد کے ایک معتدبہ حصے کو جانچنے والی ہو۔ یہ نہیں کہ محض ایک حقیر سے گوشے کو احاطہ کرنے پر بس کر دے۔

(۴) معروضیت جس سے مراد یہ ہے کہ آزمائش لینے والوں کے ذاتی تاثرات آزمائش کے نتائج پر اثر انداز نہ ہوتے ہوں

(۵) قابل عمل یعنی آزمائش ایسی ہو کہ اس سے کام لینا عام حالات میں ہر وقت ممکن ہو۔

(۶) قابل جائزہ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آزمائش کے نتائج کو آسانی سے جانچا جا سکتا ہو۔

(۷) کفایت۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آزمائش کا سارا کام وقت اور محنت کی خاص بچت کے ساتھ انجام دیا جا سکتا

(۸) قابل مقابلہ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آزمائش کی افادیت کا مقابلہ کسی دوسری آزمائش کی افادیت کے سا[تھ] کیا جا سکتا ہو۔

(۹) افادیت۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آزمائش کے نتائج کو آسانی سے تعمیر و اصلاح کی بنیاد بنایا جا سکتا ہو

تمام اوصاف کے متعلق اطمینان کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ استاد کسی ایسے شخص سے مشورہ حاصل کر[ے] جس نے زیر نظر آزمائش کا خاص مطالعہ کیا ہو۔ ہر آزمائش کے متعلق استاد کو کچھ سوالوں کے جواب حاصل کر[نے] چاہئیں۔ اگر ان کے جواب ہاں میں ہوں تو آزمائش کو اطمینان کے ساتھ منتخب کیا جا سکتا ہے۔ وہ سوا[ل]

(۱) کیا یہ آزمائش ان معلومات۔ مہارتوں۔ تصورات۔ فہموں اور ذوقوں کا جائزہ لے سکے گی جن کا جائز[ہ] مطلوب ہے۔

(۲) اس پر کتنا وقت صرف ہوگا؛ کیا یہ آزمائش اتنی جامع ہے کہ ایک قابل اعتماد اور استوار پیمانہ ثابت ہو سکے؛

(۳) کیا اس کے نتائج کو صحت کے ساتھ جانچنا آسان ہے؛

(۴) کیا اس سے کوئی ایسا تسلی بخش پیمانہ حاصل ہو سکے گا جس کی مدد سے مختلف نتائج کا باہمی مقابلہ کیا جا سکے؛

(۵) کیا یہ آزمائش پہلے بھی کثرت سے استعمال ہو چکی ہے؛

(۶) کیا اس کے نتائج کی تاویل کرنا ایک آسان اور سادہ کام ہے؛

(۷) کیا اس کے نتائج کسی اصلاحی کام کی طرف اشارہ کریں گے؛

(۸) کیا اس کی افادیت اتنی ہے کہ وقت اور لاگت کے لحاظ سے اسے ایک کم خرچ آزمائش کہا جا سکے؛

آزمائش کا استعمال

مندرجہ بالا معیاروں پر پوری اترنے والی آزمائش یقینی طور پر ایک مفید آزمائش ہوگی۔ لیکن ایک اچھی آزمائش سے نتائج حاصل کرنے کے لیے اس کے استعمال میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ سب سے ضروری احتیاط یہ ہے کہ آزمائش حتی الامکان ایسے ماحول میں لی جائے جس ماحول میں اس کو معیاری بنایا گیا تھا۔ ایسا کیے بغیر اس کے نتائج مہمل رہیں گے ضروری ماحول پیدا کرنے کے لیے استاد کو ان ہدایات کا سختی سے لحاظ رکھنا ہوگا جو آزمائش کے ساتھ مطبوعہ شکل میں موصول ہوئی ہوں۔

کسی آزمائش کے نتائج میں ممتحن کی شخصیت اور اس کے رویے کو بھی دخل حاصل ہے۔ اگر یہ چیزیں طلبہ میں غیر قدرتی ردّ عمل پیدا کر دیں تو آزمائش کا سارا مقصد فوت ہو کر رہ جائے گا۔ ممتحن کے لیے لازمی ہے کہ اپنے طرزِ عمل سے ایسی فضا پیدا کیے رکھے جس سے طلبہ کی بشاشت اور ان کا اعتمادِ نفس قائم رہے۔ اس معاملہ میں ذرا سی غفلت آزمائش کو بے کار بنا سکتی ہے۔

آزمائش کو خوش اسلوبی سے ختم کر لینے کے بعد اگلا کام اس کی جانچ کا ہے۔ طلبہ کے جوابات کون جانچے؛ مغربی ملکوں میں بعض ایسی مشینیں موجود ہیں جو طلبہ کی کاپیوں کو جانچ دیتی ہیں۔ یہ طریق کار ذاتی اثر کو مکمل طور پر ختم کر دیتا ہے۔ مشینوں کے علاوہ مغرب میں ایسے ادارے بھی موجود ہیں جنہوں نے آزمائشوں کے نتائج جانچنے میں خصوصی مہارت پیدا کر رکھی ہے۔ وہ تھوڑی سی فیس کے بدلے بھیجی ہوئی کاپیوں کو بے لاگ طور پر جانچ دیتے ہیں۔

ان سہولتوں کے ہوتے ہوئے ایسے استادوں کی کمی نہیں جو طلبہ کی کاپیوں کو خود جانچنا پسند کرتے ہیں۔ وہ اپنی پسند کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس طرح انہیں طلبہ کے متعلق براہ راست واقفیت حاصل ہو جاتی ہے اس طرح انہیں صرف اتنا ہی معلوم نہیں ہوتا کہ فلاں طالب علم نے کتنے نمبر حاصل کیے بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے اتنے نمبر کیوں ملے۔ وہ طلبہ کی انفرادی کمزوریوں اور ان کے غیر معمولی جوہروں کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں۔

اس استدلال میں بڑا وزن موجود ہے۔ جیسا پہلے کہا جا چکا ہے۔ کوئی امتحان یا آزمائش لاکھ اچھی ہو جب تک اس کے نتائج کو آئندہ کام کا رخ معین کرنے کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا، اس وقت تک اس سے کوئی تدریسی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ استاد امتحانات محض اس غرض سے لیتے ہیں کہ اپنی تدریس کو پہلے سے بہتر بنا سکیں اور طلبہ کی بہتر رہنمائی کر سکیں۔ یہ خدمت انجام دینے کے لیے استاد کو طلبہ کے متعلق انفرادی طور پر زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہونی چاہئیں۔ طلبہ کے پرچے خود جانچنے سے اس مقصد کے حصول میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ان پرچوں سے اسے بعض اوقات ایسی چیزوں کی خبر مل جاتی ہے جس کا اسے کبھی وہم و گمان بھی نہ تھا۔ وہ ان کی روشنی میں طلبہ کو حسب حال توجہ دے سکتا ہے، ان کی دست گیری کر سکتا ہے اور پیشہ کے انتخاب میں انہیں قابل قدر مشورہ دے سکتا ہے۔

نتائج کی تاویل

آزمائش کے پرچے جانچ لینے کے بعد اگلا قدم حاصل شدہ نتائج کی تاویل و توجیہ ہے، اس کام کے لیے استاد کو شماریات کے متعلق مندرجہ ذیل باتوں میں مہارت حاصل ہونی چاہیے۔

(۱) اسے یہ علم ہونا چاہیے کہ حقائق و واقعات کو مرتب کرنا کیوں ضروری ہے اور اسے مرتب کرنے کی کیا صورت ہے

(۲) اسے یہ علم ہونا چاہیے کہ حقائق و واقعات کا مرکزی رجحان کیوں کر معلوم کیا جاتا ہے۔

(۳) اسے یہ علم ہونا چاہیے کہ حقائق و واقعات کے اختلاف کو کس طرح ظاہر کیا جاتا ہے۔

(۴) اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حقائق و واقعات کے دو نقشوں کے درمیان رابطہ کیوں کر قائم کیا جاتا ہے۔

(۵) اسے یہ علم ہونا چاہیے کہ باہمی مقابلہ اور تاویل نتائج کے لیے پیمانہ اعتدال کیوں کر وضع کیا جاتا ہے۔

(۶) اسے یہ علم ہونا چاہیے کہ حقائق و واقعات کو سادہ اور عام فہم گراف کی شکل کیوں کر دی جاتی ہے۔

ان مہارتوں کا حاصل کرنا محض اس لیے ضروری نہیں کہ استاد کمرۂ جماعت میں معیاری آزمائشوں سے کام

بلکہ آج یہ مہارتیں ہر اس استاد کے لیے ناگزیر ہیں جو پیشہ ورانہ لٹریچر سے باخبر رہنا چاہتا ہے۔ جدید تعلیمی مقالوں اور بحثوں میں جا بجا شماریات، شماری اصطلاحات، نقشوں اور گرافوں سے کام لیا جاتا ہے۔ جو استاد ان کے مفہوم کو نہیں سمجھتا وہ جدید ترین تعلیمی فکر کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

آزمائش کے بعد کیا ہو؟

ہر استاد کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال آتا ہے کہ جب معیاری آزمائشوں کو پوری ہوش مندی اور مہارت کے ساتھ استعمال کر لیا جائے اور استاد شماریات کے متعلق وہ سب کچھ جانتا ہو جس کا جاننا نتائج کی بامعنی توجیہہ کے لیے ناگزیر ہے تو پھر آگے وہ کیا کرے؟ مغرب میں جب معیاری آزمائشوں نے اول اول رواج پایا تو ان کے نتائج باوجود قابلِ اعتماد ہونے کے بالعموم اتنے عام قسم کے ہوتے تھے کہ وہ استاد کی مخصوص ضرورتوں اور مشکلوں کے حل میں واضح رہنمائی نہ کرتے تھے۔ مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جب اول اول معیاری آزمائشوں نے رواج پایا تو بہت سے استاد محض ان کی جدت میں کھو کر ہی رہ جاتے تھے۔ لیکن ہر استاد کا یہ جائز حق ہے کہ تدریسی اوقات میں سے جو حصہ وقت وہ کسی چیز پر صرف کرے اس کے عوض میں ایک واضح اور مفید مطلب نتیجے کا مطالبہ کرے۔ کم و بیش یہی حق طالبہ کو بھی حاصل ہے۔ آج معیاری آزمائشوں سے مفید خدمت لینے کا تصور بہت عام ہو چکا ہے۔ تربیتی درس گاہوں سے جو نئے استاد نکلتے ہیں وہ عموماً ان آزمائشوں سے کام لینے کی تکنیکوں سے اچھی طرح باخبر ہو کر نکلتے ہیں۔

جو معیاری آزمائشیں نگران حضرات کی طرف سے لی جائیں ان کے نتائج سے استادوں اور طلبہ دونوں کو آگاہ کر دینا چاہیے تاکہ ان کی روشنی میں کمزوریوں کا تدارک اور بہتر تدابیر کا اہتمام ہو سکے۔ ان مقاصد کے لیے نگران کو واضح اور قابلِ عمل مشورے پیش کرنے چاہئیں۔ ایسے مشورے دیے بغیر استاد کے کام کے متعلق کوئی رائے ظاہر کر دینا سراسر بیکار ہے۔

بچے کی پوری شخصیت کی پیمائش

نفسیات اور علم التعلیم نے جدید استاد کے ہاتھوں میں تول ماپ کے جو پیمانے دیے ہیں ان کا مختصر سا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ قدیم استاد کو یہ آلے میسر نہ تھے۔ تاہم اس سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ پرانے استاد اپنے شاگردوں کی فطری صلاحیتوں اور علمی استعداد کا جائزہ لینے سے یکسر قاصر رہتے تھے اور یا یہ کہ موجودہ دور کا استاد بچے کی پوری شخصیت کی پیمائش کر سکتا ہے۔ یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔ پرانے استادوں میں بھی بعض ایسی غیر معمولی بصیرت کے مالک ہوا کرتے تھے کہ

وہ طالب علم کے کردار کو بڑی ہوش مندی کے ساتھ سمجھ کر اس کے حسب حال تدریس و تعلیم کا اہتمام کرتے تھے۔

جدید معیاری آزمائشیں اگرچہ بہت ترقی یافتہ صورت اختیار کر چکی ہیں اور ان کی مدد سے طالب علم کے ذہن کے ایک وسیع رقبے کی پیمائش ممکن ہو گئی ہے۔ تاہم عادات و کردار کے بعض گوشے اب بھی ایسے ہیں جہاں کوئی پیمائشی آلہ کام نہیں دے سکتا۔ ان کی معروضی پیمائش محالات میں سے ہے۔ اس غلط فہمی کا شکار ہو جانا بہت آسان ہے کہ معیاری آزمائشوں نے شخصیت کے جن گوشوں کا معروضی جائزہ لیا ہے فی الحقیقت وہی شخصیت کے اہم ترین اجزاء ہیں۔ اس قسم کی غلط فہمی استاد کے لیے بہت افسوس ناک ہے۔ تجرباتی شہادت گواہ ہے کہ اکثر اوقات شخصیت کے زیادہ فیصلہ کن اجزا وہ ہوتے ہیں جو معروضی جائزے کی زد سے باہر رہتے ہیں۔

استاد ماہر التعلیم، نفسیات، اور عمرانیات کا کتنا بڑا عالم ہی کیوں نہ ہو، بچے کی شخصیت کے بعض پہلو ہمیشہ اس کے معروضی ترازو سے بہت دور رہیں گے۔ اس کے لیے ناممکن ہوگا کہ وہ شخصیت کے ان لطیف اجزا کو تول سکے۔ مگر ایک بات اس کے لیے ہر وقت ممکن رہے گی وہ یہ کہ وہ اس بات کا پورا پورا احساس رکھے کہ اس کا علم اور اس کے پیمانے بچے کی شخصیت کے صرف ایک ہی حصے کا جائزہ لے رہے ہیں۔

عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ تعلیم

نذیر احمد

مسلمانوں کے دورِ عروج کی تاریخ میں جو بات بہت نمایاں نظر آتی ہے وہ تعلیم کی اہمیت ہے۔ مسجد ہو یا خانقاہ اور یا شاہی دربار، ہر جگہ علم اور عالموں کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ اس دور میں ہر بادشاہ اس بات کا پورا اہتمام کرتا تھا کہ اس کی اولاد تعلیم کے معاملے میں صفِ اول میں رہے۔ تاج و تخت اور ملک و سیاست کی ذمہ داریاں ہوشمندی کے ساتھ سنبھالنے کے لیے تعلیم و تربیت کو موثر ترین تیاری خیال کیا جاتا تھا۔ یہ اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ بڑے بڑے صاحب جلال تاجدار بھی تعلیم کا ایک اچھا مفہوم ذہن میں رکھتے تھے۔ ہارون الرشید نے اپنے بیٹے کے اتالیق سے جس طریق شفقت کی توقع ظاہر کی تھی وہ آج بھی سائنسی طریقہ ہائے تدریس کا نقطۂ آغاز ہے۔

ہم میں سے بعض یہ خیال کرنے کے عادی ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں جو طریقہ ہائے تدریس مروج تھے وہ ادھورے اور ناقص تھے کیوں کہ وہ تعلیم کے کسی جامع تصور پر مبنی نہ تھے۔ مغرب کے متعلق یہ خیال بالکل درست ہے۔ مگر مشرق میں قرونِ وسطیٰ اسلامی فکر و نظر کے عروج کا زمانہ تھیں، چنانچہ جب ہم اس دور کے اہل الرائے مسلمانوں کے افکار پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دیکھ کر ایک خوشگوار تعجب ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا نظریۂ تعلیم کس حیران کن حد تک سائنسی تھا۔ وہ تعلیم کو محض لکھنے پڑھنے تک محدود نہ سمجھتے تھے، بلکہ اسے ماحول کے ساتھ موثر ہم آہنگی کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔

تعلیم کے اس جامع تصور کا نتیجہ یہ تھا کہ اس زمانے کے بڑے بڑے استادوں کو ایک جامع اور موثر شخصیت کا حامل ہونا پڑتا تھا۔ ان کے لیے یہ کافی نہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ کتابی علم سے لدے ہوئے ہوں اور عملی زندگی کے میدان میں دوسروں کے دستِ نگر ہوں، اس کے برعکس ایک اچھا استاد اسے خیال کیا جاتا تھا جو علمیت کے ساتھ زندگی کے عملی مسائل کا کامیابی کے ساتھ سامنا کرنا بھی جانتا ہو تاکہ وہ شاگردوں کو عملی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل بنا سکے۔ اس قسم کے استاد کی ایک مثال مغل شہنشاہ اکبر کے اتالیق بیرم خاں کی ہے۔ اس شخص نے اپنے عظیم المرتبت شاگرد کو گو لکھنے پڑھنے میں کوئی خاص مہارت عطا نہیں کی تاہم اس نے اسے عملی ضرورتوں سے عہدہ برا ہونے کے قابل خوب بنا دیا۔ اس نے

اپنے شاگرد کو یہ سبق عملی مثال سے سکھایا۔ جب ہمایوں کی وفات پر ملک و ریاست کا سارا بوجھ یکدم کمسن شہنشاہ کے کندھوں پر آن پڑا اور اکثر تجربہ کار مصلاح کاروں نے یہ مشورہ دیا کہ سلامتی اسی میں ہے کہ اس وقت پسپائی قبول کر لی جائے اور کچھ عرصہ قوت جمع کرنے کے بعد تاج و تخت دوبارہ حاصل کیا جائے تو بیرم خاں نے جرات کے ساتھ آگے بڑھ کر معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور اپنے شاگرد پر یہ بات واضح کر دی کہ غیر متوقع اور ناگہانی صورت حال سے کیوں کر نپٹنا چاہیے۔

عالمگیر کی غیر معمولی شخصیت

مغل بادشاہوں میں بابر اور اکبر کے بعد سب سے غیر معمولی شخصیت عالمگیر کی ہے۔ ایک اعتبار سے عالمگیر کی شخصیت اپنی نظیر آپ کہا جا سکتا ہے۔ اسلامی تعلیمات سے جو والہانہ عشق اس مغل شہنشاہ کو تھا اس کی نظیر کسی اور مغل بادشاہ میں تلاش کرنا عبث ہے۔ اس کی ایک وجہ یقیناً وہ تعلیم بھی تھی جو عالمگیر کو ایام شہزادگی میں ملی۔ مگر تاریخی شہادت یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ تعلیم جامع نہ تھی اس میں زیادہ زور نظری پہلو پر دیا گیا تھا اور زندگی کا عملی پہلو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ یہ فروگذاشت استاد کی تھی جس کے لیے آگے چل کر عالمگیر نے اس کو کوسا بھی۔

غالباً یہ بچپن کی یک طرفہ تعلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ ابتدائے جوانی میں عالمگیر نے ترک دنیا کا ارادہ کر لیا۔ وہ اس وقت دکن کے صوبے کا گورنر تھا۔ خدمت دین کا جذبہ نوجوان شہزادے کی رگ رگ میں رچا بسا تھا، وہ اس جذبے کی تشفی کے لیے بے چین تھا۔ مگر ابتدائی تربیت کے زیر اثر اسے اس کی تشفی کی صورت یہ نظر آئی کہ دنیا پر لات مار کر فقیری اختیار کرے۔ چنانچہ وہ حکمرانی کے دھندوں کو چھوڑ چھاڑ مغربی گھاٹ کے ایک بیابانی گوشے میں جا چھپا۔ مگر قدرت نے شہزادے کو بصیرت سے حصہ وافر عطا کیا تھا۔ عملی تجربے نے اس پر یہ بات بہت جلد واضح کر دی کہ جو راہ اس نے اختیار کی ہے وہ خدمت دین کا کوئی مؤثر طریق نہیں۔ اسے جلد یقین ہو گیا کہ اس راستے پر چل کر وہ دین کو فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان پہنچانے کا موجب ہوگا۔ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی اس نے درویشی کو خیرباد کہا اور پھر سے ملک و سیاست کے دھندوں میں ایسی سرگرمی سے مشغول ہو گیا کہ اس میدان میں بہت جلد بڑے بڑے ماہروں سے لوہا منوا لیا۔

نظریۂ تعلیم | تخت طاؤس پر متمکن ہونے کے بعد عالمگیر نے تعلیم کے متعلق اکثر اوقات جن خیالات کا اظہار کیا

کچھ حال برنیر کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے۔ برنیر وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ عالمگیر کو اس بات کا شدید ترین احساس تھا کہ حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے والے شخص کو بہترین تعلیم ملنی چاہیے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اسے ایسا علم حاصل ہونا چاہیے جو آگے چل کر اسے کام دینے والا ہو۔ اس کا قول تھا کہ بادشاہ کو جس طرح اختیارات کے معاملہ میں باقی سب پر فوقیت حاصل ہے بالکل اس طرح اسے علم اور نیکی میں بھی اولیت حاصل ہونی چاہیے۔ عالمگیر عموماً کہا کرتا تھا کہ ایشیائی ملکوں میں لوگوں کی تباہ حالی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حکمرانوں کی اولاد کو درست قسم کی تعلیم نہیں ملتی۔ یہ بچے ان غلاموں اور خواجہ سراؤں کی آغوش میں پل کر جوان ہوتے ہیں جو بالادست لوگوں کی بے جا خوشامد اور چاپلوسی کے عادی ہوتے ہیں اور زیردستوں پر بے جگری سے ظلم ڈھاتے ہیں۔ اس ماحول میں پلے ہوئے نوجوانوں سے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ وہ ملکی ذمہ داریوں کو سوجھ بوجھ اور عدل و انصاف کے ساتھ انجام دیں گے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب دفعتہً ذمہ داری ان کے کندھوں پر آن پڑتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی اجنبی دنیا کے بسنے والے کو اس دنیا کے دھندوں کے عین بیچ میں لا کھڑا کیا گیا ہو۔ یا کسی قبر میں گڑے ہوئے مردے کو سالہا سال کی نیند کے بعد یک دم دنیا میں گھسیٹ لایا گیا ہو۔ یہ لوگ اپنی بھاری ذمہ داریاں سنبھالنے کی صلاحیت سے یکسر عاری نظر آتے ہیں، ان کی مثال اس حیران و پریشان جانور سے زیادہ نہیں جو گلے سے بچھڑ کر حیرت و استعجاب کے عالم میں چاروں طرف دیکھ رہا ہو اور کچھ سمجھ نہ سکتا ہو۔

افسوسناک انحطاط

ان الفاظ میں عالمگیر نے اپنے وقت کے شاہزادوں اور ان کی تعلیم و تربیت کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بڑی عبرت ناک ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اکبر کے زمانے سے لے کر عالمگیر کے زمانے تک صورت حال کس تیزی سے پستی کی طرف جا چکی تھی۔ اکبر کے استاد نے اسے زندگی کی عملی دشواریوں پر قابو پانے کا سبق دیا تھا جو تعلیم کی سب سے بڑی غایت ہونی چاہیے۔ عالمگیر کے زمانے میں حکمران طبقے کی تربیت ایسے ماحول میں ہو رہی تھی جو حقائق زندگی سے فرار کے ہم معنی تھا۔ وہ ایک ایسی اخلاق سوز اور روح کش فضا میں پل رہے تھے جو فکر و عمل کی ساری صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دینے والی تھی۔

عالمگیر کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے کہ مشرقی ملکوں کی زبوں حالی کی ساری ذمہ داری ان کے حکمرانوں کی ناقص تربیت پر تھی۔ عالمگیر کے آنکھیں بند کرتے ہی مغل سلطنت کو جس زوال کا منہ دیکھنا پڑا اور اسلامی ملکوں پر دیکھتے دیکھتے جو تباہی نازل ہوئی اس کی اصل وجہ وہ غلط تربیت تھی جو ان کے حکمران طبقوں کو مل رہی تھی۔

اتالیق کو ڈانٹ

عالمگیر نے اپنے تعلیمی نظریہ کی زیادہ وضاحت اس وقت کی جب اس کا بوڑھا اتالیق انعام و اکرام کی امید میں عالمگیری دربار میں حاضر ہوا۔ اورنگ زیب کو تاج سر پر رکھے زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ اس کا بچپن کا اتالیق دہلی میں پہنچا اور شاگرد کے سلام کے لیے دربار میں حاضر ہوا۔ اس موقع پر عالمگیر نے اسے جو ڈانٹ پلائی وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ برنیئر اس واقعہ کو ان الفاظ میں نقل کرتا ہے:-

"میرے استاد! کیا آپ کا یہ فرض نہ تھا کہ مجھے یہ بھی بتاتے کہ دنیا میں کون کون سی قومیں بستی ہیں؛ وہ باہم کن کن باتوں میں ممتاز ہیں؛ وسائل اور طاقت کے لحاظ سے ان کا کیا مقام ہے؛ ان کا طریق جنگ کیا ہے؛ ان کے رہنے سہنے کے طریقے کیا ہیں؛ ان کا مذہب اور طریق حکومت کس قسم کا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا بڑا اعتماد کس چیز سے وابستہ ہے؟

کیا آپ کا فرض نہ تھا کہ باقاعدہ مطالعہ تاریخ کی مدد سے مجھ پر یہ واضح کرتے کہ ریاست کیوں کر وجود میں آتی ہے؛ اس کی ترقی اور زوال کے کیا اسباب ہیں؛ دنیا میں جو عظیم الشان انقلاب آتے رہے ان کی تہ میں کون سے اسباب کام کر رہے تھے؟

بادشاہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہمسایہ ملکوں کی زبانوں سے آشنا ہو، مگر آپ نے مجھے صرف عربی زبان سکھائی۔ آپ نے شاید یہ سمجھا کہ آپ مجھے ایک ایسی زبان سکھا کر بہت زیادہ زیر احسان کر رہے ہیں جس پر دس بارہ سال صرف کیے بغیر اسے سیکھنا ممکن نہیں۔ آپ نے اپنے خیال میں مجھ پر یہ بڑا احسان کیا مگر یہ نہ دیکھا کہ اس طرح جو وقت قربان کیا گیا وہ زیادہ مفید باتیں سیکھنے پر صرف کیا جا سکتا تھا۔

آپ کو یہ خیال کبھی نہ آیا کہ ایک بادشاہ کے لیے کتنی رنگارنگ اور اہم باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ آپ نے مجھے گرامر اور فقہ کا ایسا علم عطا کرنا چاہا جس کی ضرورت صرف ایک فقیہ ہی کو ہو سکتی ہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ آپ نے میرے بچپن کے قیمتی اوقات کو الفاظ رٹنے کے لامتناہی اور بے کار کام کی نذر کر دیا۔

کیا آپ کو یہ نہ چاہیے تھا کہ مجھے کم سے کم ایک بات تو ذہن نشین کرا دی ہوتی جس کا جاننا ہر حکمران کے لیے ضروری ہے۔ وہ یہ کہ حکمران اور رعایا کے درمیان کس قسم کا رشتہ ہونا چاہیے؟ کیا آپ کو اتنا بھی نظر نہ آیا کہ شاید میری زندگی میں آگے چل کر ایسا وقت بھی آئے جب مجھے تلوار ہاتھ میں لے کر بھائیوں سے لڑنا پڑے تاکہ میں تخت حاصل کر سکوں، یا کم سے کم

ے جان بچا سکوں؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ہندوستان کے تاجداروں کی اولاد کو ایسے ہی حالات سے سابقہ
پڑ رہا ہے۔ کیا آپ نے مجھے کبھی اصول جنگ کے متعلق کچھ بتایا؟ کیا آپ نے مجھے یہ سمجھایا کہ کسی شہر کا محاصرہ
س طرح کیا جاتا ہے، اور میدان جنگ میں صف آرائی کے کیا اصول ہیں؟ یہ میری خوش بختی تھی کہ ان امور کے
ملق میں نے ایسے لوگوں کی طرف رجوع کیا جو آپ کی نسبت زیادہ فہیم تھے۔ اب اپنے گاؤں میں واپس تشریف لے
یے اور کبھی کسی سے اس بات کا تذکرہ نہ کیجیے کہ آپ کبھی بادشاہ کے اتالیق ہوا کرتے تھے۔"

عالمگیری نظریہ تعلیم کی جدت

اپنے پرانے اتالیق کو خطاب کرتے ہوئے عالمگیر نے تعلیم کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں سے
لڑ کسی جدید ترقی پسند ماہر تعلیم کے خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ عالمگیر نے اپنے استاد سے سب سے بڑا شکوہ
یہ کیا ہے کہ اس نے اس کا وقت الفاظ رٹوانے میں ضائع کیا، اس نے گردانوں اور عربی زبان کے قواعد کو آسانی از نشستہ
سمجھ کر کمسن شہزادے کا قیمتی بچپن ان کی نذر کر دیا۔ عالمگیر اس بے کار ذہنی بوجھ کے بدلے زیادہ مفید مطلب چیزوں کا
مطالبہ کرتا ہے۔ وہ اپنی معاصر دنیا اور اس کے معاملات کا پورا فہم حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ خالی
اور خشک الفاظ کی بجائے واقعات حاضرہ پر پوری نگاہ حاصل کی جائے۔

عالمگیر نے اپنے استاد کے نظریہ تعلیم پر دوسرا بڑا اعتراض یہ کیا ہے کہ اس تعلیم نے اسے ناگہانی صورت حال کا
مقابلہ کرنے کے قابل نہیں بنایا۔ اس نے اسے کوئی بدنی مہارت یا صلاحیت عطا نہیں کی جو جہد للبقا میں اس
کے کام آ سکے، اس تعلیم نے اسے عملی زندگی کا سامنا دینے کے قابل نہیں بنایا۔

عالمگیر جو فرائض تعلیم کے ذمے لگانا چاہتا ہے وہ آج جدید تعلیم کے اہم ترین مقاصد میں شمار ہوتے ہیں۔ آج تعلیم کا
اہم ترین منصب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ فرد کو گرد و پیش کے ماحول سے مکمل طور پر ہم آہنگ کر دے۔ اس مقصد کے
حصول کی طرف لامحالہ پہلا قدم یہ ہے کہ گرد و پیش کے ماحول کا درست اور جامع فہم حاصل ہو۔ واقعات حاضرہ پر پوری
نگاہ ہو اور یہ معلوم ہو کہ یہ واقعات کن تاریخی اسباب کی پیداوار ہیں۔ اس ذہنی پس منظر کے بعد تعلیم کی اہم ذمہ داری
ایسی بدنی اور ذہنی صلاحیتوں۔ عادات، اور مہارتوں کو ترقی دینا ہے جو فرد کو اس قابل بنا دیں کہ ہر ہنگامی اور غیر متوقع
صورت حال کا مقابلہ عزم و ثبات کے ساتھ کر سکے۔

والدین کے لیے لمحہ فکریہ

نذیر احمد شیخ

حصولِ آزادی کے بعد سلطنت خداداد پاکستان کے عوام سے توقع تو یہ تھی کہ انہیں بہت جلد ذہنی آزادی حاصل ہو جائے گی۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ نو سال کے طویل عرصہ کے بعد بھی ہم ذہنی طور پر ویسے ہی غلام ہیں جیسے اس دورِ آزادی سے پہلے تھے۔ ہمیں بدیشی حکومت کی زنجیروں سے تو نجات مل گئی، لیکن فرنگی دور کے دور رس اثرات پوری شد و مد سے کام کیے جا رہے ہیں۔ ہر شعبۂ زندگی میں ہم تمام ان اشیاء کے دلدادہ ہیں جن پر بدیشی مُہر ثبت ہے۔ شعبۂ حیات سے قطع نظر اس خطرناک رجحان کا شدت سے احساس تعلیمی دنیا میں ہوتا ہے۔ اوسط درجہ کے عام والدین اپنے بچوں کو یورپین طرز کے سکولوں میں داخل کرانے کے لیے بھاگم دوڑ کرتے نظر آتے ہیں، جب ان کے بچے کسی کنونٹ یا کیتھیڈرل سکول میں داخلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں ان کی امیدیں بر آئیں۔ ان کے بچوں کی زندگیاں ٹھکانے لگیں۔ انہیں تہذیب و تمدن کے گہوارہ میں پرورش کا موقع مل گیا۔ وہ اعلیٰ قابلیت کے ماہرین تعلیم سے استفادہ کر سکیں گے۔ تمام مضامین انگریزی میں پڑھیں گے، انگریزی زبان پر وہ دسترس حاصل ہو گی کہ وہ سامعین کے لیے بن جائیں گے۔

بچے کو انگریزی سوٹ میں ملبوس کر کے سکول بھیجا جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ یہ مہذب لباس ہے، پاجامہ اور کرتہ گھر پہننے کے لیے ہیں۔ روزِ اول اسے احساس دلایا جاتا ہے کہ یہ بدیشی لباس تہذیب و تمدن کا نشان ہیں۔ کرتہ پاجامہ اگرچہ ہماری آب و ہوا کے لحاظ سے آرام دہ ضرور ہیں لیکن گھٹیا قسم کا لباس ہیں۔ اسے سکول یا کالج کی چار دیواری میں پہنے پھرنا گنوار پن ہے۔ یہ طرزِ روش گہرے اثرات کی متحمل ہے۔ بچے کو اپنے دیسی لباس سے نفرت۔ دیسی قسم گھر سے احتراز، اور بھائی بہنوں کے دیسی لباس سے بیزاری کا آغاز ہوتا ہے۔ مدرسہ اور گھر کی ہم آہنگی کی راہ میں پہلی فصیل حائل ہوتی ہے۔ اس ہم آہنگی اور یگانگت کا فقدان زندگی میں بہت سی ذہنی الجھنوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔

سکول کی حدود میں پہنچتے ہی بچہ ان اساتذہ کرام سے متعارف ہوتا ہے جو بدیشی لباس میں ملبوس بدیشی تہذیب کے پیامبر اور بدیشی زبان کے ماہر ہوتے ہیں، وہ ذخیرۂ الفاظ جو اس نے عالم طفولیت کے اوائل میں پانچ سالوں میں بہت کاوش اور جاں فشانی سے جمع کیا تھا اور اس عمل میں اس کے والدین۔ بہن بھائی اور دیگر سب متعلقین شامل تھے اور ان تمام لوگوں نے دلی توجہ سے اس ذخیرہ کے اکٹھا کرنے میں مدد دی تھی سکول کی چار دیواری میں داخل ہوتے ہی اس پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔ نئے الفاظ۔ نیا تلفظ۔ اور نیا لب و لہجہ ایک نئی دنیا کا آغاز ہوتا ہے جو نیا جنم لیتا ہے۔ وہ بے چارہ ایک عجیب سی ذہنی پریشانی میں گرفتار ہوتا ہے۔ وہ معصومیت کا دیوتا اس تغیر کی اہمیت سمجھنے سے قطعاً قاصر ہوتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے والدین کے ایک بے بنیاد وہم کا شکار ہو رہا ہے۔

بچے کے لیے یہ منزل زندگی کے اس دور کا آغاز ہے جب کہ اسے ذخیرہ کردہ الفاظ کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا وسیلہ بنانا ہے۔ ان الفاظ کو بحیثیت اوزار کے استعمال کرنا ہے، جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سابقہ تمام اوزار ناکارہ اور بے سود ہیں یقیناً اسے زندگی کی پہلی مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ سرمایہ اس نے بڑی کاوش سے جمع کیا۔ ہر دوست نے اس کارِ عظیم میں اس کی مدد کی۔ عالم طفولیت میں اس کے دماغ کی سطح ہر نقش سے پاک تھی اس لیے آسانی سے وہ تمام نقوش قبول کرتا گیا بعض الفاظ کے تکرار سے ان کے نقوش راسخ ہوتے گئے۔ اس ساری جد و جہد کے بعد وہ دن آن پہنچا جب کہ وہ اس سارے ذخیرہ کو باوثوق انداز میں استعمال کرنے کے قابل ہو گیا۔ کسی بے بنیاد وہم کے زیر اثر بچے کو اس سرمایہ سے محروم کر دینا اس کے ساتھ ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ اگرچہ وہ معصوم فرشتہ اس وطیرہ کے خلاف احتجاج کرنے کے قابل تو نہیں ہوتا۔ دل ہی دل میں ضرور کڑھتا ہو گا کہ یا اللہ مجھے کس جاہل قوم اور کس تاریک ملک میں پیدا کر دیا۔ ابھی آنکھ بھی کھولنے نہیں پایا کہ مجھے ایسے ناساعد حالات سے دوچار ہونا پڑ گیا۔

بچے کے دو تین سال بھر انہی اشیا اور افعال کے نام غیر زبان میں سیکھنے میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ یہ سراسر تضیع اوقات ہے۔ یہی قیمتی وقت اسے اپنے تخیل کی نشو و نما کے لیے استعمال کرنا چاہیے تھا۔ اپنی توجہ کو الفاظ پر مرکوز کرنے کی بجائے اپنے خیالات کی وسعت پر لگانا چاہیے تھا۔ حال ہی میں راقم الحروف کو ایک بین الاقوامی مذاکرہ میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ امریکی اور فرنگی مقرروں کا موقف یہ تھا کہ یورپین اور امریکی بچے پاکستانی اور بھارتی بچوں کی نسبت جلدی فارغ التحصیل ہو کر زندگی کی جنگ کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ ان کے اس نظریہ کو کسی پاکستانی نے

رد کرنے کی جرأت نہ کی۔ سامعین کے لیے غور و فکر کا مقام ضرور تھا کہ بالآخر ہمارے بچوں کو کیا سانپ سونگھ گیا ہے جو دیگر ممالک کے بچوں کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ میں ہر چند اس مسئلہ پر غور کرتا ہوں۔ اپنے طرز تعلیم کو اس کا موجب گردانتا ہوں۔ امریکی اور فرنگی بچے انگریزی الفاظ سیکھ کر پانچ سال کی عمر میں اپنی تعلیم کا حقیقی آغاز کرتے ہی ہمارے بچے غیر زبان کی الجھن میں پڑ کر اپنا بیش بہا قیمتی وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ ان کی وہ صلاحیتیں جو فرنگی اور امریکی بچوں سے کسی طرح اور کسی وجہ کم نہیں اپنی قوم کی غلط روش کا شکار ہو کر دب جاتی ہیں۔ بفضل ایزدی ہمارے بچے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے دوسرے ممالک کے بچوں سے کچھ کم صحت مند نہیں۔ قصور والدین کا ہے جو ان کے لیے ذہنی انتشار کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔

بدیشی سکولوں میں تمام مضامین بدیشی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں اور یہی بدیشی ذریعہ تعلیم ہی ان مدرس گاہوں کا طرہ امتیاز ہے۔ ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، سائنس کے مسائل غیر زبان میں پڑھائے جاتے ہیں، بجائے اس کے کہ بچے ان مسائل کی حقیقت کو سمجھیں غیر زبان کے فقرات اور محاورات کے چکر میں گرفتار رہتے ہیں۔ ان مسائل کی جانچ پڑتال کے بجائے الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنسے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طویل المدت تعلیمی پروگرام کے اختتام پر کورے ہی کورے نظر آتے ہیں۔ وہ مسائل کی تہ تک پہنچنے اور ان پر سوچ بچار کرنے کی چندے اہلیت نہیں رکھتے۔ وہ محض الفاظ اور فقرات پر نظر جمائے بیٹھے رہتے ہیں جن میں ان مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ معمولی مسائل پر گفتگو کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ وہ بالکل جاہل ہیں اور انہیں کسی مسئلہ پر غور و پرداخت کا موقعہ نہیں ملا۔ سائنس اور ریاضی وغیرہ کے مبادیات سے بھی بے بہرہ نظر آتے ہیں۔ البتہ طوطے کی رٹ لگانے میں مشاق ہیں۔ جہاں تک تخلیقی کام کا تعلق ہے وہ سراسر نااہل ہیں۔

جب ان بدیشی زبان کے شیدائی والدین سے کہا جاتا ہے کہ خدارا معصوم بچوں پر کچھ رحم فرمایئے اور ان کے سر پر غیر زبان کا بوجھ نہ لادیے۔ وہ اپنے اس کردار کے جواز میں قدیم تعلیمی مفکروں کا فتویٰ پیش کرتے ہیں۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ اگر بچوں کو غیر زبان سکھانا مقصود ہے انہیں عالم طفولیت میں ہی اس کام پر لگائیے جب کہ ان کے آلات گویائی نے عمل گویائی میں کسی زبان میں عادات استوار نہیں کیں۔ یہی مناسب وقت ہے جبکہ بچہ آسانی سے غیر زبان کا تلفظ سیکھ سکتا ہے، جب مادری زبان کے الفاظ کا تلفظ تکرار سے راسخ ہو جائے گا۔ غیر زبان کا صحیح تلفظ

سکھانا دگنا دشوار ہو جائے گا۔ اس ضمن میں میرے ایک انگریزی زبان کے شیدائی دوست نے ایک دلچسپ لطیفہ پیش کیا، فرمانے لگے ایک شہرہ آفاق یونانی موسیقار نے اخبار میں اشتہار دیا کہ فن موسیقی کی تعلیم کے لیے شرح فیس حسب ذیل ہو گی۔ مبتدی حضرات ..... تقریباً پچاس روپے ماہوار خواندہ حضرات (جس سے اس کی مراد غالباً وہ طلبہ ہوگی جو فن موسیقی میں دیگر اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کر چکے ہوں گے) یکصد روپے ماہوار۔ جب اس سے وجہ تفاوت شرح فیس دریافت کی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ مبتدی شاگردوں کو موسیقی کی صحیح تان سکھانے کے لیے نصف سے کم وقت درکار ہوگا۔ ایسے طلبہ جو غلط تانیں سیکھ چکے ہیں پہلے انہیں غلط سروں کو فراموش کرنا ہوگا پھر ان کی جگہ انہیں درست سریں سیکھنی ہوں گی۔ انہیں دوہرا کام کرنا پڑے گا..... یہی حال غیر زبان کے سیکھنے کا ہے۔ اگر بچوں کو صحیح انداز میں انگریزی پڑھانا مقصود ہو تو انہیں ابتدا سے ہی درست تلفظ اور لب و لہجہ سکھائیے، ورنہ اس راہ میں بہت سی دشواریاں حائل ہو جائیں گی۔

پبلک کے سامنے روزمرہ زندگی کا عملی مشاہدہ موجود ہے اور وہ یہ کہ دیسی سکولوں کے فارغ التحصیل طلبہ بھی انگریزی زبان سیکھنے پر بدیشی زبان میں ایسی ہی مہارت پیدا کر لیتے ہیں۔ جیسی بدیشی سکولوں کے طلبہ اگرچہ یہ بچے تقریباً پانچ سال بعد انگریزی سیکھنا شروع کرتے ہیں بعض حالتوں میں ہمارے سکولوں کے طلبہ بدیشی طرز کے سکولوں کے طلبہ سے گوئے سبقت لے جاتے ہیں۔ ہمارے سکولوں کے طلبہ تقریری عمل کے ساتھ تحریری کام برابر کیے جاتے ہیں۔ مگر انگریزی طرز کے سکولوں میں زبانی جمع خرچ زیادہ ہوتا ہے اور تحریری کام تقریباً مفقود۔ زیر تربیت اساتذہ کی معیت میں مجھے ایک انگریزی سکول کے معائنہ کا اتفاق ہوا۔ طلبا کی قرأت قابل تعریف تھی۔ ان کا طرز تکلم مترنم۔ تلفظ قابل صد تحسین۔ مدوجزر لحن تصنع سے تقریباً پاک۔ مگر تحریری کام سرے سے نابود۔ بعض حالتوں میں معانی الفاظ اور ان کا صحیح استعمال از سرتاپا مہمل۔ بہت سے طلبہ نے بتایا کہ انہیں صرف قرأت سکھائی جاتی ہے۔ معانی گاہ بگاہ بتا دیے جاتے ہیں مگر زیادہ زور محض قرأت پر دیا جاتا ہے۔ میرے لیے یہ ایک نئی بات تھی جو میں نے کبھی سن نہیں پائی تھی متعلقہ معلمہ نے بھی بڑی بے باکی سے کہہ دیا کہ ننھے بچوں کو معانی اور اس کے استعمال وغیرہ کے گورکھ دھندوں میں ڈالنا موزوں نہیں ہم محض قرأت پر اکتفا کرتے ہیں۔ معانی سیکھنے کے لیے ابھی بہت وقت ہے۔ جب تحریری کام کے لیے سوال کیا گیا تو گول مول جواب کے سوا کچھ بن نہ پڑا۔ نونہالوں کے قیمتی اوقات کا اس بے دردی سے خون ہوتے دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی۔

جنگِ آزادی کے دوران میں ہمارے اربابِ بست وکشاد نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے نعروں پہ پاکستان کی بنیادوں کو اُستوار کیا تھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد وہ شعار جو قائدین اور متوسط طبقہ کے حضرات نے اختیار کیا اسے اسلامی شعار قرار دینا صریحاً دروغ گوئی ہے۔ تعلیمی دنیا میں اس امر کا احساس اور بھی شدت سے ہوتا ہے۔ ہم نے تعلیمی دنیا میں کیا اسلامی طریقِ کار اختیار کیا۔ اپنے نصابِ تعلیم کو کیسے اسلامی رنگ میں رنگا، یہ امور ہمارے لیے قابلِ غور ہیں، اگرچہ اس شعبہ میں زیادہ ذمہ داری خداوندانِ محکمۂ تعلیم پر عائد ہوتی ہے مگر عوام کو بھی کسی طرح بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اہلِ ثروت حضرات اپنے بچوں کو ایسے سکولوں میں بھیجنے میں فخر محسوس کرتے ہیں جہاں ان کی آبائی روایات کا پوری بے باکی سے قلع قمع کیا جا رہا ہے۔ غیر اسلامی طرزِ زندگی سے موانست اور یگانگت پیدا کی جا رہی ہے۔ اپنے اسلاف سے نفرت اور بیگانوں سے روابط کے سبق ان کے دل و دماغ پر منقش کیے جا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ غیر اسلامی شعار کی کھلے بندوں پرورش کی جاتی ہے۔ ان درس گاہوں کے تربیت یافتہ بچے جس اسلامی رنگ میں رنگے جا رہے ہیں اس کا اندازہ ہر صاحبِ ہوش شہری خود کر سکتا ہے۔

ان ماڈرن گھروں کے والدین اپنے بچوں کو مدارشی سکولوں میں بھیجنے کے جواز میں بہت سے دلائل پیش کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سکول صاف ستھرے آراستہ و پیراستہ۔ اساتذہ کہنہ مشق تربیت یافتہ، صحت مند ماحول وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے کارپوریشن کے سکول غلیظ اور متعفن۔ بچے میلے کچیلے۔ فرنیچر دقیانوسی۔ اساتذہ نااہل۔ سارے کا سارا ماحول یاس انگیز۔ یہ حالات ہر صاحبِ استطاعت والد کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کے لیے کچھ مالی قربانی کے لیے تیار ہو۔ بنابریں یہ لوگ پندرہ بیس روپے ماہوار فیس بخوشی ادا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ کارپوریشن سکولوں میں پرائمری تعلیم مفت ہے، پھر بھی وہاں بچوں کو بھیجنے سے حتی الوسع احتراز کیا جاتا ہے۔

خداوندانِ بلدیہ کے لیے بھی یہ غور طلب معمہ ہے۔ اگر ان حضرات میں سے دو ایک ممبر صاحب فہم و فراست اس قباحت کے تدارک کا تہیہ کر لیں تو حالات کا سدھار کچھ ایسا دشوار نہیں جسے محال کہا جا سکے۔ ابتدا میں چند ماڈل سکول کھول کر تجربہ کر لیا جائے جہاں بے شک پرائمری جماعتوں میں پانچ روپے فی کس فیس وصول کی جائے لیکن کسی جماعت میں تعداد طلبہ چالیس سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ فرنیچر معقول قسم کا مہیا کیا جائے۔ مدرسہ کے در و دیوار سے یتیم خانہ کا منظر رونما نہ ہو۔ اساتذہ افسردہ و پژمردہ نظر نہ آئیں۔ ان کے طریقِ تدریس زمانہ رفتہ کی یاد

...... آمادہ نہ کرے، پھر دیکھتے ہیں کہ کون سرپھرا والد ہوگا جو اپنے بچوں کو ایسے گمراہ کن ماحول میں بھیجنے کے لیے تیار ہو۔ ہمارے عوام میں دینی لحاظ سے کچھ ایسی سوجھ بوجھ ضرور موجود ہے جس کے ہوتے ہوئے وہ ایسی فاش غلطی کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔

ہمیں تعلیمی معاملات میں سرکار عالی مدار اور بلدیہ شہر کے عزت مآب اراکین کی طرف ہی آنکھیں جمائے رکھنا نہیں چاہیے بلکہ اپنی مدد آپ کرنے کے لیے بھی تیار ہونا چاہیے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک آبادی کے چند صاحب ثروت اور اہل اثر و اقتدار حضرات سنجیدگی سے بیٹھ کر غور کریں کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیمی درس گاہوں کو کس طرح بہتر بنا سکتے ہیں۔ اگر معمولی سی قربانی کے لیے تیار ہوں تو ضروری ساز و سامان کا مہیا کر لینا چنداں دشوار نہیں۔ تمام آزاد ممالک میں ہر وارڈ اور ہر قصبہ میں تعلیمی کمیٹی ہر جسے اس وارڈ یا قصبہ کے لوگ خود منتخب کرتے ہیں تمام تعلیمی مسائل سلجھانے کے لیے ذمہ دار سمجھی جاتی ہے بالفاظ دیگر عوام اپنے تعلیمی معاملات خود اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی اصلاح کے لیے تدابیر سوچتے رہتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم دوسرے آزاد شہریوں کی طرح خود اپنی فلاح و بہبود کے لیے قدم اٹھانا سیکھیں۔ دوسروں کی مدد پر بھروسہ کیے منتظر فردا بیٹھے رہنا غلامانہ ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ اگر ہم اراکین بلدیہ کو اس ضمن میں غفلت کا شکار پاتے ہیں اور اگر ہمارے نمائندے ہمارے مفاد کے تحفظ کے اہل نہیں، ہمیں کلی اختیار حاصل ہے کہ ہم انہیں اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیں۔ اولین شرط یہ ہے کہ ہمیں خود اپنے معاملات کے سلجھانے کا احساس پیدا ہو۔

بہتر درس گاہوں کے فقدان کے جواز میں اولین شکوہ مالی مشکلات کا کیا جاتا ہے۔ رونا یہی رویا جاتا ہے کہ فنڈ نہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے سب کچھ موجود ہے لیکن کار خیر کے لیے ارادہ درکار ہے۔ صاحب ثروت حضرات ہزاروں روپے الیکشن کے موقعوں پر پانی کی طرح بہا دیتے ہیں، اس زر کثیر کا عشر عشیر بھی اگر ان درس گاہوں کے سدھار کے لیے بچا لیا جائے تو چند سالوں میں کایا پلٹ سکتی ہے۔ قوم کے چند اہل دل حضرات اگر اس قومی خدمت کو نیک نیتی سے سر انجام دینے کا تہیہ کر لیں تو چند سالوں میں تمام قباحتوں کا قلع قمع ہو سکتا ہے۔

غیر ممالک کے سرمایہ سے تعمیر کردہ عمارات کی شان و شکوہ سے مرعوب ہونا ہمارے احساس کمتری کی کرم فرمائی ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال کے فرمودہ کے مطابق ؎ خود اپنے سفال سے مینا و جام پیدا کر۔ جب تک ہم اپنی ناؤ کے خود کھیون ہار نہیں بنیں گے ہماری ناؤ کنارے نہیں لگ سکتی۔ ہماری نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہم اپنی

مدد کے لیے آپ کمربستہ ہوں۔ مسبب الاسباب کا دست غیب ہمارا مددگار ہوگا۔

وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ان بدیشی ممالک کی نمائندہ۔ بلند و بالا درس گا کے زیر سایہ کونسی تہذیب اور کس اقدار کو پنپنے کا موقع مل رہا ہے۔ قوم کے معصوم بچے اغیار کی گود میں بیٹھ کر کیسے عجیب و غریب تاثرات حاصل کر رہے ہیں۔ ان اثرات کے تحت اسلامی شعار سے کس سرعت سے بعد اختیا جا رہے ہیں، ان درس گاہوں کے تربیت یافتہ بچوں کو اکثر دیکھا گیا ہے کہ صوم و صلوٰۃ پر یوں پھبتیاں اڑا ہیں جیسے کہ ان کے اسلاف خالص فرنگی نسل کے تھے۔ اپنے بزرگوں پر مغرو میابات کی بجائے ان کے طرز زندگی آوازے کسنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اُن کی سادہ زندگی ان کے لیے مشعل راہ ہو ان کا مذاق کا ہدف بنتی ہیں۔

یہ امر موجب حیرت ہے کہ ہمارے عوام بدیشی سکولوں کو فیس کی شکل میں بھاری ٹیکس ادا کرنے کے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس ٹیکس کے معاوضہ میں ان کی داڑھی جس خوب صورتی سے نوچی جاتی ہے اُس کے تذکرہ سے خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر ہے۔ اگر پرائمری سکولوں کے ابتدائی اخراجات برداشت کرنے کا انتظام ہو جائے یہ اسی شرح فیس پر جو بدیشی سکولوں میں مروج ہے بطریق احسن خود کفیل ہو سکتے ہیں۔ ضرورت وقت یہ ہے چند خدا کے بندے فی سبیل اللہ قومی خدمت کے جذبہ سے سرشار اس کار خیر کی طرف دلی توجہ مبذول کریں۔ اگر انہیں بھی کچھ خرچ کرنا پڑے تو گریز نہ کریں۔ اپنے گرد و پیش کے سکولوں کو بدیشی سکولوں کے معیار پر لے آنا چنداں دشو جب تک ہم من حیث القوم اس غلط روش کے خلاف نعرۂ جہاد بلند نہیں کریں گے مستقبل قریب لیے وہ عقدے پیدا ہو جائیں گے جنہیں وا کرنے کے لیے ہمارا ناخن تدبیر عاجز ہوگا۔ ہماری آنے والی نسلیں ہمیں اس گناہ کبیرہ کا ذمہ دار گردانیں گی۔ وقت یہ ہے کہ ہم محض نمائش کا شکار ہو کر اپنی تہذیب اپنے تمدن ا کا خون کرانے کے لیے تیار نہ ہوں۔ اکثر سماجی قباحتوں کی وجہ ہماری بے معنی خود نمائی ہے۔ بہت سے گھرانے جو مقدور نہ ہونے کے باوجود بدیشی سکولوں کے مصارف گراں برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ محض د کے لیے اپنی ناک کٹواتے ہیں۔

امراء میں سے چند صاحبان ایسے ہیں جو اپنے بچوں کو عوام کے بچوں کے ناشائستہ تاثرات سے

رشتوں کے سکول میں بھیجتے ہیں۔ تاکہ وہ اس عالم سفلی کی زمین پر چلنے والی مخلوق کے ارتباط سے محفوظ رہ سکیں۔
فات ایسا ہوتا ہے کہ یہ رنگین دنیا کے پروردہ بچے زندگی کی پرآشوب جنگ میں بہت بودے ثابت ہوتے ہیں
اکثر ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بچوں کو اس ماحول سے دور رکھ کر جس میں رہ کر انہیں زندگی کے اکثر
زارنا ہیں، پرورش کرنا سراسر غلط ہے۔ بدیشی ماحول میں پھینکنے سے پیشتر ہمیں اپنے نونہالوں کے مستقبل
علق ضرور سوچنا چاہیے۔

ثانوی مدارج میں ریاضی کا نصاب

فضل محمد خاں

سلسلہ نمبر۲

ماہ جولائی کے آموزش میں اس مضمون کی پہلی قسط شائع ہوئی تھی۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ میٹرکولیشن امتحان کے لیے ریاضی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھانا کیوں ضروری ہے۔ لیکن (جیسا کہ اس قسط میں بتایا گیا تھا) چوں کہ نصابی کانفرنس منعقدہ سنٹرل ٹریننگ کالج میں کئی ایک مقررین نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ریاضی کو میٹرکولیشن امتحان کے لیے اختیاری مضمون قرار دیا جائے۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا ہے کہ ان دلائل پر تفصیلی بحث کی جائے جو اس مضمون کو میٹرکولیشن امتحان کے لیے۔ اختیاری مضمون بنانے کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ یہاں پر یہ بتا دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ نصابی کانفرنس کے ان افراد نے جنہوں نے ثانوی مدارج کے نصاب پر بحث کی تھی واضح الفاظ میں اس امر کی سفارش کی تھی کہ ریاضی کو ثانوی مدارج میں اختیاری مضمون بنا دینا چاہیے۔ نیز سکینڈری ایجوکیشن بورڈ لاہور نے اپنے مجوزہ نصاب میں اس مضمون کو اختیاری مضامین کی فہرست میں رکھا ہے۔ پشاور یونیورسٹی نے بھی اس مضمون کو اختیاری مضمون قرار دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس مضمون کی پہلی قسط میں ایک سوال نامہ کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ سوالنامہ راقم الحروف نے معاشرہ کے مختلف اداروں کے کارکنوں کو بھیجا تھا۔ اس میں ان سے یہ دریافت کیا تھا کہ آیا ریاضی کو ثانوی مدارج میں بطور لازمی مضمون پڑھانا چاہیے یا اس کو اختیاری مضمون بنا دینا چاہیے۔ اس سوالنامے کے جواب میں ۴۴ اسر معلمون۔ ٹریننگ کالج کے عملہ کے اراکین۔ عملہ نظارت کے کارکنوں اور زندگی کے دیگر شعبوں کے کارکنوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ریاضی کو میٹرکولیشن امتحان کے لیے اختیاری مضمون کی حیثیت دینی چاہیے۔ آئیے اب ان تمام دلائل پر بحث کی جائے جو ریاضی کو ثانوی مدارج میں اختیاری مضمون قرار دینے کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔

ریاضی کو اختیاری مضمون قرار دینے کے حق میں دلائل

(۱) ایک ہی نصاب کا بار بار دہرانا: ۔ پہلی دلیل جو ریاضی کو ثانوی مدارج میں اختیاری بنانے کے حق میں دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ نویں اور دسویں جماعت میں حساب کا نصاب تو تقریباً وہی ہے جو طلبہ مڈل تک مختلف جماعتوں میں

پڑھ آتے ہیں، الجبرا اور ہندسہ کا نصاب البتہ اس نصاب سے کافی وسیع ہے جو طلبہ مڈل تک مختلف جماعتوں میں پڑھ آتے ہیں۔ مگر الجبرا اور ہندسہ کے مروجہ نصاب کا بیشتر حصہ جو نویں اور دسویں جماعت میں پڑھایا جاتا ہے زندگی میں افادی حیثیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا ہر کس و ناکس کو اس کا پڑھانا بے معنی ہے۔ اس حصے کے چند ایک موضوع جو افادی حیثیت رکھتے ہیں ان کو مڈل کی جماعتوں کے نصاب میں شامل کیا جا سکتا ہے اور مڈل کی جماعتوں میں طلبہ ان موضوعات کو آسانی سے پڑھ بھی سکتے ہیں۔

اس دلیل کا جائزہ لینے کے لیے آپ کو پاکستان کے مختلف سیکنڈری ایجوکیشن کے بورڈوں اور یونیورسٹیوں کے متعین کردہ میٹرکولیشن میں ریاضی کے نصابوں اور وہاں کے مڈل تک کے ریاضی کے نصابوں کی تحلیل کرنا ہوگی۔ اگر آپ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور کا نویں اور دسویں جماعت میں متعین کردہ ریاضی نصاب اور ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن لاہور کے پرائمری اور مڈل کی جماعتوں کے متعین کردہ ریاضی کے نصابوں کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ حساب کے نصاب میں مندرجہ ذیل موضوع مشترک ہیں۔

(۱) اعداد کی قرأت و کتابت۔

(۲) چاروں بنیادی قاعدے۔

(۳) اجزائے ضربی۔ اعداد اول وغیرہ

(۴) عاد اعظم و ذو اضعاف اقل۔

(۵) کسور عام و کسور اعشاریہ

(۶) تجارت مفرد و مرکب

(۷) جذر

(۸) نسبت و تناسب و اکائی

(۹) متناسب حصے۔ شراکت

(۱۰) فی صد

(۱۱) نفع و نقصان

(۱۲) سود مفرد و سود مرکب

(۱۳) تقویم

(۱۴) اوسط

(۱۵) رقبہ (مستطیل. مثلث۔ دائرہ)

(۱۶) حجم (مکعب و مکعب نما۔ بیلن)

(۱۷) ٹیکس۔ بیمہ۔ دلالی۔ انشورنس

ثانوی مدارج میں حساب کے نصاب میں راس المال اور مٹی کا صرف دو ہی ایسے قاعدے ہیں جو طلبہ نے مڈل تک کی جماعتوں میں نہیں پڑھے۔ برخلاف اس کے تدی پیمائش۔ گھریلو حساب اور بل و بیچک ایسے قاعدے ہیں جو ثانوی مدارج کے نصاب میں شامل نہیں مگر وہ مڈل تک کی جماعتوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

اگر ہم مدارج مڈل اور ثانوی مدارج کے الجبرا کے نصابوں کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ مدارج مڈل کے نصاب میں صرف الجبرے کے مبادیات (اساسی قاعدے اور مفرد مساوات اور اس کے عبارتی سوال) شامل ہیں۔ برخلاف اس کے ثانوی مدارج کے نصاب میں اجزائے ضربی مقسوم علیہ اعظم۔ ذو اضعاف اقل کسور۔ قوت نما۔ مقادیر اصم۔ نسبت و تناسب ہمزاد مساواتیں۔ تسقیط۔ متماثلات۔ اور ترسیمات شامل ہیں۔ یعنی دونوں نصابوں میں نمایاں فرق ہے۔

دونوں مدارج کے تجربی ہندسہ کے نصابوں میں خطوط اور زاویوں کی تنصیف۔ متوازی خطوط کا کھینچنا۔ عمود کا گرانا۔ مثلثوں کی بناوٹ۔ ذوار بعۃ الاضلاع کی بناوٹ مشترک موضوع ہیں۔ ثانوی مدارج کے نصاب میں کثیر الاضلاع کے برابر مثلث کا بنانا۔ دائرے کے مماس۔ منتظم اشکال کا دائرے کے اندر اور باہر کھینچنا۔ متناسب چہارم۔ متناسب سوم اور وسطی متناسب کھینچنا اور اشکال متشابہ کا کھینچنا، ایسے موضوع ہیں جو مدارج مڈل کے نصاب میں شامل ہیں۔ مگر ثانوی مدارج کے نصاب میں شامل نہیں۔ اس کے علاوہ ثانوی مدارج کے نصاب میں اثباتی ہندسہ سے متعلق تقریباً ۵۰ مسئلے شامل ہیں۔ مدارج مڈل کے نصاب میں اثباتی ہندسہ بالکل شامل نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا حساب، الجبرا، اور ہندسہ کے ایسے موضوع جو ثانوی مدارج کے نصاب میں شامل ہیں اور مدارج مڈل میں شامل نصاب نہیں زندگی میں کیا افادی اہمیت رکھتے ہیں۔ حساب میں تو ایسے

موضوع جو ثانوی مدارج کے نصاب میں شامل ہیں اور مدارج مڈل میں شامل نصاب نہیں زندگی میں صرف دو ہی ہیں یعنی راس المال اور متی کاٹا کی افادی حیثیت نظمی کوئی [illegible] اس کی افادی اہمیت کے پیش نظر اس موضوع کا نصاب میں شامل کرنا یا نہ شامل کرنا دونوں برابر ہیں۔ راس المال سے واقفیت البتہ ضروری ہے۔

الجبرا میں زائد موضوع کئی ایک ہیں یعنی اجزائے ضربی مقسوم علیہ اعظم و ذواضعاف اقل کسور نسبت و تناسب تسقیط۔ قوت نما۔ مقادیر اصم۔ ہمزاد مساواتیں اور عبارتی سوالات۔ صعود اور نزول۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ جبریہ جملوں کا جذر جبریہ کسور کے پیچیدہ سوالات۔ جبریہ جملوں کے اجزائے ضربی کے مشکل سوالات۔ جبریہ جملوں کا مقسوم علیہ اعظم و ذواضعاف اقل، کا زندگی کے روزمرہ امور سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ حسابیہ عددوں پر نسبت و تناسب کے قاعدوں کا آسان آسان جبریہ جملوں پر اطلاق کافی ہے۔

مقادیر اصم۔ قوت نما، اور تسقیط کے موضوع سے تو نہ صرف طلبہ اظہار نفرت کرتے ہیں بلکہ ریاضی کے اساتذہ بھی حتی الوسع ان پر عاجلانہ نظر ڈال کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ راقم الحروف نے ریاضی کے معلمین کو ایک سوالنامہ بھیجا تھا جس میں ان سے دریافت کیا تھا کہ وہ ثانوی مدارج کے لیے نمونے کا ریاضی کا نصاب تجویز کریں۔ ایک سو معلمین نے سوال نامے کا جواب دیا تھا جس میں ۴۲ نے قوت نما کے قاعدے کو ۶۹ نے مقادیر اصم کے قاعدے کو اور ۲۴ نے تسقیط کے موضوع کو نصاب سے خارج کرنے کی سفارش کی تھی۔

پس الجبرے میں جو موضوع افادی اہمیت رکھتے ہیں اور جن کا نصاب میں شامل ہونا ضروری ہے وہ آسان آسان اجزائے ضربی۔ آسان کسور۔ ہمزاد مساواتیں اور ان کے عبارتی سوال ہیں۔ یہ موضوع مدارج مڈل کے نصاب میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ اکثر جگہ یہ موضوع مدارج مڈل کے نصاب میں فی الحال بھی شامل ہیں۔ مثلاً پشاور ڈویژن کے مڈل کے نصاب میں آسان اجزائے ضربی شامل ہیں۔ آج سے دو سال قبل پنجاب میں طالبات کا الجبرا اور مہندسہ کا جو نصاب تھا اس میں آسان اجزائے ضربی شامل تھے۔ صوبہ یو۔ پی میں مڈل سکولوں کے نصاب میں ہمزاد مساواتیں اور ان کے عبارتی سوالات شامل ہیں۔ بلکہ ہمزاد مساواتوں کا مڈل کے نصاب میں شامل کرنا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ ان مساواتوں کے اطلاق سے کسروں۔ مہندسوں۔ نفع و نقصان اور سود کے بہت سے عبارتی سوالات آسانی سے

حل کیے جا سکتے ہیں۔

علمِ ہندسہ کے وہ موضوع جو ثانوی مدارج کے نصاب میں شامل ہیں اور مڈل سکولوں کے نصاب میں شامل نہ
وہ متعلق مثلثوں متشابہ اشکال اور دائرے سے متعلق اثباتی مسائل پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے چند ایک اہم مسئلو
کے تجرباتی ثبوت مڈل کے نصاب میں شامل کیے جا سکتے ہیں اور باقی مسئلوں کو چھوڑ دیا جا سکتا ہے۔ تجربی ہندسہ یا عم
ہندسہ چند سال گذرے ہمارے ہاں مڈل سکولوں کے ریاضی کے نصاب میں شامل تھا۔ اس میں ضروری ضروری مسئلہ
کو تجربی طریق سے ثابت کیا گیا تھا۔ یہ وہ مسئلے ہیں جو روزمرہ زندگی سے مربوط ہیں۔

پس اُن لوگوں کا جو ثانوی مدارج میں ریاضی کو اختیاری مضمون کی حیثیت دینے کے حق میں ہیں کہنا ہے کہ آٹھ
سال کے طویل عرصہ میں (یعنی پہلی جماعت سے آٹھویں جماعت تک) ریاضی کے وہ تمام موضوع جو زندگی میں اعاد
اہمیت رکھتے ہیں بچوں کو پڑھائے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ نویں اور دسویں جماعتوں میں
خواہ مخواہ اس مضمون کو سب پر ٹھونسا جائے۔ اس لیے ان کے خیال کے مطابق اس مضمون کو ثانوی مدارج میں اختیار
مضمون قرار دینا زیادہ موزوں ہو گا تاکہ صرف وہ بچے اس مضمون کو پڑھیں جن کو آئندہ زندگی میں یا تو ایسے پیشے اخ
کرنا ہے جس میں اعلیٰ ریاضی کی ضرورت ہو گی یا ان کو اعلیٰ اداروں میں جا کر علمِ ریاضی کی تحصیل کرنا ہو گی اور ان جما
کے نصاب میں صرف وہ موضوع شامل کیے جائیں جو طلبہ مڈل سکولوں میں پڑھ کر نہیں آئے۔ مڈل سکولوں میں پڑ
ہوئے موضوعات کو دوبارہ دو سال تک پڑھاتے رہنا تضیع اوقات ہے۔

بچوں کی صلاحیتوں میں امتیازی فرق

دوسری دلیل جو یہ لوگ ریاضی کو ثانوی مدارج میں اختیاری مضمون قرار دینے کے حق میں دیتے ہیں وہ نفس
پر مبنی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ماہرینِ نفسیات کی رائے میں بچوں میں جہاں تک ریاضیاتی صلاحیت کا تعلق ہے نمایا
فرق ہوتا ہے۔ لہٰذا ان بچوں کو جن میں ریاضیاتی صلاحیت کی بہت کمی ہے ریاضی پڑھنے کے لیے مجبور کرنا زیادتی ہے ا
یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ان طالب علموں کو جن میں ریاضیاتی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے ایک ہی امتحان میں
ایک ہی پرچہ دے کر شامل کیا جائے۔

اس نظریے کی ماہرینِ تعلیم و ماہرینِ نفسیات نے تصدیق کی ہے۔ چنانچہ ماہرِ نفسیات سپیرمین IR MAN

نے اپنی کتاب "انسانی صلاحیتیں" میں حسابیہ صلاحیت اور ہندسی رجحان کو تسلیم کیا ہے۔ ماہر نفسیات کیلی (KELLY) نے اپنی کتاب (CUOSS ROADS) میں حسابیہ اور میکانکی اجزا کا ذکر کیا ہے۔ ماہر نفسیات تھرسٹن (THURSTONE) نے عددی جزو کو مانا ہے۔ ماہر نفسیات برٹ (BURT) نے صلاحیتوں سے متعلق حسابی جزو کو ثابت کیا ہے اور ماہر نفسیات ورنن (VERNON) نے بچوں کی صلاحیتوں میں سائنسی ریاضیاتی اجزا کے گروہ کی تصدیق کی ہے۔ ماہر تعلیم ریمونٹ (RAYMONT) اپنی کتاب "تعلیم" میں واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ جو طالب علم حساب میں نالائق ہے اس کا الجبرے کی جبری تعلیم میں حصہ لینا بے سود ہے اور ماہر تعلیم والس (WAIS) نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ اس طالب علم کے لیے جس کا ریاضی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ ریاضی سے لگاؤ پیدا کرنے کی کوشش کرنا وقت اور محنت کا ضائع کرنا ہے۔

ثانوی مدارج میں پہنچ کر بچوں کی ضرورتیں۔ ان کی دلچسپیاں اور ان کی صلاحیتوں میں بھاری اختلاف ہو جاتا ہے۔ چناں چہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ثانوی مدارج میں نصاب ایسا ہو جو بچوں کی دلچسپیوں اور ضرورتوں کو پورا کرے۔ لہٰذا ریاضی کو غیر ضروری اہمیت دے کر سب بچوں کو پڑھانا انصاف سے بعید ہے۔ پس ایسی حالت میں ریاضی کو اختیاری مضمونوں کی فہرست میں شامل کر دینا چاہیے تاکہ بچے اس کو چھوڑنا چاہیں وہ اسے چھوڑ سکیں۔

ذہنی ضبط کے نظریے کی تردید

تیسری دلیل جو یہ گروہ ریاضی کو ثانوی مدارج میں اختیاری بنانے کے حق میں پیش کرتا ہے اور ذہنی ضبط کے نظریے سے متعلق ہے۔ اس نظریے کے مطابق چند ایک ایسے مضامین تھے جو ذہنی ضبط کی پرورش میں مدد دیتے تھے۔ چناں چہ ذہنی ضبط ہی کو تدوین نصاب کی کسوٹی سمجھا جاتا تھا۔ چوں کہ ریاضی بھی ان مضامین کی فہرست میں بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس گروہ کا خیال ہے کہ یہ نظریہ اب تجزیئیا مسترد ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس نظریے کو تدوین نصاب کی کسوٹی سمجھنا صحیح نہیں۔ اپنے بیان کی تائید کے لیے وہ مختلف ماہرین نفسیات اور ماہرین تعلیم کے خیالات پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ گاڈفرے ٹامسن (GEODFRE H. THOMSON) نے وضاحت سے بیان کیا ہے کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذہنی ضبط کا نظریہ اتنا یقینی نہیں رہا جتنا کہ سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا اس نظریے کے مطابق نصاب میں مضمونوں کا انتخاب نہیں ہونا چاہیے۔ اگر مختلف مضامین کے باقی پہلو برابر ہوں تو زیادہ افادی اہمیت کے مضمون نصاب میں

شامل کرنے چاہئیں۔ روڈی گر (RUEDIGAR) نے اپنی کتاب "اصولِ تعلیم" میں صاف لکھا ہے کہ ذہنی ضبط کا نظریہ تدوینِ نصاب کے لیے بے معنی ہو چکا ہے۔ کسی مضمون کا ذہنی ضبط کے نظریے کے مطابق نصاب میں شامل کرنا یا رکھنا ایک انتہائی نازک چیز پر سہارا لینے کے مترادف ہے۔ کسی مضمون کو نصاب میں شامل کرنے یا اس کو نصاب میں رکھنے کے لیے اس مضمون کی افادی اہمیت کو دیکھنا ضروری ہے۔ سٹارچ (ARCH) نے بھی اپنی کتاب "تعلیمی نفسیات" میں ان خیالات کی تائید کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تدریسی مضمون کی اہمیت سے مطلب اُس کے نفسِ مضمون کی افادی اہمیت سے ہیں اور نصاب میں کسی مضمون کے شامل کرنے کے لیے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی افادی اہمیت کیا ہے اور صرف ثانیاً یہ دیکھنا ہوگا کہ اس مضمون کا ذہنی ضبط میں کیا حصہ ہے۔ پس لاطینی زبان اور ریاضی کو نصاب میں شامل کرنے کے لیے ہمیں ان مضمونوں کی افادی اہمیت کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا نہ کہ ذہنی ضبط میں ان کے حصے کو۔ ذہنی ضبط کی اپنی قدر ہے۔ لیکن ذہنی ضبط کو تدوینِ نصاب کا واحد اصول بنا لینا نامناسب ہے۔ کسی طعام کی قدر طعام پر منحصر ہے نا کہ ان ٹکڑوں پر جو کھانے کی میز سے نیچے گرتے ہیں۔

مضمون کے اختیاری بنا دینے کا طلبہ پر اثر

مضمون کی پہلی قسط میں بتایا گیا تھا کہ اگر ریاضی کو اختیاری بنا دیا گیا تو طلبہ اس مضمون کو پڑھنے سے گریز کریں گے۔ ان لوگوں کا جو ریاضی کو ثانوی مدارج میں اختیاری بنانے کے حق میں ہیں کہنا ہے کہ اگر حالات کا صحیح جائزہ لیا جائے تو اس تخیل میں اصلیت ثابت نہیں ہوگی۔ ایک اہم مضمون اہم ہی رہتا ہے خواہ وہ لازمی ہو یا اختیاری بنا دیا جائے۔ کئی غیر ممالک میں ثانوی مدارج کے لیے اس کو اختیاری مضمونوں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ مگر وہاں طلبہ کی بہت بڑی تعداد اس مضمون کو پڑھتی ہے۔ مثلاً راقم الحروف نے اپنے تعلیمی سفر کے دوران میں ریاست کیلی فورنیا کے جن سکولوں کو دیکھا تھا وہاں سب میں نویں جماعت میں اختیاری الجبرا اور دسویں جماعت میں اختیاری جیومیٹری پڑھنے والوں کی تعداد ۸۰ فی صد سے زیادہ تھی۔ آسٹریلیا میں ثانوی مدارج میں دو پبلک امتحانات ہوتے ہیں سولہ سال کی عمر میں اور دوسرا ۱۷ سال کی عمر میں۔ پہلے امتحان میں ریاضی کو تین حصوں میں اور ہر حصہ اختیاری مضامین کی فہرست میں شامل ہے۔ یہ تین حصے (۱) حساب (۲) ریاضی الف اور (۳) ریاضی ب کے ناموں سے موسوم ہیں۔ ایک سال وہاں اس امتحان میں کل ۳۵۹۳ طالب علموں (۱۶۸۸ لڑکے ۱۸۷۹ لڑکیوں نے) حصہ لیا۔ اس سال ۸۷

ادر ۵۷ فی صد لڑکیوں نے ریاضی ا اور ۴۷ فی صد لڑکوں اور ۳۱ فی صد لڑکیوں نے ریاضی ب کے امتحانوں
ت کی تھی۔ جنوبی افریقہ میں ریاضی میٹرکولیشن امتحان کے لیے اختیاری مضمون ہے۔ پھر بھی ۸۰ فی صد سے زیادہ
مضمون کو پڑھتے ہیں۔ چناں چہ اس ملک کی ایک تعلیمی رپورٹ میں درج تھا کہ اس ملک کے میٹرکولیشن
تحان میں جو مضامین ۸۰ سے ۱۰۰ فی صد تک طالب علم پڑھتے ہیں وہ انگریزی، افریقی زبانیں، ریاضی اور
نیں، سائنس، کیمیا، لاطینی اور جرمن کو ۳۵ سے ۷۰ فی صد تک طلبہ پڑھتے ہیں۔ چناں چہ یہ آٹھوں مضمون ہائی
لوں کے نصاب کا اہم جزو تصور کیے جاتے ہیں۔

یار جنگ کمیٹی کی رپورٹ

پورے ہند کے مسلمانوں کی تعلیم کا جائزہ لینے کے لیے جو کمیٹی ہندو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام وجود میں
تھی اور جس کو کمال یار جنگ کمیٹی کے نام سے موسوم کیا گیا تھا وہ بھی اسی کے حق میں تھی کہ ثانوی مدارج میں ریاضی
تیاری مضمونوں کی فہرست میں شامل کیا جائے۔ اس کمیٹی کا خیال تھا کہ ریاضی کو صرف ساتویں جماعت تک لازمی مضمونوں کی
ت میں شامل کرنا ضروری ہے۔ اس لازمی نصاب میں حساب، الجبرا کے مبادیات، ہندسہ، مساحت اور حساب کتاب
ہونا چاہئیں۔ اس کمیٹی کے خیال کے مطابق مدارس میں ۷ سالہ عام لازمی نصاب کی تحمیل کے بعد نصاب کے لحاظ سے
ت حصے ہو جانے چاہئیں۔ مثلاً ادبی کورس، سائنس کورس، تجارتی کورس، زراعتی کورس وغیرہ اس کمیٹی نے یہ بھی
رش کی تھی کہ ریاضی ان سب کورسوں کا ایک حصہ ہو۔ مگر سب کورسوں میں اس کی حیثیت اختیاری مضمون کی ہو۔
یہاں یہ ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ تقسیم ہند سے پہلے کی ایک مزید تعلیمی کمیٹیوں نے بھی ریاضی کو ثانوی
ں کے نصاب میں اختیاری مضمونوں کی فہرست میں شامل کرنے کی سفارشات کی تھیں۔ مثلاً صوبجات وسط ہند
رار میں ثانوی مدارج میں ریاضی کو دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا تھا (۱) ریاضی ا اور (۲) ریاضی ب دونوں حصے
تیاری مضامین کی فہرست میں شامل تھے۔ طلبہ ان دونوں حصوں کو بھی لے سکتے تھے۔ ان میں سے ایک کو بھی۔ اور
نوں حصوں کو چھوڑ سکتے تھے۔

صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے لیے ایک تعلیمی کمیٹی ۱۹۳۷ء میں قائم ہوئی
تھی۔ اس کو عام طور پر اچاریہ نریندر دیو کمیٹی کہتے تھے۔ اس کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ ساتویں جماعت کے بعد

ریاضی کو اختیاری مضمون ہونا چاہیے۔ اس کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ سات سالہ لازمی ابتدائی تعلیم کے بعد ثانوی مدارج کے نصاب کو کئی گروہوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ مثلاً (۱) معاشرتی اور ادبی (۲) سائنٹیفک (۳) زراعتی (۴) تجارتی (۵) صنعت و فنونِ عملی اور ان سب گروہوں کے نصاب میں ریاضی ایک اختیاری مضمون ہونا چاہیے۔

اب ان لوگوں کے بیانوں میں سے جنہوں نے اس مضمون کو اختیاری قرار دینے کے حق میں رائے دی ہے چند اقتباس درج کر کے مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔ ان بیانات میں ان لوگوں نے ریاضی کے ثانوی مدارج میں لازمی قرار دینے کے برُے نتائج کا ذکر کیا ہے۔

(ا) ایک رقم طراز ہے کہ میں طلبہ کو ایسے سوالات کے حل کرنے میں جن کا زندگی سے دور کا واسطہ نہیں اپنا بیش قیمت وقت ضائع کرتے دیکھتا رہتا ہوں۔

(ب) دوسرا لکھتا ہے کہ ریاضی کے ثانوی مدارج میں لازمی ہونے کی وجہ سے بے شمار نوجوانوں نے اپنی زندگی ہمیشہ کے لیے تاریک بنا لیا ہے۔ یہ ایسا مضمون ہے جس نے طلبہ کو سب سے زیادہ رلایا ہے۔ ان کو سب سے زیادہ دلی دکھ پہنچایا ہے اور ان کی نیندوں کو اچاٹ کیا ہے۔

(ج) تیسرا کہتا ہے کہ ریاضی نے ان تمام طلبہ کی زندگیوں کو تباہ کیا ہے جو ریاضیاتی صلاحیت سے زیادہ بہرہ ور نہ تھے مگر وہ اس قابل ضرور تھے کہ وہ بہت پڑھے لکھے افراد کی فہرست میں یقینی شامل ہو جاتے۔ اگر یہ مضمون ان کی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہوتا۔

(د) اگر ریاضی کو مدارج مڈل سے آگے بھی لطور لازمی مضمون شامل نصاب کیا جائے تو اس کا مطلب طلبہ پر غیر ضروری بوجھ ڈالنا ہے اور ان کی انفرادی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کا قلع قمع کرنا ہے۔ اس طریق سے اگر کسی مضمون کو طلبہ پر لادا جائے تو ان کی ذہنی نشو و نما میں ترقی نہیں ہوتی۔ کیا یہ افسوس ناک بات نہیں ہے کہ ذہین طلبہ کو صرف ریاضی میں فیل ہو جانے کی وجہ سے میٹریکولیشن امتحان کی سند حاصل کرنے سے محروم کر دیا جاتا ہے جو ان کے لیے ازبس ضروری ہے۔ خواہ وہ کالج میں داخلہ لیں یا کسی پیشے یا ملازمت میں حصہ لیں۔ کیا یہ ظلم نہیں کہ ان طلبہ کو اس مضمون کے پڑھنے کے لیے مجبور کیا جائے جس کے ساتھ ان کی قطعی کوئی دلچسپی نہیں۔ کیا یہ تضیع اوقات نہیں ہے کہ بچوں کو اس مضمون کے پڑھنے کے لیے مجبور کیا جائے جس سے ان کو کوئی رغبت نہیں

ہرا ان افراد کی رائے یہ ہے کہ ریاضی کے ان تمام موضوعات کو جن کا روزانہ زندگی سے رابطہ ہے آٹھویں جماعت
کے نصاب میں شامل کر دیا جائے۔ نویں اور دسویں جماعت میں ریاضی کو اختیاری مضمونوں کی فہرست میں شامل
ئے۔ جو طالب علم اس مضمون سے دلچسپی رکھتے ہیں یا جن کو آئندہ زندگی میں ایسے پیشے اختیار کرنا ہے
یں ریاضی کی ضرورت ہے، اس مضمون کو پڑھیں اور جو لڑکے ریاضی سے رغبت نہیں رکھتے ان کو ریاضی کی بجائے
مضمون پڑھنے کی اجازت ہونی چاہیے ؛

جماعت اول کی ابتدائی اُردو تعلیم

انور علی قریشی

یہ کہنا کہ ترقی یافتہ ملکوں کی بہبودی کا انحصار تجارت، یا کاشتکاری یا کسی اور کاروبار پر ہے بالکل غلط ہے۔ بلکہ ترقی یافتہ ملکوں کی فلاح و بہبود کا انحصار بچوں کی تعلیم و تدریس پر ہے اور گھروں کی ترقی کا انحصار بھی بچوں کی تعلیم پر ہے۔ جس گھر میں سب بچے تعلیم حاصل کر لیں وہ گھر کسی دن اعلیٰ معیاری گھر ہو جائے گا۔ اور بچوں کی تعلیم کا سارا دارومدار استاد صاحبان پر ہے۔ اس لیے اساتذہ کرام کا پہلا فرض ہے کہ وہ آئے دن نئے تعلیمی تجربات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے تعلیمی رسائل و کتب کا مطالعہ کرتے رہیں۔

امریکہ و یورپ میں تو اکثر ممالک میں اساتذہ کرام کو تعلیمی مسائل کے لیے تازہ ترین معلومات بہم پہنچانے کے لیے تعلیمی کتب و رسائل فراہم کیے جاتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں اس طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اردو زبان میں تو خاص کر ایسی کتابوں کی بہت کمی ہے جن کے مطالعہ سے اساتذہ کرام اپنے علم میں اضافہ کر سکیں۔

اس میں اردو کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے طریقۂ تعلیم کے متعلق عملی تجاویز کا پیش کرنا ضروری سمجھا ہوں جس کا مقصد یہ ہے کہ طریقۂ تعلیم میں دلچسپی لینے والے اصحاب اس طرف توجہ دیں اور زبان اردو کی تدریس کے مختلف طریقوں کا تجزیہ کریں۔ اگر ان کے دماغ میں کوئی نئی چیز آئے تو دنیا کو روشناس کرائیں۔

نمایاں پوزیشن: انسان کو دنیا کی تمام چیزوں یا حیوانات، جنات وغیرہ پر شرف حاصل ہے۔ خدا نے انسان کو قوت تخلیق عطا کی ہے اور انسان معاشرتی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس کو دوسرے کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرنا پڑتا ہے تو اظہار خیالات کا بہترین ذریعہ الفاظ ہی ہو سکتے ہیں۔ ان الفاظ کو ادا کرنے کے لیے قوت گویائی ہے۔ اسی طاقت نے انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا معیار بنا دیا۔ تو الفاظ کا استعمال سیکھنے اور مشق کرنے کے بغیر نہیں آ سکتا۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں تو مطلب کا اظہار کر لینا اور بات ہے۔ مگر اپنے خیالات کو مناسب الفاظ میں بہترین طریق سے ادا کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان زبان پر قادر نہ ہو۔

پڑھنے کا عمل:- جب ہم پڑھیں گے تو الفاظ کی شکل آنکھ کے پردہ بصارت میں نقش ہو جائے گی۔ پھر اس پردے سے اعصاب کے ذریعے دماغ کے مقام باصرہ میں تحریک ہوگی۔ اس حرکت سے الفاظ کی شکلوں اور معنوں میں لگاؤ پیدا ہو جائے گا۔ اس لگاؤ کی وجہ سے وہ پیغام مرکز بصارت سے زبان تک پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد زبان سے تعلق رکھنے والے اعضا کو حرکت ہوگی۔ یہ الفاظ بلند یا خاموش صورت میں پیدا ہوں گے۔ اور یہ سارا کام اس سرعت سے ہوگا کہ لفظ پر نگاہ پڑی اور وہ منہ سے بولا گیا۔ یہ دونوں عمل ساتھ ساتھ ہوتے جائیں گے۔

جب بچہ پہلے پہل پڑھنے لگتا ہے تو لفظ اس کے سامنے آتا ہے جس سے وہ آشنا نہیں، تو ... زبان میں تعلق پیدا نہیں ہوتا۔ مگر جب استاد وہ لفظ پڑھتا ہے تو اس کی آواز لڑکے کے کان تک گئی اور دماغ کے مرکز بصارت اور سماع میں تعلق پیدا ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب لڑکا پھر اسی لفظ پر نگاہ ڈالتا ہے تو ... لفظ کی آواز دماغ میں محسوس کرتا ہے، خواہ وہ اس کا مطلب سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو۔

پڑھتے وقت آنکھ کی حرکت بہت تیز ہوتی ہے۔ مگر یہ حرکت مسلسل نہیں، بلکہ آنکھ کو کہیں کہیں ٹھہرنا بھی پڑتا ہے۔ اس وقفہ کی مقدار مضمون کے آسان یا مشکل ہونے پر منحصر ہے۔ دوسرے الفاظ کی شناخت پر۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ مطالعہ میں صرف آنکھ کا استعمال ہو۔ بچہ جب باتیں کرنا سیکھتا ہے تو اس وقت پہلے پہل خود سننے اور دوسروں کے بولنے سے زبان سمجھنے لگتا ہے۔ اس لیے شروع شروع میں بلند آواز سے پڑھنے کی مشق کرانا ضروری ہے۔

پڑھنا سکھلانے کے طریقے:- اگر استاد ہوشیار، سمجھدار، محنتی اور نیک نیتی سے کام کرنے والا ہے تو ہر ایک طریقہ تعلیم سے اچھے نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ مگر بدنیت، نالائق استاد کا اچھے سے اچھے طریقے سے بھی ناکامیاب ہوتا ہے۔ ہندیوں کو اردو پڑھنا سکھانے کے طریقے تو کئی ہیں، مثلاً طریق تہجی، طریق الصوت، طریق بیان گو۔ میرا تجربہ ہے کہ ان میں کامیاب طریقہ طریق تہجی ہے۔ اس میں پڑھنے میں بچے بہت جلد کامیاب ہوتے ہیں کیونکہ کل لفظ کے حروف کا نام لے کر اس کا تلفظ کر دیا جاتا ہے۔ اور لفظ کی آواز اور اس آواز کے اجزا کی مقررہ شکلوں میں تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ جب بچہ حروف سیکھ کر ان سے لفظ بنانے کا طریقہ سمجھ لیتا ہے تو اس میں الفاظ پڑھنے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جب بچہ کے سامنے بورڈ پر لکھا جائے اور بچہ کو ذہن نشین کرا دیا جائے تو بچہ اس لفظ کو کبھی نہیں بھولتا۔ بچے ہجوں سے واقف ہو جاتے ہیں۔ پہلے استاد لفظ کے ہجے کراتا جائے۔ اور لڑکے اس کی اجتماعی طور پر تقلید کرتے جائیں۔

حتیٰ کہ سب بچوں سے باری باری یہ کام کرایا جائے۔ اتنے وقت میں کوئی بچہ بھی ایسا نہ ہوگا جسے سبق یاد نہ ہوا ہو۔ خواہ وہ پڑھنے میں کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو۔ اور استاد کو بھی ہر ایک سے سبق سن کر اطمینان حاصل ہوگا۔

یہ ایسا طریقہ ہے کہ اس میں ناتجربہ کار استاد بھی کامیاب ہو سکتا ہے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ پڑھنا اور لکھنا دونوں ساتھ ساتھ آجاتے ہیں۔ قاعدے پر نہ پڑھایا جائے۔ بلکہ بلیک بورڈ پر لکھ کر پڑھنا سکھایا جائے تو یہ طریق بہت مفید ثابت ہوگا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بچوں کو سبق تو بلیک بورڈ پر پڑھا کر یاد کرایا جائے اور گھر میں جاکر وہ قاعدہ پر پڑھ کر مزید مشق کریں۔ اگلے روز بچوں کی تحقیق بھی کی جائے کہ انہوں نے گھر جاکر سابقہ اسباق یاد کیے ہیں جو لڑکے گھر میں جاکر یاد نہیں کریں گے وہ اگلے روز اچھی طرح سے سابقہ سبق سنانے سے قاصر رہیں گے۔ ان کا فوراً پتہ چل جائے گا اور بچوں کے باپ یا سرپرست بھی استاد کے گوش گزار کرتے رہیں گے کہ ہمارا بچہ خوب محنت سے کام کر رہا ہے اور لڑکے بھی گھر میں جاکر ضرور کام کریں گے۔ کیونکہ انہیں بھی یاد ہوگا کہ صبح جاتے ہی سب سے پہلے استاد صاحب ہمارا سابقہ سبق سنیں گے۔ اس میں استاد کو بہت اور محنت سے کام لینا پڑتا ہے اور آدمی میں سخت کوشی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے اس کی صحت بہت اچھی بن جاتی ہے۔ کیونکہ کام وقت مقررہ پر کرنا پڑے گا اور مقررہ اوقات پر ختم کرنا ہوگا۔ یہ اوقات وہ خود مقرر کر سکتا ہے۔

جب بچوں کو کچھ تھوڑا بہت پڑھنے میں مہارت پیدا ہو جائے تو بلیک بورڈ پر فقرات کا ایک ایک لفظ لکھتے وقت استاد بچوں سے اجتماعی طور پر سوال کرے اور انفرادی طور پر جواب پوچھے۔ ہوشیار طلبہ تو کجا کمزور طلبہ بھی لفظوں کے اجزا اور ہجے کرکے بتانے کی کوشش کریں گے جن سے ان کی واقفیت زیادہ بڑھ جائے گی۔ اور جو بچے پڑھنے میں کمزور ہیں وہ بھی بہت جلد ترقی کر جائیں گے۔ کیونکہ فقرات میں سابقہ الفاظ کے کئی سابقہ حروف ان میں سے ہوں گے جو بار بار آئیں گے اور وہ انہیں یاد ہوں گے۔ ان الفاظ کی اشکال بچوں کے دماغ میں محفوظ ہوں گی اور وہ دن بدن پڑھنے میں ہوشیار ہوتے جائیں گے۔

گروپ بندی بلحاظ تعلیم:۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ استاد کو وہ لڑکے بھی یاد ہوں گے جو تعلیمی لحاظ سے بہت ہوشیار ہیں اور کمزور طلبہ کا علم بھی ہوگا اور درمیانے طلبہ کا بھی۔ ہوشیار طلبہ کو علیحدہ کر لیا۔ کمزور طلبہ کی تعداد پر ہوشیار طلبہ کی تعداد تقسیم کر دی۔ اسی طرح درمیانہ طلبہ کی تعداد پر ہوشیار طلبہ کی تعداد کو تقسیم کر دیا۔ اور ان کو ایک ایک ہوشیار

ہونے کے ساتھ شامل کر کے ان کے گروپ بنا دیے۔ کلاس میں آٹھ دس طلبہ تو ضرور ہوشیار ہوں گے۔ ان کے ساتھ دو دو تین تین کمزور اور درمیانے لڑکے شامل ہو کر آٹھ دس گروپ بنا دیے۔ اگر لڑکوں کی تعداد زیادہ ہے تو ایک ہوشیار طالب علم کے ساتھ چار پانچ لڑکے شامل ہو جائیں گے۔ ہر روز پہلے ہوشیار طلبہ سے سابقہ سبق سنا۔ اور پھر ان کو مخالف گروپوں پر سبق سننے کیلئے مقرر کر دیا۔ یعنی ہوشیار طالب علم اپنے گروپ کا سبق نہ سنے بلکہ کسی دوسرے ہوشیار طالب علم کے گروپ کا سبق سنے۔ اس طرح یہ فائدہ ہوگا کہ اگر کسی لڑکے کو ذرا بھی سبق بھولے گا تو وہ فوراً اسی لڑکے کو کھڑا کر دے گا۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس لڑکے کو سبق یاد نہیں۔ بعد میں استاد اس لڑکے کو بلا کر خود تسلی کر سکتا ہے کہ اسے یاد ہے یا نہیں۔

اسی طرح نیا سبق پڑھایا جاتا ہے کہ تمام جماعت کو بلیک بورڈ پر سبق لکھ کر پڑھا دیا اور پڑھاتے وقت سب فقرات کے الفاظ ہوشیار طلبہ سے پوچھتے گئے اور وہ بتاتے جائیں گے۔ کیوں کہ سبق کی طرف ان کی توجہ ہوگی اور استاد کے الفاظ پوچھنے کا سوال تو اجتماعی ہوگا۔ یہ دیکھنے کے لیے کتنے لڑکے ہیں جو اس لفظ کے ہجے کر کے بتا سکتے ہیں اور کتنے ایسے لڑکے ہیں جو بتا نہیں سکتے اور جواب انفرادی طور پر ہوگا تو ہر ایک لڑکے کی توجہ سبق کی طرف ہوگی کیونکہ انہیں یہ خیال ہوگا کہ شاید مجھ سے پوچھا جائے۔ مگر ہر ایک طالب علم سے پوچھنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ انہیں یہ بھی معلوم ہو کہ ہم سے بھی پوچھا جائے گا۔ اس طرح ان میں لاپرواہی کی عادت نہیں پڑے گی۔

جب تمام سبق پڑھا دیا تو پہلے باری باری ہر ایک ہوشیار طالب علم سے سبق سن لیا۔ بلکہ سننے کی بجائے اگر ہوشیار طلبہ باری باری بلیک بورڈ پر تمام سبق لکھاتے جائیں اور باقی تمام لڑکے اجتماعی طور پر اس کی تقلید کرتے جائیں تو اس طرح یہ ہوگا کہ بہت سے کمزور طلبہ کو سبق یاد کرنے میں بہت سی مدد ملتی جائے گی، جو لڑکے سبق نہ سنائیں گے وہ بعد میں اپنے گروپوں میں تقسیم کر دیے جائیں اور ہوشیار طلبہ کمزور طلبہ کو سبق یاد کرانے کے لیے لگا دیے جائیں استاد صاحب خود نگرانی کرتے رہیں کہ ہر ایک ہوشیار طالب علم کمزور طالب علم کو محنت سے سبق یاد کرا رہا ہے، یا نہیں اور کمزور بچے توجہ سے سبق یاد کر رہے ہیں یا نہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بچوں کو شرارتوں کا موقع نہیں ملے گا اور بچوں میں سبق کی زیادہ پختگی ہو جائے گی، اور گروپ کا ہوشیار مانیٹر اپنے گروپ کو اچھی طرح سے سبق یاد کرائے گا کیوں کہ اسے علم ہے کہ کل کو یہی سبق دوسرے گروپ کا مانیٹر سنے گا۔ اگر میرے گروپ کے کسی لڑکے کو سبق نہ آیا تو وہ فوراً اسے کھڑا کر دے گا۔ اس طرح ان میں ایک دوسرے گروپ سے مقابلہ کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔ جس سے ان کی

تعلیمی حالت دن بدن بڑھتی ہوئی نظر آئے گی۔

جماعت میں جتنے ہوشیار طالب علم ہیں اتنے ہی گروپ بن جائیں گے اس طریق سے تھوڑے وقت میں کام زیادہ ہوگا۔ کمزور طلبہ کو ہوشیار طلبہ سے کافی مدد ملے گی۔ اور استاد صاحب کو کام کرانے میں بہت سی آسانی بھی پیدا ہو جائے گی۔ البتہ نگرانی کی ضرورت ہے۔ کمزور طلبہ بہت جلد ترقی کرنے لگ جائیں گے۔

گروپ بندی بلحاظ داخلہ:۔ جماعت اول کا داخلہ سال میں دو دفعہ ہوتا ہے جو تین گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) اپریل مئی جون کا داخلہ (۲) اکتوبر نومبر کا داخلہ (۳) سابقہ سال کے اکتوبر نومبر کا داخلہ۔ اس لحاظ سے بھی گروپ بندی تو خود بخود ہو سکتی ہے جو دوسرے گروپوں کو کام کرانے میں مدد مل سکتی ہے۔ کیوں کہ پہلے کے داخلہ کا گروپ کچھ نہ کچھ پڑھ سیکھ چکا ہے۔ اور وہ تعلیمی حالت میں پہلے داخلہ کے گروپ سے آگے ہے۔ وہ اپنے پچھلے گروپ کے طلبہ کو کام کرا سکتے ہیں۔

بعض کو یہ خیال ہوگا کہ اس طرح سے پہلے داخلہ کے طلبہ کو نقصان پہنچے گا۔ کیوں کہ وہ دوسرے گروپ کو کام کرانے میں مصروف رہے ہیں اور خود اپنا کوئی کام نہیں کر سکے۔ بات غلط ثابت ہوگی۔ پہلے داخلہ کی گروپ بندی تو تعلیمی لحاظ سے کرنی چاہیے۔ اس لحاظ سے ہوشیار طلبہ کمزور طلبہ کو کام کرا کے اپنے ساتھ ملائے رکھیں گے اور کمزور طلبہ بھی ہوشیار طلبہ کی مانند ہی ہو جائیں گے۔ کیوں کہ کمزور طلبہ میں کمی پیدا ہی نہیں ہوگی اور تمام طلبہ ہوشیار ہوں گے۔ کیونکہ وہ دوسرے گروپوں کو کام کرا کے واقفیت میں اضافہ کر لیں گے اور ان کا اعادہ بھی ہو جائے گا۔

جب دوسرا داخلہ ہوگا تو اس وقت یہ تمام لڑکے دوسرے گروپ کو کام کرانے کے لیے لگا دیے جائیں۔ ایک ہوشیار طالب علم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ایک یا دو، دو نئے گروپ کے لڑکے سپرد کرنے پڑیں گے ایک یا دو لڑکوں کو کام کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ ہوشیار طلبہ چند منٹوں میں ان کو سبق یاد کرا کے استاد کے پاس لاتے جائیں گے۔ اور استاد صاحب ایک ایک لڑکے کا سبق انفرادی طور پر سن کر تسلی کر سکتا ہے۔ جو لڑکا اپنے ساتھیوں کو سبق اچھی طرح یاد کرا کے لائے۔ ان لڑکوں کو شاباش دی جائے تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ اور اگلے روز اپنے گروپ کے لڑکوں کو جلد ہی سبق یاد کرانے میں کوشش کریں گے۔ کبھی ان کا مقابلہ کرا دیا کہ پہلے کون لڑکا اپنے گروپ کے لڑکوں کو سبق یاد کرا کے لاتا ہے۔

اس طرح تعلیم بہت جلد ہو جائے گی اور جنوری سے پیشتر ہی ان کا تعلیمی نصاب ختم ہو جائے گا اور

بھی مکمل تعلیم حاصل کر جائیں گے۔ فروری سے نصف مارچ تک پورا مادہ بھی کافی کر دیا جا سکتا ہے۔ جس کا طریقہ یہ ہے
جماعت کے طلبہ کو صبح کے وقت بلایا، اور نمبروں کے لحاظ سے بٹھا دیا۔ اور ہر روز اسی طرح بیٹھنے کی تاکید کر دی
چالیس کے قریب طلبہ کی جماعت اپنا قاعدہ ختم کر چکی ہے۔ نمبر ایک سے قاعدہ کا پہلا صفحہ سننا شروع کر دیا۔ نمبر دو سے
۲ نمبر تین سے صفحہ ۳، اگلے روز نمبر دو سے صفحہ ۱ اور نمبر تین سے صفحہ ۲۔ اسی طرح اگلے روز نمبر تین سے
۱ اور نمبر چار سے صفحہ ۲۔ اس طرح پہلے نمبر جو خالی رہیں گے، قاعدہ کا آخری صفحہ ان پڑا کر ختم ہوگا۔ اور
قاعدہ اسی روز تعطیل سے پہلے ختم ہو جائے گا۔ اس طرح تمام طلبہ سے سالم قاعدہ بھی سنا جائے گا اور
نیز پھر بیس تیس بار قاعدہ ختم ہوگا۔

کھیلوں کے ذریعہ تعلیم

بذریعہ تاش:۔ جب طلبہ نصف قاعدہ سے زیادہ ختم کر جائیں تو ساتھ ہی تعلیم بذریعہ کھیل بھی شروع کی جا سکتی ہے۔ الف سے ی تک حروف تاش (کاغذ کے مستطیل ٹکڑوں) پر لکھ کر ایک تھیلے میں ڈال دی جائیں۔ اور ایک لڑکے کو وہ تھیلا دے کر چٹھی رساں بنا دیا جائے۔ وہ تمام کاغذ کے لکھے ٹکڑے طلبہ میں تقسیم کر دے گا تو بعد میں ہر ایک لڑکے سے پوچھ لیا کہ تمہارے کارڈ (کاغذ کے ٹکڑے) پر کیا لکھا ہے۔ وہ اپنے حروف کو بتا دے گا کہ یہ فلاں حرف ہے۔ یہ کام ابتدائی بچوں میں ہو سکتا ہے۔

بذریعہ گھڑی:۔ گتے کے دو گول ٹکڑے کاٹ لیے جن کا نصف قطر ۶ ہو۔ ان پر چھوٹے چھوٹے فقرے اس طرح لکھے جائیں۔ مثلاً "آم لے آ" ایک فقرہ ہے۔ اس کو ایک گتے پر تو لکھا "آم"۔ دوسرے گتے کے ایک خانے میں لکھا "لے آ"۔ اسی طرح اور فقرات کے الفاظ بھی دونوں گتوں کے خانوں میں لکھ دیے۔ اب ان دونوں گتوں کو درمیان میں ایک کیل سے گاڑ دیا۔ بعد میں دونوں گتوں کو گھما کر فقرے بنوانے شروع کر دیے۔ اس طرح بچے تعلیم میں بھی شوق ظاہر کریں گے اور خوش بھی ہوں گے۔

چوپڑ یا شطرنج:۔ ایک بڑا گتا جو ایک مربع کو ہو اس پر چوپڑ کی سڑک بنائی۔ سڑک کے درمیانی مربع کو چھوڑ کر سڑک کے باقی چاروں راستوں میں مربع شکل کے خانے بنا لیے اور ان خانوں میں ایک ایک لفظ لکھ کر ایک ایک فقرہ مکمل کر دیا۔ مثلاً "ایک سیر برف لے آ"، یہ پانچ خانے بنیں گے۔ اس طرح چوپڑ کی سڑکوں میں

بہت سے فقرات لکھے جا سکتے ہیں اور انہی فقرات کے الفاظ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے مربع شکل کے ٹکڑوں پر لکھ دیے اور یہ تمام ٹکڑے اس بڑے گتے کے قریب رکھ دیے۔ طلبہ کا وہ گروپ جو ان فقروں کے پڑھنے کے قابل ہو ان میں سے چار لڑکوں کو سڑکوں کے سامنے بٹھا کر کہہ دیا۔ کہ اپنے سامنے کا فقرہ پڑھو۔ اور اس فقرے کے الفاظ لکڑی کے مربع شکل کے ٹکڑوں پر لکھے ہوئے ڈھونڈ کر نکالو۔ اور گتے کے اپنے فقرات کے اوپر یہ الفاظ لکھوا لو لکڑی کے ٹکڑوں پر لکھے ہوئے الفاظ سے فقرے کو مکمل کرو۔ جو تم نے اپنے سامنے سے چوپڑ کی سڑک پر پڑھے ہیں اس طرح ان میں فقرات بندی کا ملکہ بھی پیدا ہوگا۔

بذریعہ مٹکا :۔ تین چار الفاظ سے بنے ہوئے بامعنی جملے بہت سے کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھ کر مٹی کے گھڑے میں ڈال دیے اور لڑکوں کو کہا کہ اس گھڑے سے باری باری کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالو اور فقرہ پڑھو۔ وہ باری باری ایک ایک ٹکڑا نکالیں گے اور پڑھیں گے جو بچوں کی دلچسپی کا باعث ہوگا،

بذریعہ زینہ :۔ ایک زینہ کی شکل زمین پر بنا دیجئے اور ایک ایک زینہ پر ایک ایک لفظ لکھ کر فقرہ مکمل کر دیجیے۔ اور لڑکوں کو پڑھنے کے لیے کہیے۔ جب ایک لڑکا فقرہ پڑھ چکے تو پھر زینہ کے خانوں سے یہ الفاظ مٹا دیے جائیں، اور نئے الفاظ لکھ کر نیا فقرہ مکمل کر کے پڑھنے کے لیے کہہ دیا جائے اور دوسرے لڑکے سے سن لیا جائے۔ اس طرح باری باری یہ کام لڑکوں کو کرا دیا جائے۔ یہ کام تختہ سیاہ پر بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے بچوں میں سوچنے کا مادہ پیدا ہوگا۔

غرضیکہ ایسے بہت سے طریقے استاد اختیار کر سکتا ہے جن سے بچوں میں کافی مہارت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور اے ڈی آئی صاحبان یا افسرانِ بالا بھی ایسے طریقوں کی تعلیم کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے، جو سکول میں قدم رکھتے ہی تعلیم بذریعہ کھیل کا راگ الاپنے لگتے ہیں۔ اور استاد کو بھی اپنا تعلیمی کام دکھانے کے لیے ناجائز ذرائع اختیار نہیں کرنے پڑیں گے۔ اور بچے بھی خوشی سے تعلیم حاصل کرتے جائیں گے۔ بچے استاد کو اپنا ہمدرد خیال کریں گے، اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ استاد کو بلند خیال ہونا چاہیے اور اپنے کام سے بھی جی نہیں چرانا چاہیے۔

بذریعہ چارٹ :۔ اس کے بعد گروپ کے سامنے چارٹ پیش کیا جائے۔ جس پر قاعدہ کے فقرے لکھے ہوئے ہوں۔ باری باری لڑکے چارٹ کے فقرے پڑھ کر سنائیں۔ اگر مدرس اپنے دماغ سے چارٹ تیار نہیں کر سکتا۔ تو قاعدے کے اسباق کی مدد سے جو بچے پڑھتے ہیں الفاظ کی ترتیب بدل کر نئے فقرے بنا سکتا ہے۔ اگر مضمون کے مطابق تصاویر بھی مل سکیں تو وہ بھی لگا دی

جائیں۔ چارٹ کمرے کی زیبائش کا سبب بھی بنیں گے اور بچوں کی تعلیم کو دلچسپ بھی بنا دیں گے۔

طریق تہجی کی فوقیت:۔ طریقہ تہجی پرانا طریقہ ہے۔ تمام سکولوں میں جاری ہے۔ جو بچوں میں نئے اور ناخواندہ الفاظ کے پڑھنے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ صحیح املا لکھنے کی قابلیت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے کیوں کہ اجزا سے کل بنا لیتے ہیں بچے ہم آواز حروف سے واقف ہو جاتے ہیں۔ تلفظ درست ہو جاتا ہے۔ بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ بچوں کی تعلیم رفتار بھی بہت تیز ہو جاتی ہے اور تھوڑے ہی عرصہ میں بچے پڑھنا سیکھ لیتے ہیں گو نئے طریقہ ہائے تعلیم کے دل دادہ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ قدرتی نہیں لیکن اس کے مقابلے میں نئے طریقے بھی نقائص سے خالی نہیں کیوں کہ املا لکھنا تو درکنار بچوں کو پڑھنا بھی نہیں آسکتا۔ جو لفظ دیکھ کر پڑھ جائے یاد ہیں گے وہ تو پڑھ دیں گے۔ مگر نئے یا ناخواندہ الفاظ پڑھنے کا ملکہ پیدا نہیں ہوگا کیوں کہ ہجے کرنا تو بالکل آتے ہی نہیں۔ دوسری یہ ہے کہ بچے املا نویسی میں بہت کمزور ہوں گے جب تک بچوں کو ہجے کرنا نہ سکھا جائے وہ طریق بھی ادھورے اور نامکمل ہیں۔

مرکب طریقہ:۔ مناسب یہی ہے کہ پہلے تو طریق تہجی سے تعلیم دی جائے اور بعد میں طریق بین وگو (کھیلوں کے ذریعہ) سے جیسا تعلیم بذریعہ کھیل میں لکھا گیا ہے۔ اس طرح سے یہ طریقہ دلچسپ بھی بن جائے گا اور فقرات بنانے میں آسانی ہوگی۔ اس طریقہ سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ بچوں کے دماغ بے معنی مرکبات سے پریشان نہیں ہوں گے اور روانی میں بھی فرق نہیں آئے گا۔ چھوٹے بچوں کی تعلیم کو دلچسپ بنانے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں اور مناسب موقعوں کے لیے مختلف اصول۔

حاضری:۔ میرا تجربہ ہے کہ تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے حاضری کا ٹھیک رکھنا بھی ضروری اور لابدی ہے۔ حاضری درست ہونے سے طلبہ تعلیم میں بہت جلد ترقی کرتے ہیں کیوں کہ ان کا تعلیمی نقصان نہیں ہوتا۔ اور وہ پہلی جماعت کے کورس کو ان تین چار ماہ تک ختم کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد اعادہ کے لیے کافی وقت مل جاتا ہے جس سے طلبہ کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور کمزور بھی شاذ و نادر ہی کوئی لڑکا رہتا ہے اور استاد صاحب کو بھی کام کرانے میں کافی سہولت ہو جاتی ہے۔

غیر حاضری:۔ جو بچے غیر حاضر رہیں گے ان کی تعلیم میں کافی نقصان ہوگا۔ دوسرا استاد صاحب کو بھی کام کرانے میں بہت دقت ہوگی جس کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس طرح غیر حاضر رہنے والے طلبہ نصاب کو مقررہ وقت پر ختم بھی نہیں کر سکیں گے۔ اور ان میں تعلیمی کمزوری بہت بڑھ جائے گی جس کی وجہ سے وہ کسی دن سکول چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

اور اکثر وہی بچے غیر حاضر ہوں گے جن کی تعلیمی حالت خراب اور بدتر ہو گی۔

غیر حاضری کا انسداد: اگر دیہاتی پرائمری سکول ہے تو اس میں مختلف دیہاتوں کے بچے تعلیم حاصل کریں گے اور ہر ایک گاؤں سے پانچ سات بچے ضرور پڑھتے ہوں گے۔ وہ دیہات وار خود بخود گروپ بن جائیں گے۔ اور ان کے گروپوں کے بڑے لڑکوں کو اپنے ہمراہ چھوٹے لڑکوں کو لانے کی تاکید کر دی جائے۔ اگر شہری پرائمری سکول ہے۔ تو اس سکول میں مختلف محلوں کے کئی کئی لڑکے پڑھتے ہوں گے، ان کے محلہ وار گروپ بنا دیے جائیں اور بڑے لڑکے اپنے ساتھ چھوٹے لڑکوں کو لے آئیں، اس طرح بچوں کے راستہ کی مشکلات اور رکاوٹیں بھی دور رہیں گی۔

استاد صاحب کو بچوں کے باپ یا سرپرست سے بھی ان کی غیر حاضری یا کمزوری کے متعلق بات چیت کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے بچوں کو یہ بھی ڈر ہوگا کہ ہمارے استاد صاحب ہمارے باپ یا سرپرست کو ہماری غیر حاضری کی اطلاع دیں گے تو ہمیں گھر سے ڈانٹ ڈپٹ ہو گی وہ غیر حاضری کرنا چھوڑ دیں گے۔ جب غیر حاضری کی اطلاع بچوں کے باپ کو ملتی رہے گی تو وہ خود بھی اپنے بچوں کا خیال رکھیں گے کیونکہ بعض بچے گھر سے کتابیں لے کر آجاتے ہیں اور سکول میں حاضر نہیں ہوتے تو جب بچوں کے باپ کو اطلاع دی جائے گی تو انہیں علم ہو جائے گا کہ ہمارا بچہ گھر سے تو چلا گیا۔ مگر سکول میں نہیں پہنچا، یہ کہاں رہا ہے اس کی تحقیق کریں گے۔

جو حاضر باش لڑکے ہوں، استاد صاحب کو ان کے باپ یا سرپرست سے بھی ملتے رہنا چاہیے تو ان کو اپنے بچوں کی تعلیمی حالت کا پتہ چلتا رہے گا اور وہ بھی اپنے کمزور بچوں کی کمزوری کو دور کرنے کے لیے کوشش کریں گے اور استاد بچوں کے باپ یا سرپرستوں کی نظروں میں مقبول ہو جائے گا کیونکہ وہ اسے اپنا ہمدرد خیال کریں گے۔

مدرس کی تیاری: ادنیٰ جماعتوں کو پڑھانے کے لیے استاد صاحبان کو گھر سے تیاری کر کے آنا چاہیے کیونکہ سبق پڑھاتے وقت کئی مشکلات پیش آجاتی ہیں۔ جن کا بچوں پر برا اثر پڑتا ہے۔ بچے گو چھوٹے ہوتے ہیں لیکن استاد کی بعض کمزوریوں کو بھانپ جاتے ہیں، اور استاد کے سامنے تو کچھ کہہ نہیں سکتے، مگر استاد کے متعلق ان کی رائے خراب ہو جاتی ہے۔

اچھا پڑھانا سکھانے کے لیے اچھے اوصاف پیدا کرنا مدرس کی ذات پر منحصر ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مدرس جو سبق پڑھانا چاہتا ہے اسے خوب اچھی طرح سے پڑھ لے۔ اور مشکل الفاظ کی مشکلات کو دور

کرنے کے لیے اچھی طرح تسلی کر لے۔ یہ بات استاد کے لیے بے حد مفید ہوگی اور بچوں پر بھی اس کا اچھا اثر رہے گا۔

مدارس کی ڈائری:۔ سبق کی تیاری کا کام تب ہی ہوگا جب کہ استاد گھر پر ڈائری لکھے۔ ڈائری لکھنی ضرور پڑے گی، مگر سبق پڑھانے میں بھی کافی سہولت رہے گی کیوں کہ وہ مشکلات کا گھر پر انسداد کر چکا ہے۔ بعض کو یہ خیال ہوگا، کہ جماعت کو پڑھانا اور ڈائری کا کیا تعلق۔ مگر بغیر ڈائری کے مشکلات کا حل ناممکن ہے۔ کیوں کہ قاعدہ میں بھی کوئی ایک ایسے مشکل لفظ آجاتے ہیں جن سے بچے اکتا کر ہمیشہ کے لیے علم سے محروم ہو جائیں گے۔ اور وہی بچے سکول سے دوڑیں گے جن کے لیے تعلیمی مشکلات پیدا ہوں گی ÷

سکول میں جمہوری فضا

آفتاب احمد جاوید

پرانے وقتوں کی بات ہے جب سکول کی سنسان فضا سکول کے اعلیٰ نظم و نسق کی آئینہ دار تھی۔ انسپکٹر صاحبان کو کے اس ماحول کی ثناخوانی میں رطب اللسان تھے جہاں سوئی کے گرنے کی آواز واضح طور پر سنائی دیتی تھی۔ بچے خاموش اساتذہ چپ چاپ۔ کانوں ہی کانوں میں باتیں کرنے، کسی نظروں سے اوجھل دیوِ استبداد کے خوف و ہراس سے لرزاں سارے کا سارا ماحول پُراسرار طریق پر مکر و ریا سے بھرپور۔ طلبہ بظاہر مطالعہ میں محو لیکن پس ادراک شرارت پر آمادہ... بظاہر کام میں دل و جان سے مشغول لیکن اندر ہی اندر بغاوت کے لیے تیار۔ ان کے سینے لاوے کی چٹان، آن واحد میں پھٹنے پر تلے ہوئے۔ ایسے ماحول میں تعلیم و تعلّم محض دکھاوا، نمائش، حقیقت مفقود۔ معلمین اور متعلمین کی دماغی قوتیں اور صلاحیتیں غلط راہوں پر گامزن۔ ان کے خیالات پراگندہ۔ اندریں حالات کردار کی جس انداز سے تعمیر ہوتی ہوگی اور عادات و اطوار جس ڈھب پر پرورش پاتے ہوں گے، بآسانی قیاس کیے جا سکتے ہیں۔ صدر معلّم کا بید طلبہ اور نائب معلمین کے لیے ایک ہوّا تھا جس کی ہر جنبش پر ہزاروں ننھے دل دہل جاتے، جسے دور سے دیکھ کر ننھے منھے بچے اور نو دخیزان اپنے اپنے کمروں میں گھس جاتے۔ ان کی آمد پر وہ بھاگم دوڑ ہوتی جو قیامت صغریٰ کا نقشہ پیش کرتی۔

شکر ہے کہ اس آمریت کا دور ختم ہوا۔ اس کا زہر میں سمویا ہوا بید، جمہوریت کے تند و تیز سیلاب کی تاب نہ لا سکا۔ وہ نمود و ریا کا دور ختم ہوا۔ ہٹلرانہ احکام کی آرڈر بک پارلیمانی دور میں روپوش ہو گئی۔ مطلق العنان حاکم کی مونچھوں کا تاؤ اتر گیا۔ جائے شکر ہے کہ وہ اپنے انسانی روپ میں ظہور پذیر ہے۔

آج ہماری اکثر و بیشتر درس گاہوں کے صدر معلم صحت مندانہ اصولوں پر کاربند ہو کر اپنے اداروں کو جدید نفسیاتی تجربات کی روشنی میں شاہ راہِ ترقی پر بڑھائے لیے جا رہے ہیں، وحشت خیز خاموشی سے انہیں نفرت ہے نائب معلمین پر ناجائز قسم کے دباؤ ڈالنے کی بجائے وہ ان کا حقیقی تعاون حاصل کرنے کے متمنی ہیں۔ وہ انہیں اپنا ساتھی اور مخلص دوست بنانا چاہتے ہیں۔ طلبہ ان سے ہراساں ہونے کی بجائے مخلصانہ طور پر ان کی عزت کرتے

انہیں ناجائز طریقوں سے خائف نہیں کیا جاتا۔ ان کا تعاون اور محبت حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ طلبہ کے فطری تقاضوں کو دبانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ان کے لیے کھیل کود اور سیر و تفریح کے لیے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں انہیں اپنے فطری رجحانات کی نشو و نما کی پوری پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔

راقم الحروف کو حال ہی میں ایک محترم دوست کی ماڈرن درس گاہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہیں فخر تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کا پورا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہیں۔ ان کے طلبہ بڑی آزادی سے ان کے دفتر میں آکر اپنی انفرادی مشکلات پیش کرتے ہیں۔ ان مشکلات کا حل تلاش کرنے میں ان کی کماحقہٗ امداد کی جاتی ہے۔ ہر صبح نت نئے آرڈر صادر نہیں کیے جاتے۔ طلبہ اور اساتذہ کی ایک مشاورتی کمیٹی معرض وجود میں لائی گئی ہے۔ طلبہ نے اپنے نمائندے خود منتخب کیے ہیں اساتذہ اس مجلس میں اپنے فیصلوں کو ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتے۔ طلبہ کو اظہار خیال کی پوری آزادی حاصل ہے۔ مدرسہ کے نظم و نسق کے اکثر پہلو اس مشاورتی کمیٹی میں زیر بحث آتے ہیں، صدر معلم اور دیگر اساتذہ طلبہ کو آمرانہ انداز میں سزائیں نہیں سناتے طلبہ کے خلاف تمام شکایات اس مشاورتی مجلس کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ طلبہ کو خود اپنے ساتھیوں کی لغزشوں کی جانچ پڑتال کا موقع ملتا ہے، وہ ہر معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر خوب غور و فکر کرتے ہیں۔ سزا کے مستحق طلبہ کو قرار واقعی سزائیں دی جاتی ہیں ہر طالب علم کو مجلس مذکور موقع دیتی ہے کہ اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے جو اقدامات چاہے اختیار کرے۔ ہر سزا کا فیصلہ سنانے سے پیشتر ہر مجرم کو یقین دلایا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ انصاف کیا جا رہا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ دیگر طلبہ میں بھی جہاں تک ہو سکے یہ احساس پیدا کیا جائے کہ ہر معاملہ میں انصاف کو کسی قیمت پر بھی بیچا نہیں جا سکتا تاکہ ان میں سے کوئی بھی ناجائز حربے اختیار کرنے کی سرے سے کوشش ہی نہ کرے۔

ایک فقرہ جس کی جانب صاحب مذکور نے سکول کے دروازہ کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے نہایت فخریہ انداز میں اشارہ کیا وہ یہ تھا، اس مدرسہ کے نظم و ضبط کے ذمہ دار خود طلبہ ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ طالب علموں میں یہ احساس پیدا کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہیں، طلبہ سمجھ گئے ہیں کہ وہ خود اپنی درس گاہ کی شہرت کے ذمہ دار ہیں۔ اگر ان کا گھر بدنام ہو گا تو وہ انفرادی طور پر نیک نام حاصل نہیں کر سکتے۔ نام و ننگ کا معاملہ اجتماعی ہے۔ یہ جذبہ انہیں پوری آزادی دے کر اور نتائج و عواقب کا خود ذمہ دار ٹھہرا کر پیدا کیا گیا ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ان خطوط پر تربیت اچھا شہری بنانے کے لیے بہت حد تک ممد و معاون ہو سکتی ہے جو بچے ایسی درس گاہوں سے فارغ التحصیل ہو کر زندگی کی جنگ کا آغاز کریں گے۔ یقینی طور پر اپنے معاملات با حسن وجوہ نبھانے کے اہل ہوں گے۔ پہلے سے ہی انھیں اپنی گتھیوں کو خود سلجھانے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس تربیت سے وہ زندگی بھر مستفید ہوتے رہیں گے۔

ایک مباحثہ (سکول میں ایک وردی ہونی چاہیے یا نہیں)

حنیف عالم شاہ

زیل میں ایک مباحثہ کی روئداد درج ہے جو ہمیں گورنمنٹ ہائی سکول شترنیور سے بھیجی گئی ہے

(مدیر معاون)

(۱) اکثر مواقع پر جب افسران محکمۂ تعلیم یا دوسرے محکمات کے افسران سکول میں آتے ہیں اور سرسری نگاہ دوڑاتے ہیں تو وہ اپنے ذہن میں اچھا اثر لے کر نہیں جاتے۔ کیوں کہ لڑکوں کا علیحدہ علیحدہ لباس ہوتا ہے۔ جن میں سے چند لڑکوں کا لباس اُجلا اور صاف ستھرا ہوتا ہے اور اکثر کا لباس میلا کچیلا۔ لیکن اگر تمام سکول کے طلبہ کی ایک ہی یونی فارم یا وردی ہو تو افسران کے دلوں میں خوامخواہ سکول کی عزت سما جاتی ہے۔ ان کی نگاہ میں سکول کی مقبولیت کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے جس کا اثر اساتذہ و تلامذہ دونوں پر پڑتا ہے۔

(۲) اس کے علاوہ یونی فارم سکول میں ایک اعلیٰ شان اور یونیفیشن پیدا کرتی ہے۔ کیوں کہ ایک ہی رنگ کے لباس میں لڑکے رضاکاروں اور فوجیوں کی مانند دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس طریقے سے لڑکوں کے ذہن میں قدرتی طور پر سپاہیانہ دلولہ پیدا ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہر لڑکا اپنے آپ کو فوجی تصور کرتا ہے اور سکول کو اپنا وطن سمجھتا اور خود ایک سپاہی کی حیثیت سے سکول کی خدمت کے لیے پیش پیش رہتا ہے۔ اور اپنے سکول کے وقار کی خاطر ہر قسم کے ایثار کو اپنا فرض اولین خیال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سکاؤٹ اور رضاکار کی زندگی کی ابتدا اس سے شروع ہوتی ہے، جس کے ساتھ ساتھ ایک محب وطن سپاہی کی زندگی کا نمونہ ذہن میں پرورش پاتا رہتا ہے۔ وردی بہت اچھی نمائش ہے اور اس سے سکول کی خوب صورتی اور ہر دل عزیزی کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ کیوں کہ لڑکے سکول میں ایک ہی لباس میں بیٹھے ہوئے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

(۳) اتحاد اور نماز دونوں روحانی وردیاں ہیں۔ ان سے انسان خدا کو مقبول ہو جاتا ہے۔ لہٰذا روحانی وردی کے ساتھ ظاہری وردی کا ہونا بھی لازمی ہے۔ مسلمان جب باجماعت نماز پڑھتے ہیں تو اگر ان سب کی ایک وردی یعنی

ایک ہی نوعیت کا لباس ہو تو شان میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس سے ہر وہ قوم جس کا لباس ایک ہوگا اس کے اتحاد تنظیم مستحکم کا ثبوت ملے گا جس سے دنیا کی تمام اقوام پر اچھا اثر ہوگا۔

(۴) وردی ایک ذریعہ امتیاز ہے۔ یعنی اگر کھیل کے میدان میں دو سکولوں کے کھلاڑی کھیل رہے ہیں۔ مگر انہوں نے علیحدہ علیحدہ رنگ کی وردیاں نہ پہنی ہوں تو ان میں باہمی امتیاز بہت مشکل ہے، جس سے کھیل میں گڑ بڑ مچ جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وردی کا کھیل کے میدان میں بھی بہت فائدہ ہے۔

(۵) جہاں وردی کے یہ فوائد ہیں، وہاں اس کا گہرا اثر طالب علم کے اخلاق اور اطوار پر بھی ہوتا ہے، ایک وردی کا ہونے کا سب سے پہلا اخلاقی اور اسلامی سبق اخوت ہے۔ ہر طالب علم اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھائی تصور کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں پاتا، غرض کہ ان کی ہر تکلیف اور مصیبت میں شریک ہوتا ہے۔ اگر کسی بھائی کو تکلیف میں دیکھتا ہے تو اسے رفع کرنا اپنا فرض خیال کرتا ہے۔ کیونکہ قدرتی طور پر ہم رنگی دیکھ کر اس کے جسم میں محبت کا جذبہ موجزن ہو جاتا ہے۔

(۶) اس کے علاوہ ہر طالب علم غرور و تکبر کی بد عادات سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر سکول میں ایک وردی نہ ہو تو ہر امیر لڑکے کو اپنے اعلیٰ اور قیمتی لباس پر فخر ہوتا ہے، اور غریب لڑکوں کو اپنے زاویہ نگاہ میں بالکل حقیر سمجھتا ہے بلکہ ان سے ملنا تک اپنی ہتک اور خلاف شان خیال کرتا ہے۔ لہٰذا طالب علموں کو ایک وردی کا یہ بھی بڑا فائدہ ہے کہ وہ حسد و بغض کی بد عادات سے پاک ہو جاتے ہیں۔ سکول کی زندگی بغیر کینہ اور حسد کے گذار سکتے ہیں، بلکہ وہ اپنی ابتدائی زندگی میں ہی رحم دلی، ہمدردی اور اخوت کا سبق سیکھ لیتے ہیں۔

(۷) جب تک سکول میں ایک وردی نہ ہو تو لڑکے تعصب کی زہر سے پاک نہیں ہو سکتے۔ یا وہ اپنے آپ کو حقیقی مفہوم میں ایک قوم کی طرح منظم، مرتب اور متحد نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ لڑکے (یا عوام) اپنے آپ کو امیر یا غریب نہ سمجھنا چھوڑ دیں اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب کہ ایک وردی یا یونیفارم پہننے کی پابندی ہو۔

دوسرے لڑکے نے وردی کے حق میں مندرجہ بالا دلائل کو رد کرنے کی پوری کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس نے اپنے دلائل کے حق میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا۔

(۱) بعض کہتے ہیں کہ اتحاد اور نماز دو روحانی دردیاں ہیں۔ اور روحانی وردی کے ساتھ ساتھ ظاہری وردی کا ہونا لازمی ہے

لیکن وردی ایک عام چیز ہے اور اس کا عامۃ الناس کے لیے جس میں ہندو، سکھ، عیسائی وغیرہ سب شامل ہیں۔ لیکن نماز وغیرہ کی وردی محض مسلمان کے لیے ہی مخصوص کی گئی ہے (جس میں تمام عوام شامل نہیں ہیں) نیز روح کے لیے خدا نے انسان کا جسم ہی وردی بنا دیا ہے۔ ایک جیسا چہرہ اور ایک جیسی نوعیت ہے اس کے لیے ظاہری وردی کی ضرورت نہیں ہے (۲) زمانہ اسلاف سے لے کر آج تک یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں میں وردی کا رواج رہا ہے۔ یہ ضرور ہوا کہ ایک مسلمان نے عمر بھر ایک ہی جیسا لباس زیب تن کیا۔ جس طرح حضرت علی المرتضیٰ اور حضرت ابوبکر صدیق رضہ نے پہنا۔ لیکن ان کا لباس بھی رنگ اور نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہوتے رہے۔ وردی کا آغاز محض انگریزوں کے عہد میں ہوا۔ اور اس حد تک کہ بین الاقوامی حیثیت نصیب ہوئی۔ اور ہر ایک قوم نے ان کو دیکھ کر اپنا علیحدہ علیحدہ شعار بنا لیا تاکہ باہمی امتیاز ہو سکے (۳) وردی کا پہننا ہمیں انگریزوں نے سکھایا۔ گویا یہ ان کا حکم ہے۔ اگر ہم ان ہی کے اوامر کی تعمیل کرتے ہیں تو فی الحقیقت ہم ان کے غلام ہی ہیں اور ہم آزاد نہیں اور نہ ہی آزادی کے مستحق ہیں۔ آج جب کہ ہم نے ان کے طرز حکومت کو ناپسند کیا ہے اور ان کی غلامی کو ترک کر کے آزادی حاصل کی ہے تو یہ بھی لازم ہے کہ ہم ان کا حکم دیا ہوا لباس بھی ترک کر دیں، کیوں کہ آزاد قوموں کا لباس ان کا اپنا پسندیدہ لباس ہوتا ہے۔ کیوں کہ گذشتہ زمانہ میں لوگ غلاموں کو ایک خاص قسم کا لباس پہناتے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ غلام ہیں۔ اگر آج ہم انگریزوں کے طرز عمل کو اپنائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں سے ابھی غلامی کا اثر زائل نہیں ہوا، اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ منتخب کر کے لباس پہنتے تھے ہم بھی پہنیں۔ (۴) انسان کی زندگی کی اصلیت معاشرتی زندگی ہے جس میں عام تہذیب و تمدن کا کافی حد تک دخل ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک آدمی اعلیٰ افسر ہے اور وہ دفتر میں اچھا لباس پہن کر جاتا اور آتا ہے۔ لیکن اس کا لباس ایک ہی ہمیشہ نہیں رہے گا۔ بلکہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ سادہ اور عوام کی طرح لباس پہنتا ہے۔ اس طرح اس وردی کا کھیل کے میدان میں اتحاد کے مظاہرہ میں اور مرکزیت کے قائم رکھنے کے سلسلے میں چنداں مفید نہیں۔ کیوں کہ لباس وہی پسندیدہ ہو سکتا ہے جس کی معاشرتی زندگی میں زیادہ قدر ہے۔ اور وردی کا عام تمدن سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے وردی کا ہونا لازمی نہیں۔

ایک اور لڑکے نے وردی کے خلاف ایک مثال پیش کی کہ اگر کسی سکول کا لڑکا چوری کے الزام میں پکڑا جائے تو وہ وردی سے پہچانا جائے گا کہ یہ فلاں سکول کا طالب علم ہے اور وردی پورے سکول کے لیے بے عزتی کا سبب بنے گی۔

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

نوخواندہ لوگوں کے لیے مطبوعاتِ مطالعہ

پاکستان، بھارت، سیلون اور برما میں جمعیتوں کی معاشرتی اور ثقافتی ترقی کے موضوع پر غور و خوض کرنے کے لیے مغربی پاکستان کے شہر مری میں ماہرین تعلیمات کا ایک اجلاس ۱۱ سے ۱۸ جون تک یونیسکو کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ اور نوخواندہ لوگوں کے لیے مطبوعات مطالعہ کا منصوبہ بنانے اور اسے عمل میں لانے کے سلسلے میں بات چیت ہوئی۔

مغربی پاکستان کے گورنر مسٹر مشتاق احمد گورمانی، حکومت پاکستان کے وزیر تعلیم مسٹر محمد عبدالستار، اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل مسٹر ڈیگ ہیمر شیلڈ، یونیسکو کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر لیوتھر ایونز اور حکومت پاکستان کے مشیر تعلیمات اور یونیسکو کی مجلس انتظامیہ کے ایک رکن مسٹر شریف کے خاص پیغامات جلسۂ افتتاحیہ میں پیش ہوئے۔

اجلاس کا مقصد یہ تھا کہ نوخواندہ بالغوں کے لیے ایسی مطبوعات فراہم کی جائیں جو ان کی استعداد کے لائق اور ان کے ذوق کے مناسب ہوں۔ مذکورہ بالا چاروں ملکوں کے ماہرین نے بات چیت اور منصوبہ بندی میں حصہ لیا۔ یونیسکو کی فنی امداد کے وفد کے مشیر اور اقوام متحدہ کے مبصرین بھی شریک ہوئے۔

ایشیا میں نوخواندہ لوگوں کے لیے جو کام ہو چکا ہے یا اب ہو رہا ہے اس پر مبسوط مقالوں میں روشنی ڈالی گئی۔ ایک مقالے میں بتایا گیا کہ برما کی انجمن ترجمہ نے بہت بڑے پیمانے پر یہ کام شروع کر رکھا ہے۔ سیلون نے اس ضمن میں جو تجربات حاصل کیے ہیں ان کا بھی ذکر کیا گیا۔ بھارت کی ریاستوں، شہروں اور دیہاتوں میں جو خدمات اس ضمن میں انجام دی گئی ہیں ان کا ذکر مشتاق احمد کی رپورٹ میں کیا گیا جو دہلی کے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ تحقیقات و تربیت کے ڈائرکٹر ہیں۔ بھارت میں تقریباً ۲۷ سرکاری اور غیر سرکاری ادارے ہیں جو ملک کی متعدد زبانوں میں ایسی مطبوعات تیار کرنے میں مصروف ہیں تاہم نوخواندہ بالغوں کے ذوق و شوق اور مزاج کا اندازہ لگانے کی ابھی تک کوشش نہیں کی گئی ہے اور نہ ان مطبوعات کی جو بھارت میں مختلف اداروں نے تیار کی ہیں۔ صحیح قدر و قیمت کا احساس ہوا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ معمولی سی نوشت و خواند کی منزل گذر جانے کے بعد بھی نوخواندہ لوگوں کی بہت امداد کی ضرورت ہوگی اور انھیں مفید مشورے دیے جائیں گے۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ دیہاتیوں کو ان کے روزمرہ کے مسائل سے متعلق کتابیں دینے کے ساتھ کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ لکھنے پڑھنے میں برابر دلچسپی لیں اور اسی لیے دیہاتوں میں کتب خانوں کے منتظمین کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔

پاکستان کے ماہرین تعلیمات بھی اندازہ لگا چکے ہیں کہ پاکستان میں ناخواندہ لوگوں کے لیے عمدہ مطبوعات کی سخت ضرورت ہے، اور وہ مطبوعات روزی کمانے کے مسائل سے متعلق ہوں۔ یہ نکتہ مسٹر سیموئیل افتخار نے اپنے مقالے میں بیان کیا ہے اور ڈاکٹر امداد حسین نے جو کچھ عرصہ قبل حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم میں مشیر تھے اس پر تبصرہ کیا ہے۔ اس مقالے کا تعلق زیادہ تر ان خدمات سے ہے جو دیہاتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

دیہاتیوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے ان سے کہا گیا کہ تم اپنی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کر سکو گے۔ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو خط لکھ سکو گے۔ مہاجنوں سے دھوکہ نہیں کھا سکو گے اور اپنے مسائل کو بہتر طریقے پر حل کر سکو گے۔ لیکن صرف اتنا ہی کافی نہیں تھا۔ عملی منفعت کے وعدے ان سے ضروری تھے۔ اس لیے حکومت نے دیہاتوں میں تعلیمی کام کو زراعتی اور صنعتی پروگرام کے ساتھ منسلک کر دیا۔

تعلیمی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں اصل دشواری یہ ہے کہ نوخواندہ لوگوں کے لیے مناسب مطبوعات میسر نہیں آتیں۔ یہ نکتہ بھی پاکستانی مقالے میں درج ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جو کتابیں اس وقت موجود ہیں ان میں پیشہ ورانہ استعداد کو بڑھانے اور اس طرح ان کی آمدنی میں اضافہ کرنے کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ بہتر ہے کہ کتابیں مرتب کرنے والے عملی قدم اٹھانے سے پہلے خود ان لوگوں کی ضرورتیں معلوم کر لیا کریں۔ کیونکہ اگر کوئی تحریر مذہبی عقاید یا اقتصادی معاشرتی اور ثقافتی رجحانات کے خلاف ہو تو بے حد مفید ہونے کے باوجود ان کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

کانفرنس میں بتایا گیا کہ خود یونیسکو اس تعلیمی مہم میں کیا خدمات انجام دے رہا ہے۔

تعلیم کے مالیاتی پہلو

سرکاری افسر جب بھی تعلیم کی ترقی و توسیع کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں، اس کا مالیاتی پہلو ان کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن ہوتا ہے۔ آج کل دنیا کے تقریباً ہر خطے میں یہ مسئلہ درپیش ہے۔ خصوصاً ان ملکوں کی حکومتیں جہاں ابتدائی لازمی تعلیم کا نظام ابھی رائج نہیں ہوا ہے۔ اس کے نفاذ سے قبل سوچتی ہیں کہ کافی تعداد میں مدرسوں کی تعمیر کے اخراجات اور استادوں کی تنخواہیں کن ذرائع سے ادا کی جائیں اور جن ملکوں میں ابتدائی تعلیم رائج ہو چکی ہے۔

وہاں خاص طور پر ثانوی تعلیم شروع کرنے اور ابتدائی تعلیم کو ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کرانے کا سوال قابلِ غور بن جاتا ہے کیوں کہ طلبہ کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

اس طرح ان سفارشات کو جو عوامی تعلیم سے متعلق اٹھارھویں بین الاقوامی کانفرنس میں اتفاق رائے سے منظور ہوئی تھیں، عملی جامہ پہنانا غیر ممکن نظر آتا ہے۔ یہ کانفرنس یونیسکو اور بین الاقوامی ادارۂ تعلیمات کے مشترکہ اہتمام سے جنیوا میں منعقد ہوئی تھی جس میں ۷۵ ملکوں کی وزارت ہائے تعلیمات کے نمائندے شریک ہوئے تھے وہ حسبِ ذیل اصولوں پر متفق تھے۔

(۱) یہ امر مسلمہ ہے کہ تعلیم کے اخراجات ہر منزل میں بڑھ رہے ہیں کیوں کہ ایک طرف طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف مدرسوں کی تعمیر اور ان کے لیے سامان کی فراہمی، استادوں کی تنخواہوں اور اسی قسم کی دوسری کارگزاریوں پر بے پناہ روپیہ صرف ہو رہا ہے۔

(۲) بیشتر ملکوں میں تعلیم کے سرکاری میزانیہ میں اضافہ کا سبب تو نیز لرزندہ ہے۔

(۳) تجربے سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ اگر تعلیمی نظام عمدہ ترقی یافتہ ہو تو اس سے اقتصادی اور معاشرتی ترقی پر اچھا اثر ہوتا ہے اور اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ تعلیم کی مد میں زیادہ سرمایہ لگانا اقتصادی اعتبار سے بہت مفید ہے۔

(۴) چوں کہ امن ایک بڑی دولت ہے اور جنگ ہر لحاظ سے تباہی کا باعث بنتی ہے اور اس پر خرچ کرنے سے کوئی حقیقی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رقم کا جو آج کل اسلحہ سازی اور لام بندی پر خرچ ہو رہی ہے، کچھ حصہ تعلیمی امور کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔

ترجیحی نوعیت

یہی چار اصول کانفرنس کے جملہ فیصلوں کی بنیاد ہیں۔ اول یہ کہ تعلیم کا ہر حال میں خیال رکھا جائے۔ اور سرکاری ارباب حل و عقد اس ضمن میں روپیہ خرچ کرنے سے دریغ نہ کریں، دوسرے یہ کہ نئے کاموں کے منصوبوں کو ترقی دینے کی خاطر تعلیم کے اخراجات میں کمی نہ کی جائے۔

ضرورت ہے کہ ہر ملک میں ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا جائے جس میں ارباب تعلیم کے ساتھ ساتھ مالیاتی افسران شامل ہوں اور وہ اصحاب بھی شریک کیے جائیں جنھیں تعلیم سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ یہ کمیشن تعلیمی نظام میں

مناسب تبدیلیاں کرنے کے بعد اس پہلو پر غور کرے کہ کس قسم کی تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے اور اس کے لیے مزید مالی تعاون کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔

کانفرنس عالمگیر بنیاد پر قائم ہوئی تھی، لہٰذا وہ تعلیم کے لیے سرمایہ حاصل کرنے کے کسی ایک طریقہ کار کے حق میں فیصلہ نہیں کر سکتی بلکہ یہ رائے قائم کی کہ ہر ملک اپنے قومی نظم و نسق کے مطابق اس کا انتظام کرے اور اس مقصد کے لیے اپنے خاص جغرافیائی، تاریخی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کا لحاظ رکھے۔ تاہم کانفرنس میں یہ فیصلہ ضرور کیا گیا کہ دو عملی کو ختم کر کے آسانیاں پیدا کی جائیں اور حسب ضرورت تعلیم کی ذمہ داریاں مرکزی اور صوبائی علاقہ جاتی حکومتوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اور ہر علاقے میں رہنے والوں کے معیار زندگی کا لحاظ رکھتے ہوئے تعلیمی بجٹ کی رقم معین کی جائے۔ کسی علاقے کا مالیاتی نظام خواہ کچھ بھی ہو، [illegible] ترتیب سامنے نہ پائے۔

مساوات کا لحاظ

کانفرنس میں شریک ہونے والے اراکین نے ہر ملک کے ارباب تعلیمات کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ ثانوی تعلیم میں بھی مساوی حقوق حاصل کرنے کی تحریک زور پکڑ گئی ہے اور اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ ثانوی مدارس میں طلبہ کی تعداد بہت جلد اتنی ہو جائے گی جتنی کہ ابتدائی مدرسوں میں ہوا کرتی تھی۔ یہ تغیر ہر ملک میں اس کے حالات کے مطابق مختلف اوقات میں رونما ہوگا۔

پیشہ ورانہ تعلیم کے نظام میں سرمایہ لگانے کا سوال بھی غور طلب ہے جبکہ اس سلسلے میں آلات کی قیمت بہت گراں ہوتی ہے اور سرکاری میزانیہ پر اس کا زیادہ اثر پڑ سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کی تعلیم کے نظام پر مناسب نگاہ رکھی جائے اور مرکزی اور صوبائی ارباب تعلیم باہمی تعاون سے اس مسئلہ کو حل کریں۔

بین الاقوامی ادارۂ تعلیم نے تعلیم کے مالیاتی پہلوؤں کے موضوع پر ۴۵ ملکوں میں جو تحقیقات کرائی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تنخواہیں، مدرسے کی عمارتیں اور آلات و سامان اخراجات کی سب سے بڑی مدیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ضروری ہے کہ اساتذہ کے حالات زندگی کو حسب حیثیت بہتر بنانے کا انتظام کیا جائے اور چونکہ تعلیم کی ہر منزل میں اساتذہ کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے۔ اس لیے تنخواہوں کی مد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جنیوا میں۔ جمع ہو کر اس پہلو پر غور کرنے والے ماہرین نے اس امر پر زور دیا ہے کہ اگر استادوں کی بڑھتی

حاد سے تنخواہوں میں اضافے کے مسئلے پر فوراً غور نہ کیا جائے تو تعلیم کا اصل مرحلہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ اسی طرح طلبہ کی تعداد میں اضافے کے باعث مدارس کی عمارتوں میں گنجائش کی جو قلت محسوس ہو رہی ہے اگر اس کا فوراً تدارک نہ کیا گیا تب بھی تعلیم کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ چناں چہ کانفرنس نے سفارش کی ہے کہ مدرسوں کے عمارتی پروگراموں کو عمل میں لانے کے لیے حکومتوں سے کہا جائے کہ وہ روپیہ قرض دیں اور نجی ذرائع سے بھی مالی امداد حاصل کرنے کے لیے عوام سے استدعا کی جائے۔

روپے کا حصول

بعض ملکوں میں تعلیمی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے عام ذرائع کے علاوہ جائدادوں پر یا سگریٹوں اور شرابوں کی فروخت پر خاص قسم کے ٹیکس لگا کر بھی کچھ رقمیں جمع کی جاتی ہیں۔ ہر ملک کے حالات کے مطابق اس طرح روپیہ حصول کرنے کے ذرائع مختلف ہو سکتے ہیں۔ تاہم اس لحاظ سے مسئلہ پر غور کرنا ضروری ہے۔

عالمگیر تعاون

کانفرنس میں اس پہلو پر اظہار اطمینان کیا گیا کہ تعلیمی امور کو صرف قومی دائرے میں محدود رکھنے کا طریقہ اب ایک قصۂ پارینہ بن چکا ہے اور بہت سے بین الاقوامی ادارے وظیفوں یا ماہرین کی خدمات کی صورت میں تعاون کر کے اسے بین الاقوامی حیثیت دے رہے ہیں۔ اس لحاظ سے اقوام متحدہ کا فنی امداد کا پروگرام سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اگر تعلیم کے لیے کوئی اور بین الاقوامی فنڈ بھی قائم کیا جائے تو اس کے نتائج بہت ہی دور رس ثابت ہو سکتے ہیں۔

یونیسکو نے تعلیم کے بین الاقوامی تعاون کے لیے جو پروگرام بنائے ہیں، ان میں طلبہ کو وظائف دینے کے علاوہ آلات و سامان کی فراہمی شامل ہے۔ اور مدرسوں کی تعمیر کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔

اخبارات، ریڈیو اور فلموں کی ترقی

دنیا بھر میں روزانہ اخبارات کی ۲۰ کروڑ ۵۰ لاکھ کاپیاں ۔ ۲۵ کروڑ ۷۰ لاکھ ریڈیو سیٹ اور ۴ کروڑ ۴۰ لاکھ ٹیلی وژن سیٹ کرۂ ارض کے بسنے والوں تک خبریں پہنچاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک لاکھ ۲۰ ہزار سینما گھر دنیا کے مختلف حصوں میں انسان کی تفریح کے ایک عمدہ ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

یہ تمام معلومات یونیسکو کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی ایک کتاب "ورلڈ کمیونیکیشنز" نامی کتاب میں درج ہیں اس میں اخبارات۔ ریڈیو۔ ٹیلی وژن اور فلموں کے متعلق معلومات کا ایک بیش قیمت ذخیرہ موجود ہے۔ گذشتہ پانچ سال میں جو ترقی ہوئی ہے اس پر بھی اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے دیباچے میں یونیسکو نے لکھا ہے کہ سب سے زیادہ توجہ دنیا کے ان علاقوں کے حالات پر دی گئی ہے جہاں مواصلاتی سہولتوں کی کمی لوگوں کو اتنا موقع ہی نہیں دیتی کہ وہ حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہیں۔ آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ حالیہ فیصلوں کے مطابق ان ملکوں کو، جو اپنے ہاں خبروں کی اشاعت کے ذرائع کو وسیع کرنا چاہتے ہیں اقوامِ متحدہ اور اس کے مخصوص اداروں سے فنی امداد مل رہی ہے۔

کتاب کے چار حصے ہیں (۱) مواصلات کی قسمیں (۲) تصویری خاکے (۳) ملک ملک میں مواصلات کی سہولتیں اور (۴) ضمیمہ جات۔ تیسرے حصے میں ایک باب پاکستان کے لیے مخصوص ہے جس کا متن حسبِ ذیل ہے:-

اخبارات اس ملک کے بیشتر باشندے دیہاتوں میں آباد ہیں اور تعلیم کو زیادہ فروغ نہیں ہوا ہے۔ اس لیے روزانہ اخبارات کی اشاعت کا دائرہ محدود ہے، تقریباً ۱۷۰ روزانہ اخبار چھپتے ہیں۔ جن کی اشاعت صرف ایک لاکھ ۷۵ ہزار ہے۔ تاہم پڑھنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک ہی اخبار کو متعدد لوگ پڑھتے ہیں اور بڑے قصبوں میں بھی ایک یا دو اخبار ہی خریدے جاتے ہیں۔ کراچی اور لاہور اشاعت کے بڑے مرکز ہیں۔ دیہاتی علاقوں میں شاذ و نادر ہی کوئی اخبار پہنچتا ہے۔ پاکستان کے سب سے کثیر الاشاعت روزانہ اخبار کی ۳۰ ہزار کاپیاں چھپتی ہیں۔ بڑی زبانیں انگریزی اور اردو ہیں۔ حالاں کہ بعض اخبارات سندھی، گجراتی، بنگالی اور پشتو میں بھی چھپتے ہیں عام طور پر اخبار کی ضخامت ۸ صفحات ہوتی ہے، اخباری کاغذ زیادہ تر درآمد کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ مشرقی پاکستان میں کاغذ کا ایک کارخانہ قائم ہو چکا ہے۔

ہفتہ وار اور دوسرے رسالوں کی اشاعت ۱۷ ہزار ہے۔ ہفتہ وار پرچوں کی تعداد ڈھائی سو ہے اور ان کی مجموعی اشاعت تقریباً ایک لاکھ ۵۰ ہزار ہے، تقریباً ۷۰ اور رسالے شائع ہوتے ہیں۔

پاکستان میں تین اپنے خبر رساں ادارے ہیں، سب سے بڑا ادارہ ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان ہے (اے۔ پی۔ پی) جس کا صدر دفتر کراچی میں ہے اور ۹ شاخیں مغربی اور مشرقی پاکستان میں پھیلی ہوئی ہیں۔

قریباً ۵ روزانہ اخبارات کو ٹیلی پرنٹروں کے ذریعہ ملکی اور غیر ملکی خبریں فراہم کرتا ہے۔ روزانہ خبروں کی مقدار تقریباً ۴ ہزار الفاظ کے برابر ہوتی ہے۔ خبروں کا تبادلہ کرنے کے سلسلے میں اے۔ پ۔ پ کا رائٹر، اے۔ پی اور انڈونیشیا کی ایک خبررساں ایجنسی "انانا" سے معاہدہ ہے۔

دوسرا خبررساں ادارہ یونائیٹڈ پریس آف پاکستان (ی۔ پ۔ پ) ہے اس نے ۱۹۴۹ء میں کام شروع کیا تھا کراچی کے علاوہ لاہور اور ڈھاکہ میں بھی اس کے دفاتر قائم ہیں۔ یہ بھی ملکی اور غیر ملکی خبریں جن کی مقدار تقریباً ۶ ہزار الفاظ کے برابر ہوتی ہے۔ انگریزی اور اردو زبان میں فراہم کرتا ہے۔ ۲۴ اخبارات اس کو چندہ دیتے ہیں۔ خبروں کا تبادلہ کرنے کے سلسلے میں یونائیٹڈ پریس آف انڈیا سے اس کا معاہدہ ہے۔

تیسرا نسبتاً چھوٹا ادارہ "اسٹار" ہے۔ اس کا صدر دفتر کراچی میں ہے۔ وہ ملک کے چھوٹے چھوٹے اخبارات کو انگریزی اور اردو میں ایسی ملکی اور غیر ملکی خبریں بھیجتا ہے جو دنیائے اسلام کے لیے مفید ہوں۔

اے۔ ایف۔ پی، رائٹر اور یو۔ پی کے دفاتر بھی کراچی میں قائم ہیں۔ قومی اداروں نے اپنے باقاعدہ نامہ نگار مقرر کیے ہیں۔

ریڈیو سرکاری اجارہ داری میں ریڈیو پاکستان نے ۳۱ ٹرانسمیٹر قائم کر رکھے ہیں۔ ان میں سے ۶ شارٹ ویو کے ہیں ان کی مجموعی طاقت ۷۰۰ کلو واٹ ہے۔ ریڈیو پاکستان کا صدر مقام کراچی اور طبقاتی مرکز پشاور، لاہور، راولپنڈی اور ڈھاکہ میں قائم ہیں۔ اس کے اخراجات سرکاری خزانے سے ادا ہوتے ہیں۔ لائسنس فیس اور سرکاری عطیے پر اس کے بجٹ کا انحصار ہے۔ اشتہارات نشر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اس وقت ریڈیو پاکستان ۱۷ زبانوں میں تقریباً ۹ گھنٹے کا پروگرام روزانہ نشر کرتا ہے ۱۹۴۷ء میں اس کا آغاز ہوا، تو زبانوں میں صرف ۶ گھنٹے روزانہ کا پروگرام نشر ہوتا تھا۔ خبروں کے لیے اس کا ایک مرکزی نظام ہے۔ جو انگریزی اردو۔ بنگالی، پشتو۔ بلوچی اور کشمیری زبانوں میں خبرنامے نشر کرتا ہے۔ بعض طبقاتی مرکزوں سے۔ سندھی۔ پنجابی اور پوٹھوہاری میں بھی خبریں نشر ہونے لگی ہیں۔

تیز قوت والے شارٹ ویو ٹرانسمیٹروں سے۔ عربی۔ افغانی۔ فارسی۔ برمی۔ گجراتی اور انگریزی میں ۵ گھنٹے روزانہ پاکستان کی آواز دوسرے ملکوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ برطانیہ۔ ترکی۔ انڈونیشیا۔ جنوبی اور جنوب مشرقی

ایشیا میں سننے والوں کے لیے مختصر پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

کراچی سے سکول پروگرام چار بار اور لاہور اور ڈھاکہ سے دو دو بار نشر ہوتے ہیں۔ بہت سے مدرسوں میں ریڈیو سیٹ موجود ہیں۔

۱۹۵۴ء سے ریڈیو پاکستان نے ثقافتی۔ اقتصادی۔ مذہبی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر تقریروں اور مذاکروں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ عورتوں، بچوں اور فوجیوں کے لیے بھی خاص پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیہاتی اور قبائلی علاقوں میں سننے والوں کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ پاکستان میں استعمال ہونے والے ریڈیو سیٹوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے۔

فلم | پاکستانی کمپنیوں نے ۱۹۵۴ء میں ۷ بڑے اور ایک سو چھوٹے فلم بنائے۔ ان کے خاص سٹوڈیو اور ڈھاکہ لاہور میں ہیں۔ خبروں کے ریل اور دستاویزی فلم سرکاری محکمے کے ذریعہ تیار ہوتے ہیں۔ ملک میں ۲۸۴ سینما گھر ہیں جن میں ایک لاکھ ۴۰ ہزار نشستوں کا انتظام ہے ۱۹۵۴ء میں تقریباً ۲ کروڑ افراد نے فلم دیکھے۔

غیر ملکی ضمن میں ۶۰ فی صد فلم بھارت سے، ۳۰ فی صد ریاستہائے متحدہ سے اور ۱۰ فی صد برطانیہ سے آتے ہیں۔ خبروں کے برطانوی اور امریکی ریل بھی دکھائے جاتے ہیں۔ تعلیمی فلموں کی نمائش خصوصیت کے ساتھ مغربی پنجاب میں ہوتی ہے۔

مبتدیوں کے لیے کتابیں

یونیسکو نے حال ہی میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے جنہوں نے ابھی لکھنا پڑھنا سیکھا ہے لیکن آسانی سے کتابیں نہیں پڑھ سکتے کیا کام کیا جا رہا ہے۔

چار سال ہوئے یونیسکو نے بھارت کی حکومت کے ساتھ مل کر ایک منصوبہ شروع کیا تھا اس کے ماتحت دہلی پبلک لائبریری میں ساٹھ ہزار کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ کتابیں انگریزی، اردو، ہندی زبانوں میں ہیں اور ہر مہینے ستر ہزار مبتدی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی قسم کا ایک اور منصوبہ ۱۹۵۴ء میں کولمبیا میں جاری کیا گیا تھا۔ وہاں ہر مہینے تیس ہزار نوآموز انہیں پڑھتے ہیں۔ رپورٹ میں لکھا ہے کہ اب تک تعلیم کے سلسلے میں بہت سے تجربے اس لیے ناکام ثابت ہوتے ہیں کہ مبتدیوں کے لیے مناسب کتابیں موجود نہیں تھیں کہ جن کی مدد سے یہ آسانی سے پڑھنا سیکھ سکیں۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

اموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ہی تعلیمی رسالے ہیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ہیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاہوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ہیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ میں چھپتے ہیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاہئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ہونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر
پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش
۲ کچہری روڈ - لاہور (پاکستان)

آموزش

شمارہ ۸] لاہور [نومبر ٦

اس شمارہ میں

مدیر: پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین: عبدالغفور چوہدری
فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

12 DEC 1956

آموزش

لاہور

نومبر ۱۹۵۶ء

جلد ——— ۹

شمارہ ——— ۸

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس ۱۰ آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی۔ لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

ایک حقیقت پسندانہ منصوبہ

ایم۔ اے۔ مخدومی

پاکستان کے وجود میں آنے کے جلد بعد ۱۹۴۷ء میں جو تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس نے طے کیا تھا کہ ملک بھر میں پانچ سالہ مفت اور لازمی ابتدائی تعلیم رائج کردی جائے اور بعد ازاں اس کی میعاد آٹھ سال تک کردی جائے۔ کانفرنس کا فیصلہ اس احساس پر مبنی تھا کہ تمام شہریوں کو تعلیم دیے بغیر انھیں جمہوری اور شہری ذمہ داریوں کے لیے تیار نہیں کیا جاسکتا۔

اس وقت سے لے کر اب تک ہم اس تعلیمی نصب العین کے حصول میں کوشاں رہے ہیں مختلف صوبائی حکومتوں نے اس کے لیے مختلف منصوبے وضع کیے۔ یہ کوششیں خاصی حد تک کامیاب بھی ہوئیں۔ ملک کے ابتدائی مدرسے ۳۸,۱۲۲ سے بڑھ کر ۴۱,۷۵۱ تک جا پہنچے۔ ان میں پڑھنے والے بچوں کی تعداد ۶۴۳۰۰۰ کی بجائے ۹۶۲۰۰۰ ہوگئی۔ ملک کے بیشتر حصوں میں ابتدائی تعلیم کا نصاب چار کی بجائے پانچ سال کا کردیا گیا۔ ابتدائی تعلیم پر پہلے کوئی تین کروڑ روپے سالانہ خرچ ہوتے تھے اب پونے ۶ کروڑ روپے خرچ ہونے لگے۔ یہ سب کچھ ہوا، مگر اس کے باوجود ہم اب تک ۱۹۴۷ء کے طے کردہ مقصد سے جس قدر دور ہیں اس کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہوگا :۔

منصوبہ بندی بورڈ کے جمع کردہ اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۵۳-۵۴ء میں چھ اور گیارہ سال کی درمیانی عمر کے آدھے بچے مدرسوں میں پڑھ رہے تھے۔ جو بچے پہلی جماعت میں داخل ہوتے ہیں ملک کے ترقی یافتہ حصوں میں بھی ان میں سے دو تہائی بچے پانچویں جماعت پاس کرتے ہیں۔ ملک کے بعض حصے ایسے بھی ہیں جہاں پہلی جماعت میں داخل ہونے والے بچوں کا صرف کوئی چھٹا ساتواں حصہ پانچویں جماعت تک پہنچتا ہے۔ ابتدائی مدرسوں میں پڑھانے والے استادوں میں سے ساٹھ فی صد تربیت یافتہ ہیں، باقی چالیس فی صد غیر تربیت یافتہ۔ موجودہ مدارس کو تمام تر تربیت یافتہ استاد مہیا کرنے کے لیے چالیس ہزار نئے تربیت یافتہ استاد چاہئیں۔ اگر لازمی ابتدائی تعلیم کے منصوبے کو

کمل کرنا مقصود ہو اور تمام بچوں کو پڑھانے کے لیے مزید ابتدائی مدرسے کھولے جائیں تو ایک لاکھ بیس ہزار تربیت یافتہ استاد درکار ہوں گے۔ اس مطلب کے لیے ملک میں بیس ہزار نئے ابتدائی مدرسے جاری کرنا ہوں گے مالی لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابتدائی تعلیم پر چھ کروڑ کی بجائے کوئی اٹھارہ کروڑ روپے سالانہ خرچ ہونے لگیں گے۔

حکومت ان اعداد و شمار پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔ قومی معیشت میں ابھی اتنی وسعت نہیں کہ تعلیم پر اخراجات کو اتنی تیزی سے بڑھایا جا سکے۔ بے شک تعلیم پر خرچ کی گئی ہر پائی انجام کار سودمند ثابت ہوا کرتی ہے۔ لیکن قومی زندگی کی دوسری ضرورتیں بھی اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ یہ مشکل حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ تعلیمی مسائل کے حل رسمی راہوں سے ہٹ کر تلاش کیے جائیں۔

یہ امر مسرت کا موجب ہے کہ مغربی پاکستان کی حکومت تعلیم کو عام کرنے کے مسئلہ پر خاص توجہ دے رہی ہے اور اس کے حقیقت پسندانہ حل کی متلاشی ہے۔ حال ہی میں وزارتِ تعلیم کے ایک ترجمان نے صوبائی اسمبلی میں اس امر کا انکشاف کیا تھا کہ تعلیم کی کمی کے پیش نظر حکومت یہ چاہتی ہے کہ کوئی ایسا طریق کار اختیار کرے جس کے نتیجہ میں سرمایہ کی قلت کے باوجود خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکیں چناں چہ حکومت کا ارادہ ہے کہ بہاولپور کے تنظیم مکاتب کے منصوبے کو مناسب رد و بدل کے بعد اپنا لیا جائے اور پنچائتوں کے ذریعہ صوبے بھر کی دیہی مساجد میں ابتدائی مدرسے کھول دیے جائیں۔ اس منصوبے کے ماتحت مساجد کے اماموں کو تربیت دے کر تدریس کے کام پر لگایا جائے گا۔ حکومت لوگوں سے اپیل کرے گی کہ وہ اس منصوبے کو کامیاب بنانے میں مدد دیں اور اپنی بستی کے ابتدائی مدرسے کے جزوی یا پورے اخراجات اپنے ذمہ لیں۔

ہم اس حقیقت پسندانہ تعلیمی منصوبے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس سے نہ صرف مسجد دوبارہ اپنے تاریخی فرائض کو سنبھال لے گی بلکہ ہماری تعلیم کا ایک ایسا مشکل مسئلہ بھی حل ہو جائے گا جس کا دوسرا کوئی حل اب تک ڈھونڈا نہیں جا سکا۔

[ق]ومی زبان اور نصاب تعلیم

[ا]فضل احمد

ہمارے تعلیمی حلقوں میں آج کل یہ مسئلہ کثرت سے زیر بحث ہے کہ اردو کو نصاب تعلیم میں کیا مقام حاصل ہو۔
[ا]س وقت مغربی پاکستان کے اکثر حصوں میں اردو آٹھویں جماعت تک ایک لازمی مضمون ہے اور ذریعہ تعلیم بھی۔
[ا]ونچی جماعتوں میں جا کر یہ ایک اختیاری مضمون بن جاتا ہے۔ مگر وہاں بھی ذریعہ تعلیم بدستور اردو ہی کو رکھا جاتا ہے۔
[ز]یادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ہائی جماعتوں کے کئی ایک مضامین مثلاً ریاضی، سائنس وغیرہ انگریزی میں پڑھائے جایا کرتے تھے
[پاک]ستان بننے کے تھوڑا عرصہ بعد یہ مضامین بھی اردو میں پڑھائے جانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ اب انہیں پھر سے
[ا]نگریزی میں پڑھایا جانے لگے گا۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جو طلبہ مدرسے میں سائنس اور ریاضی اردو میں
[پڑھ]کر کالج میں داخل ہوتے ہیں وہ اعلیٰ سائنس اور ریاضی کی تعلیم میں بڑی دقت محسوس کرتے ہیں وہ انگریزی
[اصط]لاحات سے نابلد ہوتے ہیں اس لیے پروفیسروں کے لیکچروں سے دیر تک فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

مغربی پاکستان کے جن حصوں میں اردو آٹھویں جماعت تک ایک لازمی مضمون ہے وہاں بھی ایسے
[مد]رسے موجود ہیں جو عموماً انگریزی مدارس کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ان مدرسوں میں انگریزی پہلی جماعت
سے پڑھائی جاتی ہے۔ قومی زبان کو ان مدرسوں کے نصاب میں کوئی جگہ حاصل نہیں۔ ان مدرسوں میں عموماً اونچے
[طب]قے کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ ان کے فارغ التحصیل طلبہ اردو کے بارے میں تقریباً کورے کے کورے رہتے ہیں۔

مغربی پاکستان کا ایک کافی بڑا حصہ ایسا بھی ہے جس کے مدرسوں میں اردو کا مطلق گذر نہیں۔ سابق صوبہ سندھ
[ک]ے پرائمری مدرسوں میں سندھی کے سوا دوسری کوئی زبان پڑھائی نہیں جاتی۔ ثانوی مدرسوں میں بھی کہیں کہیں اردو
[ا]یک اختیاری مضمون کے طور پر نظر آجاتی ہے ورنہ عام طور پر وہ اس جگہ بھی غائب ہے۔

قومی زبان اردو کے مقابلے میں غیر ملکی زبان انگریزی کو واضح تفوق حاصل ہے۔ جن مدرسوں میں ابتدائی
[د]رجے سے ہی اردو کو دخل حاصل نہیں وہاں تو انگریزی کی اجارہ داری قدرتی ہے۔ لیکن جن مدرسوں میں آٹھویں جماعت

تک اردو لازمی ہے وہاں بھی فی الحقیقت چھٹی جماعت سے انگریزی ہی کی حکمرانی شروع ہو جاتی ہے۔ اور آٹھویں جماعت کے بعد اردو کا رہا سہا بھرم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ انگریزی زبان پر اس تمام زور کے باوجود طلبہ کی اکثریت کو کالج کے درجہ تک بھی اس غیر ملکی زبان پر کوئی تسلی بخش قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ ہاں اس سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ ملکی زبان پر بھی قدرت حاصل کرنے سے رہ جاتے ہیں۔ اس کا ایک بے حد افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ پڑھے لکھے نوجوانوں کی غالب اکثریت اس قابل نہیں رہتی کہ انگریزی یا اردو دونوں میں سے کسی ایک زبان میں بھی لکھ یا بول کر اپنے خیالات کو مؤثر طور پر ظاہر کر سکے۔

زبان اور قوت فکر

تعلیم کی سب سے بڑی غایت قوت فکر کو ترقی دینا ہے حقیقی طور پر پڑھا لکھا آدمی وہ ہے جو اپنے طور پر سوچ سکے۔ صرف ایسا آدمی ہی اپنے مسائل کے حل خود تلاش کر سکتا ہے لیکن قوت فکر کی ترقی کے لیے پہلی شرط زبان پر قدرت ہے نفسیاتی طور پر یہ بات ثابت شدہ ہے کہ خیالات اور الفاظ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ الفاظ کے بغیر خیالات کا تصوّر ہی محال ہے۔ الفاظ نہ صرف خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں بلکہ یہ ان کو ایک واضح شکل بھی عطا کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے قوت بیان کو خدا کی ایک بہت بڑی نعمت قرار دیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ کے جو انعامات بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک مؤثر قوت بیان بھی ہے۔

تعلیمی اور نفسیاتی لحاظ سے زبان کو ایک آلے کی حیثیت حاصل ہے اور بس۔ ہم کسی زبان میں اس لیے مہارت حاصل کرتے ہیں کہ اپنے خیالات کو اس میں خوبی کے ساتھ ادا کر سکیں۔ زبان بذات خود مطلوب نہیں بلکہ ایک ذریعہ اور واسطہ ہے۔ اصل چیز خیالات اور ان کا اظہار ہے۔ ہم خواہ کوئی بھی زبان سیکھیں، وہ مادری زبان ہو یا غیر ملکی زبان۔ اسے قومی زبان کا نام دیا جائے یا کوئی دوسرا نام، غرض زبان کے نام سے نہیں بلکہ اس کے کام سے ہے۔ ہر زبان جو سیکھی جائے اسے مؤثر ذریعہ بیان اور وسیلۂ اظہار بننا چاہیے۔ اگر وہ یہ خدمت انجام نہیں دیتی تو اس کے سیکھنے پر جو وقت اور محنت بھی صرف ہو، اسے کم و بیش اکارت سمجھنا چاہیے۔ وجہ یہ کہ جو زبان مؤثر ذریعہ اظہار نہیں بن سکتی وہ قوت فکر کو ترقی نہیں دے سکتی۔ ہاں اگر کوئی شخص بیک وقت دو زبانیں جانتا ہے جن میں سے ایک پر اسے پوری قدرت حاصل ہے تو ایسی صورت میں اس کی فکری ترقی کا راستہ نہ رکے گا۔ اس کے خیالات کی نشوونما

اس زبان کے ذریعہ ہوتی رہے گی جس پر اسے قدرت ہے۔ دوسری زبان اس کی محدود اور مخصوص ضرورتیں پوری کر سکتی ہے

قوت بیان اور شخصیت

یہ بات نفسیاتی طور پر ثابت شدہ ہے کہ موثر قوت بیان سے شخصیت کو بہت سہارا ملتا ہے۔ راقم کو اس نفسیاتی حقیقت کا شدید احساس پہلی بار اس وقت ہوا، جب اسے پیرس میں ایسے ماحول سے سابقہ پڑا جس میں انگریزی سمجھنے اور بولنے والا شخص کہیں خال خال ملتا تھا اور ہر جگہ ایک ایسی زبان کی حکمرانی تھی جس سے وہ قطعاً نابلد تھا۔ قوت اظہار سے معذوری خواہ وہ مکمل ہو یا جزوی۔ انسانی شخصیت کو بڑا دھکا لگاتی ہے

انسانی شخصیت کا معراج اس کی تخلیقی قوتوں کا بروئے کار آنا ہے۔ ہماری بہت سی تخلیقی قوتیں منظر عام پر آنے کے لیے قوت اظہار ہی کی رہین منت رہتی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے کوئی شخص اس قابل نہیں ہو سکا کہ وہ کسی ایک زبان پر پوری قدرت حاصل کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی بہت سی تخلیقی قوتوں کا راستہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند رہے گا اس سے ایک ایسا تلخ احساس نامرادی پیدا ہوگا جو اس کی شخصیت کو گہنائے رکھے گا۔ اس کے خداداد جوہروں کی آب وتاب کبھی پوری طرح ظاہر نہ ہو سکے گی۔

اس نفسیاتی حقیقت کی روشنی میں جب ہم اپنے حالات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو سخت دکھ ہوتا ہے۔ ہمارے جن مدرسوں میں قومی زبان پہلی جماعت سے پڑھائی جاتی ہے وہاں بھی پانچویں جماعت کے بعد یہ مرکز توجہ نہیں رہتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر نوجوان اعلیٰ تعلیم کی ساری منزلیں ختم کر لینے کے بعد بھی اس قابل نہیں ہو پاتے کہ قومی زبان میں بلاتکلف چند جملے ہی ادا کر سکیں۔ چہ جائیکہ اسے کسی تخلیقی قوت کے اظہار کا ذریعہ بنائیں۔ انگریزی کو اپنا کر وہ کسی محدود علمی میدان مثلاً طب۔ یا انجینئرنگ۔ یا سائنس وغیرہ میں مہارت ضرور پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ مہارت بذات خود ایک ازحد پسندیدہ شے ہے۔ لیکن محض اسی کے حصول سے متوازن شخصیت کی ترقی کا سامان پیدا نہیں ہو جاتا۔ فنی اور پیشہ ورانہ کمال کے ساتھ ساتھ عام شخصیت کی پائدار اور وسیع نشوونما کا سامان بھی ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر انسانی زندگی میں ہمہ جہتی حسن پیدا نہیں ہو سکتا۔ افسوس ہے کہ ہم قومی زبان کو بالکل ابتدائی درجے پر ہی کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ کر عام شخصیت کی صحت مند ترقی کے امکانات بڑی حد تک ختم کر دیتے ہیں۔

تاہم جو لوگ کسی فنی میدان میں خصوصی مہارت پیدا کر لیں۔ یہ کمال بذات خود ان کی شخصیت کے لیے ایک سہارا

ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر ہمارے نوجوانوں کی بہت بھاری اکثریت اعلیٰ تعلیم سے خصوصی فنی مہارت کی بجائے عام وسیع المشرب تعلیم حاصل کرتی ہے۔ ہمارے اکثر نوجوان کالجوں اور یونیورسٹیوں سے ڈاکٹر، انجینئر یا فنی ماہرین بن کر نہیں بلکہ آرٹس کے گریجوایٹ بن کر نکلتے ہیں۔ ان کے پاس طب، انجینئرنگ یا اس قسم کی کوئی مخصوص فنی مہارت موجود نہیں ہوتی اور نہ ہی بالعموم انہیں کسی زبان پر ایسی قدرت ہوتی ہے جس کے طفیل ان کی تخلیقی قوتیں ذریعۂ اظہار حاصل کر سکیں۔ انگریزی زبان پر اتنی قدرت حاصل کرنا خارج از بحث ہے۔ اردو کو کبھی اس قابل سمجھا ہی نہیں گیا تھا کہ اس پر مؤثر قدرت حاصل کی جائے۔ نتیجہ ایک غیر مؤثر شخصیت کی شکل میں نکلتا ہے۔ ایک ایسی شخصیت جو اپنی انفرادیت سے بڑی حد تک بے خبر رہتی ہے۔

ایک افسوس ناک غلط فہمی

انگریزی زبان بے شک ایک ترقی یافتہ جدید زبان ہے۔ اس کے دامن کی وسعت کا یہ حال ہے کہ جدید علمی اور سائنسی فکر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اس کی لپیٹ میں نہ آ جائے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی برق رفتار ترقی کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے یہ زبان مفید ترین ذریعہ ہے۔ اس کی عالمگیر وسعت بھی ناقابل انکار ہے۔ لیکن ان تمام باتوں سے قومی زبان کی عدم اہمیت کسی طرح ثابت نہیں ہوتی۔ مادری زبان اور غیر زبان کے متعلق اب تک جو مطالعے بھی کیے گئے ہیں ان سے یہی ثابت ہوا ہے کہ قومی زبان پر اچھی طرح قدرت حاصل کر لینے سے غیر زبان کا سیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے تمام زبانیں انسانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ ان تمام میں نظم و ترتیب کے خواص موجود ہیں جن کو ہم ہر زبان کی بنیادی ساختوں یا قواعد زبان کے نام سے پکارتے ہیں۔ کسی ایک زبان کی بنیادی ساختوں پر قدرت حاصل کر لینا دوسری زبانوں کی بنیادی ساختوں کے سمجھنے میں بہت ممد ثابت ہوتا ہے۔ اور جس زبان کی بنیادی ساختوں اور محاورے پر قدرت حاصل کرنا سب سے آسان ہے وہ مادری زبان یا قومی زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی۔

ظاہر ہے کہ قومی زبان پر وقت اور توجہ صرف کرنا انگریزی یا کسی دوسری غیر زبان سیکھنے کے راستے میں رکاوٹ ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ چیز اس کے لیے ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کے اکثر والدین یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ بچہ جتنا وقت اردو زبان سیکھنے پر صرف کرے گا اسی قدر وہ انگریزی میں پیچھے رہ جائے گا۔ اس غلط فہمی کا افسوس ناک نتیجہ یہ ہے کہ والدین اس امر میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے

بچہ چھوٹی سے چھوٹی عمر میں انگریزی پڑھنا شروع کر دے۔ وہ بھاری فیسیں ادا کر کے بچوں کو ایسے مدرسوں میں بھیجتے ہیں جہاں پہلی جماعت سے یا اس سے بھی پہلے انگریزی شروع کرائی جاتی ہو۔ ہمارے یہاں کسی مدرسے کی برتری کا معیار بھی صرف یہ بن کر رہ گیا ہے کہ اس میں انگریزی کس جماعت سے شروع کرائی جاتی ہے اور اسے کس قدر وقت دیا جاتا ہے۔ اکثر والدین کے نزدیک تعلیم کی تاثیر تولنے کا صرف یہی ایک ترازو ہے۔ اس بات کو کوئی نہیں پوچھتا کہ جو مدرسہ بچے سے پندرہ بیس روپے ماہوار فیس لے رہا ہے وہ بچے کو فہم مطالب کا کتنا حصہ عطا کر رہا ہے۔

جیسا پہلے کہا جا چکا ہے کسی زبان پر قدرت حاصل کرنے کی سب سے بڑی پرکھ اس زبان میں موثر قوت اظہار ہے۔ خواہ یہ قوت تقریری ہو یا تحریری۔ دونوں صورتوں میں نہ صرف خیالات کی فراوانی ضروری ہوتی ہے۔ بلکہ ان خیالات کو موزوں طور پر مرتب کرنے اور انھیں مناسب الفاظ کا جامہ پہنانے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ جس شخص نے اس بلند ذہنی عمل کی مشق مادری زبان میں نہ کر لی ہو اس کے لیے یہ بے حد مشکل ہے کہ اسے غیر زبان کے توسط سے حاصل کرے۔

تجرباتی شہادت

کوئی پچیس سال گذرے ایک ہندوستانی عالم مسٹر ڈی۔ کے بینر جی نے یہ معلوم کرنے کے لیے ایک تحقیقی مطالعہ کیا تھا کہ مادری زبان کی استعداد اور انگریزی کی استعداد کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ اس مطالعہ کی بنیاد قدرے محدود تھی کیوں کہ صرف ایک سو طلبہ کا مطالعہ کیا گیا تھا، پھر بھی اس کے نتائج نے کلی طور پر ان ہی خیالات کی تائید کی تھی جو اوپر درج کیے گئے ہیں۔ ان نتائج سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ مادری زبان میں قابلیت اور انگریزی میں قابلیت کے درمیان اتنا گہرا رشتہ ہے جس کا بعض لوگوں کو وہم و گمان بھی نہیں۔ جن ایک سو طلبہ کے نتائج کا مطالعہ کیا گیا تھا ان میں سے ۶۲ انگریزی میں فیل ہوئے اور ۶۵ مادری زبان میں۔ ۴۷ طلبہ ایسے تھے جو ان دونوں مضامین میں فیل تھے۔ صرف دس طلبہ ایسے تھے جو مادری زبان میں فیل تھے مگر انگریزی میں پاس۔ لیکن ان دس میں سے صرف ایک طالب علم ایسا تھا جو انگریزی میں اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا۔ باقی نو حالتوں میں انگریزی کے نمبر بمشکل پاس ہونے کے لیے کافی تھے۔ ان نمبروں اور مادری زبان کے نمبروں میں بہت تھوڑا فرق تھا۔

مسٹر بینر جی کے تحقیقی مطالعہ سے کئی سال پہلے کلکتہ یونیورسٹی نے اس مسئلہ کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی

مقرر کی تھی۔ اس کمیٹی نے واضح الفاظ میں یہ فیصلہ دیا تھا کہ قومی زبان کو انگریزی کا حریف نہ خیال کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ اس کی بہترین حلیف اور مددگار ہے۔

آج کل ورنیکلر مڈل سکول خال خال باقی رہ گئے ہیں۔ مگر اب سے کوئی بیس پچیس برس پہلے ہمارے دیہاتی علاقوں میں ان کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ جو طالب ان سکولوں سے فارغ ہو کر ہائی سکول میں داخل ہونا چاہتے تھے انھیں دو سال لگا کر جونیئر اور سینیئر سپیشل کلاسوں میں انگریزی پڑھنا پڑتی تھی۔ یہ لوگ عموماً اپنے ان ہم جماعتوں سے کافی بہتر ثابت ہوتے جو پانچویں جماعت سے انگریزی پڑھتے چلے آیا کرتے تھے۔

اس واقعاتی اور تجرباتی شہادت کا نتیجہ بالکل صاف ہے۔ غیر زبان سیکھنے کے لیے بہترین تیاری یہ ہے کہ پہلے اپنی زبان اچھی طرح سیکھ لی جائے۔ نئے خیالات اور تصورات اخذ کرنے کا آسان ترین ذریعہ مادری زبان ہے۔ اگر خیالات میں پختگی پیدا کیے بغیر غیر زبان کا سیکھنا شروع کر دیا جائے تو اس کا مطلب بیک وقت دو مشکلوں کو دعوت دینا ہو گا۔

(۱) نئی زبان کی دشواری (۲) نئے خیالات کی دشواری۔

اس دوہری دشواری کا اثر بچے پر بُری طرح پڑتا ہے۔ وہ الفاظ ہی کے گورکھ دھندے میں پھنسا رہتا ہے مطالب کی تہ کو بہت کم پہونچ پاتا ہے۔ تدریس کا سب سے بڑا کمال یہ بن کر رہ جاتا ہے کہ الفاظ کو بلا سوچے سمجھے رٹ دیا جائے۔ نوٹ لکھانا اور نوٹ یاد کرنا تدریس و تعلم کے سہارے بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ جاری پوسٹ گریجوایٹ جماعتوں میں بھی طلبہ کا اولین اور مسلسل مطالبہ یہی ہوتا ہے کہ نوٹ لکھا دیے جائیں۔ خود مطالعہ کر کے اپنے نوٹ تیار کرنا ایک ایسا کام ہے جو انھیں کسی طرح بھی اپنے بس کا روگ نظر نہیں آتا۔ حد یہ ہے کہ ان کی اکثریت مسلسل انگریزی تقریر سے بھی کچھ اخذ نہیں کر سکتی۔ اگر نوٹ لکھانے کے ساتھ انھیں کوئی بات سمجھانی مقصود ہو تو یہ تشریح ایک ایسی زبان میں ہونی چاہیے جو نہ انگریزی ہو نہ اردو بلکہ ڈاکٹر ڈیورنگ کے الفاظ میں ان دونوں کی کھچڑی۔ یہ ایک ہلکی سی جھلک ہے ہمارے گریجوایٹ نوجوانوں کی لسانی استعداد کی۔ وہ اردو اور انگریزی کی کھچڑی کے بغیر نہ لگاتار چند جملے بول سکتے ہیں اور نہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

فروری ۱۹۵۵ء کے نصابی مذاکرات ان حقائق سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زبان کے مسئلہ کا اصلی حل

تعلیم کے لیے کس قدر بنیادی چیز ہے۔ یہ اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ پچھلی فروری میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں نصاب سازی کے متعلق جو سہ روزہ مذاکرات ہوئے ان میں اس مسئلہ کو بہت اہمیت دی گئی تھی۔

ان نصابی مذاکرات میں اس سوال کے تمام پہلوؤں پر پوری روشنی ڈالی گئی تھی کہ ثانوی جماعتوں کے نصاب میں اردو اور انگریزی کو کیا مقام حاصل ہونا چاہیے۔ اس سوال پر غور کرنے کے لیے جو ماتحت کمیٹی مقرر تھی اس نے کافی سوچ بچار کے بعد یہ سفارش کی تھی کہ ثانوی درجہ تک اردو ایک لازمی مضمون ہونا چاہیے اور انگریزی ایک اختیاری مضمون۔ اس سفارش سے غایت یہ تھی کہ ہر طالب علم قومی زبان میں اتنی استعداد پیدا کرلے کہ آگے چل کر زندگی میں اس کے توسط سے عہد حاضر کے عام اہم علمی اور سائنسی مطالب کو اخذ کر سکے۔ اور اس طرح نہ صرف اپنے مخصوص پیشے میں وقت کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے بلکہ آزاد جمہوری زندگی کی ذمہ داریوں کو بھی خوبی کے ساتھ نباہ سکے انگریزی کو اختیاری مضمون بنانے کی سفارش اس لیے کی گئی تھی کہ یہ مضمون ان طلبہ کے راستے میں ناقابل عبور رکاوٹ نہ بنا رہے۔ جو اس کے سوا دوسرے تمام مضامین میں خاصی اچھی قابلیت رکھتے ہیں اور جنہیں آگے چل کر زندگی میں انگریزی دانی کی کوئی خاص ضرورت بھی پیش آنے والی نہیں۔ ایسے امیدواروں کی ایک اچھی مثال ہماری اکثر طالبات ہیں جنھیں صرف مائیں بننا ہوتا ہے۔

یہ امر بڑا اطمینان بخش ہے کہ سنٹرل ٹریننگ کالج کے سہ روزہ نصابی مذاکرات نے نصاب تعلیم کی نگاہ ثانی کا جو احساس عوام میں پیدا کیا تھا وہ اب تک باقی ہے۔ پچھلے دنوں لاہور کی ایک غیر سرکاری انجمن نے زبان کے مسئلہ پر ایک پر رونق مباحثہ کا انتظام کیا تھا۔ اس میں صوبے کے بعض بلند پایہ عالموں اور ماہرین تعلیم نے حصہ لیا ان کے افکار کے زیادہ اہم حصے تبصرہ کے ساتھ نیچے درج کیے جاتے ہیں۔

جذبات سے الگ رہنے کی ضرورت

مباحثے کا آغاز میاں افضل حسین صاحب وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کی تقریر سے ہوا۔ میاں صاحب نے کہا کہ نصاب تعلیم میں انگریزی کے مقام پر بحث کرتے وقت ہمیں جذبات سے بالکل الگ ہو کر بات کرنی چاہیے۔ انگریزی زبان کو اس وقت ہمارے نصاب میں جو مقام حاصل ہے وہ تاریخی حالات کی پیداوار ہے۔ ہم اس بات کو پسند کریں یا نہ کریں، لیکن یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ انگریزوں نے ہمارے ملک پر کوئی دو سو برس حکومت کی۔ اس

عرصہ میں سرکاری زبان انگریزی تھی۔ سرکاری زبان ہونے کے طفیل یہ کاروبار اور تعلیم کی زبان بھی بن گئی۔ آج یہ سائنس اور ٹکنالوجی کی زبان بھی ہے۔ یہ انہی تاریخی اور معاشی حالات کا نتیجہ ہے کہ انگریزوں کو اس ملک سے گئے برس سے اوپر ہو گئے مگر ان کی زبان ہمارے لیے اب تک ناگزیر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی قوم اپنے آپ کو یک دم اپنے تاریخی پس منظر سے کاٹ کر علیحدہ نہیں کر سکتی۔ ہسپانیہ سے مسلمانوں کو وہیں نکالا ملنے کے کئی سال بعد تک میڈرڈ کے گلی کوچوں میں عربی زبان کے سوا کوئی دوسری زبان بولی یا سمجھی نہ جاتی تھی۔ آج مصر اور شمالی افریقہ کی زبان عربی ہے۔ لیکن اسلام کی آمد سے پہلے دنیا کے ان خطوں میں کچھ اور زبانیں بولی جاتی تھیں۔ امریکی حبشیوں کو آج اپنے باپ دادا کی زبان کی خبر بھی نہیں۔ حالاں کہ جب وہ افریقی جنگلوں سے پکڑ کر لائے گئے تو وہ اپنی آبائی بولی کے سوا کوئی دوسری زبان نہ سمجھتے تھے۔

میاں صاحب نے قومی زبان اردو کی اہمیت کو تسلیم کیا اور فرمایا کہ میرے خیال میں میٹرک کے درجہ تک انگریزی کو ایک اختیاری مضمون قرار دے دینا چاہیے تاکہ ثانوی جماعتوں کے طلبہ قومی زبان میں بہتر استعداد پیدا کر سکیں۔ تاہم قومی زبان کی ترقی کو قومی تعمیر کے تقاضوں کے ساتھ ٹکرانے کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جو طلبہ یونی ورسٹی کے درجہ پر سائنس یا ریاضی وغیرہ مضامین لینا چاہیں ان کے لیے یہ ضروری قرار دے دیا جانا چاہیے کہ انہوں نے ثانوی جماعتوں میں انگریزی پڑھی ہو اور اس میں ایک معقول استعداد پیدا کر لی ہو۔ یوں یہ بات ناممکن نہیں کہ سائنس کی تعلیم بھی اردو ہی میں دی جائے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ایسا ہوتا تھا۔ مگر وہاں بھی طلبہ انگریزی کتابوں سے استفادہ کرنے پر مجبور تھے۔ اس کے باوجود نتائج سے یہ پتہ چلتا تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ سائنسی مضامین میں وہ فہم اور قدرت پیدا نہیں کر سکتے جو دوسری یونیورسٹیوں کے طلبہ کر لیتے تھے۔

آخر میں میاں صاحب نے دوبارہ اپیل کی کہ زبان کے مسئلہ پر جذبات سے الگ ہو کر بات کرنی چاہیے۔ زبان کے معاملے میں ہم ایسے الفاظ و محاورات سے کام لیتے ہیں جو خواہ مخواہ جذبات کو جگا دیتے ہیں۔ مثلاً "مادری زبان" کی اصطلاح ہی کو لیجیے۔ دراصل قدرت نے انسان کو کوئی مخصوص مادری زبان عطا نہیں کی۔ مثلاً اگر چند ماہ عمر کے کسی پاکستانی بچے کی ماں وفات پا جائے اور اس کے عوض میں اسے ایک انگریز سوتیلی ماں مل جائے تو اس کی مادری زبان انگریزی ہوگی۔ اردو یا پنجابی نہیں ہوگی۔

میاں صاحب کے یہ افکار عمر بھر کے تعلیمی تجربے اور گہرے خوص کی پیداوار ہیں۔ اس لیے ان کا احترام

چاہیے۔ لیکن اصولی طور پر ان میں دو غلط فہمیاں موجود ہیں (۱) مصر، شمالی افریقہ اور ہسپانیہ میں عربی قدرتی اسباب کے نتیجہ کے طور پر عوام کی زبان بنی تھی، اس میں کسی دانستہ کوشش کو ہرگز دخل نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہسپانیہ سے مسلمانوں کے نکالے جانے کے بعد بھی وہاں کے لوگ عربی کے سوا کوئی اور زبان نہ سمجھ سکتے تھے۔ لیکن پاکستان کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گوشہ بھی ایسا نہیں جہاں عوام کی زبان انگریزی ہو۔ انگریز کی دو سو سالہ حکومت نے انگریزی کو حکومت، کاروبار اور تعلیم کی زبان تو بنا دیا مگر اسے عوامی زبان نہ بنا سکی۔ اسے عوامی زبان کی سطح پر رکھ کر بات چیت کرنا سائنسی طور پر درست نہیں۔

(۲) یہ درست ہے کہ جس پاکستانی بچے کو انگریز سوتیلی ماں میسر آ جائے اس کی مادری زبان انگریزی ہو گی۔ مگر حسنِ اتفاق سارے ملک میں شاید ایک آدھ بچے کے حصے میں آتا ہو۔ ہم کسی علمی بحث میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہمارے بچے جب انگریزی سیکھنا شروع کرتے ہیں تو اس سے پہلے وہ کچھ لسانی عادات اخذ کر چکے ہوتے ہیں اور یہ عادات خوب راسخ ہو چکی ہوتی ہیں۔ اس سے ان کے لیے انگریزی سیکھنے کا کام دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ ان کی عمر کا وہ زمانہ ہوتا ہے جب خیالات اور تصورات کی دنیا کو تیزی سے آباد ہونا چاہیے۔ قومی زبان پر سے یک دم نگاہ ہٹ جانے سے یہ کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ اس کے بدلے وہ کلی طور پر غیر مانوس لسانی عادات کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ اس سے ذہنی پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ یہ نفسیاتی حقائق ہیں جن پر ہر اس بحث میں نگاہ رہنی چاہیے جو زبان کے مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ کی جا رہی ہو۔

ذہنی آزادی کے لیے قومی زبان ضروری ہے

دوسری اہم تقریر مسٹر مسعود سیکرٹری حکومت مغربی پاکستان کی تھی، انھوں نے اس بات کی سخت مخالفت کی کہ انگریزی کو کسی درجہ پر بھی ذریعۂ تعلیم بنانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ دنیا کے ۸۵ آزاد ملکوں میں ہمارے سوا ایک بھی ایسا نظر نہیں آئے گا جہاں تعلیم ملکی زبان میں نہ دی جا رہی ہو۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے یہاں نہ صرف یونیورسٹی کے درجہ پر ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے بلکہ بعض مدرسے پرائمری درجہ پر بھی تعلیم انگریزی میں دیتے ہیں۔ اس صورت حال نے نوجوانوں کے قوائے فکر کو مفلوج کر رکھا ہے۔ ان کی شخصیتیں مرجھا کر رہ جاتی ہیں۔ ان میں وہ بھروسہ اور عزم پیدا نہیں ہو سکتا جو آزاد زندگی کے لیے ضروری ہے۔ وہ ذہنی اور روحانی طور پر اپنے معاشرتی ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی اہلیت کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ ایک غیر حقیقی دنیا کے باسی بنکر رہ جاتے ہیں۔

اپنے نقطۂ نگاہ کی تائید میں مسٹر مسعود نے جاپان کی مثال پیش کی۔ انھوں نے کہا کوئی نوے برس گذرے اس ایشیائی ملک نے جدید علوم حاصل کرنے کا تہیہ کیا۔ اس کے لیے اس نے انگریزی زبان کو اپنے تعلیمی اداروں میں ذریعۂ تعلیم نہیں بنایا اس کی بجائے

اس نے اس تیزی سے ترقی کی کہ صرف چالیس سال کے بعد وہ ۱۹۰۴ء میں روس جیسے بڑے ملک کو شکست دینے کے قابل ہو گیا۔ یہ اس لیے کہ جاپان نے انگریزی زبان کو مفید علوم اور مہارتیں حاصل کرنے کا آلہ نہیں بنایا تھا اسے اس بات کی اجازت نہیں دی تھی کہ ساری قوم کی فکری صلاحیتوں کا گلا گھونٹ کر رکھ دے۔ اس ملک کے انگریز حکمرانوں نے دراصل اپنی زبان کو ہم پر مسلط بھی اسی لیے کیا تھا کہ ہم ذہنی طور پر کبھی قوی نہ ہونے پائیں اور ہمارے دلوں پر ایک ناقابل علاج احساس کمتری ہمیشہ چھایا رہے۔ مسٹر مسعود نے کہا کہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ انگریزی کے بغیر سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ عثمانیہ کی جو مثال پیش کی گئی ہے وہ زیادہ حسب حال نہیں۔ ریاست حیدرآباد کے وسائل بہرحال محدود تھے۔ اردو میں اعلیٰ تعلیم کا وہاں جو تجربہ کیا گیا تھا اس کے پیچھے کسی قوم کی پوری قوت موجود نہ تھی۔ پاکستان کی نوعیت ریاست حیدرآباد سے بہت مختلف ہے۔ اب یہاں اگر ہم اردو کا تجربہ شروع کریں گے تو اس کے پیچھے نہ صرف ایک وسیع ملک کے وسائل ہوں گے بلکہ ایک پوری قوم کا جذبۂ عمل بھی۔

مسٹر مسعود نے اس خیال سے بھی اختلاف کیا کہ زبان ورثہ میں نہیں ملتی بلکہ حاصل کی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہر زبان ایک مخصوص ثقافتی ورثے کو اپنے اندر سموئے ہوتی ہے جو بچہ اس ثقافت میں پیدا ہوتا ہے وہ کسی کوشش کے بغیر اس ثقافت کی سطح تک بلند ہو جاتا ہے۔ اگر یہ ثقافت ترقی یافتہ ہے تو بچہ بھی از خود اسی قدر ذہنی ترقی حاصل کر سکے گا۔ اگر یہ پسماندہ ہے تو بچے کی ذہنی کیفیت بھی اسی قدر پسماندہ رہے گی۔ یہ کہنا مضحکہ خیز ہے کہ ہم تو ذہنی طور پر بلند ہیں۔ مگر ہماری زبان اس بلندی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس لیے کوئی غیر زبان مستعار لینی چاہیے۔ زبان کی وسعت اور ثقافت کی بلندی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر ہم اپنی ثقافت کو ترقی دیتے جائیں گے تو ہماری زبان خود بخود نئی ثقافتی ضرورتوں کا ساتھ دے گی۔ اس میں از خود وسعت آتی جائے گی۔

انگریزی کو لازمی مضمون بنائے رکھنے سے ملک کو جو مالی نقصان ہوا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر مسعود نے کہا کہ پچھلے نو سالوں میں ایک لاکھ بیالیس ہزار چھ سو طلبہ یونیورسٹی کے مختلف امتحانوں میں فیل ہو چکے ہیں۔ ان کے فیل ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ انگریزی میں کمزور تھے۔ اگر ان میں سے ہر ایک طالب علم کی پڑھائی، خوراک اور رہائش کے اخراجات کو ۵۰ روپے ۸ آنے فی کس ماہوار شمار کیا جائے تو یہ ۶۰۶ روپے فی طالب علم سالانہ خرچ بنتا ہے۔ اس حساب سے قوم کو کوئی ساڑھے تیرہ کروڑ روپے کا خسارہ ہوا۔ اگر یہ طالب علم پہلی کوشش ہی میں پاس ہو جاتے تو لامحالہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی کام پر لگ جاتا اور کم و بیش ایک ہزار روپے سالانہ کماتا۔ اس طرح ساڑھے تیرہ کروڑ روپے کے خسارے کے علاوہ قوم کو تقریباً اٹھارہ کروڑ روپے سے محرومی بھی برداشت کر[illegible] یہ محض مالی نقصان کا حساب ہے۔ نوجوانوں کی عمر کے قیمتی سال جو ضائع ہوئے ان کی قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ناکامی کی

نہیں اور ان کے والدین کو جو بے پناہ ذہنی پریشانیاں اٹھانا پڑیں ان کو روپے پیسوں کی شکل میں ظاہر کرنا بالکل ناممکن ہے ۔

نصاب میں لسانی بوجھ کی بھرمار ایف سی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر یورنگ نے اپنی تقریر میں کہا کہ اس بارے میں کوئی اختلاف رائے میں ہو سکتا کہ بچے کی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ یہ زبان وہ ابتدائی بچپن میں سیکھ چکا ہوتا ہے۔ اب اس لسانی آلے کی دسے خیالات کی نشو و نما ہونی چاہیے۔ اگر اس کی بجائے اس بے چارے پر ایک غیر زبان کا بوجھ ڈال دیا جائے تو خیالات کی نشو و نما رک جائے گی۔

ڈاکٹر یورنگ نے کہا کہ اس ملک میں زبان کا مسئلہ خاص طور پر الجھا ہوا ہے مثلاً مغربی پاکستان کے ایک بڑے حصے میں بچہ گھر پر بابی زبان سیکھتا ہے۔ مدرسے میں آتے ہی اسے اردو سیکھنا پڑتی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے پانچ سالوں میں وہ بمشکل اس زبان کی مبادیات پر قدرت مل کر پاتا ہے۔ چھٹی جماعت میں آتے ہی اسے انگریزی سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس غیر زبان کا سیکھنا ایسی لسانی عادتوں کا مطالبہ کرتا ہے جو اس کی بلی لسانی عادتوں سے یکسر مختلف ہوتی ہیں۔ پھر معاملہ اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اس غریب سے فارسی اور عربی میں سے کوئی ایک زبان سیکھنے مطالبہ بھی کیا جاتا ہے۔ غرض ثانوی مدرسے کے پانچ سال اسے عجیب لسانی گورکھ دھندوں میں الجھائے رکھتے ہیں۔ اسے اس بات کی ملت ہی نہیں ملتی کہ ان زبانوں کو خیالات کی نشو و نما کا ذریعہ بھی بنائے ۔

ڈاکٹر یورنگ نے کہا کہ تعلیم کی اصل غایت ذہنی نشو و نما ہے۔ زبانیں اس نشو و نما کے حصول کے لیے ذرائع اور آلات کا درجہ رکھتی ہیں۔ وہ ت خود مقصود نہیں ہیں لیکن پاکستانی بچے اپنے مدرسے کی تعلیم کا سارا زمانہ ان آلات کے حصول میں ہی گزار دیتے ہیں۔ انھیں ان لات سے خدمت لینے کی فرصت نہیں ملتی۔ ان کی مثال ایک ایسے ترکھان کی ہے جو ساری عمر اوزار حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے لیکن ان زاروں سے کبھی کوئی صندوق یا کوئی اور چیز نہیں بناتا ۔ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر یورنگ نے کہا کہ اس میں کچھ کلام نہیں کہ انگریزی یا کی ایک بے حد اہم زبان ہے۔ اس کی مدد سے سائنس اور ٹکنالوجی کی برق رفتار پیش قدمی کے ساتھ رابطہ قائم رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن انگریزی ں مہارت پیدا کرنے کے لیے پہلے اردو میں مہارت پیدا کرنی چاہیے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ اگر سوجھ بوجھ سے کام لیا جائے اور طلبہ یہ زبان سیکھنے کا حقیقی شوق ی رکھتے ہوں تو ثانوی مدرسے کے صرف دو سالوں میں ایک عام طالب علم کو اتنی انگریزی سکھائی جا سکتی ہے جو یونیورسٹی کے درجے پر سائنس ر دوسرے اعلیٰ علوم کے حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے ۔

معلم انگریزی کا ذاتی تجربہ آخر میں گورنمنٹ کالج لاہور کے سینئر لیکچرار انگریزی مسٹر اشفاق علی خاں نے تقریر کی۔ آپ نے کہا کہ انگریزی اد ھاتے میری عمر گزر گئی ہے۔ لیکن میں پوری دیانت داری اور ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آج تک اپنے طلبہ کے چہروں پر وہ وجدانی کیفیت ی ہوتے کبھی نہیں دیکھی جو غالب کے چند اشعار ہم سب پر طاری کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی ادب کے شاہکار جس ثقافتی پس منظر عکاسی کرتے ہیں ہمارے طلبہ اس سے یکسر ناآشنا ہوتے ہیں۔

اپنی طالب علمی کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر اشفاق نے کہا کہ ایک روز ہمارے فاضل استاد مسٹر بخاری نے ایک مشہور انگریز شاعر کی ایک مشہور نظم کے چند اشعار جماعت میں بار بار دہرائے اور وجدان سے جھوم جھوم کر داد دی کہ واہ کیا حسین تصویر کھینچی ہے! ہم سب استاد کی دل جوئی کے لیے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ مگر کیا مجال جو ہمیں ان اشعار میں کسی قسم کے حسن کی کوئی جھلک نظر آئی ہو۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہمارے قلب و ذہن کی جڑیں اس ماحول میں پیوست ہوتی ہیں جس میں ہم نے ہوش سنبھالا۔ ہمیں صرف ان ہی الفاظ میں حسن دکھائی دے سکتا ہے جو اس ماحول کی عکاسی کریں۔ جو الفاظ کسی غیر مانوس ماحول کی عکاسی کریں ہم ان کا حسن نہیں دیکھ سکتے۔

ان مدرسوں کا ذکر کرتے ہوئے جہاں پہلی جماعت سے انگریزی پڑھائی جاتی ہے مسٹر اشفاق نے کہا کہ ان معصوموں پر بے حد زیادتی کی جا رہی ہے۔ ان کے قلب و ذہن کو اس معاشرتی ماحول سے کاٹا جا رہا ہے جس میں ان کو زندگی گزارنا ہے۔ ایسے بچوں کے والدین کا تمول ان بیچاروں کے لیے ایک افسوس ناک محرومی خرید نے کا موجب بن رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صاحب الفکر ماہرین تعلیم ان حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور زبان کے مسئلہ کا کوئی حقیقت پسندانہ حل جلد از جلد قوم کے سامنے رکھیں

جذبات سے علیحدگی ممکن نہیں آخر میں مباحثہ کی صدر بیگم زینت فدا حسین نے تقریر کی۔ آپ نے فرمایا کہ ہمیں زبان کے مسئلہ پر جذبات سے الگ رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ مشورہ بڑا مخلصانہ ہے لیکن میں پوچھتی ہوں کہ کیا اس پر عمل کرنا ممکن بھی ہے؟ جو زبانیں آج عالمگیر وسعت کی مالک ہیں، جب اول اول ان کو میدان میں لایا گیا تو کیا ان کے حامی جذبات سے بالا تھے؟ کیا ان کی ترقی میں جذبات کی گرمی کو دخل نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جذبات کی گرمی کے بغیر کوئی انسانی کام تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ جو ملک آج صنعتی میدان میں دنیا کے امام ہیں کیا انھوں نے جذبات سے اپیل کر کے اپنی منڈیوں کو غیر ملکی مصنوعات کے ریلے سے نہیں بچایا تھا؟ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو خود ان کی اپنی صنعتیں کبھی پروان نہ چڑھ سکتیں۔ جب تک ایک بالا دست حریف کے ساتھ مقابلہ رہے، اس وقت تک ایک نو خیز بچے کی نشو و نما کے امکانات کیا ہو سکتے ہیں۔ بالکل یہی حال زبان کا ہے۔ آج انگریزی کی بالادستی ختم کر دیجیے، اردو فوراً ترقی کرنے لگے گی۔ وہ ہر قسم کی تعلیمی، کاروباری اور ملکی ضرورتیں پوری کرنے لگے گی۔

آخر میں صدر نے اس بات پر زور دیا کہ یہ مسئلہ اتنے طویل التوا کا شکار بنایا جا چکا ہے کہ اب مزید تاخیر کی قطعاً گنجائش نہیں۔ اس بارے میں ہرگز دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ آزاد اور آبرومند قومی زندگی کی ترقی کے لیے قومی زبان کی ترقی ہے۔ یہ ایک اہم قومی ضرورت ہے۔ جسے جلد از جلد پورا ہونا چاہیے ؟

انگلستان کے مدرسوں میں

رفاہی خدمات

محمد عبدالعزیز

جو قومیں اجتہاد کی خوگر اور آگے بڑھنے کا جذبہ رکھتی ہیں ان کے آگے کوہ آسا مشکلات بھی دراصل مشکلات نہیں ہوتیں برطانیہ اس وقت اپنی قومی زندگی کے نازک ترین دور سے گذر رہا ہے۔ حکومت کا لطنطنہ ختم ہو رہا ہے اور ملک ایک ایسے اقتصادی بحران میں پھنس چکا ہے کہ بظاہر اس کے زندہ رہنے کے آثار کم نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اجتماعی یا انفرادی لحاظ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ انگریز من حیث القوم حالات کا مقابلہ کرنا اور بگڑتے ہوئے حالات میں وقتی رجحانات کے زیر اثر اس سے مطابقت پیدا کر لینا جانتے ہیں۔ روس جرمنی، اور یو۔ ایس۔ اے کی حرفتی ترقی کے پیش نظر، برطانیہ کو اپنی حرفتی پست حالی کا شدید احساس ہے۔ لیکن یہ احساس محنت کار ان قوم کے ہونٹوں پر ایک مصنوعی نعرہ نہیں بن جاتا، بلکہ ان کے جذبۂ اجتہاد کو اور تیز کر دیتا ہے۔ پچھلی نصف صدی سے انہیں یہ احساس ہے کہ اگر تعلیمی دوڑ میں ہم ان ترقی یافتہ قوموں سے پیچھے رہ گئے تو ہماری حیثیت اس تیز گام دنیا میں غبار کارواں سے زیادہ وقیع نہ ہوگی۔ پچھلی عالمگیر لڑائی اور موجودہ اقتصادی تعطل نے اسے اور شدید بنا دیا ہے۔ چناں چہ اس وقت ان کی تمام تر توجہ مدرسوں کی اصلاحات پر مرکوز ہو رہی ہے۔ صنعتی اور حرفتی نصاب، یا خالص تعلیمی نصاب یا ایک جامع نصاب سے قطع نظر، اسکول کے اندرونی نظم و ضبط، بچوں کی خوراک اور ان کی صحت جسمانی کے لیے جو احتیاطی تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں وہ ایک زندہ قوم کے زندہ رہنے کی ضمانت ہیں۔

پس منظر

انگلستان کے مدرسوں میں فلاحی خدمات کی ابتدا اس صدی کے عشر اول میں ہوئی۔ برطانوی پارلیمان نے سنہ ۱۸۷۰ء میں ابتدائی لازمی تعلیم کا قانون پاس کیا جو دراصل اس وقت کے سماجی اور اقتصادی حالات کے پیش نظر ضروری تھا۔ گاؤں سے جو لوگ نئے نئے صنعتی مرکزوں میں کام کرنے کے لیے آئے وہ اپنا دہقانی ماحول بھی اپنے ساتھ لائے۔ اس لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ غریب مزدوروں (LABOURING POOR) کے بچوں کو اتنی تعلیم تو دے دی جائے کہ وہ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا

اور معمولی حساب کتاب کرنا سیکھ جائیں۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد بعض دوسری معاشری اور سماجی خرابیاں بھی منظر عام پر آئیں جو بچے بورڈ کے سکولوں میں زیر تعلیم تھے، ان میں سے بیشتر کی صحت صد درجہ ناقص تھی۔ کوئی پیٹ کی بیماری کا شکار اور کوئی تپ دق کا مریض۔ دق ایک عام بیماری تھی۔

حکومت ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ لیکن چوں کہ تعلیمی امور میں مرکزی حکومت کی حیثیت محض ایک نگران کی تھی، اس لیے بظاہر کوئی مفید مطلب قدم بھی ممکن نہ تھا۔ چناں چہ جو تحقیقاتی کمیشن محکمۂ تعلیم کے انتظامی الجھاؤ کے دور کرنے کے لیے مقرر ہوئے، انھوں نے بھی ان امور کی طرف بہت کم توجہ دی۔ کراس کمیشن اور برائس کمیشن کی تحقیقاتی صدائے بازگشت صرف مقامی تعلیمی حکومتوں کے قیام یا ایک مرکزی وزارت تعلیم کی تشکیل کے حق میں گونجتی رہیں تا آں کہ انیسویں صدی ختم ہوئی اور بیسویں صدی کا آغاز ہوا۔ لیکن پچھلی صدی کے آخری دو تین سال میں جو چونکا دینے والا جمع ہوا، وہ ۱۹۰۲ء کے قانون تعلیم کی تعمیر میں کام آیا۔ مورانٹ نے اس انتشار میں جو جامعیت پیدا کی، اس نے انگریزی تعلیم کو ایک ایسی شاہ راہ پر ڈال دیا جو منزل سے زیادہ قریب تھی۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں جسمانی انحطاط (PHYSICAL DETERIORATION) کے متعلق ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوا، اور سنہ ۱۹۰۵ء میں سکول کے بچوں کے طبی معائنے اور خوراک کی تحقیقات کے متعلق ایک اور کمیشن مقرر ہوا۔ ان تحقیقات کے بعد جو رپورٹ شائع ہوئیں، ان کے نتائج نہایت اندیشہ ناک تھے جس کے دور کرنے کے لیے ایک بہت بڑے قانونی اقدام کی ضرورت تھی۔ جنگ بوئر (BOER WAR) میں جو لوگ جنوبی افریقہ بھیجے گئے، ان کی جسمانی صحت اتنی ناقص تھی کہ وہ جنگ میں اس تن دہی سے حصہ نہ لے سکتے تھے جو نوجوانوں کا حق ہوتا ہے۔ اس سے قومی ناقص تغذیہ کے بعض پہلو سنہ ۱۹۰۰ء میں بلکہ اس سے پہلے ہی نمایاں ہو چکے تھے۔ ان مختلف حالات نے حکومت کو اصلاح حال کے لیے مجبور کر دیا۔ لیکن حکومت کے لیے اس وقت تک کوئی براہ راست اقدام ممکن نہ تھا، جب تک پارلیمان اس سلسلے میں کوئی قانون نہ پاس کر دے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس قسم کا کوئی اقدام والدین کی انفرادی آزادی کے سلب کر لینے کے مترادف ہوگا۔ لیکن قومی صحت کے پیش نظر آزادی کے اس موہوم تصور کو توڑنا بھی اتنا ہی ضروری تھا۔

پہلا قانون

سنہ ۱۹۰۶ء کے انتخابات میں لبرل پارٹی کامیاب ہوئی اور پہلی مرتبہ لیبر پارٹی کے چالیس ممبر پارلیمان کے رکن بنے۔ لبرل حکومت قومی صحت کی بقا کے لیے قانون وضع کرنے کے حق میں تھی۔ لیبر پارٹی کے اراکین کی موجودگی نے اس کام کو نسبتاً آسان

جناب جے ڈبلیو ٹی ولسن (W.T. WILSON) نے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک بل پیش کیا۔ تعلیمی بورڈ کے نائب صدر نے حمایت کی اور یہ بل ۱۹۰۶ء[29] ہی میں قانون بن گیا جس کا تمام تر مقصد یہ تھا کہ مقامی تعلیمی حکومتیں (LOCAL EDUCATION AUTHORITIES) مفلس و نادار طلبہ کے لیے خوراک فراہم کریں۔ لیکن یہ ایک اختیاری قانون تھا۔ مقامی تعلیمی حکومتیں نصف پنس فی پونڈ مقامی محصول[30] لگا کر ایسے بچوں کی خوراک کا انتظام کر سکتی تھیں جنھیں اپنے گھروں میں پیٹ بھر کر روٹی میسر نہیں آتی لیکن بچوں کو اس وقت حالات اتنے سازگار نہ تھے، اس لیے مقامی تعلیمی حکومتیں اس مزید ذمہ داری کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئیں بعض کا خیال تھا کہ یہ کام دراصل   دادودہش کا ہے جس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے مفروضوں نے فراہمی خوراک کے اس قانون کو باطل قرار دے دیا۔ بچوں کی صحت روز بروز گرتی جاتی تھی، لیکن مقامی تعلیمی حکومتوں کے ارباب حل و عقد کے لیے یہ کوئی اہم مسئلہ نہ تھا۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں بعض انسانی ہمدردوں کی مساعی سے بعض علاقوں میں شوربے (SOUP KITCHEN) کی فراہمی کا انتظام تھا۔ نادار طلبہ کی انجمن :— (THE DESTITUTE CHILDREN SOCIETY) نے صرف لندن میں اٹھاون (۵۸) طعام خانے کھولے جہاں مفلس بچوں کو تھوڑا بہت کھانا مل جاتا تھا۔ لندن سکول بورڈ نے بھی بچوں کی فلاح کے لیے تھوڑا بہت کام کیا۔ لیکن اس خدمت کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ بچوں کو اس سے بہت ہی فائدہ پہنچا۔ ہفتے میں ایک روز یا دو روز نہ دوپہر کو کھانا کھلا دینا اور وہ بھی سردیوں میں کس حد تک مفید ہو سکتا تھا۔ ۱۹۰۶ء کے بعد ان حالات میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا۔ مقامی تعلیمی حکومتوں کی اس بے حسی کے پیش نظر ۱۹۰۷ء میں بورڈ نے ایک گشتی مراسلہ[31] جاری کیا۔ اس مراسلے کے مطابق مقامی تعلیمی حکومتوں کے لیے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ وہ کم سے کم تین صورتوں میں بچوں کی خوراک کا انتظام کریں اوّل شدید موسم میں۔ دوم صنعتی تعطل اور سوم عارضی بے روزگاری کے زمانے میں تعلیمی بورڈ کو بھی یہ احساس ہو چکا تھا کہ بچوں کے لیے خوراک فراہم کرنا ہمارا ایک بنیادی فرض ہے۔ لیکن مقامی تعلیمی حکومتیں بورڈ کے اس نقطہ نگاہ سے متفق نہ تھیں اس لیے باوجود ان قانونی پابندیوں کے نتیجہ خاطر خواہ رہا۔ بعض چند مقامی تعلیمی حکومتوں نے اپنے علاقوں میں چند طعام خانے کھولے۔ لیکن ان کی حالت اتنی خراب تھی کہ بچے بالعموم یہاں کھانا نہ کھانا ہی مناسب سمجھتے تھے۔ ان کی بدانتظامی بچوں کو اپنی طرف مائل نہ کر سکی۔

۱۹۱۳ء میں حکومت نے اس سلسلے میں تیسرا اہم قدم اٹھایا۔ اور فراہمی خوراک کا ایک ضابطہ جاری کیا۔ اس

---

[29] قانون تعلیم (فراہمی خوراک) مجریہ ۱۹۰۶ء [30] (RATE MONEY) [31] گشتی مراسلہ (CIRCULAR 596/1907)

ضابطے کے مطابق ہر مقامی تعلیمی حکومت مقامی محصول میں سے بچوں کی خوراک کا انتظام کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بچوں کو تعطیلات میں بھی خوراک کی سہولتیں بہم پہنچائی جا سکتی تھیں۔ لیکن یہ ضابطہ ضابطے کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکا۔ مقامی تعلیمی حکومتوں کی روش بدستور قائم رہی۔ لیکن تعلیمی بورڈ چوں کہ سماجی خدمت کی اہمیت کا اندازہ لگا چکا تھا۔ اس لیے گشتی مراسلہ نمبر ۷۴۸ کے مطابق اس نے قومی ابتدائی مدارس کے بچوں کے لیے خوراک کا انتظام کرنے کے لیے پچاس فی صد امداد دینے کا اعلان کیا۔ لیکن جنگ کی وجہ سے اس قسم کی مختلف فلاحی تجویزوں پر اوس پڑ گئی۔ فراہمی خوراک کی اہمیت کا احساس بھی جنگ کے ہنگاموں میں کچھ دنوں کے لیے دب سا گیا۔ زمانۂ مابعد جنگ میں حالات نے پلٹا کھایا اور انسانی ہمدردی کا احساس قدرے زیادہ شدید ہو گیا۔ خوں آشامی اور قتل و غارت کے بادل چھٹے تو خلوص و محبت کی بزم آرائی ہوئی۔ اگرچہ قانون تعلیم مجریہ ۱۹۱۸ء میں فراہمی خوراک کے سلسلے میں کوئی دفعہ موجود نہیں۔ لیکن چوں کہ اسے ہنوز تعلیم کا ایک جزو تصور کیا جاتا تھا اس لیے ایسی دفعات کا موجود نہ ہونا جن میں خوراک کے متعلق کوئی تجویز پیش کی گئی ہو اتنا تعجب خیز نہیں۔

پہلی عالمگیر لڑائی کے بعد

زمانۂ مابعد جنگ میں طعام خانے دوبارہ کھولے گئے بلکہ معدنی علاقوں میں ان کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ ان کی جانب ایک بار پھر حکومت کو اپنی توجہ مبذول کرنی پڑی۔ تعلیمی بورڈ نے اپنی امدادی رقم میں بھی معتدبہ اضافہ کیا۔ لیکن چوں کہ اس وقت تک تعلیم اور یہ فلاحی خدمت دو مختلف خدمت سمجھی جاتی تھیں، اس لیے بعض حلقوں سے یہ آواز بھی آئی کہ پارلیمان جو رقم وقتاً فوقتاً تعلیم کے لیے منظور کرتی ہے، اسے ناداروں اور مفلسوں کی امداد میں صرف نہ کیا جائے مفلسوں کی امداد کے لیے حکومت دوسری صورتیں اختیار کر سکتی ہے۔ یہ تنقیدیں اگرچہ وقتی طور پر ایک ہنگامے کی حیثیت رکھتی تھیں، لیکن ان میں اصولاً اتنا تضاد نہ تھا۔ دونوں گروہ مفلسوں کی امداد کے مسئلے پر متفق تھے۔ ۱۹۲۲ء میں حکومت نے یہ طے کیا کہ ہر مقامی تعلیمی حکومت کو فراہمی خوراک کے سلسلے میں کل اخراجات کا نصف مرکزی خزانے سے ملے گا۔ لیکن اخراجات کی باقاعدہ پڑتال ہوگی۔ یہ زمانہ اقتصادی بدحالی کا زمانہ تھا۔ اس قانون کے نفاذ کا مقصد یہ تھا کہ اس معاشی تعطل میں طلبہ کو ذہنی کھانا مل جایا کرے جس سے وہ اپنی صحت قائم رکھ سکیں۔

دودھ کی فراہمی

۱۹۲۳ء میں فلاحی خدمات میں اور توسیع ہوئی۔ انگریزوں کا پست طبقہ بالخصوص شراب کا عادی تھا۔ کا خاندان کا

کام کرنے کے بعد جوم دوری ملی وہ بالعموم نذر شراب ہو جاتی، جس سے بیسیوں اخلاقی اور سماجی برائیاں پیدا ہو جاتی تھیں اور صحت پر بھی اتنا ناگوار اثر پڑتا تھا کہ اس کے بعد اس کی اصلاح ممکن نہ تھی۔ ان برائیوں کے دور کرنے اور قومی صحت کی بقا کا ایک ہی طریقہ تھا کہ شراب کی عادت کو رفتہ رفتہ چھوڑایا جائے۔ چناں چہ ان دو مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ۱۹۲۳ء میں قومی استہار شیر کونسل (NATIONAL MILK PUBLICITY COUNCIL) قائم کی گئی۔ اس کونسل نے ایک دودھ سوسائٹی قائم کی جو بچوں کے لیے دودھ کا انتظام کرے گی۔ ہر بچے کو ⅓ پائنٹ (تقریباً ایک پاؤ) دودھ ملے گا، جن بچوں کے والدین قیمت ادا کر سکتے ہیں، انھیں ایک معمولی سی رقم ادا کرنی ہوگی، جو دودھ کی قیمت سے بہت کم ہوگی۔ لیکن جو والدین قیمت ادا کرنے سے قاصر ہیں ان کے بچوں کو مفت دودھ ملا کرے گا۔ ۱۹۲۹ء میں پانچ لاکھ سے زیادہ طلبہ کے لیے دودھ مہیا کیا جاتا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں یہی تعداد بیس لاکھ سے تجاوز کر گئی، دودھ کے استعمال سے طلبہ کی صحت پر خاطر خواہ اثر ہوا، بالخصوص وہ بچے جو ناقص تغذیہ کا شکار تھے۔ ۱۹۳۴ء میں حکومت نے دودھ کی خرید و فروخت کے لیے ایک بورڈ[1] قائم کیا اور اسے ایک مستحکم بنیاد پر قائم کرنے کے لیے پانچ لاکھ پونڈ کی امدادی رقم عطا کی۔ بچوں کے لیے دودھ کی قیمت نصف پنس مقرر کر دی گئی۔ مفلس و نادار بچوں کو دودھ بدستور مفت تقسیم کیا جائے گا۔ اس وقت حالات پہلے سے مختلف تھے ایک طرف سکول میں کھانے کے انتظام کی مانگ بڑھ رہی تھی اور دوسری طرف مقامی تعلیمی حکومتوں کی پہلی بے نیازی بھی ختم ہو رہی تھی، اس وقت تک تقریباً ایک تہائی مقامی تعلیمی حکومتوں کے مدارس میں دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا۔ ۱۹۳۱ء کے معاشی بحران اور [2]مئے کے اقتصادی کمیشن کے ترمیم اخراجات کی وجہ سے اگرچہ حالات کچھ اتنے سازگار نہ تھے، لیکن سکول میں کھانا کھانے والے طلبہ کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی اور سکول بھی اس کے اہتمام میں دلچسپی لے رہے تھے، اتبدائی مدارس میں ان طلبہ کی تعداد جنھیں دودھ مہیا کیا جاتا تھا۔ کل تعداد کا ۵۶ فی صد ہو چکی تھی۔

ہیڈو کی تنظیم نو کا عہد

۱۹۳۶ء میں ملک کی اقتصادی حالت بہتر ہو چکی تھی۔ ٹریویلین (TREVELYAN) کی چھ، سات برس کی مسلسل کوششیں بارآور ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ کلیسائی سکولوں (VOLUNTARY SCHOOLS) کے مسائل کی ان بحث و تمحیص میں جو ٹریویلین کے تینوں بلوں کی ناکامی کا موجب ہوئیں تنازع باقی نہ تھا۔ بلکہ دونوں گروہ مصالحت کے لیے آمادہ تھے۔ ۱۹۳۶ء کے

---

[1] (MILK MARKETTING BOARD)

[2] (MAY'S ECONOMIC COMMISSION)

تعلیمی قانون نے ہیڈو کی تنظیم (HADOW REORGANIZATION) کی ایک اہم سفارش کو تسلیم کرتے ہوئے سکول چھوڑنے کی عمر پندرہ سال کر دی اور کلیسائی مدرسوں کو بڑی حد تک مقامی تعلیمی حکومتوں کے تابع بنا دیا۔ نظام تعلیم کی ان قانونی تبدیلیوں سے ارباب تعلیم کو ایک ذہنی سکون میسر آیا۔ دس برس کی یہ مسلسل کوششیں اگرچہ ہیڈو کی تمام تر سفارشات کو اس قانون میں شامل نہ کر سکیں، لیکن ایک دشوار گذار ارادہ کو آسان ضرور بنا دیا۔ ۱۹۳۶ء ہی میں تعلیمی بورڈ کے تخمینے کے مطابق گیارہ ہزار بچے روزانہ دوپہر کو اپنے متعلقہ سکولوں میں کھانا کھاتے تھے۔ قومی تعلیمی حکومتیں فی کس دس پنس یومیہ وصول کر سکتی تھیں۔ اب جو بورڈ کو بعض اہم تعلیمی کاموں سے فرصت ملی تو اس نے کھانے کے انتظام کی جانچ پڑتال بھی شروع کی۔ ان محکمانہ تحقیقات سے اس کے بعض ایسے پہلو منظر عام پر آئے جو مزید قانونی چارہ جوئی کا باعث ہوئے۔ بعض سکولوں کی کینٹین (CANTEENS) بہت ہی اچھی حالت پر تھیں، لیکن بعض اتنی خستہ اور بری حالت میں کہ خوددار بچے یہاں کھانا کھانے کی بجائے بھوکا رہنا پسند کرتے تھے، دس پنس کے حساب سے جو رقم مقامی تعلیمی حکومتیں وصول کرتی تھیں ان سے کھانے کے اخراجات وضع کرنے کے بعد خاصہ منافع ہو رہا تھا۔ لیکن بعض حالات میں انتظام پھر بھی معقول نہ تھا۔ مقامی تعلیمی حکومتیں بالعموم ان کینٹینوں کو ٹھیکے پر دے دیتی تھیں۔ ۱۹۴۶ء میں ایسی کینٹینوں کی تعداد ۶۶ فی صد سے متجاوز تھیں۔ ٹھیکے داروں کا انتظام بہت ہی خراب تھا، نہ کھانا اتنا نفیس کہ بچے کشاں کشاں پہونچیں، اور نہ انتظام اتنا اچھا کہ طبیعت اس طرف مائل ہو حتیٰ کہ جو کھانا بچوں کو ملتا اس میں غذائیت بھی نہ ہوتی۔ اس طرح گویا یہ انتظام حکومت کے مقاصد کو باطل قرار دے رہا تھا۔

ان حالات نے دلوں میں ایک جھرجھری سی پیدا کی، اور رفتہ رفتہ چاروں طرف سے تنقید کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ بعض ناقدین کا خیال تھا کہ تعلیم اور اجتماعی کھانے کا اہتمام اتنے اونچے پیمانے پر ہونا چاہیے، جو بچوں میں آداب مجالس اور آداب طعام کا صحیح شعور پیدا کر دے کہ یہی ایک متمدن قوم کا طرہ امتیاز ہوتا ہے۔ بعض ناقدین کھانے کے انتظام کو تعلیم کا ایک ضروری جزو سمجھتے تھے، لیکن اس وقت تک کوئی متفقہ قومی فیصلہ نہ تھا جو قوم کی صحیح رہنمائی کر سکتا، اس لیے یہ مسائل، مباحث این و آں سے آگے نہ بڑھ سکے۔ کسی نے اس کی موافقت میں ایک دھواں دھار تقریر کر دی اور کسی نے اس کی خرابیوں پر ایک طویل مضمون لکھ دیا۔ غرض اس کے لیے نہ تو رائے عامہ بیدار تھی اور نہ اصحاب الرائے کو اتفاق کہ اسے اس نہج پر چلا جائے

سکول کی فلاحی خدمات کے متعلق ابھی اس قسم کی بحثیں جاری ہی تھیں کہ دوسری عالمگیر لڑائی شروع ہو گئی۔

دوسری عالمگیر لڑائی اور زمانہ مابعد | دوسری عالمگیر لڑائی اگرچہ برطانیہ کی اقتصادیات کے لیے ایک بار گراں ثابت ہوئی

لیکن زمانۂ جنگ میں ملک کو اپنی تعلیمی تنظیم کا ایسا موقع ملا جو شاید اسے آنے والے حوادث سے بچا تا رہے گا۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جب اطالوی بم باری کا خطرہ نمایاں بڑھ گیا تو حکومت نے بچوں کو محفوظ مقامات پر منتقل کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اور بچے تعلیمی و فاعی پروگرام کے مطابق غیر صنعتی علاقوں میں جو فوجی لحاظ سے اتنے اہم نہ تھے منتقل ہونے لگے تعلیمی دفاعی پروگرام کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اس سے قوم کا اخلاق بلند رہے اور بچوں کی تعلیم میں خلا نہ پیدا ہونے پائے۔ سکول کی فلاحی خدمات کے مستقل ہونے کی ابتدا دراصل تعلیمی دفاعی پروگرام کے منصوبۂ غذا سے ہوئی۔ جو بچے اپنے گھروں سے دور اپنے رضاعی والدین کے ساتھ رہتے تھے، ان کے لیے سکولوں میں کھانے کا اہتمام ضروری سمجھا گیا لیکن اس وقت تک کھانوں کے مفت اہتمام کسی کے ذہن میں نہ تھا۔ ہر مکان دار کو جس کے گھر میں دو رضاعی بچوں کے رہنے کا انتظام ہوتا، انہیں مرکزی خزانے سے ۱۹ شلنگ (تقریباً تیرہ روپے) ملتے، اور انہیں دودھ اور کھانے کی قیمت ادا کرنی پڑتی، اس سے بعض ایسی انتظامی دشواریاں پیدا ہو گئیں جن سے کام آسان ہونے کی بجائے اور مشکل ہو گیا۔ مرکزی خزانے سے جو رقم مکان دار کو ملتی، اس کا حساب علاحدہ اور جو رقم مکان دار کو رضاعی بچوں کے کھانے کے سلسلے میں دینی پڑتی اس کا انتظام علاحدہ، یہ حساب کتاب کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ تھا۔

ستمبر ۱۹۳۹ء ہی میں بورڈ نے فیصلہ کیا کہ قوم کے اخلاق کو بلند رکھنے میں اور بچوں کو ضروری سہولتیں بہم پہنچانے میں مقامی تعلیمی حکومتیں جو رقم خرچ کریں گی وہ ان کا حق اعانت سمجھا جائے گا اور یہ رقم (سو فی صد) انھیں مرکزی خزانے سے ادا کی جائے گی۔ بالخصوص ان سکولوں میں جہاں طلبہ کے دو گروہوں کو باری باری تعلیم دی جاتی ہے، ایسی مرکزی اعانت سے وافر سہولتیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں، بالخصوص ایسے بچوں کو جو ذرا سکول سے دور رہتے ہیں کھانا مہیا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان بچوں کو جو سکول کے نزدیک ہی رہتے ہیں اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے بورڈ نے بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ بچوں کو دوپہر کے وقت ہر سکول میں کھانا مہیا کیا جائے۔ اس میں دور یا نزدیک، مقامی یا غیر مقامی کی تفریق صحیح نہیں۔ لیکن بورڈ کے اس فیصلے پر عمل درآمد نہ ہوا، اس کے چند اسباب تھے، اول یہ کہ مکان دار ایک شلنگ آٹھ پنس ایک کھانے کی قیمت مناسب نہ سمجھتے تھے، دوم یہ کہ بچوں کو خود اس سکیم سے اتفاق نہ تھا۔ سوم یہ کہ سکولوں میں بالعموم جگہ کی قلت تھی، ان دشواریوں کی وجہ سے بورڈ کی سکیم اس حد تک کامیاب نہ ہو سکی جس کی توقع کی جاتی تھی، اس کے باوجود جہاں اس قسم کی سہولتیں تھیں اور والدین اور بچوں کا بھی یہ ذہنی کھنچاؤ موجود نہ تھا، وہاں بچوں کو فائدہ پہنچا۔

تقریباً پچاس فی صد بچوں نے لندن اور دوسرے بڑے بڑے صنعتی مقامات سے گاؤں یا کسی اور محفوظ مقام کا

سفر کیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد بچوں نے گھر واپس آنا شروع کر دیا۔ بعض سکول بند کر دیے گئے اور بعض فوجی ضروریات کے لیے خالی کرا لیے گئے۔ اساتذہ کی ایک بڑی تعداد جنگ کے مختلف محکموں میں کام کرنے کے لیے رخصت ہو گئی۔ اپنے نامساعد حالات میں کھانے کا اہتمام اور بچوں کو تعلیمی سہولتیں بہم پہونچانا آسان کام نہ تھا۔ بچوں کے انخلائی سکیم کی ناکامیابی کی سب سے بڑی وجہ والدین کی آمد و رفت تھی۔ بعض بچے اپنے نئے ماحول سے ہم آہنگی نہ پیدا کر سکے۔ بعضوں کو مچھلی اور آلو کے قتلے یاد آنے لگے اور بعضوں کو گاؤں کی بھیانک فضا پسند نہ آئی۔ حکومت نے یہ احساس کیا کہ انخلائی سکیم دراصل ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ اگر یہ سکیم باقاعدہ کسی منصوبے کے مطابق عمل میں آتی تو شاید کامیاب ہو جاتی۔ لیکن یہاں تو بچوں کو منتقل کرنے سے پہلے اس قسم کی تجویز پر غور نہیں کیا گیا۔ ایک ہنگامی اور اتفاقی معاملہ تھا۔ چوں کہ حملے کا اندیشہ ہے، اس لیے بچوں کو محفوظ مقامات پر پہونچا دو۔ جب حالات زیادہ بگڑے تو حکومت نے فیصلہ کیا کہ کوئی سکول بچوں کی تعلیم کے لیے اس وقت تک استعمال نہ کیا جائے جب تک اس میں ہوائی حملے سے بچاؤ کا انتظام نہ ہو۔ سنہ ۱۹۴۲ء کے شروع میں جنگ ایک خوفناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ اطالوی بم باز مشرقی لندن بلکہ وسط لندن کی بعض اہم عمارتوں کو برباد کر چکے تھے۔ مشرقی ساحل کی ساری آبادی اطالوی بم بازوں کے لیے بالکل کھلی ہوئی تھی۔ لڑائی کی اس گہما گہمی کا اثر سکول کے کھانے اور دودھ پر بھی پڑا۔ اس میں تقریباً ۴۰ فی صد تخفیف ہوئی۔ مواصلات کی غیر یقینی صورت۔ بسوں کی کمی۔ پیٹرول کا کال۔ حتیٰ کہ دودھ کے لیے چھوٹی چھوٹی بوتلوں کا فراہم کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ مشکلات ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں تھیں۔ سماجی نکتہ چینیوں نے اس کی تمام تر ذمہ داری ایجوکیشنل کمیٹیوں کی عدم تعمیر پر رکھی اگر سکولوں میں ماقبل جنگ ایسے انتظامات ہوتے تو اس قسم کی دشواریاں پیش نہ آتیں۔ یہی نہیں بلکہ بچوں کی تعلیم میں موجودہ انتشار نہ ہوتا اور شاید حالات اس سے بہتر ہوتے۔

ایٹلی کی کوششیں

سنہ ۱۹۴۳ء کی سرگرمیوں میں سماجی اجتماعیت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ تباہ کن تباہیاں ہنوز سروں پر منڈلا رہی تھیں تباہی و بربادی کی رفتار اتنی ہی سریع تھی۔ اس نے خیالات میں یک جہتی اور انتظامی کل میں ایک نئی حرکت پیدا کی۔ سکول کو فلاحی خدمات کا ایک وسیلہ بنا دیا۔ حکومت اور عوام دونوں کے رجحانات فکر میں تغیر پیدا ہوا۔ مسٹر ایٹلی (لارڈ ایٹلی۔ پرائم منسٹر ۱۹۴۵ء تا سنہ ۱۹۵۱ء) اس وقت کی قومی حکومت میں نائب وزیر اعظم اور لارڈ پریوی سیل تھے۔ وہ چوں کہ خود لیبر پارٹی کے سربراہ تھے۔ اس لیے انہیں فطری طور پر قومی تعمیر سے خاصی دل چسپی تھی۔ مفلس و نادار بچوں کی جسمانی حالت یوں بھی اہم

تھی اس پر ستزاد جنگ کی تباہ کاریاں۔ اس لیے موصوف نے مختلف کمیٹیوں میں اس امر پر زور دیا کہ انھیں بچوں کی خوراک کا وافر انتظام کرنا چاہیے۔ اس کے جواز میں انھوں نے جو دلائل پیش کیے ان سے دوسرے بھی انکار نہ کر سکے ان کا خیال تھا کہ اگر سکولوں میں کھانے اور دودھ کا معقول انتظام کر دیا جائے تو یہی چیز زمانۂ جنگ میں بچوں کی صحت کے تحفظ کی بہت بڑی ضمانت ہوگی۔ اس سے بعض تحصیل حاصل کوششوں اور سامان خورد و نوش کی بچت ہوگی جس سے بڑی کفایت ہو سکتی ہے۔ ایک ساتھ مل کر کھانے میں بچوں کو ایک جہتی، یگانگت، بھائی چارے اور ہمدردی کا وہ سبق دیا جا سکتا ہے جو شاید خالص تعلیمی درسوں سے ممکن نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس سے صرف قومی اخلاق ہی بلند نہ ہوگا بلکہ یہ اقدام عسکری لحاظ سے بھی موزوں ہوگا۔ اگر تقسیم خوراک کی موجودہ اکثریت کو توڑ کر اسے چھوٹے چھوٹے وحدوں میں تقسیم کر دیا جائے تو یہ ایک ایسی تنظیم ہوگی جس سے فوجی کارروائیوں میں سہولت پیدا ہو جائے گی۔ حالات سازگار تھے اور قوم ان دلائل پر کان دھرنے کے لیے تیار تھی۔ حکومت نے بھی اپنی آمادگی کا اظہار کیا، چنانچہ قومی کابینہ نے یہ فیصلہ کیا کہ بچوں کو سکول میں کھانا مہیا کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں مقامی تعلیمی حکومتوں کو مرکزی خزانے سے سو فی صد اعانت دی جائے گی۔ لیکن چند انتظامی اور مالی دشواریوں کی وجہ سے کابینہ کے اس فیصلے پر فوری عمل درآمد نہ ہو سکا۔ بورڈ اور بعض دوسری وزارتوں کا یہ خیال تھا کہ یہ کام وزارت خوراک کے سپرد ہونا چاہیے۔ محکمۂ تعلیم کا اس سے براہ راست تعلق غلط ہے۔ بورڈ کا خیال تھا کہ بچوں کی خوراک کی ذمہ داری مقامی تعلیمی حکومتوں پر عائد ہونی چاہیے۔ اس وقت کافی وزن رکھتا تھا۔ کوشش و خطا اور اس سے صحیح نتیجہ اخذ کرنا انگریز کی فطرت ہے۔ بات میں بات پیدا کرنا اور بال کی کھال نکالنا اس کی سرشت اور نجی بحث و تمحیص سے ایک نتیجے پر پہنچ جانا اس کا مقصد۔ بظاہر جنگ کے زمانے میں اس قسم کی انتظامی موشگافیاں موزوں معلوم نہیں ہوتیں۔ مگر یہ اس قوم کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کا ایک پہلو ہے۔ بحثیں ہوتی رہیں، دلیلوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن بالآخر بورڈ کو بچوں کے تغذیے کی ذمہ داری قبول کرنی پڑی۔ مرکزی زر امداد کے لیے ایک سادہ سا فارمولا طے پایا کہ بورڈ ایک تاریخ مقررہ کے اخراجات کی بنیاد پر ایک مخصوص رقم ادا کر دیا کرے گا۔ لیکن اس میں یہ احتیاط رکھی گئی کہ امیر حکومتوں کو زر اعانت کم ہے اور مفلس حکومتوں کو زیادہ۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ شرح امداد ۹۵ فی صد اور کم سے کم ۷۰ فی صد مقرر ہوئی۔ لیکن حالات اتنے ناسازگار تھے کہ بعض حکومتوں کو سو فی صد زر اعانت کی ضرورت تھی۔ کابینہ نے پھر سو فی صد زر امداد دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن بورڈ کو اس فیصلے سے اتفاق نہ تھا۔ اس کے خیال میں کسی ایسے کام میں جس کا تعلق عوامی فلاح و بہبود سے ہو

مقامی تعلیمی حکومتوں کا میدان میں آنا ضروری ہے۔ سو فی صد زرِ اعانت کسی غیر مرکزی نظامِ تعلیم میں اصولاً ایک اختلافی معاملہ ہے ان اعتراضات اور دو ایک اضافات کا یہ نتیجہ نکلا کہ تعلیمی حکومت کو ۵۰ فی صد زرِ امداد دیے جانے کا فیصلہ ہوا لیکن بعض حالات میں ۶۰ فی صد مزید زرِ امداد ان حکومتوں کو مل سکتی تھی جن کے وسائل محدود تھے تاکہ اس طرح وہ اپنے میزانیے کو متوازن بنا سکیں اور خسارے کی صورت میں اس کمی کو پورا کر سکیں۔ اس فارمولے کے مطابق بعض حکومتوں کو فلاحی خدمات کے لیے ۵۰ فی صد اور بعض کو ۳۰ فی صد اخراجات کی مزید ضرورت تھی جو مقامی محصول سے پورا کر سکتی تھیں۔ اسی زمانے میں عوام کی سہولتوں کے پیشِ نظر وزارتِ خوراک نے جا بجا برطانوی ریستوران قائم کیے۔ انھیں سکول کی خدمات سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ اور سکول کو ان پر نگاہ رکھنی پڑتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان خدمات میں ایک تعطل سا پیدا ہو گیا اور وہ انتظامی یک جہتی قائم نہ رہی جو اس کا مدعا تھا۔

ایک نیا اقدام

اکتوبر ۱۹۴۱ء میں برطانیہ کی حیثیت ایک زخم خوردہ شکار کی سی ہو رہی تھی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں جاپانی فتوحات کا سیلاب انھیں "کامیاب مراجعت"لے پر مجبور کر رہا تھا۔ اطالوی، اور اطالوی فوجیں سویز کی ناکہ بندی پر مصروف تھیں۔ اطالوی اور جاپانی آب دوز کشتیاں اور تارپیڈو دیو قامت جہازوں کو زیرِ آب کر رہے تھے۔ برطانیہ اقتصادی لحاظ سے محصور ہو گیا آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوب مشرقی ایشیا سے جو خوراک آ سکتی تھی، ان کی ترسیل کی اب کوئی سبیل نہ تھی۔ ایسی صورت میں کشور کشائی اور جہاں آرائی کا سارا نشہ ہرن ہو سکتا تھا، لیکن برطانیہ کے اوسان قائم رہے اور محاصرے کی صورت میں جو سامانِ اکل و شرب یہ جزیرہ مہیا کر سکتا تھا، اسی پر گزر اوقات کے منصوبے باندھے گئے۔ ان حالات میں بچوں کے کھانے اور دودھ کی فراہمی کا مسئلہ اور شدید بن گیا۔ یہ تو ممکن نہ تھا کہ ہر شخص کو ہر وقت شکم سیر ہو کر کھانا میسر آ جائے۔ اس لیے حکومت نے یہ محسوس کیا کہ بچوں کو کم از کم ایک وقت تو نہایت اچھا کھانا مل جایا کرے۔ خیال یہ تھا کہ کھانے کا معقول انتظام جنگی خدمات میں بھی معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ سکولوں کو راشن کی دوکانوں تک رسائی کی اجازت دی گئی۔ وہ ایک ہی وقت میں ایک سامیا سے زیادہ کے لیے سامان خرید سکتے تھے۔ حکومت اس وقت کم سے کم دس لاکھ افراد کے کھانے کا انتظام کرنے کی آرزو مند تھی چناں چہ اس کے لیے زرِ امداد میں بھی اضافے کی ضرورت پیش آئی۔ بورڈ نے ۵۰ فی صد زرِ امداد کو بڑھا کر [illegible] فی صد کر دیا، اور بعض حالات میں ۹۵ فی صد تک۔ اس سے مفلس حکومتوں کو قدرے آسانی ہو گئی اور وہ بھی دوسری حکومتوں کے دوش بدوش چلنے کی اہل ہو سکیں۔ اس انتظامی اور مالی سہولت کے بعد بورڈ نے کھانے اور دودھ کا انتظام ہر ابتدائی اور ثانوی مدرسے میں عام کر دیا۔

لے (SUCCESSFUL WITHDRAWAL)

تا اس کو سکول کے کھانے اور دودھ کے اہتمام کو ایک فلاحی خدمت تصور کیے جانے لگا۔

نومبر ۱۹۴۲ء میں حالات نے قدرے پلٹا کھایا۔ مایوسی اور شکست کے بادل رفتہ رفتہ چھٹنے لگے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کا دور وقتی طور پر دبایا جا چکا تھا "ہندوستان چھوڑ دو" کی آہنسا پر ادھوری تحریک ایک خوں چکانی دور سے گزر کر خاموش ہو گئی تھی۔ کرپس کی کارگزاریاں، روس کو اتحادیوں کے گروہ میں شریک کرا چکی تھیں۔ افریقہ، یورپ اور جنوب مشرقی ایشیا میں حالات امید افزا تھے اب یہ توقع ہو چلی تھی کہ ایک ہاری ہوئی بازی جیتی جا سکتی ہے۔ امریکہ کی شرکت نے قدرے اور توی بنا دیا اور ایک مرتبہ پھر قوم نے اپنی سماجی اور معاشری اصلاح کی طرف توجہ کی، اس وقت حکومت کے سامنے دو اہم مسائل تھے۔ سوشل انشورنس اور بچوں کے وظائف۔ کیا یہ درست ہے کہ بچوں کے وظائف نقد کی صورت میں والدین کو ادا کیے جائیں یا یہ مناسب ہوگا۔ یا یہ مناسب ہوگا کہ انھیں یہ جنس کی شکل میں دیا جائے۔ جو امداد بچوں کو براہ راست پہونچے۔ وہ اس امداد سے یقیناً بہتر ہوگی جو والدین کو نقد کی صورت میں دی جائے۔ دوسرا گروہ موجودہ وظائف کی شرح کے اضافے کے حق میں تھا۔ لیکن اول الذکر اکثریت میں تھے۔ بورڈ ۱۹۴۲ء ہی سے اعانت از روئے جنس کا قائل تھا۔ یعنی بچوں کو کھانا کھلایا جائے اور ان کے لیے کپڑے مہیا کیے جائیں۔ مرکزی خوانے نے ان اخراجات کی تفصیل کا تخمینہ لگایا۔ اس اندازے کے مطابق مشترکہ فلاحی خدمات کا خرچ ساڑھے سات کروڑ (۷۵۰۰۰۰۰۰) پونڈ کے لگ بھگ ہوگا جس کی تفصیلات یہ ہیں:-

(۱)	خوراک	۳۵۰۰۰۰۰۰ پونڈ
(۲)	دودھ	۷۰۰۰۰۰۰ "
(۳)	لوازمہ	۲۵۰۰۰۰۰ "
(۴)	طبی امداد	۲۵۰۰۰۰۰ "
(۵)	کپڑے	۳۵۰۰۰۰۰ "
	کل	۷۵۰۰۰۰۰۰ " (یہ رقم روپوں میں تخمیناً ایک ارب ہوگی)

لیبر پارٹی کے بیشتر افراد اس کے حق میں تھے۔ بالخصوص مسٹر بیون (BEVAN) جو ابھی حال ہی میں لیبر پارٹی کے خزانچی مقرر ہوئے ہیں، بچوں کے وظائف کے خلاف تھے۔ ان کے خیال میں اگر مختلف خدمات کو یک جا کر دیا جائے تو انتظامی سہولتیں بھی ہو جائیں گی۔ اور بچوں کو بھی براہ راست فائدہ پہنچے گا۔ حکومت بھی اب ان خدمات میں نسبتاً زیادہ دلچسپی لینے لگی۔

اور بعض ایسے ارباب فکر بھی جو اگرچہ حکومت کے رکن نہ تھے۔ لیکن انھیں تعلیم اور بچوں سے ایک فطری رابطہ تھا، ان کے ہم خیال تھے۔

بیورج رپورٹ

اس ذہنی اور فکری پس منظر میں بیورج رپورٹ (BEVERIDGE REPORT) شائع ہوئی۔ سماجی فلاح و تحفظ کے ختم کرنے کے سلسلے میں یہ ایک جامع رپورٹ ہے۔ حکومت فلاح عامہ کے مختلف شعبوں کو یک جا کر دینا چاہتی تھی۔ بیورج رپورٹ نے سوشل انشورنس اور بچوں کے وظائف کی سفارش کی۔ ساتھ ہی ساتھ اس امر کو بھی واضح کر دیا کہ اگر یہ امداد جنس کی شکل میں ادا کی گئی تو وظیفے کے نقد کی شرح کم ہو جائے گی۔ سوائے پہلے بچے کے باقی سارے بچوں کو آٹھ شلنگ فی ہفتہ وظیفہ ملے گا۔ اس نے رپورٹ میں یہ بھی سفارش کی کہ فلاح عامہ کے مختلف شعبوں کو ایک کر دیا جائے۔ سکول کی طبی امداد اور بچوں کی دیکھ بھال کا اب تک ایک علاحدہ محکمہ تھا۔ بیورج رپورٹ نے اس اجتماعی نیشنل ہیلتھ سروس میں ضم کر دیا۔ درا صل اس رپورٹ کی سفارش انگلستان میں فلاح عامہ کے کاموں کو ایک قومی حیثیت دینے میں پہلی اہم قومی تحریک کا درجہ رکھتی ہیں جنھوں نے رفتہ رفتہ انگلستان کو ایک فلاحی ریاست کی منزل تک پہونچا دیا۔

یہی وہ زمانہ ہے کہ مسٹر بٹلر نائب صدر تعلیمی بورڈ ایک نئے نظام تعلیم کی تشکیل کے لیے مواد فراہم کر رہے تھے۔ حکومت کی امداد اور تعاون کے لیے گرین بک شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بھی فلاحی خدمات پر زور دیا گیا۔ حتیٰ کہ تعلیمی قانون مجریہ ۱۹۴۴ء نے ان فلاحی خدمات کو ایک مستقل مقام عطا کیا۔

"ہر منظور شدہ سکول میں کھانا اور دودھ مفت مہیا کیا جائے گا"

اس نے مقامی تعلیمی حکومتوں کے سکولوں اور کلیسائی سکولوں کی تمیز بھی مٹا دی۔ اب تک اس سلسلے میں جو کوششیں ہوئیں، ان کا تعلق صرف تعلیمی حکومتوں کے مدارس سے تھا۔ کلیسائی سکولوں کو ان مسائل سے کم کم تعلق تھا۔ لیکن ۱۹۴۴ء کے بعد سے ہر سکول میں کھانے اور دودھ کا انتظام جاری ہے۔ لندن کاؤنٹی کونسل کے جامع مدارس میں نیز دوسرے گرامر سکینڈری ماڈرن اور ٹیکنیکل سکولوں میں اس کا نہایت معقول انتظام ہے۔ لندن کی طرح کاؤنٹی کونسلوں میں بھی اس کا انتظام تسلی بخش ہے۔ چناں چہ اس سے یہ اندازہ لگانا کہ سارے ملک کی عمومی حالت کچھ اسی قسم کی ہوگی میرے خیال میں مبالغہ نہیں۔

اساتذہ کا پارٹ

سکول کی فلاحی خدمات میں اساتذہ ایک اہم پارٹ ادا کرتے ہیں۔ کھانے کے وقت بچوں کی نگرانی اساتذہ کے روزمرہ کے فرائض میں شامل ہے۔ لیکن انتظامی لحاظ سے مختلف سکولوں میں اس کی مختلف نوعیت ہے۔ مثلاً دین کرائی سکول میں جو مشرقی لندن میں ہے اساتذہ اور طلبہ ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ چند سینئر طلبہ باری باری کھانا چننے کے فرائض انجام دیتے ہیں، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ طلبہ قطار میں باری باری اپنا کھانا لیتے ہوئے اپنی نشستوں پر آکر بیٹھ جاتے ہیں، اور کھانا کھا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ ہیٹ فیلڈ سکول میں کھانے کا انتظام نسبتاً زیادہ بہتر ہے۔ طلبہ عمر کے لحاظ سے دو گروہوں میں تقسیم ہیں۔ کم عمر جماعتیں تقریباً بارہ بجے ڈائننگ ہال میں پہنچ جاتی ہیں۔ ہر بچے کی نشست مخصوص ہے۔ ان میں سے باری باری دو طلبہ روزانہ کھانا لاتے ہیں اور میز پر چن دیتے ہیں اور اس کے بعد برتنوں کو اٹھا کر میز کو صاف کر دیتے ہیں۔ یہ ان کا فرض ہے کہ اپنی میز کو جس حالت میں پائیں اسی حالت میں چھوڑ کر جائیں۔ تاکہ دوسرے بچوں کو زحمت نہ ہو۔ اساتذہ باری باری ایک ایک میز پر ہوتے ہیں۔

پاکستان سے موازنہ

ایک ترقی یافتہ قوم کے ارباب حکومت، مبصرین سیاست اور ماہرین تعلیم کا یہ خلوص اور یہ جذبہ کار قابل توصیف ہی نہیں لائق تقلید بھی ہے۔ برطانیہ نے تجربہ کیا اور منزل پر پہنچنے کا راستہ دریافت کیا، کوششیں کیں، صعوبتیں اٹھائیں، کڑیاں سہیں تو اس مقام پر پہنچا۔ لیکن ہمارے سامنے تو ترقی یافتہ قوموں کے تجربوں کے انبار ہیں۔ ہم ان خطوط پر اپنے لیے ایک نئی راہ متعین کر سکتے ہیں جو ہمارے مزاج اور ہماری ضروریات کے مطابق ہو۔ راستہ چلنے ہی سے منزل کی تعیین ہوتی ہے۔ پاؤں کو جنبش دینے ہی سے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم نے مغرب کے لباس معاشرت کی نقالی ہی کو عین تمدن سمجھ لیا ہے اور ہماری حیثیت نائجیریا کے اس سیمی حبشی سے زیادہ وقیع نہیں جو مغربی امراء کے انداز میں اپنی موہوم امارت پرستی کی طلسماتی چھتری ہلاتا ہوا ویسٹ منسٹر کے کسی علاقے میں پھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اسے یہ احساس نہیں کہ جس کی خاطر اس نے اپنی زبان اپنی تہذیب اور اپنے ہست و بود کا سودا کیا ہے، اس پر اس کے تمدن آفرین آقا ایک قہقہہ لگاتے ہیں۔ ایک ایسا قہقہہ جو فضا کو زہرناک بنا دیتا ہے ——— ہاں اسلام اس کا نام ہے۔ شعائر اسلامی اسی کو کہتے ہیں۔ وقت کے دکھوں کا یہی مداوی ہے:

سائنسی مساوات کی تدریس

محمد حسین

ابتدائے مطالعہ میں یہ موضوع شاید کچھ غیر مانوس سا محسوس ہو کیوں کہ سائنسی مساواتیں جو کہ علم کیمیا کا ایک حصہ ہیں۔ کی تدریس کوئی علیحدہ مضمون نہیں لیکن ان کا جو موجودہ طریقۂ تدریس ہے وہ بہت ہی ناقص ہے اور زبردستی طلبہ پر ان مساوات کو ٹھونسنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس قسم کے طریقۂ تدریس سے طالب علموں کے ذہن کند ہو جاتے ہیں۔ طلبہ میں جدت پسندی اور سوچ بچار کا مادہ بالکل مفقود ہو جاتا ہے۔ برعکس اس کے کہ انہیں سائنس میں نئی چیزیں دریافت کرنے کا موقعہ عطا کیا جائے، انہیں بے کار محض قسم کی مساوات رٹنے میں وقت ضائع کرایا جاتا ہے۔

سائنسی مساوات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اردو زبان میں جس طریقہ سے ان کی تدریس ہوتی ہے، وہ طلبہ کے لیے ذہنی بوجھ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس طریقۂ تدریس میں مندرجہ ذیل خامیاں ہیں۔

(۱) طلبہ اردو زبان میں مساوات میں کیمیائی عمل کرنے والے مرکبات کے ترکیبی عناصر کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

(۲) اساتذۂ کرام طلبہ کو مساوات امتحانی نقطۂ نگاہ سے پڑھاتے ہیں۔

(۳) طلبا محض امتحان پاس کرنے کی غرض سے چند ماہ پہلے مساوات رٹ لیتے ہیں، اور جب کالج میں جاتے ہیں تو بالکل کورے ہوتے ہیں۔

(۴) سکول چھوڑنے کے بعد جب طلبہ کالج میں داخل ہوتے ہیں تو انہیں وہاں سائنسی مساوات اور دیگر مضامین انگریزی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں۔

(۵) سکولوں کے طلبہ کے لیے درسی کتابوں میں سائنسی مساواتیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں درج کر دی جاتی ہیں جس سے طلبہ بہت پریشان ہوتے ہیں۔ کبھی وہ انگریزی کی مساوات کو دیکھتے ہیں اور کبھی اردو میں لکھی ہوئی مساوات کو۔ طالب علم ایک عجیب ذہنی کوفت محسوس کرتا ہے، اور سوچتا ہے کہ وہ کون سی مساوات یاد کرے۔

محکمہ تعلیم کی طرف سے میٹرکولیشن تک کا ذریعہ تدریس اردو زبان ہے۔ لیکن اس سے اوپر سب مضامین کا تدریسی ذریعہ انگریزی زبان ہے۔

...یزی اور اردو کا مقابلہ

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی ایک وسیع اور بین الاقوامی زبان ہے۔ یہ زبان اب بھی ہمارے سکولوں، کالجوں میں ذریعۂ تدریس ہے۔ سائنس کی تمام شاخوں میں آج تک جو ترقی ہوئی ہے وہ سب کی سب انگریزی ...میں ہوئی ہے۔ سائنسی اصطلاحات بین الاقوامی طور پر انگریزی زبان میں اختیار کی گئی ہیں موجودہ سائنسی ترقی سے ...ہنے کے لیے ہمیں انگریزی طریقۂ تدریس سائنس کا جاننا اور بھی ضروری ہے۔

سائنسی مساوات کو انگریزی طریقۂ تدریس سائنس کے ذریعہ سمجھا جائے اور پڑھایا جائے تو نہایت سہل اور ...ن کام ہے لیکن جب کام اردو میں کیا جائے تو بہت مشکل اور کٹھن ہو جاتا ہے۔ جو تسلسل انگریزی میں ہے۔ ...اردو میں ناپید سا دکھائی دیتا ہے۔ یا آج تک کسی نے اس موضوع کی طرف خاص توجہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مندرجہ ...مثال دیکھیے۔

—" اگر جست پر گندھک کا ترشہ ڈالا جائے تو کیا کیمیائی عمل ہوگا؟"

انگریزی طریقۂ تدریس سے اس کو ہم یوں ظاہر کریں گے۔

$$ZN + H_2SO_4 \longrightarrow ZNSO_4 + H_2$$

اردو میں اس کو یوں ظاہر کریں گے:- جست + گندھک کا تیزاب ← زنک سلفیٹ + ہائیڈروجن یا زنک + ...زک ایسڈ ← زنک سلفیٹ + ہائیڈروجن۔

انگریزی میں لکھی ہوئی مساوات پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہی پتہ لگ جاتا ہے کہ جست گندھک کے ترشہ کے ...ٹ گروپ (RADICAL) کے ساتھ مل کر زنک سلفیٹ بناتا ہے اور باقی ہائیڈروجن رہ جاتی ہے۔

اس کے برعکس اردو میں لکھی ہوئی مساوات کے سر پیر کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ایک نویں یا دسویں جماعت کے ...طالب علم کے لیے جست کو زنک، تانبہ کو کاپر، لوہے کو آئرن، ترشہ گندھک کو سلفیورک ایسڈ، ترشہ نمک کو ہائیڈرو...ک ایسڈ اور ترشہ شورہ کو نائٹرک ایسڈ یاد رکھنا بہت مشکل ہے۔ اکثر طلبہ اس کشمکش میں کچھ نہیں پاتے۔

اردو زبان اور انگریزی زبان کا بنیادی فرق یہ ہے کہ اردو زبان میں لکھی ہوئی مساوات کے عاملوں کی ترکیب کا اس طرح سے پتہ نہیں چلتا جس طریقہ سے انگریزی زبان میں لکھی ہوئی مساوات کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی زبان کے حروف ابجد کو متعلقہ عناصر کی علامت (SYMBOL) مقرر کیا ہوا ہے۔ مثلاً آکسیجن گیس کے لیے "O" ہائیڈروجن کے لیے "H" اور کاربن کے لیے "C" وغیرہ وغیرہ۔ اردو زبان میں آج تک اس قسم کی کوشش نہیں کی گئی، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ اردو میں کارآمد سائنسی مساوات تیار نہ ہو جاتیں اور ہم . . . . اپنی قومی زبان میں انگریزی جیسی وسعت پیدا کرنے میں اس قدر پیچھے رہتے۔ صرف میٹرک تک کے سلیبس کی سائنسی مساوات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر عنصر کو اردو علامت (SYMBOL) مقرر کرنے کی ایک کوشش درج ذیل ہے:

عنصر	علامت	عنصر	علامت
آکسیجن کے لیے	ا	کاربائیڈ کے لیے	کا^{۲}
برم کے لیے	ب	سلفیٹ کے لیے	سا^{۴}
پارہ یا مرکری کے لیے	پ	سلفیورس کے لیے	سا^{۳}
ٹن یا قلعی کے لیے	ٹ	کلورائیڈ کے لیے	(کلو^{۲})
چاندی کے لیے	چ	کلوریٹ کے لیے	کلوا^{۳}
زنک یا جست کے لیے	ز	سوڈیم کے لیے	سو
سلفر یا گندھک کے لیے	س	پوٹاشیم کے لیے	پو
طلا کے لیے	ط	کیلشیم کے لیے	کیل
فاسفورس کے لیے	ف	میگنیشیم کے لیے	میگ
کاربن کے لیے	ک	ایلومینیم کے لیے	ایلو
لوہا کے لیے	ل	امونیم کے لیے	امو
مینگنیز کے لیے	م	کرومیم کے لیے	کرو
نائٹروجن کے لیے	ن	کوبالٹ کے لیے	کو

ہائیڈروجن	کے لیے	ھ
تانبہ	کے لیے	ت
سوڈیم	کے لیے	س
آکسائڈ	کے لیے	آ
ڈائی آکسائڈ	کے لیے	آ۲
ٹرائی آکسائڈ	کے لیے	آ۳
نائٹرائٹ	کے لیے	نا۲
نائٹریٹ	کے لیے	نا۳
کاربونیٹ	کے لیے	کا۲

پلاٹینم	کے لیے	پٹنم
یورنیم		یو

نمک کے تیزاب کے لیے = ھکلو

شورہ کے تیزاب کے لیے = ھنا۳

گندھک کے تیزاب کے لیے = ھ۲سا۴

مساواتیں بنانا

میٹرک تک کے لیے مندرجہ بالا علامات (Symbols) ہر قسم کی مساوات کی تشکیل کے لیے کافی ہیں۔ مزید کوشش سے اس سلسلہ کو اور زیادہ وسعت دی جا سکتی ہے۔ انٹرمیڈیٹ اور (ایس سی) کے لیے بھی مساوات اسی طریقہ پہ بنائی جا سکتی ہیں۔

مثالیں:۔ (۱) زنک پر گندھک کے تیزاب کا اثر یعنی زنک + سلفیورک ایسڈ ← زنک سلفیٹ + ہائیڈروجن اس کو ہم علاماتی طریقہ سے اس طرح ظاہر کریں گے۔ ز + ھ۲سا۴ ← زسا۴ + ھ۲ اس علاماتی مساوات کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہوگا

زنک جمع سلفیورک ایسڈ برابر ہے زنک سلفیٹ جمع ہائیڈروجن گیس کے۔

(۲) سوڈیم اور پانی کا عمل۔ لکھنے کا علاماتی طریقہ س + ھ۲آ ← س ھا + ھ۲

پڑھنے کا طریقہ:۔ سوڈیم + پانی برابر ہے سوڈیم ہائیڈرو آکسائڈ + ہائیڈروجن کے۔

(۳) سوڈیم کلورائڈ اور سلور نائٹریٹ کا عمل۔

لکھنے کا علاماتی طریقہ:۔ س کلو + چنا۳ ← چکلو + س نا۳

پڑھنے کا طریقہ۔ سوڈیم کلورائڈ جمع چاندی نائٹریٹ برابر ہے چاندی کلورائڈ + سوڈیم نائٹریٹ کے

(۴) پارے اکسائڈ کو گرم کرنے سے ــــ لکھنے کا علاماتی طریقہ پاآ گرم ← پا + آ

پڑھنے کا طریقہ:۔ پارہ اکسائڈ گرم کرنے پر برابر پارہ + آکسیجن کے

(۵) زنک پر نیلے تھوتھے کا اثر ــــ لکھنے کا علاماتی طریقہ ز + تسآ ← زسآ + ت

پڑھنے کا طریقہ:۔ زنک جمع تانبہ کا سلفیٹ برابر ہے زنک سلفیٹ + تانبہ کے۔

اختصار کے لیے میں نے صرف پانچ مثالوں پر اکتفا کی ہے۔ مزید کے لیے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ عبارت میں بھی مساوات کے عاملوں کی ترکیب کا پتہ نہیں چلتا، لیکن جب اس مساوات کو ہم علامات میں ظاہر کرتے ہیں تو ہم ا پر نظر ڈالتے ہی مساوات کا دوسرا حصہ لکھ سکنے کے قابل ہو جاتے ہیں کہ ان عاملوں کے ملنے سے کیا کیا نئی چیزیں پیدا یہ ٹھیک ہے کہ شروع میں یہ طریقہ کچھ اجنبی اور عجیب سا محسوس ہوگا۔ لیکن جب تو دم کا رجحان اپنی ایک چیز تو میانے پر ہو تو اجنبیت وغیرہ سب دور ہو جایا کرتی ہیں۔ یہ علم باقاعدہ مشق اور تحقیق سے بہت وسیع کیا جا سکتا ہے۔ ہماری قو میں وہ لچک اور گنجائش موجود ہے جو سائنس کی مساوات کے لیے درکار ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی وس انگریزی زبان سے کہیں زیادہ ثابت ہو سکتی ہے۔ میرے مشاہدہ میں یہ چیز آئی ہے کہ پہلے حرف سے شروع ہونے عناصر اردو زبان میں سولہ بنتے ہیں۔ جبکہ انگریزی میں ایسے عناصر کی تعداد صرف دس تک محدود ہے۔ پہلے دو حر سے شروع ہونے والے عناصر کی تعداد بھی کافی ہے۔ اور علامات انگریزی زبان کے مقابلے میں زیادہ آسان ہیں۔ اور کے طریقے میں بھی انگریزی میں لکھی ہوئی مساوات کا مقابلہ کرتی ہیں۔

مخالفت کے باوجود اردو زبان مقبول عام ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف تو اقوام متحدہ کا ادارہ "یونیسکو" بھی جریدہ CURATOR میں کر چکی ہے کہ انگریزی کے بعد سب سے زیادہ بولی جانے والی اور سمجھی جانے والی زبا اردو ہے۔

اب جبکہ حکومت ذریعہ تعلیم اردو میں نافذ کر چکی ہے تو ہمارا بھی فرض ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ سہل آسان بنا کر پیش کریں۔ اس کے لیے مسلسل محنت اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ محنتی افراد کی ہمارے ملک میں کمی نہ اور نہ ایسے لوگوں کی کمی ہے جو تحقیقی کام کر سکیں۔ مگر کسی جامع سکیم کے تحت کام نہیں ہو رہا۔ سائنس کی جان تحقیق

اس کے بغیر سائنس کا پھلنا پھولنا بہت مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں سے موجودہ دور میں کوئی موجد یا نامور سائنس دان پیدا نہیں ہو سکا۔

ہم صرف دوسروں کا تحقیق کیا ہوا علم کتابوں سے پڑھ کر روزگار حاصل کرنے کے قابل بن جاتے ہیں۔ اکثر اس سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔

اب وقت ہے۔ اگر ہم پاکستان کو مضبوط توانا اور دشمن سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ریسرچ کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ پاکستان کی جنگ میدان کارزار کی بجائے۔ سکولوں۔ کالجوں۔ تجربہ گاہوں اور لائبریریوں میں ہی جیتی جا سکتی ہے ÷

ثانوی مدارج میں ریاضی کا نصاب

فضل محمد خاں مسلسل نمبر ۳

آموزش کے جولائی نمبر میں اس موضوع سے متعلق پہلی قسط شائع ہوئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ریاضی کو نویں اور دسویں جماعت کے نصاب کا لازمی جزو قرار دینا کیوں ضروری ہے۔ اس موضوع سے متعلق دوسری قسط میں جو کہ ماہ اکتوبر کے آموزش میں شائع ہوئی تھی اس امر کو واضح کیا گیا تھا کہ ریاضی کو نویں اور دسویں جماعت کے نصاب میں اختیاری مضمون کی حیثیت دینے کے حق میں کیا دلائل دیے جا سکتے ہیں۔ دونوں شماروں میں ہم نے ان لوگوں کے خیالات کا اظہار کیا ہے جو انتہا پسند ہیں۔ اس شمارے میں ہم ان لوگوں کے دلائل پر بحث کرنا چاہتے ہیں جن کا نظریہ متذکرہ بالا دونوں گروہوں کے نظریے کے بین بین ہے۔ اس گروہ کا یہ خیال ہے کہ ثانوی مدارج میں ریاضی کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ ایک حصہ جو مختصر سے نصاب پر مشتمل ہو وہ سب کے لیے لازمی ہو اور اس میں ایسے موضوع شامل کیے جائیں جو زندگی سے مربوط ہوں، اور دوسرا حصہ اختیاری ہو۔ اس اختیاری حصے میں ریاضی کی مختلف شاخوں کے ان موضوعات پر بحث ہو جن کو ثانوی مدارج کے وہ بچے جن میں ریاضیاتی صلاحیتیں موجود ہوں آسانی سے آسانی سے سمجھ سکتے ہوں۔ یا یہ ان طلبہ کے لیے کارآمد ہو جن کو میٹرکولیشن پاس کرنے کے بعد ایسے شعبوں میں داخل ہونا ہے، جہاں ریاضی کا بے حد استعمال ہو یا وہ طالب علم اس کورس کو پڑھیں جن کو کالجوں میں جا کر اعلیٰ ریاضی کی تعلیم حاصل کرنا ہو۔

ریاضی کے نصاب کا دو حصوں میں تقسیم کرنا

یہ اسکیم کوئی نئی اسکیم نہیں ہے۔ ڈھاکہ، پٹنہ، کلکتہ اور حیدرآباد دکن (عثمانیہ) یونیورسٹیوں میں تو تقسیم ہند سے قبل یہ اسکیم رائج تھی۔ کراچی بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے گذشتہ سال سے اس اسکیم کو کراچی فیڈرل ایریا کے ثانوی مدرسوں کے لیے رائج کر دیا ہے۔ صرف ہندوستان اور پاکستان میں ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی اسکیم رائج ہے۔ مثلاً اطالیہ میں دو قسم کے ثانوی مدارس ہیں۔ کلاسیکل اور سائنٹیفک — CLASSICAL AND SCIENTIFIC

دونوں میں ریاضی لازمی مضمون ہے، مگر دونوں قسم کے اداروں میں ریاضی کا نصاب جداگانہ ہے۔ اول الذکر میں ریاضی کا نصاب بہت آسان ہے اور موخرالذکر میں یہ نصاب کافی وسیع ہے۔ برمنی میں چھے قسم کے ثانوی مدارس ہیں۔ ان سب مدارس میں ریاضی لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے۔ مگر سب اداروں میں نصاب مختلف ہے۔ باہم میں تین قسم کے ثانوی مدارس ہیں۔ کلاسیکل، لیٹن میتھیمیٹکس اور موڈرن لینگویجز۔ (CLASSICAL, LATIN - MATHEMATICS AND MODERN LANGWAGES)

ان سب میں ریاضی لازمی مضمون ہے۔ مگر دونوں قسم کے مدارس کا ریاضی کا نصاب مختلف ہے۔ امریکہ کے ثانوی مدارس میں نویں جماعت کے لیے دو قسم کا ریاضی کا نصاب ہے (۱) عام ریاضی اور (۲) الجبرا - عام ریاضی ان طلبہ کے لیے ہے جن میں ریاضی کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے۔ اور الجبرا ان طلبہ کے لیے جن کو آگے چل کر اعلیٰ ریاضی کی تعلیم حاصل کرنا ہوتی ہو۔

دونوں نصابوں کے موضوع

یہاں پر یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ ان ملکوں کے نصابوں کا جہاں ریاضی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی اسکیم رائج ہے۔ اگر جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر آتے ہیں کہ حساب - الجبرے کے مبادیات - تجربی ہندسہ - مسلحات حساب کتاب کے مبادیات - اور عددی علم مثلث لازمی نصاب کا جزو ہیں۔ گو ہندوستان اور پاکستان کی یونیورسٹیوں اور بورڈوں نے جہاں یہ اسکیم مروجہ ہے موخرالذکر کو نصاب میں شامل نہیں کیا گیا۔ ان تمام علاقوں میں لازمی تدریس ریاضی کا تصور یہ ہے کہ ریاضی کی متذکرہ بالا شاخوں سے ہر بچے کی تھوڑی بہت واقفیت ضروری ہے۔ اور ریاضی کی متذکرہ بالا شاخوں کے ایسے موضوع جن کی زندگی میں افادی اہمیت ہے سب کو لازمی طور پر پڑھائے جانے چاہئیں۔ اختیاری ریاضی میں عموماً اعلیٰ الجبرا اور اعلیٰ علم مثلث شامل ہیں۔ یہ وہ مضمون ہیں جن پر اعلیٰ ریاضی کی تحصیل کا دارومدار ہے۔

سکیم کے فوائد

اس اسکیم کے رائج کرنے کے کئی ایک فائدے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ لازمی نصاب میں سے پیچیدہ اور مشکل موضوعات دور ہو جائیں گے جن پر مہارت حاصل کرنے کے لیے ان بچوں کو جن میں ریاضی کی صلاحیت بہت کم ہے بہت زیادہ وقت لگانا پڑتا ہے۔ لہٰذا جو وقت یہ طلبہ اختیاری ریاضی کو چھوڑنے سے بچالیں گے وہ دوسرے مضامین کی تحصیل میں جن سے ان طلبہ کو دلچسپی ہے لگا۔ ان مضمونوں میں اپنی قابلیت کے معیار کو بڑھالیں گے۔ اسکا

دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اختیاری ریاضی کو صرف وہ طالب علم پڑھیں گے جن میں ریاضی کی صلاحیت ہے۔ اس لیے اختیاری ریاضی کے نصاب کا معیار کافی بلند کیا جا سکتا ہے اور یہ اتنا ہی بلند کیا جا سکتا ہے جتنا کہ مغربی ممالک میں دسویں جماعت کے اعلیٰ ریاضی کے نصاب کا معیار ہے۔ اگر ہم اپنے ہاں کے آٹھویں جماعت کا نصاب مغربی ممالک کی آٹھویں جماعت کے نصاب سے مقابلہ کریں تو ان میں زیادہ فرق نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم دیتی کہ ہمارے ہاں کے طالب علم نویں اور دسویں جماعت میں بہت سا وقت تو آٹھویں تک پڑھے ہوئے نصاب کے دہرانے میں ضائع کریں، جب کہ اٹلی اور جرمنی یا کسی دیگر مغربی ملک کے بچے اس وقت کو اعلیٰ ریاضی کے موضوعات کے سیکھنے میں صرف کریں

دو شاخی تقسیم کے بعد ریاضی سے رغبت

مختلف بورڈوں اور یونیورسٹیوں کے ماتحت ثانوی مدارس کے طلبہ کی ریاضی سے رغبت کا جائزہ لینے کے لیے ان سکولوں میں ایک سوال نامہ راقم الحروف نے بھیجا۔ اس سوال نامہ میں طلبہ سے یہ کہا گیا تھا کہ وہ ان تمام مضمونوں کو جو وہ میٹریکولیشن کے امتحان کے لیے پڑھ رہے ہیں اس ترتیب سے لکھیں کہ جس مضمون کو وہ سب سے زیادہ پسند کرتے ہوں اس کو سب سے پہلے جس کو اس سے کم پسند کرتے ہوں اسے دوسرے نمبر پر۔ اور جس کو سب سے کم پسند کرتے ہوں اس کو آخری نمبر پر درج کریں۔ یہ سوال نامہ برصغیر ہند و پاک کی تین ایسی یونیورسٹیوں اور بورڈوں میں بھیجا گیا جہاں ریاضی سب کو لازمی طور پر پڑھایا جاتا تھا اور سب کے لیے ریاضی کا نصاب بھی ایک ہی تھا۔ اور ایک ایسی یونیورسٹی میں بھیجا گیا جہاں ریاضی کو دو حصوں یعنی لازمی ریاضی اور اختیاری ریاضی میں تقسیم کیا گیا تھا۔

مختلف طلبہ کو مختلف مضمونوں کے لیے جو جو مختلف جگہ دی ہے وہ نیچے کے جدولوں میں درج ہے۔ یہ یاد رہے کہ پہلی، تیسری اور چوتھی یونیورسٹی میں تاریخ اور جغرافیہ دونوں کا پڑھنا لازمی ہے۔ مگر دوسری یونیورسٹی میں تاریخ یا جغرافیہ میں سے ایک کا پڑھنا لازمی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ چوتھی یونیورسٹی میں ایک مضمون زیادہ پڑھنا پڑتا ہے۔

(I) پہلی یونی ورسٹی کے نتائج

مضامین	جگہ i	ii	iii	iv	v	vi
انگریزی	۸۸	۶۵	۶۳	۳۴	۵۹	۵۵
ریاضی	۳۶	۴۲	۵۵	۵۹	۶۵	۱۱۶
تاریخ	۳۲	۶۹	۷۸	۷۷	۶۳	۵۴

مضامین	i	ii	iii	iv	v	vi
جغرافیہ	۱۷	۴۴	۶۵	۸۱	۹۵	۷۱
اردو	۱۳۳	۶۲	۵۵	۴۸	۳۳	۴۲
اختیاری مضمون	۶۷	۹۱	۵۷	۶۵	۵۸	۳۵
میزان	۳۷۳	۳۷۳	۳۷۳	۳۷۳	۳۷۳	۳۷۳

(II) دوسری یونی ورسٹی کے نتائج

مضامین	بجملہ				
	i	ii	iii	iv	v
انگریزی	۴۱۶	۴۵۳	۴۶۶	۵۷۸	۷۳۴
ریاضی	۳۵۹	۴۳۴	۴۶۲	۵۵۰	۸۴۲
تاریخ یا جغرافیہ	۳۲۰	۵۱۹	۶۶۶	۶۷۳	۴۶۹
ہندوستانی زبانیں	۹۴۴	۵۲۰	۴۷۴	۴۱۲	۲۷۷
اختیاری مضمون	۶۰۸	۷۰۱	۵۷۹	۴۳۴	۳۲۵
میزان	۲۶۴۷	۲۶۴۷	۲۶۴۷	۲۶۴۷	۲۶۴۷

(III) تیسری یونی ورسٹی کے نتائج

مضامین	بجملہ					
	i	ii	iii	iv	v	vi
انگریزی	۲۸۵	۳۱۱	۱۲۶	۲۱۷	۸۸	۷۹
ریاضی	۲۳۶	۱۷۳	۱۹۷	۱۷۱	۱۶۵	۱۶۲
تاریخ	۸۳	۱۶۴	۲۰۳	۲۶۶	۳۱۳	۷۶
جغرافیہ	۱۰	۲۹	۱۰۷	۱۵۰	۳۱۱	۴۹۷
دو اختیاری مضامین	۴۹۰	۴۲۷	۴۷۲	۳۰۰	۲۲۷	۲۹۰
میزان	۱۱۰۴	۱۱۰۴	۱۱۰۴	۱۱۰۴	۱۱۰۴	۱۱۰۴

(دوسری طرف ملاحظہ ہو)

(IV) چوتھی یونی ورسٹی کے نتائج

مضامین	جگہ						
	i	ii	iii	iv	v	vi	vii
انگریزی	۹۶	۱۱۵	۸۷	۸۲	۳۷	۳۵	۸۱
لازمی ریاضی	۱۰۴	۱۳۷	۸۰	۵۲	۶۸	۴۴	۴۸
تاریخ	۳۲	۵۵	۷۵	۸۲	۱۰۴	۹۳	۹۲
جغرافیہ	۲۷	۵۲	۷۴	۸۴	۹۷	۱۲۴	۷۵
ہندوستانی زبانیں	۲۴۷	۷۱	۶۳	۵۶	۳۷	۳۱	۲۸
کلاسیکی زبانیں	۱۶	۶۱	۸۲	۱۰۹	۱۱۳	۸۸	۶۴
اختیاری مضمون	۱۱	۴۲	۷۲	۶۸	۷۷	۱۱۸	۱۲۵
میزان	۵۳۳	۵۳۳	۵۳۳	۵۳۳	۵۳۳	۵۳۳	۵۳۳

نسبتی رغبت معلوم کرنے کا عام طریقہ

نسبتی رغبت معلوم کرنے کا عام طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پہلی دو جگہوں پر کتنے فی صد طلبہ نے مختلف مضامین کو پڑھا ہے۔ اس نتیجہ کو ہم کہتے ہیں کہ اتنے فی صد طلبہ کو اس مضمون سے زیادہ رغبت ہے ایسا ہی ہم یہ بھی معلوم کرتے ہیں کہ کتنے فی صد طلبہ نے مختلف مضامین کو آخری دو جگہ پر لکھا ہے اس کو ہم کہتے ہیں کہ اتنے فی صد طلبہ کو اس مضمون سے کم رغبت ہے۔ ان طلبہ کی فی صد جنھوں نے مختلف مضامین کو پہلی اور دوسری جگہ لکھا ہے یا آخری جگہ لکھا ہے ذیل کے جدولوں میں درج ہے۔

(V) پہلی یونی ورسٹی کے نتائج

مضامین	پہلی دو جگہ کی فی صد تعداد	آخری دو جگہ کی فی صد تعداد
انگریزی	۴۱	۳۱
ریاضی	۲۱	۴۸۲۵

تاریخ	۲۶	۳۱
جغرافیہ	۱۶٫۵	۴۴٫۵
اردو	۵۲	۲۰
اختیاری مضمون	۴۲٫۵	۲۵

(VI) دوسری یونیورسٹی کے نتائج

مضمون	پہلی دو جگہ کی فی صد تعداد	آخری دو جگہ کی فی صد تعداد
انگریزی	۳۳	۴۹٫۵
ریاضی	۳۰	۵۳
تاریخ یا جغرافیہ	۳۱٫۵	۳۳
ہندوستانی زبان	۵۶	۲۷
اختیاری مضمون	۳۹٫۵	۲۸٫۵

(VII) تیسری یونیورسٹی کے نتائج

مضامین	پہلی دو جگہ کی فی صد تعداد	آخری دو جگہ کی فی صد تعداد
انگریزی	۵۴	۱۵
ریاضی	۳۶	۳۰
تاریخ	۲۲٫۵	۳۵
جغرافیہ	۳٫۵	۴۳
دو اختیاری مضمون	۸۳	۴۷

(صفحہ ۳۴۲ پر ملاحظہ ہو)

(VIII) چوتھی یونی ورسٹی کے نتائج

مضمون	پہلی دو جگہ کی فی صد تعداد	آخری دو جگہ کی فی صد تعداد
انگریزی	۴۰	۲۱
لازمی ریاضی	۴۵	۱۷
تاریخ	۱۲	۳۵
جغرافیہ	۱۵	۳۸
ہندوستانی زبانیں	۶۰	۱۱
کلاسیکی زبانیں	۱۴	۲۹
اختیاری مضمون	۱۰	۴۹

مندرجہ بالا جدولوں کے بغور مطالعہ کے بعد ہم مندرجہ ذیل نتائج پر پہونچتے ہیں :-

(۱) چوتھی یونی ورسٹی کے مدارس میں جہاں ریاضی کو دو حصوں یعنی لازمی اور اختیاری مضمون میں تقسیم کیا گیا ہے پہلی دو جگہ پر ریاضی کو درج کرنے والے طلبہ کی تعداد فی صد بہ نسبت دوسری یونیورسٹیوں کے زیادہ ہے۔ چوتھی یونیورسٹی میں ۴۵ فی صد طلبہ نے لازمی ریاضی کو پہلی دو جگہ میں درج کیا ہے۔ پہلی یونیورسٹی میں پہلی دو جگہ پر صرف ۱۲ فی صد نے۔ دوسری یونیورسٹی میں ۳۰ فی صد نے اور تیسری یونی ورسٹی میں ۳۴ فی صد طلبہ اس مضمون کو پہلی اور دوسری جگہ میں لکھا ہے۔ ایسے ہی آخری دو جگہ پر جن طلبہ نے ریاضی درج کیا ہے ان کی فی صد تعداد چوتھی یونی ورسٹی میں بہ نسبت باقی یونی ورسٹیوں کے طلبہ کی فی صد تعداد کے جنھوں نے ریاضی کو آخری دو جگہ پر درج کیا ہے کافی کم ہے۔ چوتھی یونیورسٹی میں یہ تعداد ۱۷ ہے۔ پہلی یونی ورسٹی میں ۴۸٫۵ دوسری میں ۵۳ اور تیسری میں ۳۰ ہے۔

(۲) نسبتی رغبت کے لحاظ سے لازمی ریاضی کو جو مقام چوتھی یونیورسٹی میں حاصل ہے وہ باقی کسی یونی ورسٹی میں حاصل نہیں۔ پہلی دو جگہ میں ریاضی کا مقام چوتھی یونیورسٹی میں دوسرا ہے۔ پہلی یونی ورسٹی میں پانچواں۔ دوسری میں آخری، اور تیسری میں تیسرا ہے۔ ایسے ہی آخری دو جگہ پر چوتھی یونی ورسٹی میں ریاضی کا مقام آخیر سے ایک کم۔ پہلی یونیورسٹی میں پہلا۔ دوسری یونیورسٹی میں پہلا اور تیسری یونی ورسٹی میں چوتھا ہے۔

(۳) چوتھی یونی ورسٹی میں جہاں ریاضی کے دو حصے کر دیے گئے ہیں لازمی ریاضی ان دو مضمونوں میں آجاتا ہے جن سے طلبہ کو زیادہ رغبت ہے۔ یہاں ان طلبہ کی فی صد تعداد جنھوں نے اس کو آخری دو جگہوں میں درج کیا ہے صرف ۱۷ ہے۔ صرف ہندوستانی زبانوں کی فی صد تعداد ریاضی سے کم ہے اور باقی سب کی زیادہ۔ یہ تعداد آخری دو جگہ پر اختیاری مضامین درج کرنے والوں کی تعداد کا تقریباً ایک تہائی اور آخری دو جگہ پر تاریخ اور جغرافیہ درج کرنے والوں کی تعداد کا نصف بلکہ اس سے بھی کم ہے۔

نسبتی رغبت معلوم کرنے کا شماریاتی طریقہ

ہم نے بارہا شماریاتی طریقہ سے نسبتی رغبت معلوم کرنے کا ذکر کیا ہے۔ چناں چہ یہ بے جا نہ ہوگا اگر مختصراً اس طریقہ سے نسبتی رغبت معلوم کرنے کا قاعدہ بتا دیا جائے تاکہ ریاضی سے دل چسپی رکھنے والے متعلمین اپنے تحقیقاتی کام میں اس سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ طریقہ مندرجہ ذیل مدارج پر مشتمل ہے۔

(۱) اس طریقہ میں تمام نتائج صفر سے ۲۰۰ تک کے اسکیل پر ظاہر کیے جاتے ہیں۔ یعنی اگر تمام طلبہ کسی مضمون کو پہلی جگہ پر درج کریں تو نسبتی رغبت کو ۲۰۰ سے ظاہر کرتے ہیں۔ اگر تمام طلبہ اس کو آخری جگہ پر درج کریں تو نسبتی رغبت کو صفر کے برابر تصور کیا جاتا ہے اور نسبتی رغبت کو ۱۰۰ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی مضمون اوسط شہرت کا ہو اور اس کو وسطی مقام پر درج کیا جائے۔

(۲) ہر جواب میں کچھ مضمونوں کو وسطی مقام سے پہلے مقاموں پر لکھا جاتا ہے اور چند کو وسطی مقام سے بعد کے مقاموں پر۔ صرف ایک مضمون کو وسطی مقام پر لکھا جاتا ہے۔ اگر مضمونوں کی تعداد طاق ہو۔ اور اگر مضمونوں کی تعداد جفت ہو تو بیچ کے دو مضمونوں کا درمیانی مقام وسطی مقام سمجھا جاتا ہے۔ یہ وسطی مقام ہمارے شماریات لگانے کا مبتدا ہے یعنی اس مقام سے شماریات لگانے کا حساب شروع کیا جاتا ہے۔ اس مقام کو صفر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب فرض کیجیے کہ مضمونوں کی تعداد پانچ ہے۔ پس تیسرے مقام کو صفر سے ظاہر کرتے ہیں۔ دوسرے مقام کو +۱ سے۔ پہلے کو +۲ سے۔ چوتھے کو -۱ سے اور پانچویں کو -۲ سے وغیرہ۔ اب فرض کیجیے کہ مضمونوں کی تعداد چھے ہے۔ پس تیسرا اور چوتھا مقام درمیانی مقام ہیں۔ ان کا وسط ۳½ ہوا۔ لہذا ۳½ ویں مقام کو ہم صفر سے تعبیر کریں گے۔ تیسرے مقام کو +½ سے دوسرے کو +۱½ سے اور پہلے کو +۲½ سے، چوتھے کو -½ ۱ سے،

پانچویں کو - ۱½ سے اور چھٹے کو - ۲½ سے۔

(۳) اب جس مضمون کی نسبتی رغبت معلوم کرنا ہو اس کے لحاظ سے تمام جوابوں کو چھانٹ لیا جاتا ہے اور یہ معلوم کر لیا جاتا ہے کہ کتنے طلبہ نے اس مضمون کو پہلی جگہ دی ہے، کتنوں نے دوسری ——— وغیرہ اور کتنوں نے آخری۔ مثلاً اگر ہم ریاضی کے لحاظ سے پہلی یونیورسٹی سے ملحق سکولوں کے طلبہ کے جوابوں کو چھانٹیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ۴۶ طلبہ نے ریاضی کو پہلی جگہ پر۔ ۳۲ نے دوسری جگہ پر۔ ۵۵ نے تیسری جگہ پر۔ ۵۹ نے چوتھی جگہ پر۔ ۷۵ نے پانچویں جگہ پر اور ۱۱۷ نے چھٹی جگہ پر رکھا ہے۔

(۴) پہلے مقام کا صفر سے فاصلہ + ۲½ ہے۔ دوسرے کا + ۱½، تیسرے کا + ½، چوتھے کا - ½، پانچویں کا - ۱½ اور چھٹے کا - ۲½۔ ہم مثبت رغبت معلوم کرنے کے لیے ۴۶ کو + ۲½ سے، ۳۲ کو + ۱½ سے اور ۵۵ کو + ½ سے، ۷۵ کو - ۱½ سے اور ۱۱۷ کو - ۲½ سے ضرب کرتے ہیں۔ اس مثال میں مثبت رغبت ۱۸۰٫۵ ہے اور منفی رغبت ۴۱۷ ہے۔

(۵) پھر ہم مثبت رغبت اور منفی رغبت کا جبریہ مجموعہ لیتے ہیں اور وہ سکور بھی معلوم کرتے ہیں جب کہ تمام طلبہ اس مضمون کو پہلی جگہ پر درج کرتے ہوں۔ اس مثال میں جبریہ مجموعہ + ۱۸۰٫۵ - ۴۱۷ = - ۲۳۶٫۵ اور ممکن سکور = ۳۷۳ × ۲٫۵ = ۹۳۲٫۵ (چونکہ کل تعداد = ۳۷۳)

(۶) جبریہ سکور کو ممکن سکور کی فی صد میں تحویل کر دیا جاتا ہے اور نتیجہ معلوم کیا جاتا ہے۔ ہماری مثال میں یہ نتیجہ

$$= \frac{-۲۳۶٫۵ \times ۱۰۰}{۹۳۲٫۵} = -۲۵$$

(۷) نسبتی رغبت مدارج (۶) کے نتیجہ کو ۱۰۰ میں جمع کرنے سے آ جاتی ہے۔ پس نسبتی رغبت = ۱۰۰ - ۲۵ = ۷۵

مختصراً سارے عمل کو یوں لکھا جاتا ہے۔

(سامنے صفحہ ۴۵ پر)

...سطی مقام	جگہ	تعداد طلبہ	وسطی مقام کا فاصلہ	مثبت سکور	منفی سکور	ممکن سکور
...مضمونوں کی تعداد	۱	۳۶	+ ۲٫۶۵	+ ۹۰		
...ہے۔ اس لیے وسطی	۲	۴۲	+ ۱٫۶۵	+ ۶۳		۳۷۲ × ۳۶۵
... = ۳ ½	۳	۵۵	+ ۶۵	+ ۲۷٫۶۵		= ۱۳۰۵۶۵
	۴	۵۹	− ۶۵		− ۲۹٫۶۵	
	۵	۶۵	− ۱٫۶۵		− ۹۷٫۶۵	
	۶	۱۱۴	− ۲٫۶۵		− ۲۹۰	
		۳۷۲	+ ۱۸٫۶۵	− ۴۱۷		

...دبہ فی صد = ۱۰۰ × ۲۳۶۶۵ − / ۹۳۲۶۵ = − ۴۷۳۰۰ / ۲۶۱۱ = − ۲۵

...بتی رغبت = ۱۰۰ − ۲۵ = ۷۵

...اتی طریقہ سے نسبتی رغبت

سوالنامہ کے جوابوں سے جو ہم نے مختلف یونیورسٹیوں کے طلبہ کو بھیجے تھے اگر ہم مضمونوں کی نسبتی رغبت شماریاتی ...سے معلوم کریں تو اس طرح جو نتائج نکلتے ہیں وہ ذیل کے جدولوں میں درج ہیں۔ شماریاتی طریقہ کے اعتبار سے نارمل ...۱۰۰ سے ظاہر کی جاتی ہے۔ ان جدولوں میں ہم نے مضمونوں کو نسبتی رغبت کی نزولی ترتیب میں درج کیا ہے۔ نسبتی ...معلوم کرنے کا یہ طریقہ پہلے طریقہ سے زیادہ بہتر ہے اور زیادہ سائنٹفک ہے۔

IX پہلی یونیورسٹی کے نتائج

مضمون	نسبتی رغبت	نتیجہ
اردو	۱۲۹	نارمل سے ۲۹ زیادہ
اختیاری مضامین	۱۱۳	نارمل سے ۱۳ زیادہ
انگریزی	۱۱۱	نارمل سے ۱۱ زیادہ
تاریخ	۹۵	نارمل سے ۵ کم
جغرافیہ	۷۷	نارمل سے ۲۳ کم
ریاضی	۷۵	نارمل سے ۲۵ کم

X دوسری یونیورسٹی کے نتائج

مضمون	نسبتی رغبت	نتائج
ہندوستانی زبانیں	۱۲۷	نارمل سے ۲۷ زیادہ
اختیاری مضمون	۱۱۵	نارمل سے ۱۵ زیادہ
تاریخ یا جغرافیہ	۹۱	نارمل سے ۸٫۵ کم
انگریزی	۸۵٫۵	نارمل سے ۱۴٫۵ کم
ریاضی	۸۱	نارمل سے ۱۹ کم

XI تیسری یونیورسٹی کے نتائج

مضمون	نسبتی رغبت	نتائج
اختیاری مضمون	۱۳۲	نارمل سے ۳۲ زیادہ
انگریزی	۱۲۹	نارمل سے ۲۹ زیادہ
ریاضی	۱۰۷	نارمل سے ۷ زیادہ
تاریخ	۹۱٫۵	نارمل سے ۸٫۵ کم
جغرافیہ	۴۰٫۵	نارمل سے ۹۵٫۵ کم

XII چوتھی یونیورسٹی کے نتائج

مضمون	نسبتی رغبت	نتائج
ہندوستانی زبانیں	۱۴۷	نارمل سے ۴۷ زیادہ
ریاضی	۱۲۲	نارمل سے ۲۲ زیادہ
انگریزی	۱۱۶	نارمل سے ۱۶ زیادہ
کلاسیکی زبانیں	۸۶	نارمل سے ۱۴ کم
تاریخ	۸۲	نارمل سے ۱۸ کم
جغرافیہ	۸۱	نارمل سے ۱۹ کم
اختیاری مضمون	۶۶	نارمل سے ۳۴ کم

شماریاتی طریقہ سے نسبتی رغبت کے جو جدول اوپر لکھے گئے ہیں وہ واضح طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ چوتھی یونیورسٹی میں جہاں ریاضی کی دو شاخی تقسیم کی گئی ہے لازمی ریاضی کی نسبتی رغبت بہت بڑھ گئی ہے۔ جہاں پہلی یونیورسٹی میں ریاضی کی نسبتی رغبت نارمل سے ۲۵ کم۔ دوسری میں نارمل سے ۱۹ کم۔ تیسری میں نارمل سے ۵ زیادہ ہے۔ وہاں چوتھی میں ارمل سے ۲۲ زیادہ ہے۔

پس ظاہر ہے کہ ریاضی سے نسبتی رغبت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اگر ہم ریاضی کے نصاب میں ترمیم کر دیں۔ یہ مضمون ان نیورسٹیوں میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ جہاں ایک ہی قسم کا نصاب سب پر لاد دیا گیا ہو، اور ان یونیورسٹیوں یں اس کو اچھی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جہاں اس مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یعنی اس مضمون کے دو حصے ر دیے گئے ہیں۔ لازمی حصہ اور اختیاری حصہ۔ پس ہم اس نتیجہ پر آتے ہیں کہ ریاضی کے مضمون کی نسبتی رغبت اس وقت بڑھ اتی ہے جب اس کے نصاب سے پیچیدہ قسم کے موضوع جن کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے نکال دیے جاتے ہیں۔ مثلاً الجبرا کے پیچیدہ سوالات۔ پیچیدہ جبریہ اجزا ضربی کسور قوت نما۔ متقادیر اصم۔ عاد اعظم، ذو اضعاف اقل کے سوالات ثباتی ہندسہ کے مشقی سوالات عام لڑکوں کے بس میں نہیں ہیں۔ اور یہ ایسے موضوع ہیں جن کی ریاضی کے کورس میں شمولیت ام طلبہ کو اس مضمون سے متنفر کر دیتی ہے۔ پس ان موضوعات کا عام طلبہ کے لیے جبری طور پر شامل نصاب کرنا غیر ضروری ہے ہذا مناسب یہ ہوگا کہ ثانوی مدارج میں ریاضی کے دو حصے کر دیے جائیں ایک لازمی حصہ جس میں صرف وہ موضوع شامل ہوں جن کی عام لوگوں کے لیے افادی اہمیت ہو اور دوسرا اختیاری حصہ جس میں ریاضی کی مختلف شاخوں کے ایسے وضوع شامل کر دیے جائیں جو ان طلبہ کے لیے موزوں ہوں جو ریاضی سے دلچسپی رکھتے ہوں یا جو کالجوں میں جا کر اعلیٰ ریاضی ڑھنا چاہتے ہوں۔ یا جو ایسے پیشوں میں داخل ہونا چاہتے ہوں جن کی اساس ریاضی پر ہے۔

نئے تعلیمی تقاضے

تاج محمد خیال

۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کا دن دُنیا کی معاشرتی تاریخ میں ایک حیثیت رکھتا ہے۔ اس دن پاکستان میں ایک ایسے تجربے کا آغاز ہوا جس کے نتائج کا مطالعہ ماہرین معاشرت و سیاست کے لیے اہم ثابت ہوگا۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء سے مغربی پاکستان کے صوبوں اور ریاستوں کی جُدا جُدا حکومتوں کو ختم کر دیا گیا اور ان کی جگہ ایک نئے صوبے کی تشکیل کی گئی۔ یہ صوبے اور ریاستیں کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ ان کے باشندوں کی مادری زبانوں میں خاصا اختلاف تھا بعض صوبے اپنے تمام اخراجات کے کفیل نہ ہو سکتے تھے اور مرکزی حکومت پر انحصار کرتے تھے بعض علم ادب، تہذیب و تمدن میں نسبتاً پسماندہ تھے۔ آب و ہوا کا اختلاف اس قدر تھا کہ ایک طرف صحراؤں کی جھلستی ہوئی لو تھی، دوسری طرف پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی تھیں مگر ان اختلافات سے زیادہ اہم اس تمام علاقے میں ایک ایسی یکجہتی اور وحدت تھی جس کی موجودگی ہر قسم کی دوری اور بے گانگی کو بے کار اور بے اثر بنا دیتی ہے۔ یہ ہے نظریۂ حیات کی وحدت و یگانگت جو ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی تھی۔ اس اشتراک سے ان کے مستقبل کی تمام آرزوئیں اور اُمنگیں، قومی زندگی کا تصور، قومی ترقی و تنزل کا معیار سب کچھ ایک وحدت میں ڈھل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی اقتصادی زندگی ایک دوسرے سے اس طرح مربوط تھی کہ جُدا جُدا انتظامی یونٹ قائم رکھنے میں سب کا نقصان تھا۔ نظریۂ حیات کی وحدت اور اقتصادی ضرورت کا قدرتی تقاضہ تھا کہ تمام مغربی پاکستان عملی طور پر ایک سیاسی وحدت کی صورت اختیار کرے تاکہ اس کے تمام باشندے رنج اور غم، کامیابی اور ناکامی، خوش حالی یا بدحالی میں برابر کے شریک ہوں۔ چناں چہ ۱۴ اکتوبر کو یہ سیاسی وحدت ایک حقیقت بن گئی اور مغربی پاکستان کا ایک صوبہ معرضِ وجود میں آگیا۔ مغربی پاکستان کی سیاسی اور انتظامی وحدت اس صورت میں کامیاب کہلا سکتی ہے جب یہ تاریخ کے پیدا کردہ اختلافات کو دور کر کے اس علاقے کے تمام باشندوں کے انداز فکر و نظر میں یکجہتی پیدا کر دے۔ ذہنی اور تمدنی اختلافات کو دور کر کے انھیں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک کر دے اور ان کی خوش حالی کسی ایک حصے میں محدود ہونے کی بجائے تمام علاقے میں مساوی طور پر پھیل جائے۔

ندازِ فکر

انداز فکر و نظر کی ایسی یکسانیت کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت کے ہر محکمے کے کارکن اور زندگی ہر شعبہ کے صاحب اختیار اپنے فرائض اختیاط اور نیک دلی سے ادا کریں۔ ہمارے نئے وحدتی مقاصد کا تقاضا ہے ہمارے نظام حیات کے ہر پہلو پر ایک نیا رنگ چڑھ جائے۔ تاکہ ہم نئے وحدتی تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ اس سے ن انکار کر سکتا ہے کہ انداز فکر و نظر کی یکسانیت بہت حد تک تعلیم کے ذریعے سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ تعلیم نہ صرف سان کو خیالات کا ذخیرہ دیتی ہے بلکہ اسے خیالات کا حامل بھی بناتی ہے۔ ان پڑھ لوگوں کے پاس نہ سفر کے علمی رائع ہوتے ہیں نہ مالی۔ وہ سفر کرتے ہیں تو صرف اس علاقے میں جہاں ان کی مادری زبان بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ لیم یافتہ لوگ ایسی زبانوں سے واقف ہوتے ہیں جن کے استعمال کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ اس لیے وہ دوسرے لاقوں کے باشندوں سے جن کی مادری زبان مختلف ہو آسانی ملتے جلتے ہیں۔ اپنے علاقے کے خیالات اور رسم و اج کو ان تک پہونچاتے ہیں۔ ان کے خیالات اور رسم و رواج سے متاثر ہو کر اپنے گھر لوٹتے ہیں۔ ان ہی لوگوں کی دلت علم و فنون کو ترقی ہوئی ہے اور علم و فنون علاقائی شکل سے گذر کر عالم گیر صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ربی پاکستان کے باشندوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں ہمارے نظام تعلیم اور تعلیمی انتظامات کو اہم یثیت حاصل ہے۔ جب تک ہمارے نئے حالات کے تعلیمی تقاضے پورے نہ ہوں گے نئی وحدت اپنے بنیادی اصد میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔

نئے تقاضے

یہ نئے تعلیمی تقاضے کیا ہیں؟ اولین تقاضہ تو یہ ہے کہ اس علاقے کے تمام باشندوں کو کوئی ایک زبان پڑھائی ئے جس کی بدولت وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی جا سکیں۔ ایک دوسرے کی بات سمجھ سکیں۔ تمام علاقے کے وں سے خط و کتابت کر سکیں۔ تجارتی تعلقات قائم کر سکیں۔ اور وہاں کے سیاسی اور تمدنی حالات سے واقف ہو سکیں۔ یک مشترک زبان ہی کے ذریعہ خیالات، اطلاعات اور تجارتی اشیاء، ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں منتقل ہو سکتی ہیں۔

میں تعلیم کے دائرہ میں آزادی اور تنوع کو مفید سمجھتا ہوں۔ نصاب اور طرز تعلیم کے لحاظ سے تمام تعلیمی اداروں کو

ایک ہی قسم کے قوانین کا پابند کر دینا قومی مفاد کے منافی ہے لیکن بعض بنیادی ضروریات ایسی ہیں جن میں آزادی اور تنوع قوم کے لیے مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔

اسی قسم کی بنیادی ضرورت ملک کے تمام حصوں کے نظام تعلیم میں ایک کم سے کم مشترک عنصر کا وجود ہے تاکہ لوگوں کے لیے ایک دوسرے سے ملنا، خط وکتابت کرنا، ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنا ممکن ہو جائے اور وہ ایک دوسرے کے کام آ سکیں۔ اس کم سے کم مشترک عنصر کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی یہ کہ جو لوگ پرائمری لازمی درجہ تک تعلیم حاصل کر لیں وہ ایک مشترک زبان سیکھ جائیں اور اپنے ملک کے باقی حصوں کے لوگوں کے حالات سے بقدر ضرورت واقف ہو جائیں۔ دوسری یہ کہ تعلیم کے مختلف درجوں کو اس طرح منظم کیا جائے کہ لوگ ملازمت اور کاروبار کے لیے ملک کے ایک حصہ سے دوسرے حصوں میں جائیں تو ان کے بچوں کی تعلیم باقاعدہ جاری رہ سکے۔

مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں موجودہ تعلیمی نظام ان بنیادی تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ پچھلے تیس پینتیس سال تعلیم کا انتظام صوبائی حکومتوں کے اختیار میں تھا اور تعلیمی معاملات میں کوئی فیصلہ کرتے وقت ایک صوبہ دوسرے صوبوں سے مشورہ نہ کرتا تھا۔ چنانچہ صوبائی نظام تعلیم میں اختلافات رونما ہو گئے۔ سب صوبوں میں صرف ایک چیز مشترک ہے یعنی یہ کہ پرائمری تعلیم ہر جگہ لازمی ہے۔ مگر اس کی بھی نہ مدت ایک ہے نہ ذریعہ تعلیم۔

سابق سندھ میں

سابق سندھ میں پرائمری چار سال کا کورس ہے۔ پرائمری سکول ہائی سکولوں سے جدا ہیں۔ پرائمری میں تعلیم سندھی میں دی جاتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مہاجرین کی آبادی کی وجہ سے کچھ اردو سکول قائم ہوئے ہیں۔ پرائمری سکول میں پہلے دو سال تو سندھی کے علاوہ کوئی اور زبان تو پڑھائی ہی نہیں جاتی۔ تیسری جماعت سے اردو ثانوی زبان کی طرح لازمی پڑھائی جاتی ہے اور اردو سکولوں میں تیسری جماعت سے سندھی کی یہی حیثیت ہے۔

چوتھی جماعت کے بعد طلبہ ہائی سکولوں میں داخل ہوتے ہیں جن میں سات جماعتیں ہوتی ہیں اور جو طلبہ کو میٹرکولیشن کے امتحان کے لیے تیار کرتے ہیں۔ گویا سندھ یونیورسٹی کا میٹرکولیشن گیارہ سال کا ہے اور گیارھویں سال سے پہلے کوئی پبلک امتحان نہیں ہوتا۔ اس امتحان میں طلبہ کو اجازت ہے کہ سوالات کے جواب سندھی میں، اردو میں

انگریزی میں لکھیں۔ سکولوں میں تعلیم بھی ان تینوں زبانوں میں استاد اپنی سہولت کو مدنظر رکھ کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پرائمری سکولوں کے سینکڑوں اساتذہ ایسے ہیں جو سندھی کے علاوہ اور کوئی زبان اچھی طرح نہیں جانتے۔ کیونکہ ساتویں جماعت پاس کرنے کے بعد لوگ پرائمری ٹیچرز ٹریننگ سکولز میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ساتویں تک خود تعلیم سندھی میں حاصل کرتے ہیں اور ٹریننگ کے بعد تعلیم سندھی میں دیتے ہیں۔

گیارہ سالہ میٹرکولیشن کے بعد بی۔ اے اور بی۔ ایس سی کے لیے چار سال لگانے پڑتے ہیں اور ایم۔ اے کے لیے مزید دو سال۔ گویا بی۔ اے پندرہ سالہ اور ایم اے سترہ سالہ کورس۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ میٹرکولیشن پاس کرنے کے بعد تین یونیورسٹی امتحان دے کر طالب علم بی اے پاس کرتا ہے۔ یہ امتحان پہلے سال دوسرے سال اور چوتھے سال کے اختتام پر لیے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی کو چھوڑ کر تعلیم کے باقی تمام درجے گورنمنٹ کے زیر اہتمام ہیں۔ کچھ پرائیویٹ سکول اور کالج ضرور ہیں۔ مگر لوکل باڈیز کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں۔

سابق پنجاب میں

اب دیکھیے کہ سابق سندھ کا نظام تعلیم سابق پنجاب سے کس قدر مختلف ہے۔ یہاں پرائمری پانچ سال کا کورس ہے۔ اس کے اختتام پر وظائف کے لیے ہر ضلع میں ایک پبلک امتحان ہوتا ہے۔ اس کے بعد تین سال کا مڈل کا کورس ہے۔ مڈل کے درجے تک کے سینکڑوں سکول قائم ہیں اور محکمہ تعلیم کی طرف سے مڈل کا پبلک امتحان ہوتا ہے جو لڑکیوں کے لیے لازمی ہے۔ اور اب ان طلبہ کے لیے لازمی ہو گیا ہے جو میٹرکولیشن کا امتحان پرائیویٹ دینا چاہتے ہیں۔ مڈل کے بعد دو سال میٹرکولیشن کا کورس ہے۔ گویا سابق سندھ میں گیارہ سال کے بعد ایک پبلک امتحان ہے اور سابق پنجاب میں دس سال میں تین پبلک امتحانات ہوتے ہیں۔ میٹرک کے بعد دو سال میں ایف۔ اے، دو میں بی۔ اے اور دو میں ایم اے کیا جاتا ہے۔ کل چودہ سال میں بی۔ اے ہوتا ہے اور میٹرک کے بعد تین نہیں بلکہ دو امتحان پاس کرنے سے بی۔ اے پاس کیا جاتا ہے۔ ایم اے سولہ سال کا کورس ہے۔

پہلی جماعت سے تعلیم اردو میں شروع ہوتی ہے اور دسویں ہی تک صرف اردو میں دی جاتی ہے۔ البتہ چھٹی جماعت سے انگریزی بھی بطور ایک مضمون کے پڑھائی جاتی ہے۔ پنجابی کسی جماعت میں نہیں پڑھائی جاتی۔ پرائمری اور مڈل کی تعلیم براہ راست گورنمنٹ کے پاس نہیں بلکہ لوکل باڈیز کے پاس ہے۔ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے مدارج بورڈ آف سیکنڈری

ایجوکیشن کے پاس ہیں۔ ڈگری اور مابعد کی تعلیم یونیورسٹی کے پاس۔ سابق بلوچستان، بہاول پور، اور سابق سرحدی صوبہ کا نظامِ تعلیم سابق پنجاب کے نمونہ پر ہے۔ مگر سرحدی صوبے میں پچھلے چند برس میں بعض اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مثلاً پرائمری کورس سرکاری طور پر چار سے پانچ سال کر دیا گیا ہے۔ مگر اکثر پرائمری سکول ابھی تک چار جماعتوں پر مشتمل ہیں۔ پانچویں جماعت مڈل یا ہائی سکول کے ساتھ ہے۔ پرائمری کی جماعتوں میں جو زبان پڑھائی جاتی ہے وہ پشتو ہے۔ اور اس میں دوسرے مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ آٹھویں جماعت تک کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ کسی لوکل باڈی کا کوئی سکول نہیں۔

مختلف صوبوں کے نظامِ تعلیم کے اس مختصر سے خاکے سے ظاہر ہے کہ ہمارے پرائمری سکولوں میں ذریعۂ تعلیم یکساں نہیں۔ چوں کہ طلبہ کی اکثریت پرائمری کے بعد تعلیم چھوڑ دیتی ہے اس لیے اکثر طلبہ کوئی ایک مشترک زبان نہیں سیکھتے جو ان کو ملک کے ہر حصے میں جانے وہاں کے لوگوں سے گفتگو کرنے اور ان کے حالات سمجھنے کے قابل بنائے۔ نہ ہی تعلیم کے درجوں کی مدت یکساں ہے تاکہ طلبہ ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں جا کر ہر سکول اور کالج میں داخل ہو سکیں۔

لہٰذا ملی وحدت کا اولین تعلیمی تقاضہ یہ ہے کہ ابتدائی مدارج کے تمام سکولوں میں ایک مشترک زبان پڑھائی جائے اور تعلیم کے درجوں کی مدت صوبہ کے تمام سکولوں اور کالجوں میں یکساں کی جائے۔

یکساں تعلیمی ترقی

دوسرا تقاضہ یہ ہے کہ صوبہ کے تمام حصوں کو تعلیمی ترقی کے ایک درجہ پر لانے کی کوشش کی جائے۔ سابق صوبوں اور ریاستوں کی موجودہ تعلیمی حالت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ سابق سرحدی صوبہ، سندھ، بلوچستان، بہاولپور اور خیرپور کے تمام کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی مجموعی تعداد سابق پنجاب کے صرف ایک شہر یعنی لاہور کے طلبہ کی تعداد کے برابر ہے۔ ان علاقوں کی تعلیمی پسماندگی کا ایک اہم سبب وہاں مناسب ڈگری یافتہ اساتذہ کی قلت ہے۔

اس لیے دوسرا تعلیمی تقاضہ یہ ہے کہ پسماندہ علاقوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ کی جائے۔ سابق پنجاب کے تعلیم یافتہ مرد اور خواتین اپنے گھروں سے دور سکولوں اور کالجوں میں ملازمت کے لیے جانا گوارا کریں اور (نیک دلی سے) علم کی روشنی پھیلا کر ان علاقوں کی خدمت کریں اور ایسے ہی ان لوگوں کو چاہیے کہ وہ ترقی یافتہ علاقے سے آنے والے اساتذہ کو بطیب خاطر خدمت کرنے کا موقع دیں۔

تیسرا تعلیمی تقاضہ یہ ہے کہ موجودہ تعلیمی اداروں میں سب علاقوں کے طلبہ کے اکٹھے پڑھنے اور رہنے کے انتظامات کیے جائیں۔ ایک علاقے کے بہترین طلبہ کو دوسرے علاقے کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہونے کی سہولتیں بہم پہونچائی جائیں۔ ان کے لیے نشستیں مخصوص کی جائیں اور وظائف دیے جائیں تاکہ سندھ یونیورسٹی کے طلبہ پنجاب اور پشاور کی یونیورسٹیوں میں۔ اور پنجاب کے طلبہ سندھ اور پشاور یونیورسٹیوں میں جاکر تعلیم حاصل کرسکیں۔

اگر تعلیم کو اس کے صحیح اور وسیع معنوں میں استعمال کیا جائے اور تدریس تک ہی محدود نہ رکھا جائے تو چوتھا تعلیمی تقاضہ یہ ہے کہ صوبہ کے علما اور اساتذہ کو ملنے تبادلۂ خیالات کرنے اور علمی مباحثہ میں حصہ لینے کے مواقع کثرت سے بہم پہونچائے جائیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قومی درجہ پر ہر مضمون کی مجلس قائم کی جائے۔ آرٹس۔ سائنس۔ سوشل سائنس اسلامی علوم اور زبانوں کے لیے اکیڈیمیز قائم کی جائیں۔ علم و ادب کی مجالس کے لیے قومی وقار کے شایان شان عمارات بنائی جائیں۔ ان مجالس کی سرگرمیوں کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے باقاعدہ امداد دی جائے۔ ان کے مرکزی دفتر لاہور رہی ہوں، مگر ان سب کی شاخیں پشاور، حیدرآباد اور کوئٹہ میں بھی ہوں۔ ان کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی حسب حالات شاخیں قائم کی جائیں۔

اگر ملک کے ہر حصہ کے طلبہ۔ اساتذہ اور علما کو اکٹھے رہنے اور اپنے خیالات سے ایک دوسرے کو مستفید کرنے کے مواقع بہم پہونچائے جائیں تو وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ چند سال میں مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں بسنے والے لوگوں کی سطحی اجنبیت دور ہو جائے گی۔ اور اکتوبر ۱۹۵۵ء کو ظہور پذیر ہونے والی سیاسی وحدت ذہنی، معاشرتی بلکہ قلبی وحدت میں تبدیل ہو جائے گی۔" (ماخوذ از "استقلال" لاہور)

بصری امدادیں

انیس احمد

تدریس کے پیش نظر سہ گانہ مقاصد رہتے ہیں (۱) معلومات میں اضافہ کرنا (۲) مہارتیں پیدا کرنا (۳) ذوق پیدا کرنا ان مقاصد کے لیے استاد طلبہ کے حواس کو متاثر کرتا ہے۔ وہ کتاب پڑھ کر سناتا ہے، اس کی تشریح کرتا ہے۔ تاریخی داستان کو ایک پُرلطف، کہانی کے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ ریاضی کے سوالات تختہ تحریر پر حل کر کے سمجھاتا ہے۔ کرۂ ارض پر از زندگی کے مرقع کو گلوب اور نقشوں کی مدد سے واضح کرتا ہے۔

ان تمام مثالوں میں استاد کا زیادہ بھروسہ اپنے منہ سے نکالے ہوئے الفاظ پر ہے۔ خواہ وہ نمونے کی قرا پیش کرے۔ خواہ الفاظ و محاورات کی تشریح کرے۔ اور خواہ تاریخی واقعات کو پُرجوش پیرائے میں بیان کرے۔ اس سبق کی تاثیر کا بڑا بھروسہ اس کے الفاظ پر ہوگا۔ وہ طلبہ کی قوت سامعت کو متاثر کر کے ان کے ذہنوں میں موزوں ذہنی کیفیت پیدا کرنا چاہے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ اس کے الفاظ طلبہ کے ذہنوں میں بھی ان ہی خیالات اور جذبا کو جنم دیں جو خود اس کے اپنے ذہن پر طاری ہیں۔

بصری امدادیں جدید نفسیاتی تحقیق نے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ تدریس کی تاثیر کو بڑھانے کے لیے طلبہ کے حواس ایک سے زیادہ وسائل سے متاثر کرنا چاہیے۔ ماضی میں تدریس نے زیادہ بھروسہ سماعت پر کیا ہے۔ استاد کا تقریر کرنا تدریس کا بڑا سہارا رہا ہے۔ آج کوشش یہ ہونی چاہیے کہ سماعت کے ساتھ ساتھ بصارت کو بھی متاثر کیا جائے۔ حسن اتفاق سائنس کی ایجادوں نے طرح طرح کی نئی بصری امدادیں بھی پیدا کر دی ہیں۔ مثلاً فلمی سلائڈیں۔ غیر متکلم متحرک تصویریں متکلم متحرک تصویریں۔ فلمی پٹیاں وغیرہ۔ فلمیں اوّل اوّل تفریح کے لیے استعمال کی گئی تھیں، لیکن جلد ہی ان کے تعلیمی بھی نظر آنے لگے۔ آج مغرب کی اکثر یونیورسٹیوں میں فلموں کی لائبریریاں موجود ہیں۔ یہاں سے مدرسوں کو فلمیں دی جاتی ہیں۔ غرض ترقی پسند تعلیم بصری امدادوں سے بڑی خدمت لے رہی ہے۔ یہ امدادیں استاد کے الفاظ کو حقیقی کا رنگ روپ عطا کرتی ہیں۔ وہ نئے مباحث کے لیے دلچسپ تمہید کا سامان پیدا کرتی ہیں۔ وہ بعض پیچیدہ مہارتا

کی وضاحت ایسی خوبی اور صفائی سے کر دیتی ہیں جو زبانی تشریح سے کبھی ممکن نہ ہو سکتی۔ ان ساری باتوں نے آج کل بصری امدادوں کا بڑا چرچا کر رکھا ہے۔ حد یہ ہے کہ بعض لوگ ترقی پسند تعلیم اور بصری امدادوں کو لازم و ملزوم سمجھنے لگے ہیں۔
بصری امدادوں کی افادیت ناقابلِ انکار ہے۔ مگر بصری امدادیں کوئی ایسی اشیاء نہیں جو عہدِ حاضر کی مخصوص پیداوار ہوں۔ فلم اور ٹیلی ویژن وغیرہ بے شک جدید سائنس کے کرشمے ہیں۔ لیکن پہلے وقتوں کے استاد بھی بصری امدادوں کی تاثیر سے بے خبر نہ تھے۔ جغرافیے اور تاریخ میں نقشوں سے کام لیا جاتا تھا۔ تصویروں اور نمونوں کا استعمال بھی ہوتا تھا۔ غرض دستیاب ہونے والے وسائل کے مطابق بصری امدادیں وضع کی جاتی تھیں اور ان سے خدمت لی جاتی تھی۔

بے جا مصرف کا خطرہ انسانی ذہن کی یہ عجیب کمزوری ہے کہ وہ ہر نئی چیز میں اپنی ساری مشکلوں کے حل تلاش کرنے لگتا ہے۔ بصری امدادوں کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا ماجرا ہوا۔ جدید سائنس نے تعلیم کی خدمات کے لیے ایسی ایسی بصری امدادیں مہیا کر دی ہیں جو پرانے استادوں کو میسر نہ تھیں۔ اس کا فوری ردِ عمل کئی صورتوں میں ایک غیر ضروری خوش فہمی کی صورت میں نظر آیا۔ بعض استادوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ اب ان کی ساری فنی مشکلیں حل ہو گئیں۔ ان کے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ بصری امدادیں فراہم کر لیں اور ان سے کام لینے کا ڈھنگ اچھی طرح سیکھ لیں۔ اس سے آگے تدریس کا سارا کام خود بخود ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ بصری امدادیں از خود تدریس میں ایسی جادو بھری تاثیر پیدا کر دیں گی جس سے اس کی تمام خامیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی خوش فہمی خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ امدادیں خواہ سمعی ہوں خواہ بصری۔ وہ آخر الامر استاد کی خدمت کے لیے ہیں۔ اس کی جگہ لینے کے لیے نہیں۔ اگر ان امدادوں میں کوئی ایسی جادو بھری تاثیر ہوتی جس سے وہ استاد کا سارا کام انجام دے دیتیں تو استادوں کی تربیت اور ملازمت کے جھگڑے بالکل ختم ہو جاتے۔ ان امدادوں سے کام لینے کے لیے مدرسوں میں کچھ مستری ملازم رکھ لیے جاتے اور بس۔ مگر یہ ایک ایسا خواب ہے جو کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ تدریس ایک نازک ذہنی عمل ہے، جس کے پیچھے ایک ماہرِ فن استاد کی ہدایت کاری ہر قدم پر موجود رہنی چاہیے۔ اگر یہ ہدایت کار ہاتھ ایک لمحہ کے لیے بھی غافل ہو جائے تو تدریس کی تاثیر اسی وقت ختم ہو جاتی۔

سچ یہ ہے کہ جدید بصری امدادوں نے استاد کے کام کی تاثیر کو یقیناً بڑھایا ہے۔ مگر اس کام کو پہلے سے آسان ہرگز نہیں بنایا۔ استاد کا کام آج بھی اسی سوجھ بوجھ اور قبل از وقت منصوبہ بندی کا مطالبہ کرتا ہے۔ جس کا وہ پہلے مطالبہ

کیا کرتا تھا۔ اس میں سر مو فرق نہیں آیا۔ جو استاد یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ بصری امدادیں خود بخود اس کا کام کر دیں گی وہ ان امدادوں سے کام لینے کے درست ڈھنگ سے بے خبر ہے۔ ان سے موثر طور پر کام لینے کے لیے استاد کو پہلے سے تیاری کرنا پڑتی ہے۔ ان سے کام لیتے وقت طلبہ کے ردّعمل پر پوری نگاہ رکھنا پڑتی ہے اور آخر میں اس ردعمل کو بنا قرار دے کر آگے کام کرنا پڑتا ہے۔

نوآموز استادوں کو مشورہ بصری امدادوں کے متعلق جو غلط قسم کی خوش فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کا بہت دل چسپ نظارہ زیر تربیت استادوں کی کسی جماعت میں دکھایا جا سکتا ہے۔ ان کا اپنا حافظہ کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتا جہاں ان کے زمانہ طالب علمی میں بصری امدادوں سے کوئی خاص خدمت لی گئی ہو۔ درسی کتاب کی تصویروں اور جغرافیہ و تاریخ کے دیواری نقشوں کو چھوڑ کر انہیں کوئی اور بصری امداد یاد نہیں ہوتی جس سے ان کے استادوں نے کبھی کام لیا ہو۔ تربیتی درس گاہ میں آتے ہی انہیں بصری امدادوں کے چرچے سنائی دینے لگتے ہیں۔ یہاں ان کے سامنے جو نمونے کے سبق پیش کیے جاتے ہیں ان میں بصری امدادوں جیسی رنگارنگ تصویروں اور چارٹوں کی خوب بھرمار ہوتی ہے۔ اب ان کے اپنے سبق دینے کی باری آتی ہے۔ غلط یا درست طور پر یہ بات ان کے ذہن میں اتر چکی ہوتی ہے کہ سبق کی ساری کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ کتنی تصویریں یا نقشے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس غرض سے دنوں پہلے تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر متعلم استاد تصویر کشی میں کچھ دست رس رکھتے ہوں تو اس قسم کی تیاری میں کچھ مضائقہ نہیں۔ مگر بدقسمتی سے اکثر حالتوں میں ایسا نہیں ہوتا بیشتر صورتوں میں متعلم استاد کو خود ایک سیدھی لکیر تک کھینچنی نہیں آتی۔ اس لیے چار رونا چار دنوں کی محنت کے بعد تصویروں اور چارٹوں کا ایک پلندہ جمع کر لیا جاتا ہے اور اسے تدریسی مہارت کا کمال اور تدریسی تاثیر کا معراج سمجھا جاتا ہے۔

یہ انداز فکر بے حد افسوس ناک ہے۔ تربیت حاصل کرنے کے بعد ہر زیر تربیت استاد کو ایک عام مدرسے میں کام کرنا ہوگا جہاں اسے دن بھر میں چھ سات سبق پڑھانے پڑیں گے۔ ان سبقوں کے لیے تصویروں اور چارٹوں کی وہ فراخدلانہ فراہمی کبھی ممکن نہ ہو سکے گی جس کو وہ زمانہ تربیت میں جان تاثیر سمجھا کرتا تھا۔ یہ غلط نگاہ حاصل کرنے کی بجائے اگر وہ تربیت کے زمانے میں بلا تکلف سادہ خاکہ یا لکیری تصویر بنانا سیکھ لیتا تو یہ چیز اس کے لیے حقیقی طور پر فائدہ دینے والی ثابت ہوتی۔ وہ صبح سے شام تک پڑھاتے وقت بھی اس قابل ہوتا کہ تاریخ جغرافیہ کے سبقوں میں آسانی سے تختہ تحریر پر نقشے کھینچ کر اہم نکات کی وضاحت کر دیا کرتا، سائنس کے اسباق میں ضروری اشکال آسانی سے بنا لیا کرتا وغیرہ۔ یہ وہ بصری امدادیں ہیں جنکی ہمارے کمرۂ جماعت میں آسانی سے رسائی ہو سکتی ہے۔ ان سے بہتر اور دلکش بصری امدادیں موجود ضرور ہیں لیکن اس ملک میں ایک عام استاد کے ذرائع اور وسائل ایسے نہیں کہ ان سے خدمت

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

مشرق وسطیٰ میں مفت لازمی تعلیم کا رواج

ملک شام کی آبادی ۶۰ لاکھ سے زیادہ ہے۔ آج سے بارہ سال پہلے اس ملک کے صرف ۷۷ ہزار بچے ابتدائی سرکاری مدرسوں میں داخل تھے۔ اس کے دس سال بعد اندازہ لگایا گیا تو پتہ چلا کہ ۲ لاکھ ۵۴ ہزار بچے ابتدائی سرکاری مدرسوں میں اور ۱۱۵۵۶ ہزار غیر سرکاری مدرسوں میں تعلیم پا رہے تھے۔ صرف شام ہی میں نہیں بلکہ مشرق وسطیٰ کے تمام ملکوں میں ابتدائی تعلیم کا رواج بڑھ رہا ہے۔ نئے مدرسے قائم ہو رہے ہیں اور اساتذہ کی تربیت کے لیے بھی مناسب اقدامات سے کام لیا جا رہا ہے اور اس طرح جہالت کی تاریکی علم کی روشنی میں بدلنی شروع ہو گئی ہے۔

لیکن اس ترقی کے باوجود دنیائے عرب میں مفت لازمی تعلیم رائج کرنے کے لیے ابھی کئی منزلیں طے کرنی باقی ہیں اس علاقے کے ملکوں کے تعلیمی مسائل کا جائزہ لینے کے بعد اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ یہاں تعلیمی نظام بہت دیر میں شروع ہوا ہے کیوں کہ بعض ملک حال ہی میں آزاد ہوئے ہیں اور انہیں نئے سرے سے قومی تعمیر کے میدان میں قدم اٹھانا پڑ رہا ہے۔ ابتدائی دور میں غیر ملکی نظام تعلیم ان علاقوں میں رائج تھا اور عربی زبان کی تعلیم بہت ہی محدود تھی۔

مغرب کے زیر اثر مدرسوں کے فروغ پانے سے پہلے تعلیم صرف مکتبوں میں ہوتی تھی جن کو عموماً مسجدوں کے حجروں میں قائم کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ اب بھی رائج ہے۔ ان مکتبوں میں قرآن شریف حفظ کرانے کے علاوہ ارکان مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ دوسری منزل پر وہ مدرسے ہیں، جہاں لکھنے پڑھنے کا ذرا اور خیال رکھا جاتا ہے۔

اصل رکاوٹ :۔ اگرچہ موجودہ آئین کے مطابق بعض ملکوں نے مفت تعلیم دینے کا اعلان کر دیا ہے۔ لیکن روپے کی کمی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ عراق اور سعودی عرب جیسے تیل والے ملکوں کے سوا باقی کے پاس اتنی رقم بھی نہیں ہے کہ مدرسوں کے لیے عمارتیں بنوائیں، حسب ضرورت استادوں کو اعلیٰ تربیت دلوائیں یا جدید کتب نصاب اور آلات کا انتظام کریں۔ بعض ملکوں کے ذرعی وسائل بہت محدود ہیں۔ لیکن خاطر خواہ آمدنی نہیں ہوتی۔ اگرچہ پچھلے چالیس سالوں میں مدرسوں کی تعداد

بارہ گنا ہو گئی ہے۔ لیکن ان کے مقابلے میں آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور توقع حیات بہت قلیل ہے۔ اس لیے تعلیم پانے کے لائق بچوں کی تعداد ہمیشہ بے پناہ رہتی ہے۔

شادی کے لیے معیاری سند:- یونیسکو کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ شام میں ۱۹۵۲ء کے بعد سے اب تک ہر سال ڈھائی سو نئے مدرسے قائم کیے گئے ہیں۔ عراق میں استادوں کے لیے نیا تربیتی نصاب قائم کیا گیا ہے۔ وہاں اب بڑا موجودہ کالجوں سے ہر سال ایک ہزار اساتذہ فارغ التحصیل ہوتے ہیں اور ابتدائی تعلیم کا نظام روزانہ زیادہ فروغ پا رہا ہے، تعلیم نسواں کا جہاں تک تعلق ہے مشرق وسطیٰ میں بہت سی روایتی رکاوٹیں حائل ہیں جن کو صدیوں پرانے رسم و رواج نے بے حد وزنی بنا دیا ہے۔ پیر روپے کی کمی اس پر مستزاد ہے، لیکن جدید معاشرتی ترقی کا تصور آہستہ آہستہ اپنا رنگ جما رہا ہے مثال کے طور پر مصر میں ایک لاکھ نو ہزار نو سو تیس (۱۰۹۹۳۲) طالبات ابتدائی مدرسوں میں داخل تھیں۔ ۱۹۵۴ء میں ان کی تعداد ایک لاکھ ۸۸ ہزار ۶ سو ۸۹ (۱۸۸۶۸۹) ہو گئی۔ لبنان میں تقریباً ہر لڑکی کے لیے ابتدائی تعلیم پانا ضروری ہو گیا ہے اور شاید وہ دن دور نہیں جب کہ گریجوایٹ ہونے کی سند آئندہ دلہنوں کے لیے شادی کا اعلیٰ معیار ثابت ہونے لگے۔

مشرقِ وسطیٰ کی تعلیمی جھلک دکھاتے ہوئے یونیسکو کی رپورٹ میں آخری الفاظ بہت ہی خوش آئند ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ لبنان، شام اور اردن کے ابتدائی مدرسوں میں ۷۰ فی صد وہ بچے داخل ہیں جن کو بلحاظ عمر تعلیم پانا چاہیے۔ جہاں تک لڑکوں کا تعلق ہے شاید ہی کوئی مدرسے میں داخل ہونے سے بچا ہو۔ اسی طرح مصر کے ۵۰ فی صد اور عراق و کویت کے ۴۰ فی صد بچے مدرسوں میں داخل ہیں۔ ان حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آئندہ چند سال میں لازمی تعلیم کم سے کم شمالی علاقوں میں عام ہو جائے گی اور دس بیس سال میں تمام عرب ملک اس اصول پر کاربند ہوں گے۔

جنگلات کی دولت

اس زمانے میں دنیا کی نصف سے زیادہ آبادی لکڑی اور دوسری جنگلاتی پیداوار کی کمی محسوس کر رہی ہے۔ سب سے زیادہ دقت پاکستان، بھارت، چین کے بعض اضلاع اور شمالی افریقہ کے ملکوں میں لاحق ہے۔ جہاں بہت سے لوگ اپنے جلا کر اپنا کھانا پکاتے یا موسم سرما میں اپنے آپ کو گرم رکھنے کا انتظام کرتے ہیں۔ ان ملکوں میں جہاں کھیت جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں عمارتی لکڑی کی بھی سخت قلت ہے۔

یہ حقائق لکڑی کے وسائل سے متعلق اس جائزے میں پیش کیے گئے ہیں جو ادارۂ خوراک و زراعت نے ۱۹۵۳ء

کے اعداد و شمار سامنے رکھ کر حال ہی میں تیار کیا ہے۔ اس پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ سطح ارض کے ۳ ارب ۱۹ کروڑ ۵۰ لاکھ ہیکٹر کے رقبے میں جنگلات پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ دنیا کی کل سطح کا ایک تہائی ہے (ایک ہیکٹر ۲.۴۷ ایکڑ کے برابر ہے) لیکن اس وسیع رقبے کا صرف ۳۳ فی صد حصہ ایسا ہے جس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ باقی جنگلات سے انسان نے اب تک فائدہ اٹھانا شروع نہیں کیا ہے۔ ۲۴ کروڑ ۷۰ لاکھ ہیکٹر کے رقبے میں ایسے جنگلات ہیں جہاں انسان کی رسائی تو ممکن ہے لیکن حمل و نقل کی دشواریوں یا دوسرے اسباب کی بنا پر ان سے بھی استفادہ نہیں کیا جاتا۔ اب تک جن جنگلوں میں رسائی حاصل ہوئی ہے ان میں ۹۶ ارب مکعب میٹر عمارتی لکڑی موجود ہے۔ اس میں سے تقریباً ایک ارب ۹۷ کروڑ مکعب میٹر ہر سال استعمال ہو جاتی ہے۔

سطح ارض پر جنگلات کی تقسیم بہت ہی غیر مساوی ہے۔ مثلاً شمالی امریکہ میں اوسط ۱.۴ ہیکٹر فی کس ہے جبکہ ایشیا میں صرف ۰.۴ ہیکٹر فی کس ہے۔ اور ایشیا کے بھی بعض ملک ایسے ہیں جہاں جنگلاتی وسائل بالکل معدوم ہیں۔ اسی طرح درختوں کی بعض قسموں کی تقسیم بھی بہت ہی غیر مساوی ہے۔ مثلاً یورپ، روس اور شمالی امریکہ میں صنوبر کی قسم کے درخت ۵ کروڑ ۶۰ لاکھ ہیکٹر کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں اور باقی دنیا میں ان کا رقبہ صرف ۵ کروڑ ہیکٹر ہے۔ اس طرح دنیا کی دو تہائی آبادی کے حصے میں صنوبر کے درختوں کی صرف دس فی صد مقدار آتی ہے۔ صنوبر کی قسم کے درختوں سے کاغذ، کپڑا، خوراک، موٹر گاڑیوں کے لیے ایندھن، مشینوں کو چکنا رکھنے کے لیے روغن، کھانا پکانے کے لیے گیس اور کیمیاوی ربڑ تیار کیا جاتا ہے۔ عمارتوں اور سامان آرائش کے لیے اس کی ضرورت علیحدہ ہے۔ صنوبر کے قسم کی تمام درختوں کی لکڑی ہلکی اور بغیر گانٹھ کے ہوتی ہے اور اس کی قوت سہار ابھی یکساں ہوتی ہے۔ پھر اس کو چھیلنا اور تراشنا بھی زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔ نیز اس میں بدرنگ کرنے والا کوئی مادہ نہیں ہوتا، اسی لیے کاغذ اور ریان کی صنعتوں کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔

فنی دشواریاں

جب ہم گرم علاقوں کے جنگلات میں اگنے والے درختوں پر توجہ مبذول کرتے ہیں تو ہمیں اپنی ناواقفیت کی بنا پر چند فنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یعنی ہم نہ ان درختوں کی صحیح نشو و نما سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ان درختوں کی لکڑی کی نوعیت سے آشنا ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے درختوں کی لکڑی کو تراشے جانے کے بعد خشک ہونے میں کتنی مدت صرف ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں ایسی لکڑی کو منڈیوں میں بیچ کر فروخت کرنے کا مسئلہ بھی حل طلب ہوتا ہے۔ نئی قسم کی عمارتی لکڑی سے لکڑی کے تاجر ناآشنا ہوتے ہیں اور کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس لکڑی کا قدرتی رنگ اور اس کی طاقت کتنے عرصے برقرار رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تاجر عام طور پر معتدل علاقوں میں اگنے والے درختوں کی لکڑی کا سودا کرتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ضمن میں پوری معلومات فراہم کی جائیں تاکہ خاطر خواہ فائدہ ہو سکے۔ قیاس کہتا ہے کہ آج گرم علاقوں کے جن درختوں کی لکڑی عمارتوں وغیرہ کے کام میں استعمال نہیں ہوتی ہے۔ جدید تحقیقات کے بعد اپنی خوبیوں کا سکہ جمالے گی۔ دلیل یہ ہے کہ درختوں کی بہت سی قسمیں جو آج قیمتی سمجھی جاتی ہیں، کچھ عرصے پہلے بے قدری کا شکار تھیں۔

جنگلاتی صنعتیں

جنگلات کی پیداوار سے متعلق صنعتوں میں گودا بنانے اور کاغذ تیار کرنے کی صنعت خاص اہمیت رکھتی ہے آج کل دنیا میں تقریباً ٥ کروڑ ٹن کاغذ لکڑی کے گودے سے تیار ہوتا اور خرچ ہو جاتا ہے گویا اوسط ٢ر١٩ کلوگرام فی کس ہے۔ دنیا کی آبادی میں سے ٢٣ فی صد باشندے یورپ، شمالی امریکہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں آباد ہیں۔ لیکن ان علاقوں میں کاغذ کا اوسط خرچ کلوگرام فی کس ہے۔ گویا کاغذ کی عالمی پیداوار کا ٨٦ فی صد حصہ یہاں کام آجاتا ہے۔ صرف شمالی امریکہ میں کاغذ کی سالانہ کھپت ١٦٩ کلوگرام فی کس ہے۔ اس کے برعکس جنوبی امریکہ، مشرق قریب، مشرق بعید اور افریقہ میں اوسط ٣ر٥ کلوگرام فی کس سے زیادہ نہیں بڑھتی۔

ادارۂ خوراک و زراعت نے اندازہ لگایا ہے کہ جن ملکوں میں اس وقت کاغذ کی کھپت بہت کم ہے وہاں آئندہ دس سال میں اس کی مانگ بقدر ٥٠ فی صد بڑھ جائے گی۔ لیکن اس کے برعکس گرم علاقے کے ملکوں میں ضرورت کے اعتبار سے کاغذ کی پیداوار میں محض برائے نام اضافہ ہوگا۔

اس اہم مسئلے کو حل کرنے کے لیے ادارۂ خوراک و زراعت نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ علاقے کی حکومتوں کو اپنے جنگلاتی وسائل سے استفادہ کرنے میں مشورہ دے گا اور ترقی کے منصوبے بنانے میں تعاون کرے گا۔ اگر کسی ملک میں سرے سے جنگلات ہی نہ ہوں تو نئے جنگلات کو ترقی دینے کی ضرورت پر زور دیا جائے گا اور اگر مناسب لکڑی کافی مقدار میں موجود ہو تو وہاں تحقیقاتی ادارے قائم کیے جائیں گے۔ نیز ایسے قوانین بھی مرتب ہوں گے جن کی رو سے جنگلات کی پیداوار صرف سرکاری مقاصد کے کام آئے گی۔

یہ مسائل غیر معمولی حیثیت رکھتے ہیں، ان کو حل کرنے میں کافی وقت لگے گا۔ اس لیے عام رائے یہ ہے کہ بلا تاخیر س ضمن میں عملی قدم اٹھا لیا جائے۔ ادارے کا تجربہ ہے کہ اگر عزم صمیم کے ساتھ منصوبہ بندی ہو اور سخت محنت سے م لیا جائے تو خراب سے خراب جنگلات بھی کارآمد بنائے جا سکتے ہیں۔

بدھن کی ضرورت

تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے سب سے پہلے ایندھن حاصل کرنے کے لیے جنگلات کے چکر لگائے۔ چناں چہ اس بیسویں صدی میں بھی دنیا بھر کے جنگلات سے جس قدر لکڑی حاصل کی جاتی ہے اس کا نصف حصہ کھانا پکانے اور سان کو گرم رکھنے کے کام آتا ہے۔ کچھ حصہ ریل کی پٹریوں کے نیچے سلیپر لگانے، باڑ کے ڈنڈے گاڑنے اور تعمیر کے لیے ڑ باندھنے کے کام آتا ہے، اور جب اس لحاظ سے بے کار ہو جاتا ہے تو اسے بھی ایندھن بنا دیا جاتا ہے۔

پرانی وضع کے چولھوں میں جلنے والی لکڑی کی بہت سی حرارت اصل مقصد پورا کیے بغیر ضائع ہو جاتی ہے، اس لیے وشش کی جا رہی ہے کہ چولھوں کی بناوٹ سے متعلق معلومات ساری دنیا سے جمع کر کے ایسے نمونے تیار کیے جائیں ن میں حرارت سے سو فی صد فائدہ اٹھایا جا سکتا ہو اور ساتھ ہی ان کی ساخت آسان اور کم خرچ ہو۔

ایندھن کے مسئلے کو حل کرنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ صحیح قسم کے درخت صحیح قسم کی زمین میں اگائے جائیں س کے بعد دوسری دشواریوں کو دور کیا جائے جن میں حمل و نقل کا مسئلہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ درخت کو مناسب قت پر صحیح طریقے سے تراشنا بھی ایک اہم پہلو ہے جس کے لیے تحقیقاتی اور تربیتی ادارے قائم کرنے پڑیں گے۔

پاکستان میں تعلیم بالغاں کا نیا مرکز

دیہاتی کارکنوں کو تربیت دینے کے لیے حکومت پاکستان نے لالہ موسیٰ میں تعلیم بالغاں کا ایک نیا مرکز کھولا ہے جو دیہی علاقوں میں زرعی اور صنعتی ترقی کے سرکاری منصوبے کے ماتحت قائم ہوا ہے۔ اس مرکز میں پاکستانی عملہ ام کرے گا، البتہ اقوام متحدہ کے تعلیمی سائنسی اور ثقافتی ادارے کے دو ماہرین بطور مشیر کام کریں گے۔ اقوام متحدہ کے فنی امداد ے ادارے نے مرکز کے لیے خاص سامان فراہم کیا ہے اور ابتدائی کتابیں چھاپنے کے لیے ایک مشین بھی دی ہے۔ نیز رنگین ملکے اور نقشے شائع کرنے کے لیے سلک اسکرین کا انتظام کیا ہے۔ ان ماہرین میں سے ایک ڈاکٹر ڈونالڈ برنز ہیں جو برطانیہ کے بنیادی تعلیم کے ماہر ہیں۔ دوسرے ڈاکٹر برنز پچھلے سال سے وزارت تعلیم اور دیہی امداد کے سرکاری ادارے کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

موجودہ زمانے میں پانی کی اہمیت

انسان اپنے دماغ سے دنیا کے حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے مشکل سے محسوس کرتا ہے کہ اس دماغ کا نوے فیصد حصہ پانی سے مرکب ہے۔ اس پانی سے جو بھاپ بن جانے کے بعد اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے، دوبارہ وہی ہیئت اختیار کر کے برف کے تودوں، بلندی سے گرنے والی آبشاروں یا طوفان برپا کرنے والے دریاؤں کے تیز دھاروں میں بدل جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ سخت موسم گرما میں ہر روز سمندر کی ایک مربع میل سطح سے پچاس ہزار ٹن پانی بخارات بن کر اڑ جاتا ہے اور وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اسی پانی کے ایک قطرے میں جراثیم کی آمیزش ہو تو وہ اس کے لیے کس قدر ہلاکت ثابت ہوتا ہے۔

نقشے پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا خشک خطے مقابلتہً غیر آباد ہیں۔ اور دریاؤں کی وادیاں گنجان آبادی بٹی پڑی ہیں۔ غالباً بارش کی بوندوں نے جو مل کر نہروں اور دریاؤں میں بدل جاتی ہیں انسان کو صلاح دی ہے کہ وسیع کنبوں کے ساتھ کہاں آباد ہوا جائے۔ پانی صرف کھیتوں اور گھروں میں ہی استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ دریا تیز دھاروں سے انسان کو سفر و سیاحت اور تجارت میں بھی مدد دیتے ہیں۔ اور اس طرح ثقافتی رشتوں کو پروان چڑھانے اور فروغ دینے میں ان کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ اس ترقی یافتہ زمانے میں بھی دنیا بھر کے دریاؤں نہروں پر چلنے والی کشتیاں آبی حمل و نقل کا ایک بڑا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ اکثر دریاؤں کے ذریعہ پیداوار منڈی تک خام مال کارخانوں تک اور تیار شدہ اشیا بازاروں تک پہنچتی ہیں۔

بنی نوع انسان کی ایک بڑی تعداد اپنی تمام زندگی ـــ پیدائش سے موت تک ـ دریاؤں اور جھیلوں کی سطح پر ہچکولے کھانے والی کشتیوں میں گذار دیتی ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا اور مشرق بعید کے ملکوں میں لوگوں پر یہ بات زیادہ صادق آتی ہے جو سورج کی پہلی کرن پھوٹنے کے وقت سے ڈوبنے کی جوت دکھائی دینے تک سطح آب کے سوا کہیں نظر نہیں آتے۔

بہت سے ملکوں نے اقوام متحدہ سے درخواست کی ہے کہ دریائی جہازرانی کے مسائل حل کرنے میں ان کی مدد کی جائے جن کو اقتصادی ترقی کے پروگرام کا اہم حصہ کہا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اقوام متحدہ اور یونیسکو نے ان ملکوں کے دس ماہرین کو تین ماہ کے لیے ایشیا یورپ اور شمالی امریکہ کے دورے پر روانہ کیا تاکہ وہ تمام حالات

لے کر اپنی سفارشات پیش کریں۔ چناں چہ پاکستان اور دوسرے ملکوں کو خاص نمونے کی کشتیاں
نے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اسی طرح دریائی گودیاں تعمیر کرنے میں معقول ہدایات دی گئی ہیں۔

اس کے علاوہ پاکستان، انڈونیشیا اور بولیویا جیسے ملکوں کو دریائی ترقی کے کثیر المقاصد منصوبے بنانے میں
ام متحدہ نے مدد کی ہے جن کی بدولت شہروں میں استعمال کے صاف پانی کی فراہمی اور آب پاشی کی
ن حاصل ہوئی ہیں اور کثیر مقدار میں پانی خرچ کرنے والی صنعتوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

صنعتی اداروں میں پانی کی مانگ برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ مثلاً ریاست ہائے متحدہ میں زراعت سے بھی
نعت و حرفت کے کاموں میں پانی استعمال ہوتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۷۵ء تک صاف پانی کی
ل شدہ مقدار کا دو تہائی حصہ صرف صنعتی کارخانوں کے کام آیا کرے گا۔ اس وقت تک وہاں تمام مقاصد
ے پانی کی روزانہ مانگ آج کل کی نسبت دوگنی ہو جائے گی۔ اس ملک میں ایک گیلن پٹرول بنانے کے لیے
ین پانی، ایک پونڈ ارنی کپڑا تیار کرنے کے لیے چوبیس گیلن پانی اور ایک ٹن فولاد کے لیے ۶۵ ہزار گیلن پانی
ہو جاتا ہے۔

کے بڑے مصرف عام طور پر پانی کے پانچ بڑے مصرف ہیں۔ سرد کرنے کے لیے۔ تعمیری کاموں میں بھاپ بنا
ے کے لیے۔ غلاظت بہانے کے لیے اور آگ سے محفوظ رکھنے کے لیے۔ اقوام متحدہ کے امور اقتصادیات
یہ نے تحقیقات کے بعد لکھا ہے کہ صنعتوں میں استعمال ہونے والے پانی کی ایک تہائی مقدار صرف سرد رکھنے
یر و ساخت کے کاموں میں صرف ہو جاتی ہے۔ عہد جدید میں ایئر کنڈیشن کرنے کے لیے بھی پانی کی بہت
مقدار کام آتی ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک بڑی عمارت میں پانی کی اتنی مقدار روزانہ صرف ہو جاتی ہے جو ۱۵ ہزار
ی آبادی والے شہر میں ایک دن کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

تقریباً تمام بڑے شہروں کو اس دشوار مسئلے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ اپنی بے کار چیزوں خصوصاً گندگی کو کس
طرح ٹھکانے لگایا جائے۔ جن علاقوں میں یہ مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا ہے وہاں بیماریوں نے
نگ جما لیا ہے۔ کیوں کہ غلاظتوں کے جمع ہوتے رہنے سے ماحول پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس ضمن میں
ن کی مثال کافی ہے۔ جہاں روزانہ ۸۰ کروڑ گیلن انسانی فضلے کو بہانے کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اقوام متحدہ کے ماہرین جب بھی کسی نئے شہر کی تشکیل اور منصوبہ بندی میں تعاون کرتے ہیں، غلاظتوں کو بہانے کا مسئلہ سب سے زیادہ مدِنظر رکھا جاتا ہے۔

بیکار سے کارآمد

ہم دیکھتے ہیں کہ بخارات بوندوں کی شکل میں تبدیل ہوتے ہیں اور بوند بوند جمع ہوکر پانی کا ایک تیز دھارا بن جاتا ہے۔ یہ پانی ایک نعمت ہے۔ لیکن یہی پانی آفت بھی ہے۔ خصوصاً جب کارخانوں سے پھینکی ہوئی بے کار چیزیں اور انسانی فضلہ اس میں ملتا ہے تو پھر ہر قطرۂ آب پر اپنا رنگ جما لیتی ہے۔ ان آلائشوں سے پانی کو صاف رکھنے کی ضرورت اتنی اہم ہے کہ پچھلے سال عالمی ادارۂ صحت نے یومِ عالمی صحت کے موقع پر اسی اصول کی تشہیر کی تھی کہ انسانی صحت کے لیے عمدہ صاف پانی ضروری ہے۔

ایشیا کے اکثر علاقوں میں عورتیں گھریلو ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنا بڑا وقت پانی تلاش کرنے اور لانے میں صرف کرتی ہیں۔ لیکن یہ پانی عموماً دریاؤں، نہروں، تالابوں، یا کنوؤں سے لیا جاتا ہے۔ جن میں بیماری پھیلانے والے کیڑوں کی کمی نہیں ہوتی اور لوگ بری طرح ان بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انسانی خوراک کی پوری طرح حفاظت نہ کرنے سے صحت کو بڑا نقصان پہونچتا ہے۔ حال ہی میں ان ملکوں نے جو طبی اعتبار سے بڑے ترقی یافتہ کہلاتے ہیں ان پریشان کن حالات پر قابو پایا ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء اور سنہ ۱۹۴۰ء کے درمیان ریاست ہائے متحدہ میں شہری باشندوں کے پانی کی مانگ دوگنی سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ لیکن ناقص پانی سے بیمار ہونے اور مرنے والوں کی تعداد میں نوے فی صد کمی ہے۔ تاہم خطرہ ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔ ذرا سی غفلت مضر کیفیات پیدا کرسکتی ہے۔

پینے کا بے ضرر پانی

اب تک جو تجربات ہوئے ہیں ان کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ پینے کے بے ضرر پانی کا کوئی مقررہ معیار نہیں ہے۔ عالمی ادارۂ صحت اس کوشش میں ہے کہ اس ضمن میں ایک بین الاقوامی معیار قائم کردے۔ چناں چہ اس سال اپریل میں ایک خاص اجلاس اسی مقصد کے لیے منیلا میں منعقد ہوا تھا۔

پانی سے پھیلنے والی بیماریوں کا ذمہ دار بڑی حد تک خود انسان ہے۔ کیوں کہ عموماً خود اسی کے ہاتھوں پانی غلیظ اور مضر بن جاتا ہے۔ عام بیماریوں کے جراثیم قدرتی طور پر پانی میں موجود نہیں ہوتے۔ بلکہ انسان کی غفلت سے اس میں مل جاتے ہیں

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

اموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ہی تعلیمی رسالے ہیں۔ جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے۔

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ہیں۔ جو مرکزی اور صوبائی درسگاہوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ہیں۔

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو بھیجے جائیں۔ ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے۔

۴ - یہ رسالے ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ میں چھپتے ہیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے۔ جو کہ مینیجر کو بھیجنا چاہئے۔

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ہونگی۔ تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت مینیجر سے کریں۔

مینیجر
پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش
۷ کچہری روڈ - لاہور (پاکستان)

آموزش

[دسمبر ۱۹۵۶] **لاہور** [شمارہ ۹]

اس شمارہ میں

تحریر { پروفیسر سراج الدین / پروفیسر ایم - اے - مخدومی }

معاونین { عبدالغفور چوہدری / فضل احمد }

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

دسمبر سنہ ۱۹۵۶ء

جلد ۹

شمارہ ۹

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ۔ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

ایم۔ اے مخدومی

آموزش کے اس شمارے میں خداداد استعداد اور ماحول کی تاثیر پر ایک تفصیلی بحث شائع ہو رہی ہے۔ یہ یقین ہمیشہ سے چلا آیا ہے کہ بعض لوگوں کو قدرت نے کچھ غیر معمولی جوہر عطا کر رکھے ہوتے ہیں اور یہ جوہر منظر عام پر آنے کے لیے خود اپنے لیے راہیں پیدا کر لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم و تربیت کی تاثیر بھی ہمیشہ مسلّمہ رہی ہے۔ اس بات کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے کہ سازگار فضا اور پسندیدہ ماحول کو انسانی کمالات کی ترقی میں بڑا دخل حاصل ہے۔

خداداد استعداد اور ماحول کی اضافی تاثیر کا مسئلہ تعلیم کے لیے ہمیشہ ایک دلچسپ موضوع بنا رہا ہے۔ بڑے بڑے صاحب نظر لوگوں نے اس مسئلہ کے دونوں پہلوؤں پر بہت کچھ کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعات و شواہد کی روشنی میں اس کے دونوں پہلوؤں کی اہمیت تقریباً یکساں معقولیت کے ساتھ ثابت کی جا سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ماضی کے بعض عالموں نے موروثی استعداد کو سب کچھ قرار دیا ہے، اور بہتوں نے ماحول یعنی تعلیم و تربیت کو اولیت کا مستحق سمجھا ہے۔

جدید تعلیم کا سب سے بڑا خاصہ اس کا سائنسی استدلال ہے۔ وہ کسی ایسے نظریے کو تسلیم نہیں کرتی جس کے حق میں قطعی سائنسی شہادت موجود نہ ہو۔ موجودہ صدی کے آغاز میں جب علم التعلیم کو نتائج کی پیمائش کے لیے ایک اچھا قابل اعتماد آلہ ہاتھ لگ گیا تو اس نے اپنے بہت سے اختلافی مسائل کے شافی جواب تلاش کرنا شروع کیے ان میں سے ایک مسئلہ خداداد استعداد اور ماحول کی اضافی تاثیر کا مسئلہ بھی تھا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے درمیانی وقفے میں اس مسئلہ پر لمبی چوڑی بحثیں ہوئیں۔ دونوں نقطہ ہائے نگاہ کے حامیوں نے تحقیقی مطالعوں کے نتائج کو بنا قرار دے کر اپنے اپنے موقف کو ناقابل تردید ثابت کرنا چاہا۔ آخر یہ بحث اس نتیجہ پر پہنچ کر ختم ہوئی کہ انسانی شخصیت کی تعمیر میں خداداد استعداد اور موزوں ماحول دونوں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ ماحول کی تاثیر کوئی دقیق شے نہیں ہے

بلکہ یہ تاثیر بھی نسل بعد نسل منتقل ہو سکتی ہے۔

سائنسی تحقیق کے یہ نتائج جدید تعلیم کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ جمہوری طرز زندگی کی ساری عمارت دو بنیادی ستونوں پر اٹھائی گئی ہے۔

(۱) ہر شخص بعض یگانہ صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے، جن کے اظہار کے لیے اسے پورے مواقع میسر ہونے چاہئیں۔

(۲) معاشرے کے تمام افراد کو حصول خودی کے یکساں مواقع ملنے چاہئیں۔

جدید طریقہ ہائے تدریس کی اصل بنیادیں یہی دو اصول ہیں۔ جدید مدرسہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے ایسا آزاد، اجازت دہ، اور زندگی سے بھرپور ماحول پیدا کرے کہ ہر بچے کے انفرادی جوہر پوری آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آجائیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ فرد کی خداداد استعداد نشوونما پا کر معاشرتی ہیبت میں اضافہ کا باعث ہو سکتی ہے۔ اجتماعی زندگی کے حسن و خوبی کا راز اسی میں ہے کہ ہر بچے کی یگانہ صلاحیتوں کو معلوم کیا جائے اور ان کے ابھرنے اور بلا روک ٹوک ترقی پانے کا بہترین سامان پیدا کیا جائے ٭

کس کو زیادہ اہم سمجھا جائے
ماحول کو یا سرشت کو

فضل احمد

کوری تختی

بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا جب تعلیم کے متعلق یہ یقین کیا جاتا تھا کہ وہ متعلم کو جس سانچے میں چاہے ڈھال دے۔ مشہور انگریز فلسفی جان لاک کے الفاظ میں بچے کا دل ایک "کوری تختی" کی مانند ہے جس پر استاد جو چاہے لکھ دے۔ یہ یقین اس قدر عام تھا کہ جہاں تعلیم متوقع نتائج پیدا کرنے سے عاجز نظر آتی تھی اسے استاد یا بیشتر حالتوں میں طالب علم کا قصور سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جو طالب علم پڑھائی میں دوسروں سے پیچھے رہ جاتا اسے استاد اور والدین دونوں لعنت ملامت اور مار پیٹ کا مستحق سمجھتے تھے۔ اس یقین کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ استاد کو طالب کی ذہنی زندگی کا خالق سمجھا جاتا تھا۔ یہ بات اس کی پسند پر موقوف سمجھی جاتی تھی کہ وہ کس طالب علم کو کتنا علم عطا کرتا ہے۔

جدید نفسیاتی انکشافات

موجودہ صدی کے نفسیاتی انکشافات نے اس تصور کو بالکل غلط ثابت کر دکھایا ہے کہ بچہ مدرسے میں "دل کی ایک کوری تختی" لے کر آتا ہے۔ تحقیق نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہر بچہ ماں کے پیٹ ہی سے بعض مخصوص صلاحیتیں اور جوہر لے کر آتا ہے۔ ماں باپ اور مدرسے کا کام ان جوہروں کی آبیاری کرنا ہے اور بس۔ وہ اپنے پاس سے بچے کو کوئی نیا جوہر عطا نہیں کر سکتے۔ ماں کے پیٹ میں جس وقت حمل قرار پاتا ہے۔ بچے کی جلد، آنکھوں اور بالوں کے رنگ کا فیصلہ اسی وقت ہو جاتا ہے۔ اس کے قد و قامت اور بعض دوسرے جسمانی خصائص بھی اس وقت طے ہو جاتے ہیں۔ یہی حال بہت سے ذہنی اور مزاجی خصائص کا ہے۔ بچہ یہ استعدادیں ساتھ لے کر دنیا میں قدم رکھتا ہے۔

ان علمی انکشافات نے تعلیم کے منصب اور اس کے طریقہ ہائے کار پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ جدید مدرسے اب اس بات کا دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ ایک طالب علم کو جو چاہیں بنا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ بہت سا وقت اور توجہ بچے کی ذہنی افتاد اور اس کی مزاجی ساخت معلوم کرنے پر صرف کرتے ہیں، وہ اسے ایسی تعلیم دینے کی کوشش

کی صلاحیتوں یعنی اس کے مخصوص جوہروں کے حسب حال ہو۔ جہاں روایت پرست تعلیم کی ساری دوڑ دھوپ اس بات پر صرف ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح بچے کو مدرسے کی تعلیم کے ڈھب پر لایا جائے وہاں جدید ترقی پسند تعلیم کی ساری کوشش اس بات پر صرف ہوتی ہے کہ تعلیم کو بچے کے حسب حال بنایا جائے۔ جدید مدرسے طرح طرح کی معروضی آزمائشوں سے ہر بچے کی قدرتی دلچسپیوں اور اس کے فطری جوہروں کا جائزہ لیتے ہیں اور ان آزمائشوں سے حاصل شدہ واقفیت کی روشنی میں اسے کسی خاص پیشے کے لیے تیار کرتے ہیں۔

تعلیم کا بڑا حربہ

جب صورت حال یہ ہو کہ ہر بچے کی فطری صلاحیتیں پہلے سے طے شدہ ہوں تو تعلیم کے پاس اثر انگیزی کا کونسا حربہ باقی رہ جاتا ہے۔ اس کا جواب جدید تعلیم کے پاس ہے "ماحول"۔ مدرسہ بچوں کے لیے اس قسم کا ماحول پیدا کرتا ہے جو ان کے فطری جوہروں کو ٹھیک ٹھیک کر ابھرنے کی ترغیب دے۔ مدرسے کی فضا اور اس کا سارا ماحول ایک سوچے سمجھے منصوبے کے ماتحت تیار ہوتا ہے۔ یہ ماحول بچے کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتا اور اس کے مخفی جوہروں کو منظر عام پر لاتا ہے۔

ایک معمہ:- بعض لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ جب ہر شخص کی سرشت اس کے دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے مقرر ہو چکی ہے تو پھر ماحول اس میں کیا رد و بدل کر سکتا ہے؟ یہ لوگ فردوسی کے ان مشہور اشعار کو دہراتے ہیں۔

اگر بیضۂ مرغ ظلمت سرشت — نہی زیر طاؤس باغ بہشت
بہ ہنگام آں بیضہ پروردنش — ز انجیر جنت دہی ارزنش
دہی آبش از چشمۂ سلسبیل — بر آں بیضہ دم در دمد جبرئیل
شود عاقبت بچۂ زاغ - زاغ — برد رنج بیہودہ طاؤس باغ

ان اشعار میں جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ درست ہے۔ کوئی ماحول کوے کے انڈے سے مور کا بچہ نہیں نکال سکتا۔ لیکن ماحول یہ ضرور کر سکتا ہے کہ کوے کے کسی بچے کو اپنی جنس کے بہترین نمونہ میں تبدیل کر دے۔ ماحول کا منصب صرف اس قدر ہے اور بس۔

ایک حدیث میں صاحب جوامع الکلم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے الناس معادن

معادن الذہب والفضۃ - اخیارکم فی الاسلام، اخیارکم فی الجاہلیۃ ؛ــ

ترجمہ) لوگوں کی مثال سونے اور چاندی کی کانوں کی سی ہے۔ تم میں سے جو لوگ اسلام لانے کے بعد سب سے اچھے ہیں، وہ جاہلیت کے زمانے میں بھی سب سے اچھے تھے۔

اس حدیث میں ماحول اور سرشت کے مسئلے کا حل نہایت خوب صورت اور جامع الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ جو لوگ اسلام کی آمد کے بعد نیکی کے لحاظ سے چوٹی پر تھے یہ وہی لوگ تھے جو زمانہ قبل از اسلام میں بھی نیکی کے اعتبار سے چوٹی کا درجہ رکھتے تھے۔ مگر اس سلسلہ میں اہم نکتہ یہی ہے کہ زمانہ جاہلیت کی نیکی اور اسلام کی آمد کے بعد کی نیکی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس کی بہترین مثال غالباً یہ ہے کہ برسات کی آمد سے پہلے کسی کھیت میں کئی ایک پودے اُگے ہوئے ہوں۔ ان میں سے چند ایک دوسروں سے بلند تر ہوں گے۔ برسات کی بارشوں کے بعد یہ سب کے سب تیزی سے بڑھیں گے اور خوب سرسبز اور تنومند ہو جائیں گے۔ لیکن جو پودے پہلے زیادہ بڑے تھے وہ باقیوں سے زیادہ تیز رفتار کے ساتھ بڑھیں گے اور اپنی امتیازی حیثیت کو بدستور قائم رکھیں گے۔

اس حدیث شریف میں سرشت کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ جس طرح کوئی شخص سونے کی کان میں سے چاندی اور چاندی کی کان میں سے سونا نہیں نکال سکتا بالکل اسی طرح ہر شخص میں صرف وہی جوہر مل سکتے ہیں جو اس کی سرشت میں موجود ہوں۔ لیکن ماحول کی تاثیر بھی ناقابلِ انکار ہے۔ اسلام نے عرب کے ماحول میں یک دم ایسا انقلاب پیدا کر دیا کہ قوم کی قوم کے چھپے ہوئے جوہر دفعتہً چمک اٹھے اور یہ گمنام قوم دنیا کی راہ نما بن گئی۔

سرشت اور ماحول کے صحیح مفہوم اور ان کے باہمی رشتہ کو سمجھنا تعلیم کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ذیل میں اس سوال کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی نگاہ ڈالی جا رہی ہے۔

ماحول کیا ہے ؟ :- ماحول کے لفظی معنی ان اشیا کے ہیں جن سے ہم اپنے آپ کو گھرا ہوا پاتے ہیں۔ اس مفہوم کے مطابق ہم اپنے جسم کو اپنی ذات خیال کرتے ہیں اور اپنی ذات کے علاوہ تمام بیرونی اشیا کو ماحول میں شمار کرتے ہیں یہ خیال زیادہ صحیح نہیں۔ سچ یہ ہے کہ ماحول صرف زندگی پر اثر انداز ہونے والی شے نہیں بلکہ یہ خود زندگی کا ایک جزو ہے۔ ہم اپنے ماحول سے اس قدر ہم آہنگ ہو چکے ہوتے ہیں کہ اس کے تصور کے بغیر زندگی کے مفہوم کا اندازہ کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہم کرۂ ارض پر زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں، اس سیارے کی اپنی مخصوص کشش

ثقل ہے۔ جس کی چند در چند کارفرمائیوں کو ہم قدرتی چیز سمجھنے کے عادی ہیں۔ اگر دفعتہً ہم کسی طرح اس سیارے کو چھوڑ کر اس سے کئی گنا بڑے سیارے مشتری پر چلے جائیں تو ہمارے لیے خود اپنی ذات ایک عجوبہ بن کر رہ جائے گی۔ ہمارا جسم یک دم کئی گنا زیادہ بوجھل بن جائے گا۔ صرف یہی ایک چیز ہمیں خود اپنی ہستی کے متعلق شبہ میں ڈال دینے کے لیے کافی ہو گی۔ اگر مشتری کی بجائے ہم کسی طرح چاند میں جا پہنچیں تو بھی معاملہ کچھ اسی قسم کا ہو گا۔ چاند کی جسامت زمین سے کئی گنا چھوٹی ہے۔ اسی نسبت سے اس کی کشش ثقل کم ہے۔ ہم چاند میں پہنچتے ہی اپنا وزن کئی گنا ہلکا پائیں گے اگر اتفاق سے ہم کمرے کے فرش پر زور سے پاؤں دے ماریں تو اگلے لمحہ اپنا سر کمرے کی چھت کے ساتھ ٹکراتا ہوا پائیں گے اس یکسر اجنبی ماحول میں شاید زندگی زیادہ عرصے کے لیے ممکن نہ ہو۔ ہم زندگی کو صرف اس ماحول کے پس منظر میں ہی جانتے ہیں، جس کے ساتھ یہ ہم آہنگ ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے زندگی اور ماحول دو متوازی چیزیں ہیں۔

کسی دوسرے سیارے پر چلے جانے سے ماحول میں جو تبدیلی ہو جاتی ہے وہ صد درجہ انقلابی قسم کی ہے خود اس دنیا میں ایک ملک سے دوسرے ملک بلکہ ایک مقام سے دوسرے مقام کو چلے جانے سے ماحول میں بہت بڑی تبدیلی آ جاتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک ہی مقام کے مختلف گوشوں میں مختلف قسم کے ماحول موجود ہیں دوہری شخصیت ایک عام مشاہدہ ہے۔ دوہری شخصیت سے مراد یہ ہے کہ ایک آدمی کا عام وطیرہ ایک خاص ماحول میں اور ہو اور عام ماحول میں اور۔ مثلاً ایک شخص گھر پر بڑا ملنسار اور حلیم الطبع ہے لیکن دفتر میں جا کر ماتحتوں کے ساتھ صد درجہ سخت گیر اور ترش رو بن جاتا ہے۔ اس کے طرز عمل کا یہ حیران کن تفاوت ایک ایسا معمہ ہے جس کی شرح ماحول ہی میں ڈھونڈی جا سکتی ہے ورنہ اس کی سرشت دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ اس طور پر ہمارے مدرسوں میں کئی ایسے بچے ملیں گے جو گھر میں صد درجہ شوخ ہوتے ہیں لیکن مدرسے میں آتے ہی اس طرح سن ہو جاتے ہیں گویا منہ میں زبان نہیں۔ اس تفاوت کی وجہ بھی مدرسے کے ماحول میں ہی تلاش کرنی چاہیے۔ غرض انسانی زندگی پر ماحول کا اثر نہ صرف ناقابل انکار ہے بلکہ بہت دور رس بھی۔

ماحول کی ہر تبدیلی خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، ماحول میں رہنے والوں کے طرز عمل میں کچھ نہ کچھ تبدیلی لاتی ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ ماحول ایک فعال عنصر ہے اور انسانی طبیعت کا کام اثر پذیری کے سوا کچھ نہیں انسانی طبیعت بھی اسی طرح فعال ہے جس طرح ماحول۔ مثلاً بچپن کے زمانے میں ایک شخص کے مراسم گھر والوں سے

اور نوعیت کے ہوں گے۔ لڑکپن کے زمانے میں اس سے مختلف نوعیت کے، اور جوانی کے زمانے میں ان دونوں سے مختلف اگر گھر کے ماحول میں رتی بھر تبدیلی واقع نہ ہو تو بھی ان تینوں حالتوں میں اس شخص کے طرز عمل میں نمایاں تبدیلی نظر آئے گی اس تبدیلی کی وجہ ماحول کی بجائے خود اس شخص کی ذات میں تلاش کرنی پڑے گی۔

ہر جاندار شے کو اپنے ماحول کے ساتھ نباہ کرنا پڑتا ہے۔ اس نباہ کے لیے وہ ماحول کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرتی ہے۔ ہم آہنگی ایک جامع لفظ ہے۔ اس میں صرف ماحول کے سامنے سر جھکا دینے کا مفہوم ہی نہیں بلکہ اس مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ ماحول میں اس حد تک ترمیم کر دی جائے کہ وہ جاندار شے کا ساتھ دے سکے۔ ماحول میں ترمیم کرنے کا ملکہ جانداروں میں انسان کا مخصوص حصہ ہے۔ اسی ملکہ کی بدولت اسے باقی کائنات پر برتری حاصل ہے۔

ماحول کے دو اہم اجزاء:۔ انسان نے اوّل اوّل جب دنیا میں قدم رکھا تو اپنے آپ کو ماحول کے رحم پر پایا موسموں کی شدت، آندھیوں اور طوفانوں کی تندی، بجلی کی کڑک اور جنگلی جانوروں کے حملوں کے خلاف اس کے پاس کوئی بچاؤ موجود نہ تھا۔ لیکن قدرت نے اسے ایک ایسی قوت عطا کر رکھی تھی جو ان مہیب طاقتوں سے بھی قوی تر تھی۔ یہ قوت انسان کا ذہن تھا۔ اس کی فکری قوت نے بے بسی کی حالت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انسان اپنے ماحول پر قابو پانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک ماحول پر قابو پانے کی یہ کوشش جاری ہے۔ اس کوشش کا نتیجہ وہ شاندار مصنوعی ماحول ہے جو صدیوں کی انسانی جدوجہد کی پیداوار ہے اور انسانی تہذیب کے نام سے موسوم ہے۔ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اسے انسان کے اس پیدا کردہ ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے۔ نئی پود کو ماحول کے ساتھ ہم آہنگ بنانا تعلیم کی ذمہ داری ہے۔

انسان کا پیدا کردہ ماحول دو اجزا پر مشتمل ہے:۔ (ا) بیرونی (ب) اندرونی۔ ماحول کا بیرونی حصہ ان تمام چیزوں پر مشتمل ہے جو انسان نے قدرتی ماحول میں ردو بدل کر کے پیدا کی ہیں مثلاً مکانات، شہر، ذرائع آمد و رفت نہریں، کھیتیاں، باغ اور تہذیب کے دوسرے مادی لوازمات۔ اس بیرونی ماحول کا ایک امتیازی خاصہ یہ ہے کہ اگر آج اس کے خالق کسی وجہ سے ناپید ہو جائیں تو بھی یہ کچھ عرصہ کے لیے باقی رہے گا۔ ماحول کا اندرونی حصہ غیر مادی ہے۔ یہ خود معاشرے، اس کے اوضاع و اطوار، رسم و رواج، اس کے اداروں، اس کی ممنوعات

اور مستحبات پر مشتمل ہے۔ یہ معاشرتی ماحول ہے۔ اس کا امتیازی خاکہ یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے آج یہ معاشرہ ختم ہو جائے تو اس کا یہ اندرونی ماحول بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔

زندگی بسر کرنے کے لیے انسان کو ماحول کے ان دونوں اجزا سے سمجھنا پڑتا ہے۔ ہاں ان دونوں اجزا میں ایک فرق ضرور ہے، وہ یہ کہ بیرونی ماحول کو قبول کیے بغیر زندگی ممکن نہیں۔ مثلاً جو شخص مقامی موسم کی کیفیتوں کو برداشت نہیں کر سکتا وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ بیرونی ماحول جبراً مناسبت حاصل کرتا ہے اندرونی ماحول میں جبر کی یہ شدت نظر نہیں آتی۔ اس کی قدروں کو اپنانا ایک حد تک انسانی اختیار میں ہے، مگر اندرونی ماحول کی قوت بھی ناقابل انکار ہے۔ بچہ اس ماحول میں آنکھ کھولتا اور پل کر بڑا ہوتا ہے۔ یہ ماحول اس کی تربیت کا جزو بن جاتا ہے، اسے اپنی ہر خواہش کی تشفی کے لیے اس ماحول کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔

موروثی اوصاف

تعلیم کی سب سے بڑی غرض نئی پود کو گرد و پیش کے ماحول کے ساتھ ہم آہنگ بنانا ہے۔ اس ماحول میں صرف محدود ملکی ماحول ہی شامل نہیں بلکہ بین الاقوامیت کے موجودہ دور میں اس ہم آہنگی میں یہ بھی شامل ہے کہ نئی پود ملکی اور عالمی حالات کی ہر ناگہانی صورت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔ ماحول کی اس غیر معمولی اہمیت نے عالموں کی توجہ موروثی اوصاف کے مطالعہ کی طرف کھینچی ہے۔ جب ایک ہی ماحول دو طبائع پر یکساں اثر پیدا نہیں کرتا تو آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ یہ وجہ بدیہی طور پر فطری استعدادوں کے اختلاف کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ موروثی اوصاف میں انسان کو قدیم زمانے سے اعتقاد چلا آیا ہے۔ بادشاہت اور مذہبی پیشوائی کا وراثتاً منتقل ہونا اس اعتقاد کی ہی ایک کارفرمائی تھی۔ مگر مطالعہ و تحقیق کے موجودہ زمانے میں ایسے معرکتہ الآرا مسئلہ کو بلا ثبوت و شہادت درست تسلیم نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس اہم سوال کا مطالعہ پچھلی صدی میں شروع ہوا، جب گالٹن نے اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اکثر غیر معمولی ذہانت کے لوگ بظاہر اتفاقیہ طور پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر والد اعلیٰ ذہانت کا مالک ہو تو غیر معمولی ذہانت کے بچوں کا پیدا ہونا زیادہ غالب ہو جاتا ہے۔ گالٹن کے کام کو کارل پیرسن نے جاری رکھا۔ اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ معمولی قابلیتوں میں جو غیر معمولی اختلافات نظر آتے ہیں ان کے لیے ماحول کے مقابلے میں موروثی اوصاف زیادہ ذمہ دار ہیں۔ اس نے ان دونوں عناصر کی اضافی تاثیر کو ناپنے کی کوشش بھی کی اور بعض شواہد سے یہ ثابت کرنا چاہا کہ ایک ہی نسل کے لوگوں میں موروثی اوصاف ماحول

مقابلے میں سات گنا زیادہ تاثیر رکھتے ہیں۔ بعد میں وڈز نے نسل کی بجائے پیشے کو ایک اہم عنصر قرار دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ دوسرے خاندانوں کے مقابلے میں شاہی خاندانوں میں زیادہ قابل لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ امریکہ میں اس قسم کا ایک مطالعہ وشر نے کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قابل بچوں کی سب سے زیادہ تعداد پادریوں کے گھروں میں پیدا ہوتی ہے۔ پادریوں کے بعد تاجروں کا درجہ آتا ہے۔ پھر کسانوں کا۔ پھر ماہر کاریگروں کا اور سب سے آخر میں غیر تربیت یافتہ مزدوروں کا۔ امریکہ میں اس قسم کے اور بھی بہت سے مطالعے کیے گئے، جن میں مختلف نسلوں اور نسلی گروہوں کی ذہانت کا مقابلہ کیا گیا۔ گوری نسل اور حبشیوں کی ذہانت کو ماپ کر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ گورے بچے عموماً زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ ان مطالعوں میں وہ مطالعہ بھی شامل ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ امریکہ کے بعض مشہور خاندان، مثلاً جوناتھن ایڈورڈز غیر معمولی ذہانت کے حامل ہیں۔ جب کہ بعض بدنصیب خاندان مثلاً جیوک اور کالیکاک اپنی کند ذہنی کے لیے مخصوص ہیں۔ وشر نے اپنے نتائج کی بنیاد ان لوگوں کے مطالعہ پر رکھی تھی جن کے نام ۲۳-۱۹۲۲ء میں ملک کے مشہور آدمیوں کی فہرست میں شامل کیے گئے تھے۔ ان اعداد و شمار کا ایک دلچسپ حصہ درج ہے۔

	شاہیر کے والدین کی تعداد	مشہور ہستیوں کی تعداد جو ۰۰۰۸۲ افراد میں ایک ہیں
با فراغت اشخاص	۴۹	×
غیر تربیت یافتہ مزدور	۹۲	۱
تربیت یافتہ مزدور	۱۱۶۵	۳۰
کسان	۴۳۱۰	۷۰
کاروباری لوگ	۶۴۷۳	۶۰۰
ڈاکٹر، وکیل اور دوسرے پیشہ ور	۴۲۶۵	۱۰۳۵
پادری	۲۰۳۶	۲۴۰۰

ان مطالعوں کے نتائج سے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی گئیں۔ تاہم یہ نظر انداز کیا جاتا ہے کہ پڑھے لکھے اور شستہ گھروں کے بچوں کو جو سلجھا ہوا ماحول میسر آتا ہے وہ عام گھرانوں کے بچوں کو میسر نہیں آتا۔ اس قسم کے اعداد و شمار سے نتائج اخذ کرتے وقت بڑی احتیاط چاہیے کیوں کہ وہ بذات خود موروثی اوصاف یا ماحول کے حق میں کوئی واضح

فیصلہ نہیں دیتے۔ ہر شخص کے گھر کا ماحول اس کے پیشے سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر پادریوں کے گھروں میں دوسرے تمام پیشوں کے لوگوں کے مقابلے میں ایسے بچے زیادہ تعداد میں پیدا ہوئے جو آگے چل کر ملک کے مشاہیر میں شامل ہوئے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ان بچوں کو باپ کی طرف سے کوئی خصوصی جوہر ورثہ میں ملے تھے یہ امکان موجود ضرور ہے لیکن بالکل اسی قدر امکان یہ بھی ہے کہ گھر کے مخصوص ماحول نے ان بچوں کے فطری جوہروں کی غیر معمولی آبیاری کی ہو۔ غرض مطالعہ کرنے والوں نے موروثی اوصاف کو جو تاثیر عطا کرنا چاہی ہے اعداد و شمار اپنی زبان حال سے اس کے حق میں کچھ نہیں کہتے۔

ان اعداد و شمار سے وراثت کے حامیوں کے حق میں بھی گنجائش نظر آتی ہے۔ اور اس کے مخالفوں کے حق میں بھی۔ تاہم گوری نسل کی برتری کے حامیوں نے اس قسم کی شہادت کو بنا قرار دے کر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ حبشی نسل کے افراد زندگی کے پہلے دن سے بعض ایسے ذہنی اوصاف سے محروم ہوتے ہیں جو گوری نسل کو ورثہ میں ملے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا کوئی عام نتیجہ نکالنے سے پہلے سائنسی تحقیق کے وہ تمام معیار پورے ہونے چاہئیں جن کی عدم موجودگی میں کوئی رائے قابل اعتماد نہیں کہلا سکتی۔

بعض شواہد:— ذیل میں چند مخصوص شواہد کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ پڑھنے والے کو اس دشواری کا کچھ احساس ہو سکے جو معاشرتی واقعات و شواہد کے جانچنے میں پیش آتی ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے فوجی رنگروٹوں کی جو نفسیاتی آزمائش کی جاتی ہے اس کے اعداد و شمار کا مطالعہ کرتے ہوئے ہرکس اس نتیجہ پر پہونچا کہ حبشی رنگروٹوں کی اوسط ذہنی عمر ۴ء۱۰ سال تھی جبکہ گورے رنگروٹوں کی ذہنی اوسط عمر ۱۳ء۱ سال۔ اس شہادت سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کی توجیہہ کی جائے۔ اس سلسلے میں پہلا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک مخصوص طبقے کے کچھ گنے چنے افراد کو ساری جماعت کی ذہنی سطح کا آئینہ دار کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے؟ دوسرا سوال اس سے زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ جن نفسیاتی آزمائشوں کو ذہانت کا ترازو بنایا گیا تھا وہ خود کس حد تک قابل اعتماد تھیں، مثلاً یہ کہ ان آزمائشوں میں بعض اجزا صحت کار کی پیمائش کرتے ہیں یعنی امیدوار کو وقت کے ایک مخصوص وقفے میں ایک مقررہ عمل صحت کے ساتھ انجام دینا ہوتا ہے۔ لیکن اگر کچھ امیدوار مقررہ وقت میں اس عمل کو تیزی سے پورا نہیں کر سکتا تو اس سست روی کو ذہانت کی سی لطیف شے کا پیمانہ قرار دینا کہاں تک جائز ہے۔ تیسرا سوال بھی یکساں طور پر اہم ہے۔ وہ یہ کہ حبشی اور گورے رنگروٹ مختلف قسم کے معاشرتی پس منظر سے

آتے ہیں۔ کیا نفسیاتی آزمائش اس قدر معروضی تھی کہ دونوں گروہوں کے معاشرتی ماحول کے اثرات سے متاثر نہ ہوئی ہو؟ زیادہ وضاحت کے لیے ایک مثال دیکھیے۔ فرض کیجیے کہ نفسیاتی آزمائش کا ایک جزو کوئی بدنی مہارت ہے اور دوسرا جزو حساب کتاب کا کوئی ذہنی عمل۔ اب فرض کیجیے کہ دو امیدوار اس آزمائش میں سے گذر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ترکھان ہے اور دوسرا کسی بنک کا کلرک۔ ظاہر ہے کہ پہلا امیدوار دستی مہارت میں بڑا کامیاب رہے گا۔ مگر حساب کتاب کے معاملے میں اپنی ساتھی سے پٹ جائے گا۔ دوسرے امیدوار کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوگا۔ وہ دستکاری کی آزمائش میں ناکام رہے گا۔ لیکن حساب کتاب میں اپنے حریف پر بازی لے جائے گا۔ حبشیوں اور گوروں کے موازنے میں تقریباً اسی قسم کی دشواری پیش آتی ہے۔ دونوں کے معاشرتی پس منظر میں نمایاں فرق موجود ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ کوئی ایسی ذہنی آزمائش وضع کی جاسکتی ہے۔ جو مختلف معاشرتی ماحول میں پلے ہوئے افراد کے درمیان بالکل غیر جانب دار رہے۔ مثلاً اگر حبشی امیدوار کسی لسانی مہارت میں اپنے گورے حریفوں سے پیچھے رہتا ہے تو کیا اس کی یہ وجہ نہیں کہ اس کی تربیت ہی اس طور پر ہوئی ہے جس سے وہ لسانی مہارت میں پیچھے رہ گیا ہے؟ کیا گورے ساتھیوں کے مقابلے میں زندگی کی سہولتوں اور مستقبل کے مواقع کا فقدان ذہنی سطح کو نیچے کھینچنے والی چیز نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ماضی کے ماحول کے اثرات ہماری ذات کا جزو بن جاتے ہیں۔ شخصیت کو تولتے وقت ایسا کوئی ذریعہ ہاتھ نہیں لگ سکتا جو ماحول کے اثرات کو موروثی اوصاف سے الگ کرکے دکھا دے۔ ہر آزمائش امیدوار کی موجودہ ہستی کا ہی جائزہ لے سکتی ہے۔ یہ ہستی موروثی اوصاف اور ماحول کے اثرات کی پیداوار ہوا کرتی ہے۔ اب تک کوئی ایسا ذریعہ ہاتھ نہیں لگ سکا جو جائزہ لینے کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دے کہ شخصیت کا یہ حصہ موروثی اوصاف کی پیداوار ہے اور یہ حصہ ماحول کی پیداوار۔

دوسری مثال:۔ اب ایک اور مثال لی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی مثال ہے جس میں مندرجہ بالا دشواریوں میں سے بہت سی دشواریاں موجود نہیں۔ کیوں کہ اس مثال میں موضوع پیمائش ذہنی سطح نہیں بلکہ جسمانی اطوار ہیں جن کی پیمائش نسبتاً سہل ہے۔ اس مثال میں جاپانی اور امریکی سپاہیوں کے قد کا موازنہ کیا گیا ہے۔ اول الذکر کا قد ۵۶ اور ۶۹ انچ کے اندر اندر پایا گیا اور آخر الذکر کا ۶۱ سے ۷۵ انچ کے اندر اندر۔ جاپانی سپاہیوں کا اوسط

قد ۶۲ء۲۳ انچ نکلا اور امریکی سپاہیوں کا ۶۷ء۵۱ انچ۔

دو قوموں کے سپاہیوں کے اس جسمانی فرق کو ان دونوں قوموں کے عام جسمانی اختلاف کا ایک آئینہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف دونوں قوموں کے بالغ مردوں کے قد کی اوسط کی درست پیمائش نہیں۔ اس نتیجے سے یہ یقین کر لینا کہ امریکی قوم کا لمبا قد اور جاپانی قوم کا پست قد ایک موروثی شے ہے۔ واضح طور پر غلط استدلال ہوگا۔ امریکی اور جاپانی قوموں کے ماحول میں بڑا نمایاں فرق ہے۔ دونوں ملکوں کی آب و ہوا۔ غذائی صورت حال۔ حالات زندگی اور طریق تربیت میں بڑا فرق ہے۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں قوموں کے اوسط قد کا فرق وراثتی شے ہے یا مختلف ماحول کی پیداوار۔ یہ نکتہ اس وقت اور بھی زیادہ اہم نظر آتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہنگامی حالات مثلاً جنگ یا قومی ابتلا کے دور میں جب غذائی صورت حال اعتدال سے نیچے گر جاتی ہے تو اس کا نمایاں اثر بچوں کے قد اور ان کے وزن پر پڑتا ہے۔ اس بات کی شہادت بھی موجود ہے کہ اچھی اور متوازن غذا سے بچوں کے قد بڑھ جاتے ہیں۔ بعض امریکی عالموں نے ریاست ہائے متحدہ میں غیر ملکوں سے آکر آباد ہونے والے لوگوں کے بچوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ ان کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ ایسے لوگوں کے امریکہ میں پیدا ہونے والے بچے اپنے ماں باپ کے مقابلے میں لمبے قد والے ثابت ہوئے۔ یہ تمام امور اس بات کی دلیل ہیں کہ قد جیسی جسمانی خصوصیت کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا یہ موروثی چیز ہے یا ماحول کی پیداوار۔

تیسری مثال:- تیسری مثال ایسی ہے جس میں نسلی فرق کو دخل نہیں۔ کارل پیئرسن نے اپنے دارالتجربہ میں جو مشاہدے کیے ان کی بنا پر اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ والدین اور بچوں کے قد میں ایک خاص مناسبت موجود ہے۔ اس کے حساب کے مطابق یہ مناسبت +۰ء۵۰ تھی۔ اگرچہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قد کے بارے میں وراثت کو دخل حاصل ہے۔ لیکن پوری صحت کے ساتھ اس کی تعیین کرنا محال ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ نشوونما کے زمانے میں بیماری یا غذا کی کمی بچوں کے قد کو بڑھنے سے روک دیتی ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ جن معدودے چند بچوں کا مطالعہ کیا گیا وہ اپنے پورے گروہ کے نمائندہ تھے تو بھی یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ تمام زیر مطالعہ بچوں کا گھریلو ماحول قد کے بڑھنے کے بارے میں یکساں طور پر سازگار تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ زندگی کے امور کو تولنے ناپنے بیٹھتے ہیں وہ فی الحقیقت کس قدر پیچیدہ اور لطیف اشیاء سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کام میں تول ماپ کے

سیدھے سادھے پیمانے پورے طور پر ناکارہ نظر آتے ہیں۔

مینڈل کے مطالعوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بعض اوقات بچوں کو ایسے خصائص ورثہ میں مل جاتے ہیں جو ان کے والدین میں مخفی طور پر موجود تھے لیکن کبھی آشکارا نہ ہوئے تھے لیکن دادا، پردادا، یا کسی دوسرے مورث اعلیٰ میں یہ اوصاف آشکارا طور پر موجود تھے۔ اس شہادت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب خصائص کی وراثت کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد کئی پشتیں ہونی چاہئیں نہ کہ صرف والدین۔

اگر موروثی خصائص پچھلی کئی پشتوں سے ورثہ میں مل سکتے ہیں تو ماحول کے اثرات بھی کوئی وقتی شے نہیں اس بات کی شہادت موجود ہے کہ پچھلی چند صدیوں میں یورپی قوموں کا اوسط قد بڑھ گیا ہے۔ اگر ماحول قد جیسی جسمانی خصوصیت پر اثر ڈال سکتا ہو اور یہ خصوصیت پشت بعد پشت منتقل ہونے لگتی ہے تو ماحول کا اثر ذہنی خصائص پر بھی ضرور پڑتا ہو گا۔ یہ امر اس بات کا ناقابل انکار ثبوت ہے کہ معاشرتی ماحول ورثہ میں منتقل ہوتا ہے۔

چوتھی مثال:۔ ایف۔ ڈبلیو ٹاسگ اور سی۔ ایس جوزلن کی کتاب "امریکی کاروبار کے رہنما" میں مصنفوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مختلف پیشوں کے لوگوں کی آمدنیوں میں جو فرق ہے اس کی بنا غیر مساوی مواقع نہیں بلکہ غیر مساوی فطری صلاحیتیں ہیں۔ اس مطالعہ میں ایسے صنعت کاروں اور کاروباری رہنماؤں سے ایک سوالنامہ پُر کرایا گیا تھا جن کی سالانہ آمدنی پانچ لاکھ ڈالر سے زائد تھی۔ سوالنامے کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اس گروہ میں سے ۳۷ فی صد لوگ بڑے بڑے سوداگروں کے بیٹے تھے۔ ساری تعداد میں سے ۵۷٫۶ فی صد ایسے تھے جن کے باپ کاروباری لوگ تھے ۱۲٫۴ فی صد کسانوں کے بیٹے تھے۔ ۵ فی صد کلرکوں کے بیٹے تھے۔ ۸ فی صد ماہر کاری گروں کے بیٹے اور صرف ۲٫۲ فی صد غیر تربیت یافتہ مزدوروں کے بیٹے۔

سوال نامے میں یہ بھی پوچھا گیا تھا کہ (۱) کیا تمہارے رشتہ داروں یا دوستوں میں کوئی ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے تمہیں کاروبار چلانے میں مدد دی ہو؟ (۲) کیا کاروبار کے آغاز میں تم کو ان لوگوں کی طرف سے دس ہزار ڈالر یا اس سے زیادہ رقم کی مدد دی گئی تھی؟ جواب دہندوں میں سے ۶٫۱۱ فی صد نے اقرار کیا کہ انہیں ایسی مدد ملی تھی۔ ۹٫۵۳ فی صد نے کہا کہ انہیں، یا تو تعلقات کی وجہ سے مدد ملی۔ سوالنامے کا جواب دینے والوں میں ۹٫۱۲ فی صد لوگ گریجویٹ تھے۔

اس تمام شہادت کی موجودگی میں مصنفوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کاروباری دنیا میں رہنمائی کا مقام حاصل کرنے میں مواقع اور ماحول کو کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں۔ بلکہ یہ رہنمائی ذاتی صلاحیت کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ پیش نظر شہادت صاف طور پر بتاتی ہے کہ کاروباری دنیا میں غیر معمولی کامیابی حاصل کرنے والوں کی اکثریت ایسے گھرانوں میں پیدا ہوئی جو پہلے ہی کاروباری دنیا میں تھے۔ ان کی ایک خاصی تعداد کو کام چلانے میں مدد ملی۔ ایک تہائی سے زیادہ تعداد کو رشتہ داروں اور دوستوں کے اثر و رسوخ نے کام دیا۔ ان ساری باتوں کے ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ کاروباری دنیا میں داخلے کے لیے مواقع غیر مساوی نہ تھے! یا یہ کہ جن لوگوں نے کاروبار میں رہنمائی کا مقام حاصل کیا۔ وہ سب کے سب غیر معمولی فطری صلاحیتوں کے مالک تھے!

پانچویں مثال:۔ یہ آخری مثال جیوک اور ایڈورڈز کے گھرانوں کے مشہور موازنے کی مثال ہے۔ ۱۸۷۷ء میں جیوک نامی ایک شخص کی اولاد میں سے ۱۲۰۰ اشخاص موجود پائے گئے یہ آدمی ۱۷۲۰ء میں نیو یارک میں پیدا ہوا تھا ان ۱۲۰۰ افراد میں سے ۴۴۰ جسمانی طور پر معذور یا بیمار تھے۔ ۳۱۰ بالکل قلاش تھے اور برسوں سے دارالامان میں زندگی گزار رہے تھے۔ ۳۰۰ افراد محتاج خانوں میں مر چکے تھے۔ ۱۳۰ کو مختلف جرائم میں سزا مل چکی تھی۔ ان میں سے ۷ قاتل تھے۔ اس خاندان کی آدھی سے زیادہ عورتیں عصمت فروشی کر رہی تھیں۔ مردوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو بھیک مانگنے کے سوا کوئی اور پیشہ جانتا ہو۔

۱۹۱۵ء میں اس خاندان کے افراد کی دوبارہ گنتی کی گئی۔ اس وقت ان کی تعداد ۲۸۲۰ تھی ان میں سے ۶۰۰ ضعیف العقل تھے۔ اندازہ کیا گیا کہ یہ خاندان حکومت کے خزانے پر کوئی ۲۵ لاکھ ڈالر کا بوجھ ڈال چکا ہے۔

قلاشی، ضعیف العقلی، غلاظت، جرم اور عصمت فروشی کے اس مرقع کے مقابلے میں جوناتھن ایڈورڈ نامی ایک دوسرے شخص کی کہانی ہے۔ ۱۹۰۰ء میں اس خاندان کے لوگوں کی تعداد ۱۳۹۴ تھی۔ ان میں سے کم از کم ۲۹۵ کالج کے گریجوایٹ تھے۔ ان میں سے بہت سے مختلف پیشوں مثلاً وکالت۔ طبابت۔ موسیقی۔ پروفیسری وغیرہ میں معزز مقامات پر تھے۔ کچھ فوج اور دوسرے محکموں میں اچھے عہدوں پر تھے۔ کچھ پادری تھے۔ تیرہ اہم کالجوں کے صدر تھے اور ایک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا نائب صدر تھا۔ باقی تمام افراد کاروبار میں اچھے کامیاب تھے۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے کبھی کسی جرم میں سزا ملی ہو۔

دونوں خاندانوں کا باہمی تفاوت بڑا حیرت انگیز ہے۔ لیکن اس تفاوت کو محض وراثت کا نتیجہ قرار دینا قرین دانش نہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ جیوک اور ایڈورڈز کے موجودہ کنبے کس حد تک وہی کنبے کہلا سکتے تھے جو آج سے نو پشت پہلے تھے؟ ہر نسل میں کئی خونوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ کیوں کہ کوئی کنبہ اپنی تمام شادیاں اپنے ہی اندر نہیں کرتا۔ اس طرح نو پشتیں گذر جانے پر جیوک اور ایڈورڈ کے کنبوں میں مختلف اطراف سے خونوں کی جو آمیزش ہوئی اس کے پیش نظر یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ نسلی اعتبار سے نو پشت پہلے کا کنبہ زیر بحث کنبے سے بڑی حد تک مختلف تھا۔ وراثت اور ماحول کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے ای۔ جی۔ کونکلن نے بالکل بجا کہا ہے، کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کسی مشہور و معروف مورث اعلیٰ کے نام سے پکارے جاتے ہیں لیکن ان کے حصے میں نہ ان بلند پایہ شخصیتوں کے خون کا کوئی ذرہ آیا ہوتا ہے نہ ان کے ذہنی اوصاف کا کوئی شمہ۔ ان کے مقابلے میں دوسرے لوگ ہوتے ہیں جن کے ناموں کو ان بلند مرتبہ شخصیتوں سے کوئی نسبت نہیں ہوتی لیکن ان کی رگوں میں ان کا خون دوڑ رہا ہوتا ہے اور وہ حقیقی معنوں میں ان کے جانشین اور وارث ہوتے ہیں۔ غرض لوگوں کے باہمی رشتوں ناطوں سے خون کا اختلاط اس خاموش اور پُراسرار طریق پر ہوتا ہے جس کا اندازہ بہت کم لوگ کر سکتے ہیں۔

علم الحیات نے اب تک وراثت کے مسئلہ پر جو روشنی ڈالی ہے وہ بے حد دلچسپ اور سبق آموز ہے علم الحیات کا فتویٰ ہے کہ مختلف خصائص کے حامل ذرات والدین سے اولاد کو جوں کے توں منتقل ہوتے ہیں۔ لیکن قرار حمل کے وقت والدین کے ان بے شمار جوہری ذرات میں سے کوئی سے دو بالکل نصف میں کٹ کر باہم پیوست ہو جاتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف طرفین سے آئے ہوئے خصائص کی قوت بقدر نصف رہ جاتی ہے۔ بلکہ دونوں کے اختلاط سے ان کی کیفیت میں بھی تبدیلی آجاتی ہے، اس پر مستزاد یہ کہ طرفین کے ان گنت ذرات میں سے ہر ایک مختلف خصائص کا حامل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھائی بہنوں میں سے کوئی دو بھی یکساں خصائص کے حامل نہیں ہو سکتے۔ یہ عین ممکن ہے، کہ باپ خود غیر معمولی قابلیت کا آدمی ہو لیکن اس صلب سے جو ذرہ بیٹے کے حصے میں آئے وہ غیر معمولی ذہانت کی بجائے ضعیف العقلی کا حامل ہو۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ والد کے بلند اوصاف کو ورثہ میں حاصل کرنے کے امکانات کسی حد تک غیر یقینی ہیں۔ اس نظریے کو اس مشاہدہ سے بھی سہارا ملتا ہے کہ ایک ہی والدین کے مختلف بچوں کے اوضاع و اطوار اور ذہنی سطح میں اکثر اوقات نمایاں فرق دیکھنے میں آتا ہے۔ بچوں کے عادات و اطوار پر اس بات کا

اثر بھی پڑتا ہے کہ وہ والدین کی زندگی کے کس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ سب سے بڑا بچہ عموماً لاڈ پیار اور چاؤ چونچلوں کا سب سے زیادہ مرکز بنتا ہے۔ بعد میں پیدا ہونے والے بچوں کے حصے میں توجہ بٹ کر آتی ہے۔ نیز ہر نئے بچے کی آمد سے کنبے کی جیب پر زیادہ بوجھ پڑتا ہے۔ جس کا اثر براہ راست اس کی دیکھ بھال پر پڑتا ہے۔ پھر والدین کے عمر رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے مزاجوں میں بھی نمایاں تبدیلی ہونے لگتی ہے۔ یہ ساری باتیں ایک ہی والدین کے مختلف بچوں کے لیے مختلف ماحول پیدا کرتی ہیں۔

اس ساری بحث سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ گو نسلی خصائص کا والدین کے توسط سے اولاد کو منتقل ہونا ایک مسلمہ امر ہے۔ لیکن یہ انتقال اس قدر پیچیدہ اور پُراسرار طریق پر عمل میں آتا ہے کہ اس کے متعلق کوئی یقینی قیاس آرائی کرنا خود فریبی ہے۔ زیادہ سے زیادہ محتاط عالموں کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عام رجحان یہ ہے کہ کسی کی اولاد خود اس کی مانند ہو۔

جیوک اور ایڈورڈز خاندانوں کا موازنہ کرتے وقت ان حقائق کو نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہیے۔ بے شک ایڈورڈز خاندان کے بہت سے افراد نے زندگی میں اچھا درجہ حاصل کیا۔ لیکن کیا اس خاندان کے کئی افراد گنتی سے باہر نہیں رہ گئے۔ اس خاندان کی جو لڑکیاں شادی کے بعد دوسرے خاندانوں میں مدغم ہو گئیں۔ کیا ان کی رگوں میں اس خاندان کا لہو نہیں تھا۔ وہ اس خاندانی عظمت کو اپنے ساتھ کیوں نہ لے گئیں۔ پھر جو لوگ اس خاندان کی بلند ذہنی سطح کو اس کے مورث اعلیٰ جوناتھن ایڈورڈز کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان کی دلیل بھی بس اسی قدر قوی ہے جتنی اس شخص کی جو یہ کہہ دے کہ یہ بلند ذہنی سطح دراصل جوناتھن ایڈورڈز نے بیوی کا عطیہ تھی۔

ان دو خاندانوں کے موازنے میں ایک اور نکتہ جو نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ دونوں کا مختلف معاشرتی ماحول ہے ایک خاندان کو معاشی فراخی نے اس قابل بنا دیا کہ اولاد کو اچھی تعلیم دلائے۔ اس سے اس کے افراد شستہ اور خوش ذوق بن گئے۔ ان کے گھروں کا عام ماحول بلند اور اخلاق نواز بن گیا۔ اس طرح ان کی اولاد اس ماحول میں تربیت پا کر بلند تر ذہنی سطح کی حامل رہی۔ اس کے مقابلے میں ایک اور خاندان کو کسی وجہ سے ناموافق حالات اور تنگ دستی نے آن دبوچا اس خاندان کے بچے تعلیم اور زندگی کے دوسرے مواقع سے محروم رہ گئے۔ ناکامی اور یاس کے احساس نے ان کی ہمتیں اور پست کر دیں وہ شکست خوردہ ذہنیت کا شکار ہو کر پستی پر قانع ہو گئے۔ اس پست گھریلو ماحول نے آئندہ نسلوں کو بھی

اسی پست ذہنی سطح پر رکھا۔ اس استدلال کو اس امر سے بھی تقویت ملتی ہے کہ جبکہ خاندان کے جو چند افراد اس خاندان میں سے نکل کر باہر چلے گئے تھے۔ ان کی زندگیاں بہتر ہو گئیں۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ افراد نئے ماحول میں چلے جانے کی وجہ سے بہتر نہ ہوئے تھے، بلکہ یہ جبلی طور پر بہتر تھے۔ اس لیے اپنے خاندانی ماحول کو چھوڑ گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ استدلال اسی قدر معقول ہے جس قدر یہ استدلال کہ ان کی بہتری کا سبب بہترین ماحول تھا۔

سائنسی جواب کی تلاش

ماحول اور وراثت کی اضافی اہمیت کے سوال نے عمرانیات کے عالموں کو دیر تک الجھائے رکھا ہے۔ علم نباتات کے عالموں کے لیے اس مسئلہ کا سائنسی جواب معلوم کرنا بڑا آسان ہے۔ وہ ایک ہی قسم کے بیج کو مختلف قسم کی زمین اور مختلف آب و ہوا میں بو کر نتائج کا مشاہدہ کرتے ہیں اور جو اختلافات نظر آئیں انہیں ماحول کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ کیا یہ طریق مطالعہ انسانوں پر بھی آزمایا جا سکتا ہے ؟ ہاں انسانوں پر اس قسم کا تجربہ کرنے کی ایک صورت موجود ہے۔ گو سگے بھائی بہنوں میں بدنی اور ذہنی مماثلت بہت زیادہ نہیں ہوتی لیکن جڑواں بچوں میں یہ مماثلت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ اس صدی کے آغاز میں تھارن ڈائک نے بہت سے جڑواں بچوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ان کے درمیان مماثلت کا تناسب عام بھائی بہنوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ اس کے بعد جڑواں بچوں کو الگ الگ ماحول میں پالنے کے تجربے شروع ہوئے اور بڑی عجلت سے یہ فیصلہ دیا گیا کہ ان کے اوضاع و اطوار پر ماحول نے بالکل برائے نام اثر ڈالا تھا لیکن زیادہ احتیاط برتنے والے عالموں نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہ رائے صائب نہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ تجربہ کے لیے اس قسم کے جڑواں بچے چنے گئے جو زیادہ سے زیادہ مماثلت رکھتے تھے۔ پھر ان کے مطالعہ میں بھی سائنسی طریق کار کی احتیاطوں کو پوری طرح ملحوظ نہ رکھا گیا، کہ پہلے سے طے شدہ یقین کی دھن میں ناکافی شہادت سے ایک عام نتیجہ اخذ کر لیا گیا۔

کچھ عرصہ بعد ان میں کچھ مزید مطالعے کئے گئے۔ یہ مطالعے ہو بہو جڑواں بچوں کے تھے۔ ہو بہو جڑواں ایسے بچوں کو کہا جاتا ہے جو قرار حمل کے بعد بیضہ کے پھٹ کر دو حصوں میں بٹ جانے سے وجود میں آئے ہوں۔ اس قسم کے جڑواں بچے ہمیشہ ایک ہی صنف کے ہوتے ہیں یعنی دونوں لڑکے یا دونوں لڑکیاں۔ بعض اوقات ہو بہو جڑواں بچوں کی تعداد دو سے بڑھ جاتی ہے۔

ہو بہو جڑواں بچوں کے جو مطالعے اب تک ہوئے ہیں ان سے کوئی فیصلہ کن شہادت ہاتھ نہیں لگ سکی۔ ان میں سے ایک مطالعہ پروفیسر مزکا ہے۔ دو جڑواں بچوں کو کوئی دو ہفتے کی عمر میں علیحدہ کر دیا گیا اور ان کی تربیت قدرے مختلف ماحول میں ہوئی۔ بڑے ہو کر ان کے شخصی اطوار میں قدرے فرق موجود تھا لیکن ذہنی آزمائشوں کے پیمانے کے مطابق وہ دونوں ایک ہی ذہنی سطح پر تھے۔ اس لیے مزنے یہ نتیجہ نکالا کہ ذہانت کا فیصلہ وراثت کرتی ہے جبکہ عادات و اطوار ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔

ہو بہو جڑواں بچوں پر مزید تجربے پروفیسر نیومین نے کیے۔ ان سے حاصل شدہ نتائج سے مزکے نظریے کی تصدیق نہ ہو سکی۔ پہلے دو تجربوں میں دیکھا گیا کہ ہو بہو جڑواں بچوں کے جذباتی اور مزاجی اطوار میں بڑی مماثلت موجود ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ذہنی سطح میں نمایاں فرق بھی ہے۔ تیسرا تجربہ دو جڑواں بچیوں پر کیا گیا۔ ان کو تین ماہ کی عمر میں الگ کر دیا گیا اور ان کی تربیت ایسے دو گھروں میں کی گئی جو معاشرتی ماحول کے اعتبار سے بہت مختلف تھے۔ بعد میں جب ان دونوں لڑکیوں کا جائزہ لیا گیا تو ذہنی اور مزاجی ہر دو اعتبار سے ان میں بڑا فرق تھا۔ جو لڑکی ناسازگار ماحول میں پلی تھی وہ دبی دبی، شرمیلی اور میل جول سے بھاگنے والی نظر آتی تھی۔ مگر اس کی جڑواں بہن نمایاں طور پر چوکس، ملنسار اور تیز فہم تھی۔

حال ہی میں جڑواں بچوں پر کچھ اور تجربے ہوئے ہیں۔ ان تجربوں میں ایک بچے کی تربیت ماہرین نفسیات کی زیرِ نگرانی کی گئی اور دوسرے کی ایک عام گھر میں۔ اس قسم کا ایک تجربہ کولمبیا یونیورسٹی میں کیا گیا۔ اس تجربے کا موضوع دو جڑواں لڑکے تھے۔ دو تین مہینے کی عمر کے بعد ان دونوں بچوں کی نشوونما کی کیفیت اور کمیت میں نمایاں فرق نظر آنے لگا جس بھائی کی تربیت ماہرین نفسیات کی زیرِ نگرانی ہو رہی تھی وہ تقریباً ہر لحاظ سے دوسرے بھائی پر بازی لے گیا۔ وہ ابھی دو سال کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ تیرنا سیکھ گیا۔ زینوں پر چڑھنے لگا اور بلا جھجک ہر اس کام کو ہاتھ ڈالنے لگا جس کے متعلق اسے کہا جاتا۔

ان تجربوں نے ان لوگوں کا دعویٰ بالکل بے بنیاد ثابت کر دیا جو وراثت کو ہی فیصلہ کن چیز قرار دیتے تھے۔ اور ماحول کو بالکل ایک ثانوی شے سمجھتے تھے۔ لیکن بعض ماہرین علم الحیات کا خیال ہے کہ ہو بہو جڑواں بچوں کو بھی موروثی اوصاف کلی طور پر ایک سے نہیں ملتے۔ اگر یہ فی الواقع ایسا ہو تو اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ موروثی

اوصاف کو استوار حالت میں رکھنا اور ماحول میں ردوبدل کرکے آخرالذکر کی تاثیر کو جانچنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ ایسی صورت میں وراثت اور ماحول کی اضافی تاثیر کے متعلق کوئی قطعی رائے ظاہر کرنا سرے سے ناممکن ہو جاتا ہے۔

دوسرا طریق:۔ وراثت اور ماحول کی اضافی تاثیر کو جانچنے کا ایک اور طریق بھی موجود ہے۔ وہ یہ کہ مختلف والدین کے بچوں کو ایک ہی ماحول میں رکھا جائے اور ان کی ذہنی اور مزاجی نشوونما کا مطالعہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ماحول ایک ایسی شے ہے جو نہ صرف بے حد پیچیدہ ہے بلکہ ہر لحظہ بدلنے والی بھی۔ مثلاً مختلف بھائی بہن جو ایک ہی گھر میں پرورش پاتے ہیں، کیا ان سب کی تربیت یکساں ماحول میں ہوتی ہے؟ اس سوال کا جواب صریح نفی میں ہے۔ مضمون کے پہلے حصے میں یہ وضاحت گذر چکی ہے کہ والدین کی مالی حالت کی تبدیلی۔ ان کی مزاجی کیفیتوں کا ردوبدل، کنبے میں نئے افراد کی موجودگی۔ یہ اور دوسرے بیسیوں عناصر کسی ایک کنبہ کے ماحول کو بھی لگاتار بدلتے رہتے ہیں۔

مختلف طبائع پر ایک ہی ماحول کا اثر معلوم کرنے کے لیے بھی تجربے کیے گئے ہیں۔ مختلف والدین کے بچوں کو ایک ہی گھر میں تربیت دی گئی اور اس ماحول کے اثرات کا جائزہ لیا گیا۔ مثلاً دو بچوں کو ایک شستہ گھر میں بھیجا گیا۔ ان میں سے ایک کو یہ بلند تر ماحول دوسرے سے کچھ مہینے پہلے دے دیا گیا۔ کچھ عرصہ گذر جانے پر جب دونوں کا موازنہ کیا گیا تو شستہ ماحول میں زیادہ عرصہ گذارنے والا برتر ثابت ہوا۔ ایک اور تجربے میں نادار بچوں کے ایک گروہ کو ایک اعلیٰ قسم کے معاشرتی ماحول میں پالا گیا۔ بعد میں جب ان کی ذہانت اور مزاجی کیفیتوں کو جانچا گیا تو یہ سب کے سب بچے اپنے والدین کے مقابلے میں بلند تر ثابت ہوئے۔ اس قسم کا ایک تجربہ برکس نے کیا۔ غریب گھرانوں کے کچھ بچوں کا ذہنی خارج قسمت معلوم کرنے کے بعد انہیں اعلیٰ گھرانوں میں بھیج دیا گیا۔ اسی طرح اچھے گھرانوں کے کچھ بچوں کو، فروتر معاشرتی ماحول میں رکھا گیا۔ بعد میں ان کے ذہنی خارج قسمت کی دوبارہ پڑتال ہوئی۔ نتائج سے یہ ثابت ہوا کہ بہترین معاشرتی ماحول کی بدولت ذہنی خارج قسمت بقدر ۲۰ درجے گر گیا۔ لیکن یہ محض امریکی گھروں کے معاشرتی ماحول کا تفاوت تھا۔ اگر اس تفاوت کو عالمی پیمانے پر دیکھا جائے تو اس کی وسعت بہت زیادہ نظر آئے گی۔

خاتمہ کلام

وراثت اور ماحول کی اضافی تاثیر پر عالموں نے بہت کچھ کہا ہے۔ موجودہ صدی کی پہلی تین دہائیوں میں اس

بحث کا بہت چرچا تھا۔ اس زمانے میں ہر دو نقطہ ہائے نگاہ کے حامیوں نے ایک ہی واقعاتی شہادت سے متضاد نتائج برآمد کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیے۔ فریقین کے استدلال میں تقریباً تقریباً ایک سا وزن معلوم ہوتا تھا، اور لوگوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار نظر آتا تھا کہ اصل حقیقت کسی فریق کے ساتھ ہے۔ آج یہ بحث اپنی تلخی اور تندی کھو چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب ہر مکتب خیال کے عالموں کو اس حقیقت کا احساس ہو چکا ہے کہ وراثت ایک انتہا اور ناقابل پیمائش مقدار ہے اور ماحول ایک بے حد پیچیدہ اور ہر دم بدلنے والی شے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی درست عددی پیمائش محالات میں سے ہے؛ تاہم یہ امر ناقابل انکار ہے کہ انسانی کردار کی ساخت میں ان دونوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ جدید نقطہ نگاہ جس پر تقریباً سبھی کو اتفاق ہے یہ ہے کہ وراثت مختلف انسانی اوصاف کی امکانی نشو و نما کی انتہائی حد مقرر کرتی ہے جبکہ ماحول اس امکان کو واقعہ کا جامہ پہنانے کے لیے ذمہ دار ہے ☆

بتدائی تعلیم اور اس کے مسائل

بدالحی علوی و عفت الماس

جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی ترقی کا راز عوام کی تعلیم میں مضمر ہے۔ مسلمان جب تک تعلیم کے زیور سے آراستہ نہیں و تے، ترقی کے میدان میں گامزن نہیں ہو سکتے، اور نہ ہی اپنا معیار زندگی بلند کر سکتے ہیں۔ ان دنوں تعلیم کا مسئلہ حکومت ر عوام دونوں ہی کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ فرسودہ نظام تعلیم کی خامیاں چُن چُن کر بیان کی جا رہی ہیں اور ملک کا ہر سمجھدار شندہ تعلیمی معیار کا شاکی نظر آتا ہے۔ یونی ورسٹی کے امتحانوں کے نتائج خطرناک حد تک مایوس کن ہیں اور ماہرین بلیات جائز طور پر گرے ہوئے تعلیمی معیار کے ممکن اسباب پر غور کر رہے ہیں۔ کبھی نظام تعلیم کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے ر کبھی طلبہ کی نا اہلیت اور موزونیت پر شک کیا جاتا ہے۔ استاد اپنے طور پر نالاں ہیں، کہ ان کے شاگردوں میں تحصیل علم کا وق ہی باقی نہیں رہا۔ ان میں مطالعہ کی صحیح عادت ہی نہیں پڑی اور وہ محض خلاصوں کی مدد سے امتحان پاس کرنا ہی اپنا صب العین قرار دے چکے ہیں۔ سکولوں کے طلبہ کی غیر معمولی بڑھتی ہوئی تعداد اور تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی کے پیش نظر ستادوں کی شکایت اور ان کے دلائل وزنی نظر آتے ہیں لیکن ان کا حل، بدقسمتی سے یہ ابھی تک تلاش نہیں ہو سکا۔

ہماری ناگفتہ بہ تعلیمی حالت کے اسباب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ن اسباب کی تلاش اور اس کے تدارک کے تمام طریقے بالعموم ثانوی تعلیم ہی سے متعلق ہیں۔ ظاہر ہے کہ ثانوی تعلیم ساسی نہیں ہو سکتی اور ہمیں جستجو جاری رکھنے کی خاطر ذرا اور گہرائی تک جانا ہوگا۔ ہماری مراد ابتدائی تعلیم سے ہے جس کی رف سے غفلت برتنے کا انجام چند سال بعد بھگتنا پڑتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ ماہرین نے اس مسئلے کی طرف سبتاً بہت کم توجہ دی ہے۔ گویا تعلیمی تنزل کا ابتدائی تعلیم سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اگر ہم اپنی تعلیمی کیفیت کا تحقیقات کے اصولوں کی مدد سے تجزیہ کریں تو ہم پر یہ حقیقت کھلے گی کہ اس پستی کو کسی واحد سبب کا نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان بے شمار اسباب میں سے ایک اہم سبب یقیناً یہ بھی ہے کہ ہماری ابتدائی تعلیم کا نہ کوئی خاص مدعا ہے نہ کسی خاص نصب العین کے ماتحت اس کے نصاب کو ڈھالنے کی

کوشش کی گئی ہے، اور نہ ہی اس کے لیے موزوں قسم کے استاد مہیا کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دیہاتوں میں صرف مدرسوں کی تعداد بڑھا دینے سے اشاعت علم کا مقدس فریضہ ادا نہیں ہو سکتا۔ کہ اس سے عوام میں شوق پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس سے ان کی ذہنیت کو بدلا جا سکتا ہے تعلیم میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے، اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے، جب ہم بنیادی تعلیم کو اپنی توجہ کا مرکز بنائیں اور اس کے اغراض و مقاصد کو واضح طور پر پیش نظر رکھیں۔

تعلیمی مقاصد اور تربیت یافتہ معلمین کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بدقسمتی سے ہمیں یہاں بھی بانوکا ہی سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ ابتدائی تعلیم جس قسم کے استادوں کے سپرد ہے، ان کی تعلیمی قابلیت کا معیار اور ان کی تربیت کا حال کسی واقف کار سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ نہ ان کی اپنی تعلیم اتنی ہے کہ مزید مطالعہ سے اپنی معلومات وسیع کر سکیں اور نہ ہی نارمل سکولوں کا موجودہ نصاب ایسا ہے کہ ان میں جدید تحقیقات کا خاطر خواہ خیال رکھا گیا ہو اس لیے سکولوں میں اب تعلیم کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ بچوں کو بغیر سوچے سمجھے اور ان کی ذہنی قابلیت کو ملحوظ رکھے بغیر مجوزہ نصاب کی کتابیں پڑھا دی جائیں۔

پاکستان سے محبت رکھنے والے ہر شخص کو ہماری تعلیمی کیفیت اور اس کی ناگفتہ بہ حالت کا ضروری جائزہ لینا چاہیے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے، کب تک اساسی تعلیم کے مسئلے کو طاق نسیاں میں رہنے دیا جائے گا، آخر کب تک ہم ان بچوں کی تعلیم اور ان کی صحیح تربیت سے غفلت برتیں گے جن کے ساتھ ملک اور قوم کی امیدیں وابستہ ہیں، زبانی جمع خرچ کے عوض مندرجہ ذیل اصولوں کی روشنی میں جلد از جلد عملی قدم اٹھانا ہوگا۔

(ا) ہم یہ ابھی بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے اساتذہ کرام کے پیش نظر اساسی تعلیم کا کوئی واضح مقصد نہیں جس کیلئے وہ اپنے شاگردوں کو تیار کر سکیں۔ ظاہر ہے، کہ انسانی زندگی کے خاص مقصد کے بغیر تاریکی ہی میں ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ہے۔ اور جہاں بھی اسے روشنی کی مدھم سی شعاع نظر آتی ہے، بغیر سوچے سمجھے چل پڑتا ہے۔ ہمارے پرائمری سکولوں میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ واضح مقصد کے بغیر تاریکی ہی میں تمام تعلیمی تجربات سرانجام دیے جا رہے ہیں کسی استاد سے پوچھ لیجیے کہ بچوں کی تعلیم میں اسے کونسا مقصد ملحوظ ہے۔ یا بچے کے لیے سکول بھیجے جانے پر مجبور کیے جاتے ہیں، تو جا کر تلاش معاش ہی ایک ایسا مقصد رہ گیا ہے جس میں معلم پناہ لے سکتا ہے، اور اس کا جواب بھی

کچھ اسی قسم کا ہوگا جب مقاصد پست ہو جائیں تو ہمت اور ارادہ معیار سے کیوں نہ گر جائیں؟ انسانی شخصیت کی تکمیل کیوں نہ خام رہ جائے؟ اور تعلیم و تربیت ہمارے بچوں کے لیے کیوں نہ بے اثر اور نمائشی چیز بن کر رہ جائے؟

اپنی آزادی حاصل کر لینے اور ملک کو اسلامی اصولوں پر چلانے کا تہیہ کر لینے کے بعد تعلیم کے مقصد میں خاطر خواہ تبدیلی ہونی اشد ضروری ہے۔ اس تبدیلی کے بغیر وہ ذہنی انقلاب برپا نہیں کیا جا سکتا جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ ہمیں یہ نہ بھول جانا چاہیے کہ ہماری ریاست ایک اسلامی جمہوریہ ہے اور اس کی بیشتر آبادی دیہات میں رہ کر کھیتی باڑی کا کام کرتی ہے، اگر ہم اس بنیادی قومی ضرورت کو مدنظر نہیں رکھیں گے تو شاید ہم ایسا مقصد متعین کر بیٹھیں، جو حقیقت سے بہت دور ہو، اور جس کی تحصیل ممکن نہ ہو، اس قومی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اپنے تعلیمی مقصد کا تجزیہ مندرجہ ذیل طریقے سے کر سکتے ہیں۔

(ا) جمہوریہ اسلامیہ کی شہریت۔ یعنی تعلیم و تربیت میں اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ آئندہ آنے والی نسلیں اس طرح تربیت پائیں کہ اپنی گذشتہ اسلامی روایات کو تازہ کر سکیں۔ اور پاکستان کے مفید شہری بن سکیں۔ دوسرے الفاظ میں ایسے مسلمان بن سکیں جو اپنے ملک کی بہبود کے لیے تن من دھن کی بازی لگا سکیں۔

(ب) بچوں کے بنیادی تقاضوں کی تسکین۔ پرائمری سکول کے طلبہ کو باعزت طریق سے روزی کمانے کے لیے تیار کرنے کا مقصد کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس اس تعلیم کا ایک واضح مقصد یہ ہونا چاہیے کہ بچے اپنے فطری تقاضوں کو تسکین پہونچانے کے موزوں طریقوں سے آشنا ہو سکیں تاکہ انھیں ماحول کے مطابقت اختیار کرنے میں کسی وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ مقصد ہمارے نزدیک اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ ہم اس کی توضیح کے لیے چند صفحات وقف کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

(ج) سائنس کی حیرت انگیز ایجادات نے تہذیب اور تمدن پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ہماری تعلیم اس وقت تک مکمل خیال نہیں کی جا سکتی جب تک ان اثرات کو ہم اپنا نہ لیں۔ ایجادات کی وجہ سے موجودہ سوسائٹی بے حد پیچیدہ ہو گئی ہے۔ اور ہم معلمین نے اس خاص سوسائٹی کے لیے افراد مہیا کرنے ہیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تعلیم دیتے وقت زمانہ حال کی ان تمام تبدیلیوں کو مدنظر رکھا جائے۔

(د) متعلمین کو مخصوص تمدن۔ تاریخ اور فنون لطیفہ سے محظوظ کرنے کی سعی۔

(۱) تعلیم کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ بچوں کو اجتماعی زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سکھایا جائے۔ تاکہ وہ مل جل کر کام کرنے کے عادی بن سکیں۔

(۲) ابتدائی مدارس کے نصاب کو مندرجہ بالا مقاصد کی روشنی میں از سر نو ترتیب دینا اشد ضروری ہے۔ نشوونما کے لحاظ سے ہر بچہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ نصاب کی ترتیب میں ہمیں انفرادی اختلافات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اس کے علاوہ ایک اہم نفسیاتی حقیقت کو بھی مدنظر رکھنا ہے۔ یعنی گو انفرادی اختلافات شخصیت کی جان ہیں لیکن جہاں تک انفرادی تقاضوں اور ضروریات کا تعلق ہے ان میں بعض اصول مشترک پائے جاتے ہیں۔ اگر ہم ان مشترک اصولوں کو تعلیم میں زیر نگاہ رکھیں تو ترتیب کا کام ہمارے لیے نسبتاً سہل ہو جائے گا۔ اس کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم بچوں کی نشوونما کے مختلف درجوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر درجے کی واضح صفات اور ضروریات کا مطالعہ کریں، اور اپنے نصاب کی بنیاد انھی اصولوں پر رکھیں۔ بدقسمتی سے نصاب کی تیاری میں اس نہایت ہی اہم اصول کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور اس کی تیاری میں ایسے ماہرین سے مشورہ طلب کیا جاتا ہے جنھیں بچوں کو پڑھانے کا کبھی تجربہ نہیں رہا۔ ظاہر ہے کہ ایسا نصاب بچوں کی صحیح ضروریات کی ترجمانی نہیں کرے گا۔ بلکہ اپنی طرف سے ایسی ضروریات فرض کر لی جائیں گی جو ممکن ہے کہ بچوں کی دنیا میں کوئی حقیقت ہی نہ رکھیں۔

انفرادی اختلافات کے ضمن میں ہمیں یہ نہ بھول جانا چاہیے کہ تعلیم کے عمل میں متعلمین کے ذاتی معیار کو ملحوظ رکھنا اشد ضروری ہے۔ انھی اختلافات کی وجہ سے ہر طالب علم اپنی ذہنی اور جسمانی استعداد کے لحاظ سے اپنے طور پر بے مثل ہوتا ہے۔ اس لیے تعلیم کا بچوں کی ذہنی اور جسمانی قابلیت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ تعلیم میں ذاتی معیار کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ یہ بھگتنا پڑے گا کہ تعلیم اور زندگی کا باہمی تعلق ٹوٹ جائے گا۔ اور ایسی تعلیم طلبہ کو کسی خاص مقصد کی طرف نہیں لے جا سکے گی۔

(۳) ابتدائی تعلیم کی ایک بہت بڑی خامی یہ ہے کہ ایسے معلمین کا فقدان ہے جو تعلیم دینے کے اہل ہوں، اور جن میں ایسی صفات موجود ہوں، جو چھوٹے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے خاص طور پر ضروری ہیں، یہ درست ہے کہ نارمل سکول میں "نفسیات" کے نام سے زیر تربیت معلمین کو چند اصطلاحات سے ضرور آگاہ کیا جاتا ہے۔ لیکن جب ہم اس مضمون کے نصاب پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دو بنیادی نقص موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ کورس معلمین کے

کسی کام نہیں آتا رہا۔ نارمل سکولوں سے فارغ ہوتے ہی یہ "علم" بھی سکول کی چاردیواری ہی میں رہ جاتا ہے۔ اور معلمین عملی طور پر اس سے کچھ استفادہ نہیں کر سکتے۔

(ل) ایک خامی تو یہ نظر آتی ہے کہ نفسیات کا نصاب نہایت فرسودہ ہے۔ فلسفے سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد اس علم نے گذشتہ چند سالوں میں حیرت انگیز ترقی کی ہے، بالخصوص بچوں کی نفسیات کے اس شعبے نے جس کا تعلق شخصیت کے مختلف مدارج، نمو اور عملی اکتساب سے ہے۔ ہمارا موجودہ نصاب ان تمام تحقیقات سے محروم ہے۔ اس کے برعکس ابھی تک جبلات اور ان کی ترمیم کی بحث میں مصروف ہے۔ کون نہیں جانتا کہ بچوں کی نفسیات کا مطالعہ معلمین کے لیے نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس سے ایسا علم مراد ہے جو فی الواقع معلمین کو بچوں کی شخصیت کے اسرار سے آگاہ کر سکے اور ان کی جسمانی اور ذہنی صحت کو برقرار رکھنے کے اصول بتا سکے۔ مروجہ نصاب میں نہ شخصیت کے مطالعہ کرنے کے علمی اور جدید طریقے موجود ہیں اور نہ اس میں ذہنی صحت برقرار رکھنے کے اصولوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ نصاب ایسا ہو جس کی مدد سے معلمین نہ صرف اپنی ذاتی مشکلات کو حل کر سکیں۔ بلکہ اپنے شاگردوں کو ماحول کے مطالعہ کا دشوار کام بھی سکھا سکیں۔ معلمین جانتے ہیں کہ انھیں ہر روز کسی نہ کسی خاص مشکل سے واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے۔ کبھی وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی کوشش کے باوجود بچے سبق میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہے ہوتے۔ اور کبھی انھیں ضبط کی قسم کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جدید نفسیات کو ان تمام امور میں استادوں کو مدد پہنچانے اور ان کی رہنمائی کرنے کے قابل ہونا چاہیے۔

(ب) دوسری خامی اہمیت کے لحاظ سے کم نہیں۔ نفسیات کی تعلیم سراسر نظری ہے، جس میں عملی تعلیم کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ زبانی پڑھانے کو تو سب کچھ پڑھا دیا جاتا ہے، لیکن ان اصولوں کو روزمرہ کے مسائل میں استعمال کرنے کا طریقہ کبھی بھی نہیں سکھایا جاتا۔ نفسیات کا علم حاصل کرنے کے طریقے تمام کتابوں میں موجود ہیں، لیکن مشاہدہ کس طرح کرنا چاہیے اور عملی زندگی میں اس کا استعمال کہاں تک ممکن ہے؟ ان سوالوں کا جواب کسی کے پاس نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زیر تربیت معلمین اپنے نفسیات کے استاد کی زیر نگرانی نفسیاتی اصولوں کو بچوں پر آزمائیں اور بعد میں اپنے تجربات بیان کر کے ان پر بحث کریں۔ نفسیات حاصل کرنے کا یہ طریقہ افسوس ہمارے سکولوں میں موجود نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم ابھی ابھی بیان کر چکے ہیں۔ نفسیات کے حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ کسی ماہر کی نگرانی میں بچوں کا مشاہدہ کیا جائے۔ لیکن یہ شرط ہمیشہ ممکن نہیں۔ اس کا بہترین بدل یہ ہے کہ معلمین بچوں کی نفسیات پر لکھی ہوئی کتابوں کا بغور مطالعہ کر کے انھیں خود استعمال کریں اور دیکھیں کہ یہ اصول کہاں تک ان کی راہ نمائی کر سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے اردو میں بچوں کی نفسیات کی کتابوں کی کمی ہے جو جدید تحقیقات کی روشنی میں لکھی گئی ہوں، اور جن میں عملی پہلو پر خاص طور پر زور دیا گیا ہو۔

آئندہ اوراق میں ہم اردو زبان میں ایک ایسی کوشش کر رہے ہیں جس کا مقصد معلمین کو ایسا راستہ دکھانا ہے، جس پر چل کر وہ تعلیم کے مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں، اور بچوں میں دل چسپی لینا شروع کر سکتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ پرائمری مدرسوں کے استادوں کے لیے ایسا مواد موجود ہو جو صحیح معنوں میں بچوں کی شخصیت کے سمجھنے اور نصاب کی تیاری میں راہ نما ثابت ہو سکے، جن امور کی طرف ہم اس تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں انھیں مدنظر رکھے بغیر ہم اپنی تعلیمی حالت کو کبھی درست نہیں کر سکتے۔ ہم کوشش کریں گے کہ آگے چل کر ان مضامین کی توضیح کریں جو ہماری تعلیمی حالت کو بہتری کی طرف لے جا سکتے ہیں، اور جن پر عمل پیرا ہونے سے ہمارے معلمین کامیاب استاد ثابت ہو سکتے ہیں۔ (مسلسل)

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

"پابندیٔ آئین نے انسانوں کو تربیت دی"

عبدالغفور چودھری

معاشرے کی اخلاقی اور معاشی تعمیر میں ضابطہ آئین کی پابندی ایک ایسی تربیت ہے جس سے قوم کی تعلیمی، ثقافتی، اخلاقی اور معاشی اقدار مضبوط، اتنی مؤثر اور اتنی روشن ہو سکتی ہیں کہ اگلی نسلوں کے لیے مشعل ہدایت بن جاتی ہیں۔

عربوں کے قومی کردار کا جائزہ لینے کے لیے ہم مکہ کی اُس زندگی کا موازنہ کریں گے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پیشتر تھی۔ مکی لوگوں کا کردار عرب کے باقی لوگوں کی نسبت زیادہ گھناؤنا اور مکروہ تھا۔ بدی کا دیوتا یہاں اپنی تمام امکانی قوتوں کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ مکہ اگرچہ عربوں کا مذہبی مرکز تھا۔ لیکن غیر ملکی تاثیر سے محفوظ تھا۔ ابھی تک وہاں ایرانی یا رومی تہذیب کا اثر نہ پڑا تھا۔ سوسائٹی میں لاقانونیت عام تھی اور لوگوں کے شہری حقوق محفوظ نہ تھے۔ عدم مساوات تو گویا ایک چلتا ہوا قانون تھا جس کے باعث چھوٹے لوگوں کی زندگی نہایت دُکھ میں تھی۔ عام طور پر پرانے نام نہاد قسم کا قبائلی آئین جاری تھا۔ اس کی بنیاد انصاف اور مساوات پر نہ تھی۔ اس آئین کی رُو سے تمام عرب میں افراتفری کا سماں تھا۔ چھوٹے تو کیا بڑے لوگوں تک اکثر پریشان زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ آئین اپنے تاثر اور نظریات کی رُو سے سراسر کلیسائی طرز کا آئین تھا، چناں چہ ایسی صورت حال میں اگر اس طرز زندگی یا مروج آئین میں اگر اصلاح کی جاتی تو یہ اصلاح سارے عرب معاشرے کی اصلاح تھی کیوں کہ زندگی میں اضطراب کی صورت ہر جگہ یکساں تھی۔ عدم مساوات اور نسلی امتیاز کی بدولت آزاد اور غلاموں کے حقوق اور فرائض جدا جدا تھے اور یہ اختلاف جزو زندگی تھا۔ اسلام کے ابتدائی دنوں میں غلاموں پر قبول اسلام کے بعد جو مظالم ٹوٹتے تھے ملک کے آئین میں ان کا جواز موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آقا جب غلاموں کو دردناک سزائیں دیتے تو تمام لوگ چپ چاپ تماشہ دیکھتے رہتے تھے۔

بہر حال کچھ بھی ہو اہل مکہ کے قومی کردار میں محض برائی کا پہلو ہی نمایاں نہ تھا بلکہ ان میں کچھ حسنِ کردار کا شائبہ بھی تھا اور یہی خوبیٔ کردار تھی جس کی بدولت ان کی سرکش طبیعتوں نے اسلام کو اپنے اندر جذب کر لیا اور آہستہ آہستہ ان کی تمام

برائیاں اچھائیاں بن گئیں۔

قومی زندگی کی پریشان صورت حال سے متاثر ہو کر اہل مکہ کے بعض حساس لوگوں نے اس کے ازالے کی صورت سوچی کیونکہ عدم مساوات کی ہولناک اور تکلیف دہ وبا سے زندگی یکسر دوبھر ہو چکی تھی۔ ان کے علاوہ ایک سیاسی ضرورت بھی لاحق تھی کہ جنگ فجار کے بعد قریش کو غریب طبقوں سے تعاون رکھنا ناگزیر تھا وہ بے چین تھے کہ اگر نچلے طبقے سے انہیں کچھ مدد مل سکے، تو آئندہ کے لیے ان کی خاندانی عظمت قائم رہ سکتی ہے، چناں چہ اس اخلاقی یا سیاسی ضرورت نے مکے میں اونچے طبقے کے شرفا کو ایک ہموار رستہ ڈھونڈھنے پر آمادہ کیا، اور وقت کی یہ ضرورت حلف الفضول کے معاہدہ سے پوری کی گئی، یہ معاہدہ اگرچہ سیاسی حالات کی مجبوری تھی تاہم ایک مخلصانہ کوشش تھی کہ ملک میں انصاف، مساوات اور اخوت کی بنیادوں پر ایک آئین پھر رائج ہو جائے، اس معاہدہ میں شامل ہونے والے تمام قبیلوں نے حلفاً عہد کیا کہ وہ مستقبل میں مظلوموں کی ہمیشہ حمایت کریں گے۔ غریب اور بے یار و مددگار لوگوں کی حفاظت میں تمام متفق رہیں گے۔ اور ان کی حمایت میں اپنی متفقہ کوشش صرف کریں گے۔ اس طرح حلف الفضول محض ایک سیاسی یا قانونی قسم کا معاہدہ ہی نہ تھا بلکہ اس میں دور رس معاشی اثرات کی غایت بھی تھی۔ یہ معاہدہ ایک عظیم المرتبت شخصیت عبد اللہ بن جدعان کے مکان پر طے ہوا، اور اس عہد پر تمام متفق ہوئے کہ

> "خدا کی قسم! ہم مظلوموں کی حمایت میں ظالموں کے خلاف یک جان رہیں گے۔ یہاں تک کہ مظلوم کو اُس کا حق مل جائے، اور ہم اس عہد پر اس وقت تک کاربند رہیں گے جب تک سمندر میں نمی باقی ہو اور حرا اور ثبیر کے پہاڑ اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ ہم معاشی معاملات میں ایک دوسرے سے انصاف اور مساوات کا سلوک کریں گے۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدہ میں بذات خود شامل تھے۔ پیشتر ازیں آپؐ کئی بار ایسے معاہدہ کی ضرورت جتا چکے تھے، اور اب ہوئے کہ تو یہ معاہدہ ہو گیا، اور تمام نے اس کی پابندی کو قائم رکھنے پر حلف بھی اٹھائے۔ لیکن جونہی اسلام کی اشاعت کا آغاز ہوا، قریش نے اس معاہدہ کی دھجیاں اڑا دیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے لیے مظالم اور مصائب برپا کرنے کی ایک باقاعدہ مہم شروع کر دی، یہ وہ وقت تھا کہ بے چارے مسلمانوں کو مکہ تو کیا سارے عرب میں کہیں پناہ نہ ملتی تھی اور سوائے ایسے سینیا کی سرزمین کے عرب میں کہیں اور کسی جگہ بھی ان کا کوئی ہمدرد نہ تھا۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ زمانۂ ماضی میں بھی اسی طرح کا ایک معاہدہ فضل نام کے چند قیدیوں کے درمیان ہو چکا تھا ممکن ہے ان لوگوں پر اس کے بعد فضل فدا ہوا بھی ہو، لیکن عبد اللہ بن جدعان کے مکان پر جو معاہدہ ہوا وہ اسی پرانے معاہدہ کی تجدید تھی، پرانا حلیف الفضول، مکے میں کچھ مدت تک تو قابلِ احترام آئین کی طرح رائج رہا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت گھٹتی رہی اور معاشرے میں اخلاقی و ثقافتی اقدار تاریکی میں آگئیں، اور لوگ پھر ایک نئے معاہدہ کی ضرورت محسوس کرنے لگے تھے۔

اس وقت عرب کے مختلف قبیلوں کے اپنے اپنے قوانین تھے، ہر قبیلے کا قانون باقی قبیلوں سے مختلف تھا۔ اس اختلاف کے لحاظ سے مکہ اور مدینہ دونوں برابر تھے۔ اگر بنو قریظہ والوں سے بنو نضیر کا کوئی آدمی مارا جاتا تو انہیں قاتل کا سر پیش کرنا پڑتا تھا، لیکن اگر قتل کا یہی جرم بنو نضیر والوں سے سرزد ہوتا تو قاتل کو ایک سو اونٹ وزن کے کھجوروں کے بدلے چھوڑ دیا جاتا، بعد میں اس کے خلاف جب بنو قریظہ والوں نے پیغمبرؐ کی خدمت میں درخواست کی تو آپؐ نے بنو نضیر والوں کے لیے بھی برابر کی سزا کا فرمان جاری کیا۔ حاکمِ وقت کے قبیلے کے آدمیوں کے لیے قتل کی سزا ایک ہزار اونٹ اور عام آدمی کے لیے ایک سو اونٹ تھی۔

عربوں کو اگرچہ شخصی آزادی ہو، یہ تھی لیکن وہ دوسروں کے لیے آزادی کا یہ حق ضروری نہ سمجھتے تھے۔ دوسروں کے حق میں وہ اخلاق سے گری ہوئی حرکات سے بھی دریغ نہ کرتے، اور اُن کا ضمیر انہیں بالکل ملامت نہ کرتا۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے پر چڑھ دوڑتا۔ اور ان حملوں کا بڑا مقصد یہ تھا کہ غلام اور لونڈیاں حاصل کیے جائیں اور ان کی تجارت کر کے فائدہ حاصل کیا جائے۔ ابو سلمان فارسیؓ مدینہ کے سفر میں ایک قافلے کے ہاتھ چڑھ گئے اور بعد میں ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیے گئے۔ حضرت زیدؓ بن حارث کو بچپن میں ایک مخالف قبیلے نے گرفتار کیا تھا اور عکاظ کے مشہور میلے میں بیچا تھا۔ الغرض ہر قبیلے کا طرزِ معاشرت اور اصول زندگی جدا تھا۔ اور پھر ہر قبیلے کے لوگوں کے ساتھ برتاؤ کے لیے الگ الگ طریق کار تھا۔ مثلاً رشتہ داروں کے ساتھ برتاؤ کا اصول جدا اور دوسرے لوگوں کے لیے قانون اور تھا۔ جگہ جگہ سیاسی اور قومی نظریات میں اختلاف تھا۔

الغرض ایک ایسے معاشرے میں جہاں زندگی کا کوئی اصول ہی نہ تھا اور اخلاقی معیار نہایت ہی شرمناک تھا ایک مصلح کے لیے اصلاحی کوشش کچھ آسان کام نہ تھا۔ مکے میں اسلام کے ابتدائی دنوں میں اگرچہ مسلمانوں کی تعداد

قلیل تھی اور وہ کمزور بھی تھے لیکن وہ ایک عام رشتے میں منسلک تھے۔ اسی کا ہر فرد مذہبی عشق و جوش میں دیوانہ وار دوسروں کا وفادار تھا، اور تھوڑی مدت میں ہی مواخات اور مساوات کے اہم اصول نے کلیسائی ضابطۂ زندگی کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں، تمام خاندانی رشتوں کا لحاظ بالکل ہی توڑ دیا۔ ہجرت کے بعد پیغمبرؐ نے مدینہ میں مواخات کا جو اصول مہاجر اور انصار میں نافذ فرمایا اس کی بدولت انصار نے نہ صرف اپنی جائدادوں، مکانوں اور دوسرے ساز و سامان کو اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے وقف کیا، بلکہ بعض نے تو دو بیویاں ہوتے ہوئے ایک کو طلاق دے دی تاکہ مہاجرین میں جو مجرّد زندگی بسر کرتے ہیں شریک زندگی پا کر آرام سے رہیں۔ ان ایام میں مدینہ کے سیاسی حالات بھی ابتر تھے، اور کئی لحاظ سے یہاں بھی وہی مکہ جیسی حالت تھی۔ گروہی تعصب اور قبیلوں کے معاشی اختلافات یہاں بھی اسی سطح پر تھے، اور سچ تو یہ ہے کہ ایک تعمیری ضابطۂ آئین کے لیے مدینہ ایک وسیع اور جاذب مقام تھا۔ حضرت عائشہؓ کے قول کے مطابق مدینہ کی ابتر سیاسی صورت ایک اسلامی ریاست کے آئین کی تشکیل اور نشر و اشاعت میں بہت ہی مددگار اور سازگار ثابت ہوئیں

مدینہ میں اسلامی آئین جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب فرمایا تھا۔ وہ نیا ہونے کے علاوہ صحت مند آئین تھا۔ اس آئین کی بہت سی دفعات بیعت عقبیٰ کے معاشی معاہدہ کے مطابق تھیں، اوس اور خزرج کے مشہور قبیلوں نے اس کو اپنی قومی رسوم اور قانون کے یکسر خلاف دیکھتے ہوئے بھی تسلیم کر لیا۔ کیوں کہ اس میں گروہی تنگ خیالی کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔ اس کے نظریات ہمہ گیر تھے، اور یہ آئین کلیتہً جمہوری اور اخلاقی اقدار کا محور تھا کیونکہ اسے جن لوگوں نے ترتیب دیا تھا جو ان کی پسند کے بعد نافذ کیا گیا تھا، اس آئین کی دفعات میں تمام قبیلوں کے نام اور ان کے مروجہ آئین کا ذکر ایک ایک کر کے کیا گیا اور پھر اس ضرورت کو بیان کیا گیا جس کے تحت یہ ذکر ناگزیر تھا۔ اس اندراج کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ تمام قبائل اپنے اپنے مروجہ قوانین کے خلاف ایک ہمہ گیر اور بلند اقدار آئین کے حق میں ہیں، نئے آئین کی تیرھویں دفعہ کے تحت بغاوت، ظلم و تعدی بلکہ تمام جرائم نیز شخصی اور جماعتی تعصب کے نظریات بالکل ختم کر دیے گئے کیوں کہ ان خرابیوں سے ساری قوم متاثر ہو رہی تھی، اور جو مصائب شہری زندگی پر مسلط تھے وہ کسی خاص قبیلہ یا جماعت کے لیے نہ تھے، بلکہ اجتماعی مصیبت بنے ہوئے تھے۔ نئے آئین کے نفاذ نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ باپ اپنے بیٹے کی محبت کے خلاف آئین کے احترام اور اس کی پابندی کو ترجیح دیتا تھا یہودیوں کے لیے یہ رعایت رکھی گئی کہ اگر وہ اسلامی آئین کی باقی دفعات کے پابند رہیں تو اپنے قبیلے کے فوجداری

اور دیوانی مقدمات اپنے مروجہ قانون کے مطابق فیصلہ کر لیا کریں۔ آئین کی پچیسویں دفعہ میں صاف صاف وضاحت تھی کہ یہودیوں کے عقاید اپنے ہیں اور مسلمانوں کے اپنے۔ چناں چہ اس آئین کو تمام یہودی قبیلوں اور ان کے مذہبی رہنماؤں نے بالاتفاق تسلیم کیا۔ مفتوح لوگوں کے لیے مراعات کی شرائط نہایت مفصل اور صراحت کے ساتھ موجود تھیں۔ شام اور فلسطین کے یہودی اور عیسائی قبیلوں کے ساتھ مربیانہ اور منصفانہ سلوک کا باوضاحت ذکر تھا۔

تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ بدر کے بعد کا وقت اسلامی آئین کے نفاذ کے لیے نہایت ہی صبر آزما اور حوصلہ طلب تھا۔ چوں کہ پہلی بار نسبی اور خاندانی امتیازات مٹائے جارہے تھے، اس لیے مخالفت کا طوفان اٹھ پڑا۔ لیکن یہ آپؐ کی بلند اور اٹل قوت ارادی تھی کہ آپؐ نے مخالفانہ ہجوم میں پرجوش خطبے دیے۔ اور ہر حال میں اسلامی آئین زندگی کے نفاذ کے لیے مستقل مزاج رہے۔

"آج ہم اپنے ان قرابت داروں کی کھوپڑیاں توڑ دیں گے جن کا پیشہ ظلم و تعدی تھا، اور انھوں نے انسانی رشتوں کا لحاظ نہیں کیا۔"

رسول کریمؐ کے چچا حضرت عباسؓ بدر کی لڑائی میں قید ہوئے، تو آپ کے ہاتھوں اور پاؤں کو رسیوں سے کس کر مسجد نبوی میں ڈال دیا گیا۔ حضرت عباسؓ رسیوں کی شدید گرفت سے متاثر ہو کر رات بھر کراہتے رہے۔ حجرۂ نبوی قریب تھا۔ آپ چچا کی تکلیف سے بستر پر بے قرار ہو کر کروٹیں بدلتے۔ لیکن خون کے رشتے سے متاثر ہو کر قطعاً یہ نہ کیا کہ رسیوں کی گرفت ہلکی کر دی جائے۔ بعد میں جب صحابہ کرام کو حضرت کی بے قراری کا علم ہوا تو انھوں نے عباسؓ کی رسیوں کو ڈھیلا کر دیا، اور جب کچھ انصار نے فدیہ دے کر حضرت عباس کو رہا کرنا چاہا تو آپ نے اس کو ہرگز قبول نہ کیا۔ اوامر و نواہی کے بارے میں آپؐ نے کبھی بھی کسی سفارش کو برداشت نہ کیا۔ جرائم کی نوعیت کے مطابق مجرموں کو صحیح سزا دینے میں کبھی تامل نہ فرماتے۔ اسامہ بن زید سے آپ کو بہت محبت تھی۔ لیکن جب وہ ایک ایسی عورت کی سفارش لے کر آپؐ کے حضور میں آئے جس پر چوری کا الزام تھا۔ تو آپؐ نے فرمایا۔

"کیا تم حدود اللہ میں دخل انداز ہوتے ہو؟"

اور اس کے بعد اسی موضوع پر عوام سے خطاب فرمایا کہ

کہ پچھلی قومیں صرف اس لیے عذاب الٰہی میں مبتلا ہوئیں کہ وہ اونچے طبقے کے مجرموں کو چھوڑ دیتے

تھے، اور نچلے خاندانوں کے مجرموں کو سزائیں دیتے تھے۔ خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ پر بھی چوری کا الزام ہو تو اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے"

حضور نبی کریمؐ نے ہر موقع پر حقوق مساوات کی اہمیت کا پُر زور اعلان فرمایا۔ ایک بار جب ایک آدمی کو چوری کے جرم میں سزا دی گئی تو ایک صحابی نے کہا "ہمیں ہرگز یہ معلوم نہ تھا کہ نوبت یہاں تک آ جائے گی"! آپؐ نے سنا تو فرمایا "یقیناً اگر فاطمہ بھی ہوتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیے جاتے"

صحابہ کرام کے عہد میں بھی یہ آئین خلوص اور احترام کے ساتھ نافذ رہا اور سختی سے اس پر عمل ہوتا رہا۔ حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ ہوتے ہی جو مشہور خطبہ دیا تھا اس کی غایت ہی یہ تھی کہ قانون کے معاملے میں سب برابر ہیں۔ فرمایا:

"تم میں سب سے زیادہ کمزور میرے نزدیک سب سے زیادہ طاقتور ہے جب تک کہ میں اس کا حق نہ دلا دوں۔ اور تم میں سب سے زیادہ طاقت ور سب سے زیادہ کمزور ہے جب تک میں اس سے کمزور کا حق نہ چھین لوں"

خلفائے اسلام معاشرے کے اس بنیادی اصول کے سخت پابند تھے۔ غسان کے شاہزادے جبلہ بن ایہم نے ایک بار کعبہ کے طواف کے دوران میں ایک مسلمان کو تھپڑ مار دیا، اور جب مظلوم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ سے یہ شکایت کی تو انھوں نے فرمایا کہ "جبلہ کو بھی اسی طرح طمانچہ مارا جائے کیوں کہ اسلام کی رو سے دونوں برابر ہیں"

مجرموں کو جو سزا ملتی اس کی نوعیت تعزیری اور انتقامی ہرگز نہ تھی، سزا عبرت کے لیے ہوتی اور اس کا منشا سبق آموزی تھا، تاکہ جرائم کا انسداد ہو جائے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مدعی غم و غصے کے عالم میں مجرم کو کوستے اور برا بھلا کہتے تو آپؐ انھیں منع فرماتے کہ وہ ایسا کرنے کے بجائے گمراہ اور مجرم کے حق میں دعا کریں۔ آپؐ کے سامنے ایک شرابی کو پیش کیا گیا جسے پتھروں اور جوتوں سے مارا گیا تھا۔ ایک شخص نے اس کو بددعا دی کہ "خدا اس کو ذلیل کرے"۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اس کے گناہوں میں زیادتی کے لیے شیطان کی مدد نہ کرو، تمھیں تو یہ کہنا چاہیے کہ خدا اس کو معاف فرمائے"

مجرم سزا کے بعد سیکھتے اور عبرت پکڑتے۔ سزا کے بعد ان کے چہرے بشاش نظر آتے، ان کے ذہن سے احساس کا بوجھ ہلکا محسوس ہوتا۔ خطاکار آپؐ کے حضور میں گناہوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے آتے اور اعتراف گناہ کرتے

ایک عورت نے آپؐ کے سامنے زنا کاری کا اعتراف کیا۔ اور سزا کے بعد اس عورت کے الفاظ ظاہر کرتے تھے کہ اس کا ضمیر پاک ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق اگر گناہوں کی سزا دنیا میں مل جائے تو قیامت میں اس جرم کی پرسش نہ ہو گی، کیوں کہ خدا غفور الرحیم ہے، اور اپنے بندوں کے گناہوں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔

ایک بار عبداللہؓ جنھیں "حمار (گدھا)" کہا جاتا تھا، آپؐ کے سامنے پکڑے آئے۔ جرم یہ تھا کہ انھوں نے شراب پی تھی۔ جب انھیں سزا ملی تو حاضرین میں سے ایک نے کہا "خدا اسے ذلیل کرے کہ کئی بار اس نے یہ حرکت کی ہے" حضورؐ نے فرمایا "اس کو بددعا نہ دو، خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ اسے خدا اور اس کے رسولؐ سے عشق ہے" ایسے مجرم جو مجبور ہو کر ارتکاب جرم کرتے ان کے لیے آپ کا دل بہت ہی پسیجتا اور آپ نرم نرم الفاظ میں اُن سے ہمدردی فرماتے۔

ابتدائے اسلام میں عمارؓ بن یاسر کے خاندان پر کفار نے سخت مظالم توڑے تھے، ان کے والدین کو اتنی دردناک سزائیں دی گئیں کہ وہ اسی دکھ میں شہید ہو گئے، اور جب کفار نے حضرت عمارؓ کو بھی پکڑا، تو اس قدر مجبور کیا کہ وہ محمدؐ سے اپنی بے زاری کا اعلان "اکفر بمحمدؐ" کے الفاظ سے کریں۔ بڑی مجبوری سے ان سے یہ الفاظ کہلوائے گئے لیکن اس کے بعد روتے روتے ان کا حلق بیٹھ گیا اور انھیں بڑی ندامت اور ذہنی اذیت ہوئی۔ روتے ہوئے پیغمبرؐ کی خدمت میں آئے اور سارا واقعہ عرض کیا۔ آپؐ نے ان کے آنسو پونچھے اور فرمایا۔ "کوئی بات نہیں تم نے وہی کچھ کہا جو انھوں نے کہا" اور جب ایک شخص نے کہا عمار مرتد ہو گیا ہے تو آپؐ نے فرمایا:-

"ہرگز نہیں وہ تو سر سے پاؤں تک ایمان میں ڈوبا ہوا ہے، اس کے گوشت اور پوست میں ایمان کا نور ہے"

(مسلسل)

ثانوی مدارج میں ریاضی کا نصاب

فضل محمد خاں

نمبر ۴

اس مضمون سے متعلق تین قسطیں جولائی، ستمبر اور اکتوبر کے شماروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان قسطوں میں ان تمام نظریوں پر بحث کی گئی تھی جو ثانوی مدارج میں ریاضی کے نصاب کے سلسلہ میں مختلف ممالک میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ پہلے مضمون میں اس امر پر بحث کی گئی تھی کہ ریاضی کو ثانوی مدارج کے تمام طلبہ کے لیے لازمی مضمون قرار دینا ضروری ہے، اور سب طلبہ کے لیے اس مضمون کا نصاب بھی ایک ہی ہونا ضروری ہے۔ دوسری قسط میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ ثانوی مدارج میں ریاضی کی حیثیت ایک اختیاری مضمون کی ہونی چاہیے، جو طالب علم اس مضمون کو پڑھنا چاہتے ہیں وہ پڑھیں اور جو چھوڑنا چاہتے ہیں وہ چھوڑ دیں۔ تیسری قسط میں یہ بتایا گیا تھا کہ ثانوی مدارج میں ریاضی کے نصاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ ایک حصہ سب کے لیے لازمی ہو اور دوسرا اختیاری۔ دوسرے حصے کو جو طالب علم چھوڑنا چاہیں وہ چھوڑ سکتے ہیں۔ لازمی حصے میں ریاضی کے وہ تمام موضوع شامل کر دیے جائیں جن کی زندگی کے روزمرہ مسائل میں افادی اہمیت ہے اور اختیاری حصے میں وہ موضوع شامل کر دینے چاہئیں جو ان طلبہ کے لیے ضروری ہیں جو ریاضی کو کالجوں میں جا کر پڑھنا چاہتے ہوں یا جن میں ریاضی سیکھنے کی خصوصی صلاحیتیں موجود ہیں یا جو میٹرکیولیشن کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایسے پیشوں کو اختیار کرنا چاہتے ہوں جن کا انحصار ریاضی پر ہے۔

جولائی کے شمارے میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ریاضی کی افادی اہمیت اب کبھی اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ ریاضی کو ثانوی مدارج میں اختیاری مضمون بنا دینے کا تخیل ہی غلط ہے۔ وہاں یہ بھی ذکر کیا گیا تھا کہ ریاضی کی افادیت پر بحث کسی اگلے شمارے میں کی جائے گی۔ جہاں اس شمارے میں ہم ریاضی کی افادیت پر بحث کو ضروری سمجھتے ہیں تاکہ ہمیں اس بات کا علم ہو سکے کہ موجودہ زمانے میں اس مضمون کی افادی اہمیت کتنی بڑھ چکی ہے اور اس مضمون کی افادی اہمیت کے پیش نظر ہم کہاں تک حق بجانب ہیں کہ اس مضمون کو ثانوی مدارج کے نصاب کا لازمی جزو قرار دیا جائے یہاں یہ بتا دینا بے جا نہ ہوگا کہ مبہم طور پر تو ہم سب ریاضی کی افادیت کے قائل ہیں لیکن اس امر کا تخیل ہم میں سے

بہت کم لوگوں کو واضح ہے کہ اس مضمون کا امور روزمرہ میں کیا حصہ ہے، دو مختلف پیشوں کا انحصار اس مضمون پر کہاں تک ہے، اور دوسرے مضامین کی تحصیل میں اس مضمون کا کہاں تک حصہ ہے۔

ا۔ ریاضی کی اہمیت میں تدریجی ترقی:

ایک جرمن حکیم کا مقولہ ہے کہ خدا نے ہندسوں کو بنایا اور باقی ساری کائنات کو لوگوں نے بنایا۔ اس مقولے کو آپ کتنا ہی مبالغہ آمیز کیوں نہ سمجھیں اس امر کی اس سے ضرور وضاحت ہوتی ہے کہ ہندسوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

جس وقت سے بشر میں اپنے آپ کو قائم رکھنے کی جبلت پیدا ہوئی اسی وقت سے ہندسوں کی ابتدا ہوئی جس وقت دنیا معرض وجود میں آئی اسی وقت انسان کو خوراک جسم ڈھانپنے اور رہائش کے مسائل پیش آنا شروع ہوئے ان کو ان امور کا احساس شروع ہو گیا کہ کتنے افراد کے لیے کتنی خوراک کافی ہوگی۔ کتنے لوگوں کے لیے کتنا بڑا گھر کافی ہوگا اس کے ابعاد کیا ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ان کو شمار کرنے اور پیمائش کرنے کی ضرورت پڑی جو کہ ہندسوں کے معرض وجود میں آنے کا باعث ہوئے۔

سماجی ترقی کے ساتھ ساتھ ہندسوں کی اہمیت بھی بڑھتی گئی۔ چناں چہ موجودہ سماج کا یہ ہندسے سب سے بڑے آلہ کار کی حیثیت رکھتے ہیں، تجارتی کاروبار کی یہ صحیح بنیاد ہیں۔ پیمائشی آلوں۔ مثلاً تپش پیما یا مقیاس المطر رفتار پیما۔ باد پیما۔ مقیاس الھوا گیس پیما کی یہ اساس ہیں۔ تقویم کی یہ اصل ہیں۔ گلی کوچوں میں مکانوں کے نمبر کتابوں کے صفحات۔ موٹر کاریں اور ٹیلیفون انھی ہندسوں سے ظاہر کیے جاتے ہیں۔ شماریاتی، معاشیاتی اور سائنٹیفک ریسرچ کا ان پر انحصار ہے۔ لان سیلٹ ہوگ بن اپنی کتاب "میتھمیٹکس فار ملین" میں شماریات کی اہمیت کے سلسلہ میں یوں رقمطراز ہے۔

> مشینی دور کا انسان ایک حسابی حیوان ہے۔ ہم اعداد و شمار کے جال میں زندگی گذار رہے ہیں مختلف مکانوں کے نقشے۔ ریل کے کرائے۔ بیکار لوگوں کے اعداد و شمار۔ جرمانے۔ زائد اوقات کی اجرت۔ معدِ رفتار اوزان۔ درجہ ہائے حرارت۔ سالانہ بارش۔ طلوع و غروب آفتاب۔ بجلی کے میٹر کا پڑھنا۔ بنک کی شرح سود۔ منی کا ٹا۔ منڈیوں کے نرخ۔ لاٹریاں، یہ اور زندگی کے کئی دوسرے اہم کوائف ہمارے سامنے ہمیشہ اعداد و شمار کی صورت میں ہی آتے ہیں۔ اعداد و شمار کے بغیر ہم ان کا مفہوم ہی نہیں

سمجھ سکتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ علم حساب جدید زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔"

حکیم فیثاغورث تو کائنات اور ہندسی اشکال کا تعلق واضح الفاظ میں بیان کرتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق زمین منتظم مسدسی مجسم ہے۔ آگ ہرم ہے۔ ہوا مثمن نما مجسم ہے۔ اور ساری اشیا دوازدہ طرفی مجسم سے بنی ہیں۔ اس تمام بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علم ریاضی کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی جس وقت سے دنیا معرض وجود میں آئی۔ اور اس کی اہمیت زمانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی گئی۔

۲- ریاضی کا دوسرے مضامین میں استعمال

جولائی کے شمارہ میں ضمناً بتایا گیا تھا کہ بہت سے مضامین کی تحصیل میں ریاضی بے حد اہم ہے۔ اس سلسلے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ شکاگو میں صد سالہ بہبودی ظاہر کرنے کے لیے ۱۹۳۳ء میں ایک نمائش منعقد کی گئی تھی۔ نمائش کے ایک کمرے میں ایک بڑے درخت کی تصویر آویزاں تھی۔ یہ درخت شجر علوم کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ اس درخت کی شاخوں اور جڑ پر مختلف علوم کے نام لکھے تھے۔ جڑ پر ریاضی کا نام تھا۔ اور شاخوں پر دیگر علوم کے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ریاضی ہی کی بدولت دیگر مضامین نشوونما پاتے ہیں۔ حق یہ ہے، کہ اس دور میں ریاضی کا استعمال دوسرے مضامین میں اتنا زیادہ ہے کہ ریاضی کو شجر علوم کی اصل ماننا حقیقت سے بعید نہیں ہے۔ اس امر کی وضاحت سطور ذیل میں کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ریاضی کی دوسرے مضامین کی تحصیل میں کیا اہمیت ہے۔

(ا) ریاضی اور علم طبیعیات:- علم طبیعیات میں ریاضی کے استعمال کا جائزہ لینے کے لیے راقم الحروف نے ایک طبیعیات کی کتاب کا بغور مطالعہ کیا۔ یہ کتاب نویں اور دسویں جماعت کے طلبہ کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کے ہر باب کے بعد دہرانے کے لیے مشقی سوالات درج کیے گئے تھے۔ جن کی مجموعی تعداد ۲۰۴ تھی۔ ان میں سے ۱۸۰ ایسے سوال تھے جن کو ہم خالص ریاضیاتی سوالات کہہ سکتے ہیں۔ کتاب کے نفس مضمون میں بھی ۷۵ صفحات ریاضیاتی عملوں پر مشتمل تھے۔ علم طبیعیات کی ایک ایسی ہی دوسرے مصنف کی کتاب میں ۲۶۳ مشقی سوالات تھے جن میں سے ۱۴۴ ایسے سوالات تھے جن کے حل کرنے میں ریاضی کا استعمال لابدی تھا، اور اس کتاب کے نفس مضمون میں ۶۴ صفحات ریاضیاتی عملوں پر مشتمل تھے۔ وہ موضوع جن میں ریاضی کا استعمال ہوتا تھا یہ تھے۔ (۱) وقت۔ طول۔ رقبہ۔ طول

اور حجم کے پیمانے (۲) ترازو کثافت اور کثافت اضافی کے قانون (۳) ہوا کا دباؤ اور پمپ (۴) بوائل اور چارلس کے قانون (۵) تپش پیمائوں کی باہمی تبدیلی۔ حرارت مخفی اور حرارت مخصوصہ (۶) انعکاس اور انعطاف روشنی کے قوانین (۷) عدسہ۔ شیشہ اور منشور میں روشنی کا گذر (۸) سادہ مشین (۹) گرتے ہوئے اجسام کا قانون۔ تیرنے والے اجسام کا قانون (۱۰) جمود اور حرکت اور ان کے قانون۔

ان موضوعات کو وضاحت سے سمجھنے کے لیے ہمیں چاروں اساسی قاعدوں کی کسور اعشاریہ کسور عام پر اطلاق میں مبادیات کی ضرورت ہے۔ دوسرے تناسب کا پوری کتاب میں متعدد بار اطلاق ملتا ہے مثلاً :۔

(1) $\frac{H_1}{H_2} = \frac{L_2}{L_1}$ (2) $\frac{1}{o} = \frac{U}{U}$ اور (3) $\frac{\text{خط استوا پر ثقل}}{\text{پول پر ثقل}} = \left(\frac{1.000}{1.0013}\right)$ تناسب کی واضح مثالیں ہیں۔ تیسرے کئی ایک طبیعات کے قانونوں کو جبریہ کلیوں میں تحویل کر لیا گیا ہے مثلاً $S = 4T + \frac{1}{2}GT^2$ اور (2) $C = \frac{5}{9}(F-32)$ محض جبریہ کلیے ہیں۔ چوتھے ترسیمات کا استعمال سے کئی ایک طبیعاتی قانونوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔ مثلاً گرتے ہوئے مجسم کا راستہ۔ مختلف پیمانوں کی باہم تبدیلی۔ غیر منتظم اشکال کا رقبہ ایسے موضوع ہیں جن کی وضاحت میں گراف کا استعمال بے حد ضروری ہے۔ پانچویں چند ایک ایسے طبیعاتی قانون ہیں مثلاً ترازو کا قانون اور گرتے ہوئے اجسام کا قانون، جن کی وضاحت میں جذر کا اطلاق ہوتا ہے۔ چھٹے سطح آئینہ میں اشکال کے قانون کی وضاحت کے سلسلے میں مطابق مثلثوں کے اطلاق کی ضرورت ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا بحث میں صرف میٹرکولیشن کے طبیعات کے کورس میں میٹرکولیشن کے ریاضی کے کورس کے اطلاق کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ اعلیٰ طبیعات میں تو ریاضی کا کہیں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ طبیعات میں جتنا زیادہ ریاضی کا استعمال ہوگا اتنا ہی زیادہ یہ مضمون یقینی اور قطعیہ بن جائے گا۔

ریاضی اور کیمیا:۔ علم کیمیا کے مبادیات سمجھنے کے لیے ہائی سکول ریاضی پر اچھی خاصی مبادیات کی ضرورت ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہائی اسکول کے علم کیمیا کو سمجھنے کے لیے کس قدر ریاضی کی ضرورت ہے۔ راقم الحروف نے ایک کیمیا کی کتاب کا جو ہائی سکول کے طلبہ کے لیے لکھی گئی تھی مطالعہ کیا۔ اس کتاب کے ۲۰۵ صفحوں میں ۷۵ صفحات ایسے تھے جن کا مطالعہ بغیر ریاضی پر اچھے خاصے عبور کے ناممکن تھا۔ ریاضی کا استعمال مندرجہ ذیل موضوع کے سمجھنے کے لیے ضروری تھا۔ (۱) چیزوں کے (مثلاً میگنیشم) جلنے سے ان کے وزن میں فی صد زیادتی (۲) چیزوں کے

(مثلاً پوٹاسیم کلورائڈ) کے جلنے سے ان کے وزن میں فی صد کمی (۳) مختلف اشیا کی حل پذیری اور حل پذیری کے گراف (۴) چاک کے تیزاب میں حل ہونے سے اس کے وزن میں فی صد کمی۔ (۵) مستقل تناسب کا قانون (۶) ڈالٹن کی اٹیامک تھیوری اور ایووگیڈرو کا نظریہ (۷) ڈیولانگ اور پیٹٹ کے قانون (۸) معمولی قسم کے حساب کا استعمال تو اشیا کے درجہ پگھلاؤ اور کھولاؤ معلوم کرنے اور ہوا اور پانی کی ترکیب معلوم کرنے میں ہوتا ہے۔

ان تمام موضوع کے سمجھنے اور ان کے عبارتی سوال حل کرنے کے لیے ہمیں چاروں اساسی قاعدے، تناسب فی صد اور سادہ مساواتوں پر مہارت کی ضرورت ہے۔ ان کے علاوہ منفی مقداروں کے اصول اور گراف سے واقفیت کی بھی ضرورت ہے۔ شیشے کی نلی کو موڑنے میں زاویہ منفرجہ۔ زاویہ قائمہ اور زاویہ حادہ سے واقفیت لازمی ہے۔ مختلف اشیا کی قلمیں ہندسی اشکال کی ہوتی ہیں، لہٰذا ان قلموں کی شکلیں سمجھنے کے لیے ہندسی اشکال سے واقفیت ضروری ہے۔ مثلاً آرٹ کی قلمیں شش پہلو منشور سے ملتی ہیں۔ کلسائیٹ کی قلمیں مضامین نما مجسم سے ملتی ہیں۔ جن کا ایک زاویہ ۷۵ درجہ کا ہوتا ہے۔ پھٹکری کی قلمیں ہشت پہلو مجسم سے نمک کی قلمیں مکعب سے اور جست کی بارہ پہلو مجسم سے۔ اشیا کے قلماؤ کا اصول کو $F + V = E + 2$ سے تعبیر کیا جاتا ہے جہاں F اشیا کے اطراف کو، V ان کی راسوں کو اور E ان کے کناروں کو ظاہر کرتے ہوں۔

اعلیٰ طبیعاتی کیمیا کے سمجھنے میں اعلیٰ ریاضی پر مہارت ضروری ہے۔ چند سال ہوئے امریکن کیمیکل سوسائٹی نے یہ بتایا تھا کہ طبیعاتی کیمیا کے مبادیات کو سمجھنے کے لیے تجزی ہندسہ اور علم الاحصاء کافی ہیں۔ مگر طبیعاتی کیمیا کے اعلیٰ کورس کو سمجھنے کے لیے ریاضی کے متذکرہ بالا کورس بھی ناکافی ہیں۔

(iii) **ریاضی اور جغرافیہ**:۔ عام لوگ تو جغرافیہ کا مطلب شہروں اور دریاؤں وغیرہ کے حالات سے لیتے ہیں۔ امر واقعہ بھی یہ ہے کہ جغرافیہ ابتدائی مدارج میں انھیں چیزوں کے حالات سے متعلق علم تھا۔ اسی دن سے یہ علم ریاضیاتی بننے لگا جس دن یہ تصور کیا جانے لگا کہ زمین گول ہے۔ ایراٹس تھینز نے زمین کے محیط کو معلوم کرنے کی کوشش کی۔ یہ شخص قاہرہ میں ایک لائبریرین تھا۔ اس کے بعد منزلوں نے طول بلد اور عرض بلد کی پیمائش میں خاصی کامیابی حاصل کی۔ ان تمام پیمائشوں کا انحصار ریاضی پر تھا۔ بعد ازاں زمین کی سورج کے گرد اور اپنے محور کے گرد گردش طول بلد اور اس کا وقت سے تعلق۔ عرض بلد اور اس کا دن اور رات کی لمبائی پر اثر (جب خط استوا سے شمالی قطب

یا جنوبی قطب کی طرف جاتے ہیں) کا سائنٹیفک طور پر مطالعہ کیا گیا اور یہ ریاضی کے اطلاق کا نتیجہ تھا کہ علم جغرافیہ قطعی بننا شروع ہو گیا۔

"اگر ہم جغرافیہ کی ایک اچھی کتاب کا جو ہائی اسکولوں کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہو غور جائزہ لیں تو ہم ان موضوعات کی ایک طویل فہرست مرتب کرلیں گے جن میں ریاضی کا استعمال ہوتا ہے۔ ہم بار بار ان لمبائی کے پیمانوں کو پڑھیں گے جو مختلف ممالک میں رائج ہیں، مثلاً گز۔ فٹ۔ کلومیٹر۔ وغیرہ۔ ہم بار بار مختلف اشیا کی پیداوار اور ان کی برآمد اور درآمد کے سلسلے میں وزن کے ان پیمانوں کو پڑھیں گے جو مختلف ممالک میں رائج ہیں۔ مثلاً من۔ ٹن۔ پونڈ۔ کلوگرام۔ ہم ایسے پیمانوں کو بھی پڑھیں گے۔ جیسے گیلن اور بشل۔ گلوب کے سلسلے میں ہم زاویوں اور درجوں کا ذکر دیکھیں گے آبادی کے سلسلے میں مربع میل۔ پیداوار کے سلسلہ میں ایکڑوں کا ذکر بار بار آئے گا۔ اس کے علاوہ ہم ایسی اصطلاحوں کا ذکر دیکھیں گے جیسے نصف النہار۔ گراف (دائرہ گراف۔ پٹی گراف اور خط گراف) جن کے صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ریاضی کی ضرورت ہے۔

اعلیٰ جغرافیہ میں ہم کو زمین، چاند اور سیاروں کی حرکت کے متعلق پڑھنا ہوتا ہے۔ ان کی وضاحت کے لیے اعلیٰ الجبرا اور علم ہندسہ پر مہارت کی ضرورت ہے۔ دوسرے خطوط مساوی البرودت اور خطوط مساوی الحرارت اور ہوا کی حرکت اور اس کا دباؤ سے تعلق۔ ہوا میں نمی گیسوں کی تقسیم کے مطالعہ کے لیے الجبرا۔ علم ہندسہ اور علم مثلث کی ضرورت ہے۔ تیسرے ساحل اور دریا کی لمبائی۔ پہاڑوں کی اونچائی کی پیمائش میں کروی علم مثلث۔ الجبرا اور علم الاحصا کی ضرورت ہے۔ چوتھے نقشہ نگاری میں آرتھوڈروماٹ خطوط۔ لاکسوڈروک خطوط وغیرہ، کے صحیح مطالعہ کے لیے علاوہ الجبرا۔ ٹرگونومیٹری اور علم الاحصا۔ تفرقی مساواتوں کا بھی استعمال ہوتا ہے۔

پانچویں نم آلود علاقوں کے کنٹور نقشوں میں ان قانونوں کے ریاضیاتی پہلوؤں کے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے جن کا آواز بازگشت سے تعلق ہوتا ہے۔ جیسے زلزلہ پیما کی مدد سے ہزاروں میل دور بھونچال کی جگہ، وقت اور شدت کا پتہ چلانا علم طبیعات کے ریاضیاتی پہلو پر منحصر ہے۔ ان تمام موضوع کے مطالعہ کی وجہ سے علم جغرافیہ میں ایک علیحدہ شاخ کا ارتقا، ہوا ہے، جس کو ریاضیاتی جغرافیہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مشہور ریاضی داں اور سائنس داں نیوٹن نے اپنی کتاب یونی ورسل جغرافیہ میں تو ریاضی کا علم ہندسہ اور علم مثلث پر مشتمل ایک باب دیا تھا۔ اور اس کا خیال تھا کہ اس کے جغرافیہ کے

واضح طور پر سمجھنے کے لیے اس باب کی ضرورت ہے۔

(۱) **علم معاشیات اور ریاضی** :- علم معاشیات کے مطالعہ میں ریاضی پر خاصی مہارت کی ضرورت ہے۔ اس مضمون کے اکثر قانونوں کو ریاضیاتی کلیات سے ظاہر کرتے ہیں۔ ریاضی کا وہ موضوع جس کا علم معاشیات میں بہت زیادہ استعمال ہو گراف ہے۔ صحیح تو یہ ہے کہ معاشیات کے بہت سے قانون مثلاً تقلیل افادیت کا قانون صارفین کی زائد طمانیت کا قانون آبادی کی بیشہ ورانہ تقسیم وغیرہ کا مطالعہ گرافوں کے ذریعہ ہی کیا جا سکتا ہے، دوسرے معاشیات میں چند ایک ایسے موضوع ہیں جن کو اگر ریاضی کے بغیر پڑھنے کی کوشش کی جائے تو وہ معمہ بن کر رہ جاتے ہیں مثلاً مزدوری۔ حصص۔ سود۔ اور منافع سمجھنے کے لیے ریاضی کی ضرورت ہے۔ میزانیہ تو بالکل ریاضیاتی مسئلہ ہے۔ انشورنس۔ بنکنگ۔ کٹوتی ریاضیاتی موضوع ہیں۔ معاشی توازن کو ریاضی اور طبیعات سے ہی لیا گیا ہے۔ علم ریاضی ہی کی بدولت ہم کامیابی سے اثاثہ، اور آمدن میں صحیح طور پر امتیاز کر سکتے ہیں۔ علم الاحصا میں ایک کو ∆ سے اور دوسرے کو ∆ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ معیشت دانوں نے معیشت کے اصولوں کو سلجھانے کے لیے اعلیٰ ریاضی میں اعلیٰ الجبرا، علم الاحصا، تفرقی اور علم الاحصا تکملی سے مدد لی ہے۔ اکثر یونیورسٹیوں میں ریاضیاتی معاشیات کا پرچہ ایم۔ اے۔ کے نصاب کا جزو ہو گیا ہے۔

(۲) **تجربی اور تعلیمی نفسیات اور ریاضی** :- موجودہ دور میں تعلیمی نفسیات کے سلسلہ میں جو تجربے نفسیاتی تجربہ گاہوں میں ہوتے ہیں ان کے ریاضیاتی نتائج پر زور دیا جاتا ہے، اور یہ نتائج وہی طالب علم معلوم کر سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں جن کو ریاضی کے مبادیات پر عبور ہے۔ تعلیمی نفسیات کی کتابوں میں بار بار ایسی اصطلاحوں کا ذکر آتا ہے جیسے اوسط، وسطی مقام، انحراف، معیاری انحراف وغیرہ وغیرہ۔ ان کے سمجھنے کے چاروں بنیادی قاعدوں۔ مربع اور جذر۔ اوسط اور وحدانی قاعدے پر مہارت کی ضرورت ہے۔ دوسرے تعلیمی نفسیات کی کتابوں میں چند ایسے موڑوں کا بھی ذکر آتا ہے۔ جیسے نارمل تقسیم کا موڑ۔ ہیبرسن کے موڑ۔ دوسیری موڑ۔ ان موڑوں کو بنانے اور سمجھنے کا کام صرف وہ طالب علم آسانی سے کر سکتے ہیں جن کو گراف کے بنانے اور پڑھنے میں مہارت ہو۔ نارمل تقسیم کے موڑ کے بنانے کے لیے ہمیں کلیہ $10\ \text{OF}\ \frac{1}{10} = \sigma$ کے اطلاق کی ضرورت پیش آتی جبکہ $x = 1, 2, \ldots$ ——— e اور e کو ظاہر کرتا ہو۔ یہ کلیہ اعلیٰ الجبرا کا ایک کلیہ اور ہمارے ہاں یہ کلیہ انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کے الجبرے کے نصاب کا جزو ہے ہوتے

تعلق باہمی کے عددی سہر معلوم کرنے میں جبریہ کلیوں کا اطلاق بار بار آتا ہے، اور صرف وہ طالب علم اس کو آسانی سے معلوم کرسکتا ہے جس کو ان جبریہ کلیوں پہ مہارت حاصل ہو۔

(ثانیاً) ریاضی اور عام پیشے :۔ ریاضی صرف طالب علموں ہی کو مختلف مضامین کی تحصیل کے لیے اہم نہیں۔ بلکہ عوام کو بھی یہ مضمون مختلف پیشوں میں فضیلت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ایک ماہر تعلیم نے کہا ہے "کہ نقاش جو تصویر بناتا ہے بڑھئی جو الماری تیار کرتا ہے، معمار جو مکان تعمیر کرتا ہے۔ باورچی جو کھانا بناتا ہے سب کو شمار کرنے۔ وزن کرنے اور پیمائش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے"۔ یعنی سب کو ریاضی سے واقفیت ضروری ہے کیوں کہ ہمیں بھی بچوں کو کسی نہ کسی پیشے کے لیے تیار کرنا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ بچے کو اس علم سے واقفیت ہو۔ ذیل میں ہم مختصراً یہ درج کریں گے کہ مختلف پیشوں میں ریاضی کا کہاں تک اطلاق ہوتا ہے۔

(۱) ریاضی اور تاجر :۔ تاجر کو خواہ وہ تھوک فروش ہو یا پرچون فروش مختلف اشیا کی قیمتیں معلوم کرنا ہوتی ہیں۔ لہٰذا اسے نہ صرف وزن۔ طول عرض وغیرہ کے پیمانوں سے واقفیت ضروری ہے، بلکہ اس کو ایسے طریقوں پر مہارت حاصل کرنے کی بھی ضرورت ہے جن کے استعمال سے وہ آسانی سے اور تیزی سے قیمتیں معلوم کرسکے۔ برصغیر ہندو پاک میں تو مہاجنی سکول ہیں جہاں تجارت اور کاروبار کے اصول سکھائے جاتے ہیں، اور یہاں ایسے طریقے اور اصول سکھائے جاتے ہیں جن کے اطلاق سے چیزوں کی قیمتیں آسانی سے اور تیزی سے شمار کی جاسکیں۔ یہ مہاجنی سکول نئے نہیں ہیں مغلوں کے زمانے میں بھی ایسے سکول موجود تھے۔ انگریزوں کے وقت میں بھی ان سکولوں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ ہندوستان کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے لیے جو کمیشن ۱۸۸۲ء میں ہندوستان آیا تھا، اس کی پنجاب کمیٹی نے ان سکولوں کا خصوصی ذکر کیا۔ اس کمیٹی نے لکھا کہ دیہاتی سکولوں میں قیمتوں کے معلوم کرنے کے ایسے طریقے سکھائے جاتے ہیں کہ جن کے اطلاق سے ان سکولوں کا چھوٹا سا بچہ اشیا کی قیمتیں معلوم کرنے کے لیے ہائی سکولوں کے طلبہ سے کئی حصے کم وقت لگاتا ہے۔ پس ظاہر ہے کہ تاجر کو علم حساب کے قاعدوں اور حساب کتاب رکھنے کے طریقوں پہ مہارت کی ضرورت ہے۔

(۲) ریاضی اور کاشت کاری :۔ ایک کاشت کار کے لیے دو چیزوں کا جاننا ضروری ہے۔ اولاً اسے اپنے کھیت اور اس کی کاشت سے متعلق سب کچھ معلوم ہو۔ اسے معلوم ہو کہ اس کا کھیت کس شکل کا ہے اور اس کا

رقبہ کتنا ہے، اس کے ہر حصے کا الگ الگ رقبے کا اسے پتہ ہو، اسے یہ معلوم ہو کہ کھیت کے ہر قطعہ میں جو مختلف فصلیں بوئی جاسکتی ہیں ان کے لیے کتنے کتنے بیجوں کی ضرورت ہے۔ کتنی کھاد درکار ہے۔ اسے اس بات کا بھی علم ہونا چاہیے کہ سال بھر کے لیے اس کے مویشیوں کو کتنے بھوسے کی ضرورت ہے اور اس پر کتنا خرچ آئے گا وغیرہ۔ دوسرے اس کو مختلف منڈیوں میں جو اشیا کے نرخ ہیں اس سے بھی باخبر رہنے کی ضرورت ہے۔ تقریباً تمام اخباروں میں مختلف منڈیوں میں مختلف اشیا کے بھاؤ درج ہوتے ہیں، اسے ان نرخوں سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ آج کل تو اہم منڈیوں کے بھاؤ ریڈیو پر بھی نشر کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اچھا کاشت کار مختلف سالوں کی اپنے کھیت کی مختلف پیداوار کا حساب کتاب بھی رکھتا ہے، ان پیداواروں کی بکری سے جو آمدنی ہوتی ہے اس کا بھی حساب کتاب رکھتا ہے۔ اسے مختلف کوآپریٹو سوسائٹیوں سے قرضہ لینے۔ ان کے سود کا حساب لگانے کے طریقوں سے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے روزانہ ان کو سابقہ پڑتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک اچھے کاشتکار کو ریاضی کے کسی ایک پہلوؤں سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ مثلاً مساحت۔ سود۔ قیمتیں لگانا وغیرہ۔ یہاں یہ بتا دینا بے جا نہ ہوگا کہ زراعتی معاشیات میں تو ریاضی کا بے حد استعمال ہوتا ہے اور وہ دن دور نہیں ہے کہ زراعت کی ایک شاخ ریاضیاتی زراعت کے نام سے ظہور پذیر ہو۔

(۳) ریاضی اور معماری:۔ ریاضی معماری کی اساس ہے۔ بالخصوص ہندسی اشکال اور حساب کو معماری میں بے حد دخل ہے۔ رومن طرز معماری میں دائرے کا بے حد استعمال ہوتا ہے۔ اس طرز کی عمارتوں میں گول کھڑکیاں۔ گول محرابیں اور گول روشن دان بنائے جاتے تھے۔ گوتھک طرز معماری میں مثلث مساوی الاضلاع کا بے حد استعمال تھا۔ برجیوں میں زمین سے لے کر برجی کے مینار تک کئی جگہ تکونی کھڑکیاں اور روشندان ہوتے تھے۔ دیواروں کو بھی مثلثوں سے سجایا جاتا تھا۔ یونانیوں نے عمارتوں کو بناتے وقت ان کی لمبائی اور چوڑائی میں ایک خاص تناسب مقرر کیا تھا جس کو وہ زریں تناسب کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ زریں تناسب آنکھ کو سب سے زیادہ بھاتا ہے اور عمارت کی خوبصورتی کو دوبالا کرتا ہے۔ افغانوں، ایرانیوں اور مغلوں کی تعمیرات میں خصوصی قسم کی خم دار محرابیں اور گنبدیں ہیں۔

(۴) ریاضی اور عطاری:۔ عطاری میں جو اوزان کے پیمانے مستعمل ہیں ان پر ہر عطار کو مہارت کی ضرورت ہے وہ وہ ان پیمانوں سے واقف بھی ہو اور ان کو آپس میں آسانی سے تبدیل بھی کرنا جانتا ہو۔ جو عطار انگریزی دوائیوں کے

نسخہ جات تیار کرتے ہوں اُن کو عشری کسری نظام اوزان سے بھی پوری واقفیت کی ضرورت ہے۔ ہر عطار کو مختلف دوائیوں کے فی صد محلول بنانا پڑتے ہیں۔ ایسا کرنے میں کئی ایک ریاضیاتی کلیوں پر مہارت کی ضرورت ہے۔ تم نے اکثر حساب کی کتابوں میں آمیزش کے باب میں ایسے سوال پڑھیں ہوں گے جن میں ایک چیز کے کسی فی صد محلول کو اس کے کسی دوسرے فی صد محلول میں تبدیل کرایا گیا ہو۔ بظاہر تو یہ سوالات بے ڈھنگے سے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ایسے سوالوں کا زندگی سے یقینی ربط ہے۔ عطاروں کو روزمرہ اس قسم کے سوالوں کو حل کرنا پڑتا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے ان کو کئی ایک جبریہ کلیوں پر مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن دو جبریہ کلیوں سے ان کو زیادہ سابقہ پڑتا ہے وہ درج ذیل ہے۔

(i) کسی چیز کے ا گرام لا فی صد محلول کو ما فی صد محلول میں بدلنے کے لیے پانی کی جو مقدار چاہیے (جبکہ لا بڑا ہو ما سے) اس کو ذیل کے کلیہ سے معلوم کیا جاتا ہے۔ پانی کی مقدار = ا (لا/ما − ۱)

مثال کے طور پر اگر ہمیں 200 گرام وزنی کسی چیز کے 70 فی صد محلول کو ۴۰ فی صد محلول میں تبدیل کرنا ہو تو

پانی کی مقدار = $200\left(\frac{70}{40} - 1\right)$

$= 200\left(\frac{30}{40}\right) = \frac{3\times 200}{4} = 150$ گرام

(ii) کسی چیز کے لا فی صد محلول کو کم کر کے ما فی صد محلول میں تبدیل کرنے کے لیے محلول اور پانی کی الگ الگ مقدار معلوم کرنے (جب کہ لا بڑا ہو ما سے) کے لیے نیا محلول ن گرام ہو مندرجہ ذیل کلیات استعمال کیے جاتے ہیں۔

(ا) اصل محلول = (ن × ما)/لا اور (ب) پانی = ن(لا − ما)/لا

مثال کے طور پر اگر ہم کو کسی چیز کے 80 فی صد محلول سے 50 فی صد محلول کے 120 گرام تیار کرنا ہیں تو۔

(ا) اصل محلول = $\frac{50\times 120}{80} = 75$ گرام اور

(ب) پانی = $\frac{(50-80)\,120}{80} = \frac{30\times 120}{80} = 45$ گرام

(۴) ریاضی اور طریق کارزار: — موجودہ زمانے میں جنگ بھی سائنٹفک اور مشینی بن گئی ہے۔ جس میں ریاضی کو بے حد دخل ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج کی جنگ میں ریاضی کا ایک پونڈ بہادری کے ایک ٹن سے زیادہ کارآمد ہے۔ جنگی تربیت میں خواہ وہ پیادہ فوج کی ہو یا توپ خانہ کی۔ بحری ہو یا ہوائی، ریاضی کا بے حد اطلاق ہوتا ہے

ہوائی جہاز چلانے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ سیکسٹینٹ کا استعمال جانتا ہو۔ آواز متعین کرنے کے آلہ کا اصول ہندسی پیمائش مثلثی پر منحصر ہے، بموں کے خطوط حرکت کے سمجھنے کے لیے ریاضی کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ ہوابازی میں عددی اور علم مثلث کا بے حد استعمال ہوتا ہے۔

(۵) ریاضی اور انجینیرنگ:- انجینیرنگ کا تو دارومدار ہی طبیعیات اور ریاضی پر ہے۔ ایک سائنس دان کا مقولہ ہے کہ جب ریاضی اور طبیعیات ایک دوسرے سے منسلک کر دیے جاتے ہیں تو نظری میکانک پیدا ہو جاتی ہے، اور جب نظری میکانک بڑی ہو جاتی ہے تو یہ انجینیرنگ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کسی انجینیر سے اس مسئلہ پر گفتگو کریں کہ ریاضی کا انجینیرنگ سے کہاں تک تعلق ہے تو وہ فوراً جواب دے گا کہ انجینیرنگ خواہ وہ میکانیکل ہو یا سول ہو یا الیکٹریکل یا کسی اور ٹائپ کی سب کی اساس ریاضی ہے اور وہ بھی اعلیٰ ریاضی۔ علم الاحصاء تفرقی۔ علم الاحصاء تکمیلی۔ تکمیلی مساواتیں۔ علم مثلث۔ علم سکونیات۔ علم حرکیات۔ غرض اعلیٰ ریاضی کی قریب قریب ساری شاخیں انجینیرنگ میں کام آتی ہیں۔ لیکن وہ آپ سے فوراً یہ بھی کہے گا کہ جس کو ثانوی مدارج کی ریاضی پر عبور نہیں وہ انجینیرنگ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

(۶) ریاضی اور عام شہری:- ایک عام شہری کو خواہ وہ کسی پیشہ میں کیوں نہ ہو ریاضی کی ضرورت ہے۔ اس کو اپنا ماہانہ میزانیہ بنانا ہے۔ اپنی آمدنی اور اخراجات کا تخمینہ لگانا ہے۔ اپنے بلوں کی ادائے گی کرنا ہے۔ روزمرہ چیزوں کو خریدنا ہے اور حساب رکھنا ہے۔ ریاضی کے بغیر تو اس کا روزمرہ کا کام نہیں چلتا پھر روزانہ اخبار پڑھتے وقت بڑی بڑی رقوم کسور اعشاریہ۔ کسور عام۔ وزن اور طول کے پیمانے۔ مختلف سکہ جات۔ رقبے کے پیمانے اس کی نگاہ سے گذرتے ہیں اسے ایسی اصطلاحوں کو بھی پڑھنا پڑتا ہے جیسے فی صد۔ کمیشن۔ بیمہ وغیرہ جو سب ریاضیاتی جملے ہیں۔

الغرض ریاضی کی زندگی کے ہر شعبہ میں بے حد ضرورت ہے، اگر اس کو بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک ماہر تعلیم نے ایک مقالہ میں ریاضی کو سورج کی چمک سے مشابہ کرتے ہوئے قلم بند کیا ہے کہ یہ ہمارے تمدن کی نشو و نما میں ریاضی کا دینی حصہ ہے جیسے کہ سورج کی چمک کا ہر جاندار کی نشو و نما میں اور جیسے سورج کی چمک کی برکات سے لاشعوری طور پر ہم مستفید ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لاشعوری طور پر ریاضی کی برکات ہمیں مستفید کرتی ہیں۔

تعلیمی اور فنی قوتیں

خداداد خاں

اس وقت تمام دنیا مختلف مسائل میں الجھی ہوئی ہے اور ہر ملک اپنے حالات کے تحت ان مسائل سے نپٹنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ یہ مسائل اقتصادی، معاشی، فنی، تجارتی یا زراعتی کسی قسم کے بھی کیوں نہ ہوں۔ ان کے حل کرنے میں تمام ملکوں کا ایک ہی مقصد اور منشا ہے اور وہ ہے حصول دولت جس کے لیے ہر جگہ تگ و دو اور ہنگامے گرم ہو رہے ہیں ہر ملک یہی چاہتا ہے کہ اس کے پاس آمدنی اور دولت حاصل کرنے کے وسیع ذرائع ہوں اور اس کی ساری کوشش اور سارے منصوبے قابل عمل سمجھتا ہے۔ ان میں کہاں تک کامیاب ہو رہا ہے، چناں چہ یہ جانچنے کے لیے ہمیں اس ملک کے طبعی، جغرافیائی اور قدرتی وسائل کو دیکھنا پڑے گا۔ کیوں کہ یہی قدرتی وسائل کسی ملک کو خوش حال بنانے کا بڑا ذریعہ ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس ملک کی تعلیمی، فنی اور صنعتی صلاحیتوں کو بھی دیکھنا ہوگا، کہ ان کی مدد سے مظاہر قدرت سے کہاں تک استفادہ کیا گیا ہے، کیوں کہ ان صلاحیتوں کے بغیر قدرتی وسائل کی فراوانی کے باوجود اس ملک کا معیار زندگی پست ہوگا اور لوگ بھوک اور ہلاکت سے دوچار رہیں گے۔ فنی اور صنعتی صلاحیتوں کے بغیر ترقی، خوش حالی اور حصول دولت کی تمام کوششیں بے کار ہوں گی کیوں کہ کارخانے، مشینری، ایجاد و اختراع اور پھر کارگزاری کے لیے حسن نظام بغیر علم اور تربیت کے کب حاصل ہو سکتے ہیں! ان کے بغیر تو ترقی کے لیے ہر اقدام بے کار ہے۔ بس جس ملک میں تعلیمی اور فنی صلاحیتیں زیادہ مؤثر ہیں، وہی دولت اور ترقی بے پناہ طور پر ہوئی ہے طبعی، جغرافیائی اور موسمی حالات کی ناساعدت اس ملک کے دولت بخش مشاغل میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کر سکی اکثر دیکھا گیا ہے کہ دنیا میں ایسے ملک بھی ہیں جہاں قدرت نے لوگوں کو بے پناہ وسائل اختیار عطا کر رکھے ہیں گھنے جنگلات، بہتے ہوئے دریا، زرخیز وادیاں، خوش گوار موسم، وقت پر ہونے والی بارشیں، تیل کے ذخیرے اور معدنیات کی قدرتی نعمتیں ان کے لیے عام ہیں لیکن وہاں کے باشندے بلحاظ معیار زندگی نہایت پست ہیں اور انھیں ہمیشہ بھوک اور ہلاکت سے واسطہ رہتا ہے۔ انہوں نے ایسے ممالک کے مقابلے میں جہاں یہ قدرتی

وسائل اور لیاقتیں نسبتاً کم ہیں لیکن وہاں کے لوگ ماہر فنون اور صنعت کار ہیں ہمیشہ مات کھائی ہے۔ اور وہ محتاجوں کی طرح دوسرے ممالک کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ذیل میں ہم پانچ غریب اور پانچ امیر ملکوں کا موازنہ کرکے دیکھیں گے کہ صنعتی اور فنی طاقت کا غضب انگیز ہونا کتنا یقینی اور کتنا اٹل ہے۔ اور اس کے بغیر محض قدرتی وسائل نفع نائدہ مند نہیں ہو سکتے۔

کولمبیا۔ جنوبی امریکہ	ڈنمارک
(۱) قدرتی وسائل	(۱) قدرتی وسائل
(ا) زرخیز زمین	(ا) ریتلی زمین
(ب) معدنیات	(ب) معدنیات کی کمی
(ج) پہاڑوں اور دریاؤں کی فراوانی	(ج) محدود جنگلات
(د) ملک کے بیشتر حصوں میں معتدل اور خوش گوار موسم	(د) خراب موسم (ھ) قدرتی وسائل کی کمی
(۲) علمی اور فنی صلاحیتیں مایوس کن	(۲) اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ فنی صلاحیتیں
(۳) محدود اور قلیل آمدنی	(۳) دولت کی فراوانی

اندازہ فرمائیں کہ کولمبیا اور جنوبی امریکہ میں ضروریات زندگی کے حصول کے ذرائع خاصے ہیں۔ لاکھوں ایکڑ کی زرخیز زمین۔ تیل کے ذخائر۔ معدنیات کی کثرت۔ جنگلات کی فراوانی اور ملک کے بیشتر حصوں میں آب و ہوا کے اعتدال کی بنا پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان ملکوں میں معیار زندگی نہایت بلند ہوگا۔ لیکن فنی تربیت کے فقدان اور قدرتی وسائل سے استفادہ کرنے کی عدم صلاحیت نے طرز معاشرت پست کر دیا ہے۔ لیکن اب پچھلے چند سالوں سے کولمبیا تعلیم کو اپنا رہا ہے اس کے برعکس ڈنمارک ایک صدی پیشتر یورپ کا ایک غریب ترین اور پس ماندہ ملک تھا۔ اس کی زمین اکثر ریگ زار تھی معدنیات کی قلت۔ موسم زراعت کے مانع اور قدرتی وسائل بھی محدود تھے۔ لیکن ایسے حالات ظہور میں آئے جنھوں نے ڈنمارک کو صنعتی ملک بنا دیا۔ لوگوں کی فنی صلاحیتیں جاگ اٹھیں۔ اور صناعوں کی فنی مہارت نے معیار زندگی کو برتر بنا دیا۔ ڈنمارک کا کسان اپنے زرعی فضائل کے لحاظ سے بہت ہی نمایاں ہے۔ اور ملک میں دولت کی فراوانی ہے۔

میکسیکو

(۱) بڑے بڑے وسائل

(ا) معدنی ذخائر کی کثرت

(ب) اچھی زمینیں

(ج) آب و ہوا کا اعتدال

(د) جنگلات (ھ) تیل کی کثرت

(۲) تعلیمی اور فنی لحاظ سے پست ملک

(۳) محدود آمدنی

نیوزی لینڈ

(۱) مفید وسائل

(ا) عمدہ زمین

(ب) قدرتی دولت

(ج) اچھے جنگلات

(د) اچھی آب و ہوا۔

(۲) اعلیٰ تعلیمی اور فنی صلاحیتیں

(۳) زیادہ آمدنی والا ہمیشاں ملک

یہاں میکسیکو اور نیوزی لینڈ مساویانہ طور پر قدرتی نعمتوں سے مالامال ہیں۔ لیکن ایک کے ہاں بلحاظ تعلیم اور فن نہایت ہی پست معیار ہے، اور دوسرے میں یہی معیار غیر معمولی طور پر بلند تر۔ نیوزی لینڈ میں زرعی ترقی بھی کچھ کم قابل تعریف نہیں۔ اس سے ملک کی آمدنی میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے، اور ایک اندازے کے مطابق نیوزی لینڈ کی آمدنی دنیا کے ہر ایک ملک سے تقریباً زیادہ ہے۔ لیکن میکسیکو قدرتی وسائل یا معدنی دولت کے باوجود پس ماندہ ملک ہے کیوں؟ اس لیے کہ وہاں نہ صنعت عام ہے نہ تعلیم۔

امریکہ

(۱) بڑے بڑے وسائل

(ا) زرخیز زمینیں

(ب) معدنیات

(ج) تیل

(د) جنگلات

(۲) تعلیم اور فن نسبتاً عام

(۳) آمدنی زیادہ

برازیل

(۱) بڑے بڑے وسائل

(ا) زرخیز زمین

(ب) معدنیات

(ج) جنگلات

(د) آبی قوتیں۔

(۲) فنی طور پر پست ملک

(۳) نہایت معمولی آمدنی

برازیل کے قدرتی وسائل نہایت ہی وسیع ہیں، دس لاکھ ایکڑ کی انتہائی زرخیز زمین، بڑے بڑے معدنی ذخائر، دنیا بھر کے مشہور جنگلات اور عمارتی لکڑی کی کثرت کچھ کم نعمتیں نہیں ہیں جو یہاں کے لوگوں کو میسر ہیں۔ عظیم ترین آبی قوتیں ہر جگہ موجود، آب وہوا ہر قسم کی پیداوار کے لیے موزوں ہے اور یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ برازیل میں معیار زندگی انتہائی بلند اور آمدنی نہایت کثیر ہوگی لیکن یہ محض خیال ہی ہے، ورنہ حالت اس کے برعکس ہے۔ حالاں کہ یہاں اوسط حد کی فنی صلاحیتیں بھی عوام کو مالا مال کرنے کے لیے کافی تھیں۔ لیکن ان کے افسوس ناک فقدان نے لوگوں کو غریب تر بنا رکھا ہے اور ان کی پست زندگی دیکھ کر نہایت افسوس ہوتا ہے۔

امریکہ میں بھی اگرچہ قدرتی وسائل کی فراوانی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض علاقوں میں آمدنی اوسطاً کم اور معیار زندگی نسبتاً پست ہے۔ کیوں کہ ملک کے ان حصوں میں ابھی تعلیمی اور صنعتی صلاحیتوں کا فقدان ہے۔ اگرچہ موجودہ کوششوں کے دیکھتے ہوئے امید ہے کہ معیار زندگی ہر جگہ یکساں بلند ہو جائے گا۔

ناروے	یوگوسلاویا
(۱) ناکافی وسائل	(۱) موزوں قدرتی وسائل
(ا) نہایت بے کار زمین	(ا) مفید زمین
(ب) خراب آب وہوا اور شدید موسم	(ب) معدنیات
(ج) معمولی معدنیات	(ج) جنگلات (د) آبی قوتیں
(۲) اعلیٰ معیار تعلیم اور اعلیٰ صنعت	(۲) فن اور تعلیم کے لحاظ سے پست
(۳) زیادہ آمدنی	(۳) معمولی آمدنی

یوگوسلاویہ میں بھی خاصی زرخیز زمینیں ہیں۔ اور یہاں کافی عرصے سے زراعتی فارم بنے ہیں، یہاں کی زمینوں کے حاصل بھی خاصے ہیں۔ معدنیات بھی کچھ کم نہیں۔ جنگلات کی دولت عام اور موزوں آب وہوا کے لحاظ سے یہ ایک ایسا ملک ہے، جس پر قدرت نے اپنے وسائل کی نعمتیں عام کر رکھی ہیں، لیکن جب تک یہاں کے لوگ تعلیم اور صنعت کی اشاعت عام نہ کریں گے، ان کی آمدنی اور معیار زندگی کا پست رہنا کوئی عجیب بات نہیں۔

ناروے کی سرزمین زرعی لحاظ سے غیر مفید ہے۔ موسم نہایت شدید اور زراعت کے لیے ناموزوں

معمولی امداد کانی اور عمارتی لکڑی نایاب ہے۔ لیکن اعلیٰ قسم کے تعلیمی اور فنی نظام نے قدرتی وسائل کی کمی کے باوجود ملک کو خوش حال بنا رکھا ہے۔

سوئیٹزرلینڈ	رومانیہ
(۱) معمولی قدرتی وسائل	(۱) بڑے بڑے وسائل
(ا) پہاڑی ملک	(ا) زرخیز زمین
(ب) ناقابل کاشت زمین	(ب) جنگلات
(ج) معمولی معدنیات	(ج) خوش گوار آب و ہوا
(د) شدید موسم	(د) تیل کے ذخیرے (ھ) اچھی بارشیں
(۲) تعلیمی اور صنعتی لحاظ سے بے مثال ملک	(۲) تعلیمی اور صنعتی پستی
(۳) دولت کی فراوانی	(۳) محدود آمدنی

رومانیہ اپنے قدرتی وسائل کے لحاظ سے یورپ کا ایک بے مثال ملک ہے۔ سونا اگلنے والی زمینیں۔ عمدہ آب و ہوا۔ سمندر کے قرب کی وجہ سے تجارت میں آسانی ہے۔ اور تیل کی پیداوار کے لیے تو رومانیہ دنیا کا ایک خاص ملک ہے۔ لیکن گھٹیا درجے کی تعلیم اور صنعتی صلاحیتوں نے یہاں کی آمدنی کو بالکل ہی محدود کر رکھا ہے۔ اس کے برعکس سوئیٹزرلینڈ تمام کا تمام پہاڑی ملک ہے، یہاں کا شدید موسم کاشت کاری کے مانع ہے۔ معدنیات ناپید اور عمارتی لکڑی کا حصول خاص مشکل ہے۔ یوں سمجھیے کہ اگر سوئیٹزرلینڈ میں زیادہ آمدنی اور دولت کا حصول ممکن ہے تو پھر دنیا کے ہر حصے میں دولت کی فراوانی ممکن ہے۔ قدرتی وسائل کے لحاظ سے یہاں کی زندگی خاصی تکلیف دہ ہونی چاہیے، لیکن یہاں کے لوگ صنعتی خوبیوں کے لیے تمام دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ ایک اوسط درجے کا کاریگر اپنے اندر بے مثال صلاحیتیں رکھتا ہے۔ بلکہ ایک عام آدمی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے کاروبار کا فطری ملکہ رکھتا ہے۔ وہ بہترین ہوٹل منیجر ہے۔ ایک کامیاب کاشت کار اور اعلیٰ پائے کا گھڑی ساز ہے۔ اسی صنعتی خوبیوں نے ملک کی آمدنی کو روز بروز زیادہ کر رکھا ہے۔

جن ملکوں کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ ان میں زیادہ آمدنی اور زیادہ دولت والے ملکوں میں ایک چیز

مشترکہ طور پر یکساں نظر آتی ہے اور وہ ان کی بلند معیاری تعلیم، اعلیٰ فنی اور صنعتی صلاحیتیں ہیں۔ ان ممالک کی جتنی آمدنی زیادہ ہوتی ہے وہ اس کو اتنا ہی تعلیم اور صنعتی نظام پر زیادہ خرچ کرتے ہیں اور یہ ایک کلیہ ہے کہ جس قدر کوئی ملک دولت مند ہوگا، اتنی ہی اس کی صنعت اور تعلیم بلند معیار پر ہوگی اور حقیقت یہ ہے کہ آمدنی کے مقابلے میں تعلیم پر خرچ بہت کم ہوتا ہے۔ ملکوں کے اس مقابلے میں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ صنعتی ترقی محض تعلیم پر منحصر ہے وقت کے ساتھ ساتھ ہر ملک کے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ڈنمارک نے پچھلی ایک صدی میں جو فنی اور صنعتی ترقی کی ہے وہ دنیا کے تمام پس ماندہ ملکوں کے لیے ایک مثال ہے۔

مختلف ممالک کے وسائل آمدنی ان کے طبعی حالات کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ جن ملکوں میں قدرتی وسائل کے لحاظ سے معیشت اتنی آسان نہ تھی وہیں آمدنی اور دولت کی فراوانی ہے۔ اگرچہ بعض حالات میں اعلیٰ قدرتی وسائل کے ممالک میں دولت اور خوش حالی بھی عام ہے۔ گزشتہ صدی میں ڈنمارک کا فنی معیار بہت بڑھ گیا۔ روس نے بھی خاصی ترقی کی، وہاں صنعتی پیداوار اور دولت میں غیر معمولی اضافہ ہوا، اور ابھی یہ ملک صنعتی تعلیم کی اشاعت کے درپے ہے، یہی ترقی جاپان، جرمنی، سوئیٹزرلینڈ اور نیوزی لینڈ میں بھی ہوئی لیکن پچھلی جنگ میں جرمنی اور جاپان کو سخت نقصان ہوا ہے۔

ہمارے ہاں پاکستان میں آزادی کے بعد ابھی تک معیار زندگی افسوس ناک طور پر پست ہے، پاکستان کی بہت سی آبادی کی خوراک اور رہائش تعجب انگیز طور پر غیر موزوں ہے۔ ہمارے اکثر کاشت کار ابھی جدید آلات زراعت سے نا آشنا ہیں، صنعتی ترقی ابھی تک ابتدائی منزلوں میں ہے، اگرچہ ملک میں صنعت کی ترقی کے لیے کارخانے قائم ہو رہے ہیں۔ لیکن اگر تعلیم عام نہ ہوئی اور زندگی کے تقاضوں کے مطابق نہ ہوئی تو صنعتی ضمن میں تمام کوششیں نہ صرف بیکار ہوں گی بلکہ مہلک بھی، کیوں کہ اس سے مزدور اور سرمایہ داری کے دو گروہ از خود پیدا ہو جائیں گے، جو ملک کی سالمیت کے لیے مستقل خطرہ بن سکیں گے لیکن ہمارے تعلیمی نظام میں بہت سی بنیادی خرابیاں ہیں، جو فن اور تعلیم میں تضاد پیدا کر دیتی ہیں۔ جوں جوں ہم سمجھتے ہیں کہ معیار تعلیم زیادہ اچھا ہو رہا ہے اتنی ہی نوجوانوں میں صنعت سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ اس طرح ہمارے ہاں صنعت اور تعلیم کے راستے جدا جدا ہیں۔ حالانکہ بنیادی تعلیم کی جامع تعریف یہ ہے کہ وہ بچوں میں معاشی علوم سیکھنے کی صلاحیت پیدا کر دے تاکہ وہ مفید شہری بن سکیں

یں قدرتی وسائل مثلاً پہاڑ، دریا، زرعی پیداوار اور زرخیز زمینیں قدرت کے انمول عطیے ہیں، جن کی بدولت
ت میں ایک صنعتی انقلاب پیدا ہو سکتا ہے اور ہم دولت مند ملکوں کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔

لن معیارِ زندگی کچھ ہمارے ہاں ہی پست نہیں بلکہ امریکہ جیسے ملک میں بھی بیشتر حصوں میں ابھی تک صنعتی ہو
ی عام ہے۔ اور وہاں بتدریج ترقی کے پروگراموں پر عمل ہو رہا ہے۔ اگر کسی ملک میں ہر شخص اپنی مدد آپ کرنے
ر پر کاربند نہیں ہے تو اس ملک کی پستی کا کیا ٹھکانہ ہے؟ وہاں تو دنیا کے دوسرے ممالک سے مشینی یا دوسری
و قطعاً بے اثر اور بے مقصد ہے۔

وجودہ زمانے میں جنگ بھی فنی مظاہرہ چاہتی ہے اور اعلیٰ معیاری صنعتی ترقی کا مطالبہ کرتی ہے۔ فوج کے
فنی صلاحیتوں سے بے بہرہ ہیں تو وہ فوج بالکل بے کار ہے۔ ایک فوجی کے لیے سینکڑوں قسم کے کام ہیں جو
روری ہیں کیوں کہ موجودہ فوجی ضرورتیں آج سے پچاس سال پہلے کی فوجی ضرورتوں سے بالکل مختلف ہیں
وجی کو گیس کا علم ضروری ہے۔ اسے عجیب و غریب قسم کی مشینوں اور رائفلوں کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ایٹمی
میں لانے پڑتے ہیں اور ٹینک، ٹرک اور مشینوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ فوجی زندگی سے گذر کر عام اور
ندگی میں بھی فنی تربیت ناگزیر ہے۔ ایک صناع کو صرف مشینوں کا استعمال ہی ضروری نہیں، بلکہ اس
رورت ہے کہ مشین کی ایک ایک کل اور پرزے کی حرکت کو خوب سمجھتا ہو۔ موجودہ زرعی آلات اور مشین
ے زرعی ہتھیاروں سے کہیں زیادہ آرام دہ اور مفید ہیں۔

یہ خیال غلط ہے کہ دنیا میں صنعتی ترقی عام ہو جانے سے پاکستان کی صنعتی منزلت قائم نہ رہ سکے گی۔ دنیا کے
جس قدر زیادہ خوش حال، ترقی یافتہ اور دولت مند ہوں گے، ہم اتنے ہی زیادہ مضبوط تجارتی مراسم ان سے
یں گے۔ بلکہ تجارتی مراسم تو قائم ہی ان ملکوں سے ہو سکتے ہیں جو دولت مند ہوں گے۔ جیسا کہ ہماری موجودہ
امریکہ، ہالینڈ وغیرہ سے زیادہ ہے، اور اس کے مقابلے میں ایشیا اور افریقہ کے باقی ممالک سے نسبتاً
اور سچ تو یہ ہے کہ ننگی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا۔ غریب ممالک کی درآمد بھی ہو گی۔

اگر صنعتی انقلاب عام ہو جائے تو دنیا میں خوش حالی کا دور دورہ کوئی عجیب بات نہیں، بعض مقامات
طی افریقہ یا ایمزن کا طاس وغیرہ میں بسنے والے لوگوں کی ضروریات نہایت محدود ہیں، وہ تجارت یا تجارتی تعلقات

کے تخیل سے ہی بے بہرہ ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں کینیڈا، ملایا، جاوا، اور انگلینڈ کے ترقی یافتہ ملکوں میں تجارت کہیں زیادہ ہے، یہی وجہ زندگی کے معیار کا پست اور بلند ہونا ہے۔ اس نکتہ نظر سے پست اور غریب ممالک ترقی یافتہ ممالک کے لیے فائدہ مند ہرگز نہیں۔ یہ نظریہ عام ہونا چاہیے کہ "ہماری دولت اور خوش حالی پر ساری دنیا کی خوش حالی کا انحصار ہے، اور ہماری تنگ دستی ساری دنیا کے لیے موجب تکلیف ہو سکتی ہے"۔ کیوں کہ معاشی حالات کی مخدوش صورت دنیا کے امن کو مختل کر سکتی ہے، مختلف ملکوں کے صنعتی مسائل کی ابتری لامحالہ جنگ کا پیش خیمہ بن سکتی ہے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ دیانت دارانہ طور پر تعلیمی اور صنعت اور حرفت کے مسائل پر توجہ کی جائے جنگ اور فتوحات سے معیار زندگی کبھی بلند نہیں ہو سکتا، صرف تسخیر فطرت کے ذریعے سے ہی خوش حالی حاصل ہو سکتی ہے۔ قدرت کے خاموش مظاہر پر کنٹرول اور غلبہ حاصل کرنے میں ہی انسانی برتری کا راز ہے اور ہر ملک کی ترقی کا انحصار اسی پر ہے۔

پس تعلیمی اور صنعتی ترقی جتنی جہاں زیادہ ہوگی وہیں معیار زندگی بلند ہوگا، اور زیادہ سے زیادہ خوش حالی ہوگی زرعی پیداوار بڑھتی جائے گی۔ لباس، خوراک، مکان اور رہائش میں پاکیزگی اور خوب صورتی پیدا ہوتی رہے گی طرز معاشرت میں نت نئی اور پسندیدہ تبدیلی ہوتی جائے گی۔ اور ملک اقل قلیل مدت میں ہموار طور پر امیر بنتا چلا جائے گا ــــ الغرض تعلیمی نظام کی عمدگی وہ کارگر طریق کار ہے جو تمام مادی ترقیوں کا محور ہے، جیسا کہ امریکہ اور بعض دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں اکثر ہو رہا ہے۔ وہاں کے عوام کا اعلیٰ معیار زندگی اس کی بین شہادت ہے۔ لیکن تعلیم کا مقصد مادی مفاد سے گذر کر کچھ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اس سے انسانی نظریات اور خیالات مسلسل طور پر روشن اور پاکیزہ ہوتے رہیں اور انسان کو مقررہ تعلیم کے بعد معاشرے میں ایک مفید فرد بنا سکے۔ اس کے لیے ہمارے سکولوں میں سیکڑوں قسم کے تعلیمی تجربات کی ضرورت ہے۔ ایسے تجربات جن سے اجتماعی کام اور تعاون کے جذبات پیدا ہوں، شہریت کے اصول ہماری سکولی تعلیم کی بنیاد بن ہونی چاہئیں کیوں کہ اچھی تعلیم کا مقصد صرف یہی ہے کہ وہ قوم کے کردار پر مفید اثر ڈالے، چناں چہ اب وہ وقت ہے کہ ہم قومی زندگی پر مفید یا مہلک طور پر اثر انداز ہونے والے تعلیمی نظام کا جائزہ لیں۔ اور ہمارے نصاب کا یہ خاصہ ہو کہ وہ قومی زندگی میں ایک صحت مند تبدیلی پیدا کر دے اور یہ صحت مند تبدیلی ہی دراصل ایک عظیم الشان اور صحیح انقلاب ہے۔ جس کے آگے تقدیر بھی سپر انداز ہے اور یہی تمام مسائل اور معاشی عقدوں کا حل ہے اور کامیابیوں کے حصول کا اسم اعظم ہے۔

دوسری جماعت میں اردو کی تدریس

انور علی قریشی

میرا تجربہ ہے کہ جماعت دوم کو اردو پڑھاتے وقت بچوں کے لیے کچھ مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں جنھیں مدرس خود دور کر سکتا ہے۔ مثلاً نئے اور مشکل الفاظ کا تلفظ جنھیں بچے اچھی طرح سے نہیں پڑھ سکتے، اور نہ ہی صحیح طور پر لفظ کی ادائگی کر سکتے ہیں، اس مشکل کا حل یہ ہے کہ جماعت دوم کو اردو کا سبق پڑھاتے وقت پہلے نئے اور مشکل الفاظ کو بلیک بورڈ پر موٹا اور خوش خط لکھ دیا جائے، پھر استاد ان الفاظ کے ہجے کرتا جائے، اور تمام لڑکے اجتماعی طور پر استاد کی تقلید کرتے جائیں، جب تمام الفاظ کو تین چار دفعہ کہلوایا جائے گا تو وہ الفاظ ہوشیار طلبہ کو یاد ہو جائیں گے، اس کے بعد چند ہوشیار طلبہ سے وہ الفاظ باری باری کہلوانا شروع کر دیا جائے، اور باقی تمام جماعت ان کی اجتماعی طور پر تقلید کرتی جائے۔ اس طرح سے نئے الفاظ کی بچوں کے دماغ میں پختگی ہو جائے گی۔

جب چند ہوشیار طلبہ مذکورہ کام کر چکیں، تو مدرس کتاب کا جتنا سبق پڑھانا چاہتا ہے، اس کو خود لڑکوں کے سامنے پڑھ کر سنائے، اور جماعت کے تمام لڑکے خاموشی سے سنتے رہیں تاکہ بچوں کو پڑھتے وقت مناسب جگہ پر ٹھہرنے اور مناسب جگہ پر زور دینے کا علم ہو جائے تو اس طرح سے بچوں کو پڑھنے کا ڈھنگ آجائے گا، اور اوصاف خوش خوانی بھی پیدا ہو جائے گی۔

اب ہوشیار طلبا سے اسی طرح سبق سننا شروع کر دیا جائے جس طرح کہ مدرس پہلے پڑھنے کا نمونہ دے چکا ہے، جب تمام ہوشیار طلبہ سے تمام سبق سن لیا، تو اس کے بعد درمیانے طلبہ سے سبق سنا جائے اس کے بعد ان بچوں سے جو کمزور ہیں۔ کئی کمزور بچے بھی سبق سنانے میں کامیاب ہو جائیں گے، جو سبق سنانے سے قاصر رہیں گے، ان کو گروہوں میں تقسیم کر کے ہوشیار طلبہ کی مدد سے سبق یاد کرایا جا سکتا ہے۔

اگلے روز ہر گروہ کے ہوشیار طلبہ کو دوسرے گروہوں سے سابقہ سبق سننے کے لیے مقرر کر دیا جائے، وہ ایک دوسرے کا سبق سن لیں گے، کیوں کہ ہر جماعت میں تین درجے کے طلبہ ہوتے ہیں۔ ہوشیار، درمیانے، کمزور

پہلے روز تو تمام ہوشیار طلبہ کا سبق خود مدرس ہی سن چکا ہے اور درمیانے طلبہ کا بھی، چند ایک کمزور طلبہ تھے جن کا سبق نہیں سنا گیا تھا، وہ اس طرح سے سن لیا جائے گا۔

اگر مدرس تمام طلبہ کا سبق خود سننا چاہتا ہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے، ذرا ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ سبق پڑھانے کے بعد جب لکھائی کا وقت آئے اور لڑکے لکھائی میں خوش خطی کی مشق کر رہے ہوں تو ایک ہوشیار طالب علم کو جو کہ اپنی لکھائی کر چکا ہو لڑکوں کی نگرانی کے لیے مقرر کر دیا جائے، تاکہ سنانے والے طالب علم کے علاوہ باقی تمام لڑکے ٹھیک طور پر لکھائی کا کام کرتے رہیں، اور خود ہوشیار طلبہ کو چھوڑ کر جو صبح سبق پڑھنے کے بعد ہی اپنا پڑھا ہوا سبق سنا چکے تھے، دوسرے طلبہ کا سبق باری باری سننا شروع کر دے، اور جو لڑکا سبق سنا جائے، وہ پھر اپنی لکھائی کے کام میں مصروف ہو جائے۔ اگر کوئی لڑکا اس دوران میں اپنا لکھائی کا کام تسلی بخش نہیں کرے گا تو نگران فوراً استاد کو اطلاع کر دے گا، اور وہ خود اسے کہہ دیں گے، اول تو جب طلبہ کو پہلے لکھنے اور پڑھنے کے فوائد بتا دیے جائیں تو وہ اپنا کام خود ہی کرتے رہیں گے، اس کے لیے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بچوں کی خوش خطی کا ہر روز مقابلہ کر دیا جائے، تاکہ لکھائی میں بھی وقت ضائع نہ ہو، اور پڑھا ہوا سبق بھی سنا جا سکے گا۔ یہ ضرور ہے کہ تعلیم کا طریقہ دلچسپ ہو گر اس طریق سے پہلے پڑھنے کی رفتار سست معلوم ہو گی مگر بچوں کی پڑھنے کی رفتار بہت جلد تیز ہو جائے گی کیوں کہ جب وہ کتاب کا نصف حصہ ہجوں کے ساتھ پڑھ جائیں گے، تو ان میں پڑھنے کی مہارت کافی پیدا ہو جائے گی جو انھیں خود بخود کتاب پڑھنے کے قابل بنا دے گی، کیوں کہ بچے خود بھی گھر جا کر تمام سبقوں کو ہجوں کے ساتھ یاد کرنے کی کوشش کریں گے، کیوں کہ انھیں علم ہو گا کہ کل سابقہ سبق سے املا لکھائی جائے گی اور ہماری املا میں زیادہ غلطیاں نہ ہوں اس طرح سے نصف جماعت کی املا تو بالکل صحیح ہو گی اور کمزور بچوں کی بھی چار یا پانچ سے زیادہ غلطیاں نہ ہوں گی اور درمیانے طلبہ کی ایک ایک یا دو دو ہوں گی۔ اور پڑھنا بھی آ جائے گا، اور تمام کتاب ہی وہ ہجوں کے ساتھ یاد کر جائیں گے۔

اس طریق سے پڑھائی کی کتابیں اکتوبر کے آخر تک ختم ہو جائیں گی، جب کتاب ختم ہو جائے تو بچوں کو نصف دائرہ میں بٹھا کر ہر روز ہر ایک لڑکے سے ایک ایک صفحہ ترتیب وار انفرادی طور پر سننا شروع کر دیا، تو کتاب کی ہر روز دس بارہ کہانیاں ہر روز سنی جایا کریں گی۔ اس طرح سے ایک کتاب مہینہ بھر میں کئی بار ختم ہو گی۔ جس سے بچوں کی پڑھنے کی رفتار بہت جلد اور بہت حد تک ٹھیک ہو جائے گی، نومبر یا دسمبر سے لے کر فروری کے آخر تک

کتاب کا کافی اعادہ کرایا جا سکتا ہے، اور بچوں سے انفرادی طور پر سننے سے ان کی غلطیوں کی اصلاح بھی کافی ہو جائے گی"

ان مہینوں میں اس طرح کام کرنے سے ثابت ہو جائے گا کہ سابقہ مہینوں میں جتنا کام کرایا گیا ہے۔ اتنا کام ان مہینوں کے دنوں میں ہوتا ہوا نظر آئے گا جس سے بچوں میں روانی بھی پیدا ہو جائے گی اور صاف خوش خوانی بھی کیوں کہ پڑھنے کا اچھا وصف بھی پیدا کرنا مدرس کی ذات پر منحصر ہے۔ پڑھانا سکھانے کے لیے جماعتیں اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ مدرس کا نمونہ نہایت ضروری ہے کیوں کہ تلفظ کی اصلاح بغیر استاد کے نمونے کے نہیں ہو سکتی، اور بچوں کو ہر ایک حروف کا علیحدہ علیحدہ ٹھیک طور پر ادا کرنا بھی آ جائے گا جس سے انہیں مختلف حروف کے صحیح مخرج بھی معلوم ہو جائیں گے، اور حروف قمری و شمسی کا بھی علم ہو جائے گا چوں کہ ان حروف کے تلفظ میں اکثر بچے عام غلطی کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ تلفظ کے اصولوں سے واقف نہیں ہوتے۔

مندرجہ بالا طریقوں پر کام کرنے سے بچوں کی قراءت میں خامی باقی رہ جانے کے امکانات تقریباً ختم ہو جائیں گے ان کی ذہنیت اچھی ہو جائے گی، اور قوائے ذہنی کی صحیح طور پر نشو و نما ہو گی۔ طاقت گویائی کے نقائص دور ہو جائیں گے بچے مشکل اسباق کی الجھنوں سے بچ جائیں گے۔ بچوں کو بلند آواز سے پڑھنا آ جائے گا جس سے ان کی شرم و جھجک دور ہو جائے گی کیوں کہ بعض بچے شرم کی وجہ سے چپ رہتے ہیں اور وہ کس مپرسی کی حالت میں عمل حصہ لینا چھوڑ دیتے ہیں، اگر استاد ان کی طرف توجہ نہ دے گا تو دوسرے بچے بھی ان کو خاطر میں نہ لائیں گے اور وہ بچے احساس کمتری کا شکار ہو جائیں گے، استاد کو ان کی ترقی کے وسائل پر غور کرنا چاہیے، جب وہ جھجک چھوڑ دیں تو انہیں شاباش یا کسی اور طریقہ سے ان کی حوصلہ افزائی کر دینی چاہیے، اس سے ان کی تعلیمی حالت بہتر ہو جائے گی۔

بچوں کی تعلیمی حالت کی اطلاع ان کے والدین یا سرپرستوں کو دیتے رہنا چاہیے۔ پڑھانے سے پہلے استاد کو چاہیے کہ جو سبق وہ پڑھانا چاہتا ہے، پہلے زبانی کہانی کی صورت میں مختصر طور پر بیان کر دے۔ تاکہ بچوں میں دلچسپی پیدا ہو جائے اور بچے شوق سے سبق پڑھیں +

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

کم قیمت سائنسی لغت کی تیاری

ان ملکوں میں جہاں صنعت و حرفت اور سائنسی تحقیقات کے کام فروغ پا رہے ہیں، ایک سے زیادہ زبانوں میں سائنسی لغت تیار کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اس دشواری کو آسان کرنے کے لیے یونیسکو نے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے جس پر عمل کرنے سے کئی زبانوں میں ایک ہی لغت کی تیاری بہت کم قیمت پر ممکن ہے۔ ان لغتوں کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ دنیا کی سب زبانوں میں ہر سال کئی لاکھ کی تعداد میں سائنسی کتابیں شائع ہوتی ہیں اور ہر ملک کے سائنس دانوں کے لیے ان کو سمجھ لینا آسان نہیں ہوتا۔ لہٰذا یونیسکو کے ایک ماہر فن ڈاکٹر ہولسٹروم نے مصر میں ایک نئے طریقے کی آزمائش کی جس کے مطابق کم قیمت پر فوٹو آفسٹ کے ذریعہ لغت کی اشاعت ممکن ہو سکتی ہے۔ فی الحال عربی اور انگریزی زبان میں ایک لغت جس میں ۲۰ ہزار اصطلاحات شامل ہیں، تیار کیا گیا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر اصطلاح کی تعریف اور اس کا ترجمہ دوسری زبان میں ایک علیحدہ کارڈ پر ٹائپ کیا جاتا ہے اور پھر ان کو ترتیب سے رکھ کر ایک صفحہ بنایا جاتا ہے۔ آفسٹ کے ذریعہ اس صفحے کی پلیٹ تیار ہو جاتی ہے۔ اس طرح الفاظ کمپوز کرنے کی ضرورت نہیں رہتی اور ٹائپ کیا ہوا کارڈ دوسری جگہ بھی کام آ جاتا ہے۔ اس لغت میں انگریزی کو بنیادی زبان بنایا گیا ہے۔ باقی دوسری زبانوں میں ترجمے کے الفاظ بدلتے اور نئی پلیٹیں تیار ہوتی رہتی ہیں۔ ترجمے میں صرف ایسے الفاظ کا انتخاب کیا جاتا ہے جو مختصر مگر معنی و مفہوم کے لحاظ سے جامع ہوں۔

دل چسپ اعداد و شمار

• حال ہی میں اقوام متحدہ کے تعلیمی سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) نے عالمی اعداد و شمار اور بعض حقائق پر ایک نیا کتابچہ شائع کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے بالغ باشندوں میں کم سے کم ۴۰ فی صد ایسے لوگ شامل ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ یہ ساری دنیا کا بحیثیت مجموعی ذکر ہے۔ افریقہ کے بعض علاقوں میں ناخواندگی کا تخمینہ ۷۷ سے ۸۱ فی صد تک لگایا گیا ہے۔ یہ اندازہ ان اعداد و شمار کی بنیاد پر ہے جو مصدقہ طور پر حاصل ہو سکے ہیں۔

ابتدائی مدرسوں میں پڑھنے لکھنے والے بچوں کی عمر عموماً ۵ اور ۱۴ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ دنیا میں ایسے کل بچوں کی تعداد تقریباً ۵۰ اور ۵۵ کروڑ کے درمیان ہے۔ ان میں سے تقریباً ساڑھے چار کروڑ بچے صرف براعظم افریقہ میں آباد ہیں۔

اس سال ماہ اپریل میں ایک اندازے کے مطابق سوویٹ یونین کی آبادی ۲۰ کروڑ تھی گویا آبادی کا اوسط ۹ کس فی مربع کلومیٹر تھا۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں روس کے ابتدائی مدرسوں میں بچوں کی تعداد ۲ کروڑ ۲۴ لاکھ ۸ ۷ ہزار ۸۱۶ تھی۔ بھارت کی آبادی ۳۷ کروڑ ۷ لاکھ کے قریب ہے۔ گویا اوسط آبادی ایک سو ۱۴ کس فی مربع کلومیٹر ہے۔ بلجیم میں آبادی کا اوسط دو سو ۹ ۸ کس فی مربع کلومیٹر ہے اور انگلستان میں دو سو ۹۲ اور سار میں ۳ سو ۳ ۸ ہے۔

سنہ ۱۹۵۲ء میں تقریباً ۲ ۶ کروڑ ریڈیو ریسیور ساری دنیا میں استعمال ہو رہے تھے۔ گویا ہر ایک ہزار آدمیوں کے پاس ۹۸ سیٹ تھے۔ کوئی ۳۰ ملک ایسے ہیں جو ٹیلی وژن کے پروگرام باقاعدگی کے ساتھ نشر کرتے ہیں۔ متحرک فلم ۳۰ ملکوں میں تیار ہوتے ہیں۔

برطانیہ سے روزانہ شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد ایک سو چودہ ہے اور ان کی مجموعی اشاعت اتنی زیادہ ہے کہ ہر ہزار آدمیوں پر ۵ سو ۰ ۷ اخبارات کی اوسط پھیلتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ سے ایک ہزار ۷ سو ۶۵، فرانس سے ایک سو ۷ ۳ اور روس سے ۷ ہزار ۲ سو ۶ ۴ روزانہ اخبارات شائع ہوتے ہیں۔

اعداد و شمار کے نقشوں میں کتابوں، لائبریریوں اور عجائب گھروں کا بھی ذکر ہے۔ اور وقت ضرورت ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

عرب خواتین اور پیشہ معلمی

مہاجرین فلسطین سے متعلق اقوام متحدہ کے ادارۂ بحالیات و امور (انروا) اور یونیسکو نے اردن میں استادوں کی تربیت کے لیے ایک تجرباتی پروگرام شروع کیا تھا اور اس مقصد کے لیے امریکہ کے ایک ماہر تعلیمی نفسیات پروفیسر آرتھر روکو ایک سال کے لیے اس ملک میں بھیجا تھا۔ ان کی تازہ ترین رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عرب خواتین زیادہ ذوق شوق کے ساتھ معلمی کے پیشے میں دلچسپی لیتی ہیں۔ پروفیسر موصوف ریاست ہائے متحدہ کے استادوں کے ایک کالج میں شعبۂ تعلیمات و نفسیات کے صدر تھے۔ اور اب اردن میں خدمات انجام دینے کے بعد

اسی منصب پر واپس چلے گئے ہیں۔

تجرباتی پروگرام کے تحت استادوں کی تربیت کے دوم کو کام کر رہے ہیں۔ اس پروگرام کے مطابق دو سال کا نصاب تیار کیا جا رہا ہے۔ مردوں کے لیے پروگرام کا تجرباتی دور ختم ہو چکا ہے اور اب رملہ میں ایک کالج قائم کیا جانے والا ہے جہاں ایک سو استادوں کی تربیت ہو گی اور وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اردن کے رہنے والے عرب مہاجرین کے بچوں کو تعلیم دیں گے۔ لڑکیوں کی تربیت کا تجرباتی پروگرام ابھی ایک سال اور جاری رہے گا۔

ہر سال ۵۰ مردوں اور ۲۰ عورتوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ مردوں کے لیے سات معلم مقرر ہیں جن کے پرنسپل یروشلم کے پروفیسر جمال بدیری ہیں۔ لڑکیوں کے لیے بھی سات استانیوں کا عملہ ہے جن کی پرنسپل نابلوس کی رہنے والی مس یسرو صالح ہیں۔ ان چالیس طلبا کی تربیت اس لیے کامیاب رہی کہ خود عرب معلمین نے اس منصوبے میں خاص دلچسپی لی ہے۔ پروفیسر رڈو نے لکھا ہے کہ عرب باشندوں کا حافظہ ایک علیہ خداوندی ہے۔ لیکن پروگرام مرتب کرتے وقت اس امر کا لحاظ رکھا گیا کہ لوگ اس روایتی صلاحیت سے زیادہ کام نہ لیں۔

مردوں اور عورتوں کو موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے اور عورتوں کو قومی ناچ بھی سکھائے جاتے ہیں۔ ذریعۂ تعلیم عربی ہے۔ مرکزوں میں عربی اور انگریزی زبانوں کے علاوہ سائنس، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، اور حفظانِ صحت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لڑکیوں کے لیے امورِ خانہ داری کی تربیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

پروفیسر رڈو کا کہنا ہے کہ اکثر لڑکیاں معلمی کو ایک عمدہ اور معزز پیشہ سمجھتی ہیں، اس سے قبل اُردن میں خواتین کے لیے اس پیشے کا رواج عام نہیں تھا۔

استادوں کی تربیت کے منصوبے اور مہاجرین اردن کے مسائل پر ایک ساتھ تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر رڈو نے کہا، یہ سلسلہ ہے کہ مہاجرین تعلیمی منصوبوں کے حامی ہیں اور کیمپوں میں تعلیم کا بہت زیادہ چرچا ہے اور نوجوان خاص طور پر اس میں حصہ لے رہے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کی یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز

اقوامِ متحدہ کے قائم مقام ڈائرکٹر جنرل سر ہربرٹ برو ڈے نے ادارے کی کونسل کو مخاطب کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ اقوامِ متحدہ کے زیرِ اہتمام ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے امکانات پر غور کیا جائے تاکہ ممبر ملکوں میں سرکاری نظم و نسق

کے لیے طلبہ کو مناسب تربیت دی جا سکے اور وہ تربیت بین الاقوامی بنیاد پر ہو۔ اس سے قبل اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے بھی فنی امداد کی سول سروس کے نام سے ایک اسکیم پیش کی تھی جس پر اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے اجلاس میں غور کیا گیا تھا۔ سر پروڈسٹ نے کہا فی الحال یہ خیال محض ایک خواب ہے۔ لیکن اس کی تعبیر حسب منشا نکل آئی تو دنیا بھر کے ان طلبا کو فائدہ پہونچے گا جو اپنے ملک کے نظم و نسق میں حصہ لینا چاہتے ہیں، اسی سے ملتی جلتی دو اور تجویزیں پہلے بھی پیش ہوئی ہیں۔ ایک کے محرک کینیڈا کے وزیر امور خارجہ اور دوسری کے محرک فرانس کے وزیر خارجہ تھے۔

یونی سیف کی خدمات کا مرقع

اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونی سیف) کی ۱۹۵۶ء کی خدمات کا مرقع "یونی سیف کیلنڈیم" کے نام سے شائع ہو گیا ہے اور اقوام متحدہ کے مرکز اطلاعات کراچی میں اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ مرقع دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یونی سیف کیا ہے اور کیا کام کرتا ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۵۰ء سے اب تک یونی سیف کی ۸۰ فی صد امداد چھوت کی بیماریوں کی روک تھام اور ایسے ہی دوسرے کاموں کے لیے دی گئی ہے۔ ان خدمات کو نقشوں اور خاکوں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے۔

اسی حصے کا ایک اور باب یونی سیف کے مالیات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس ادارے کے لیے روپیہ کس طرح جمع ہوتا ہے اور کس لحاظ سے تقسیم کیا جاتا ہے۔

دوسرے حصے میں جو اس سال علیحدہ کتابچے کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ افریقہ۔ ایشیا۔ مشرقی بحیرۂ روم کے علاقے، یورپ اور امریکہ کے الگ الگ ملکوں کا ذکر ہے اور بچوں کی صحت اور تندرستی اور نگہداشتوں کے پروگراموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہر ملک کے اعداد و شمار میں کل آبادی، بچوں کی آبادی۔ ابتدائی مدرسوں میں طلبہ کی تعداد۔ بچوں کی شرح اموات۔ آبادی کا تناسب۔ آبادی کے لحاظ سے معالجین کی تعداد کا تناسب اور یونی سیف کی طرف سے اب تک دی ہوئی امدادی رقوم کا ذکر ہے، ملک میں بچوں کی صحت کے معیار اور فنڈ کی خدمات کی تفصیل بھی درج کی گئی ہے

ایک علیحدہ حصے میں درج ہے کہ یونی سیف نے جسے ۱۹۴۶ء میں قائم کیا گیا تھا، اب تک ۱۱۲ ملکوں اور علاقوں میں کام کیا ہے۔ اس وقت ۹۵ ملک امداد پا رہے ہیں، اور حال ہی میں اس صف ۱۷ اور ملکوں کا اضافہ ہوا ہے۔

یونی سیف پاکستان میں

اقوام متحدہ کے بچوں کا فنڈ جو یونی سیف کے نام سے جانا جاتا ہے، اقوام متحدہ کے ان اداروں میں سے ایک ہے جو اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کام کر رہے ہیں ۹۵ ملکوں اور علاقوں میں بچوں اور ماؤں کی صحت و بہتری میں کوشاں یونی سیف دنیا کا سب سے بڑا بین الاقوامی ادارہ ہے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اسے ۱۹۴۶ء میں قائم کیا۔ اس کا انتظام ۲۷ اقوام پر مشتمل ایک مجلس عاملہ کرتی ہے جس کا سال میں دو مرتبہ اجلاس ہوتا ہے، یہ طے کرنے کے لیے کہ ان ملکوں میں جو امداد چاہتے ہیں کس طرح سامان کی تقسیم کی جائے۔ پاکستان مجلس عاملہ کا ممبر ہے۔ اس سال یہاں کی نمائندگی مسٹر ایم شفقت اور مسٹر این نائک کر رہے ہیں۔

بچوں کی صحت:۔ نو سال قبل جب پاکستان قائم ہوا تو اس کو ان تمام مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جو نئی آزاد قوم کو پیش ہوتی ہیں تب سے اب تک کافی ترقی ہو چکی ہے۔ یونی سیف فخر محسوس کرتا ہے کہ وہ بچوں کی صحت کے سلسلے میں اس کی ترقی میں مدد رہا ہے۔

پاکستان میں بچوں کی صحت کا مسئلہ وسیع ہے۔ ملک کی آبادی ۸ کروڑ ہے۔ تقریباً چالیس فی صد بچے ہیں ۷۳ ہزار کی آبادی میں صرف ایک ڈاکٹر ہے۔ مشرقی بنگال میں جہاں ۴ کروڑ ۳۱ لاکھ انسان بستے ہیں وہاں صرف ۸۷ تربیت یافتہ نرسیں سرکاری ملازمت میں ہیں اور غالباً ایک یا دو درجن غیر سرکاری اداروں میں۔ مغربی پنجاب میں نصف موتیں ۱۰ سال سے کم عمر بچوں میں ہوتی ہیں۔ بہت ہی کم بچے پدرانہ نگہداشت حاصل کر پاتے ہیں۔ زندگی کا اوسط ۲۴ اور ۲۷ سال ہوتا ہے۔

۱۲ نکات:۔ یونی سیف کی امداد ۱۹۴۹ء میں شروع ہوئی۔ اب تک یونی سیف ۵ لاکھ ۲۷ ہزار ایک سو ۱۰ ڈالر (دو کروڑ ۴۱ لاکھ ۱۵ ہزار ایک سو پچاس روپے) سے پاکستان کی مدد کر چکا ہے۔ اب ۱۲ پروگراموں پر عمل ہو رہا ہے۔ یونی سیف مختلف قسم کی امداد دے رہا ہے جس میں چاول، ڈی۔ڈی۔ٹی۔ ایکس رے مشین اور پنسلین بنانے کا سامان شامل ہے۔

یونی سیف کے تمام امدادی منصوبے حکومت پاکستان کے پروگرام ہیں۔ حکومت پاکستان مقامی کام کرنے والے

عمارت اور مقامی بنی ہوئی چیزیں بہم مہیا کرتی ہے۔ یونی سیف درآمد کی ہوئی دوائیں، گاڑیاں اور دوسرے سامان مہیا کرتا ہے
اقوام متحدہ کی دوسری شاخ عالمی ادارۂ صحت طبی پروگرام میں فنی مشورے دیتا ہے۔

چار قسمیں :- پروگراموں کو چار عام حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) امراض کی روک تھام۔ ماؤں اور بچوں کی صحت میں ترقی، طبی سامان کی تیاری اور فوری امداد۔

بڑے امراض کے خلاف جنگ کرنے میں یونی سیف اپنی کوششیں مخصوص طور پر بچوں کے امراض تک محدود رکھتا ہے اور جن کی بڑے پیمانے پر روک تھام کی جا سکتی ہے۔

یونی سیف حکومت کو ملیریا، تپ دق اور ٹائیفس کی روک تھام کے لیے مدد دے رہا ہے۔ اب تک پینتیس لاکھ جانیں یونی سیف کے فراہم کیے ہوئے ڈی ڈی ٹی کی مدد سے ملیریا سے بچائی جا سکی ہیں۔ حکومت امریکہ بھی حکومت پاکستان کو ملیریا کے خلاف جدوجہد میں مدد دے رہی ہے۔ توقع ہے کہ اس سال کے آخر تک کوئی ایک کروڑ پچاس لاکھ نفوس اس مرض کے حملوں سے محفوظ کر لیے جائیں گے۔

تپ دق کے خلاف جنگ :- تپ دق کے خلاف بی سی جی کے ٹیکوں کی مہم ایک کروڑ ۸۰ لاکھ کم سنوں سے زیادہ تک پہنچ چکی ہے، اور ۷۰ لاکھ ضرورت مندوں کو ٹیکے لگائے جا چکے ہیں، تپ دق کے متعدد دوا خانے یونی سیف کی مہیا کی ہوئی دواؤں- ایکس رے اور تجربہ گاہ کے سامان سے قائم ہو چکے ہیں۔ تقریباً دس لاکھ انسان ان دواؤں سے مستفید ہو چکے ہیں

بنیادی مسئلہ :- بچوں کی صحت کے مسئلہ کو بنیادی طور پر حل کرنے کے لیے یونی سیف حکومت کو بچوں اور ماؤں کے صحت کے مرکز کو بہتر بنانے اور انھیں وسیع کرنے میں مدد دے رہا ہے۔ سارے ملک میں پھیلے ہوئے کوئی تین سو مرکز یونی سیف کے سامان سے آراستہ ہوں گے اور تین سو پچاس مرکز، دوائیں، دودھ، حیاتین کی گولیاں اس سال کے آخر تک یونی سیف سے حاصل کریں گے۔ کراچی۔ ڈھاکہ۔ کوئٹہ، پشاور اور ڈیرہ اسماعیل خان کے متعدد اسپتالوں کو یونی سیف کا سامان دیا گیا ہے۔

سکولوں میں طبی امداد کی تقویت کے لیے ۷۰ جماعتیں ملک کے اہم مقامات پر موجود ہیں اور پابندی سے سکولوں اور طلبہ کا طبی معائنہ کر رہی ہیں اور صحت اور جسمانی تربیت کی نگرانی میں معروف ہیں۔

دایاؤں اور نرسوں کی تربیت کے لیے، لاہور، کراچی، پشاور اور ڈھاکہ میں مراکز قائم ہیں۔ لاہور کا مرکز بغیر WHO کے مشیر اور یونی سیف کی نئی امداد کے، پورے طور پر حکومت پاکستان کے زیر اہتمام چل رہا ہے۔

دوررس فوائد:۔ طبی ضروریات کو مسلسل طور پر پورا کرنے کے نقطہ نظر سے یونی سیف نے نوشہرہ میں ایک ڈی ڈی ٹی کے کارخانہ کے لیے ساز و سامان مہیا کیا ہے، یہ کارخانہ اس سال سو ٹن ڈی۔ڈی۔ٹی تیار کر رہا ہے اور جلد ہی ۷۰۰ ٹن تیار کرنے لگے گا۔ پنسلین کے ایک کارخانہ کی تعمیر کا کام داؤد خیل میں شروع ہو چکا ہے اور یونی سیف کی طرف سے سامان دیا جا چکا ہے، نئے کارخانہ کو ۱۹۵۸ء میں کام شروع کر دینا چاہیے۔ کراچی کے ڈفتھیریا کے ۲۵x۵۱۵ بنانے کے کارخانے نے کچھ ہی دن ہوئے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کا سامان یونی سیف نے مہیا کیا۔

اس سال مشرقی پاکستان میں غلہ کی شدید قلت پر یونی سیف نے فوراً تھائی لینڈ سے ۳۰۶۷ ٹن چاول منگوا کر ۱۱۶،۰۰۰ بچوں اور حاملہ یا زچہ ماؤں میں تین کٹھن مہینوں تک تقسیم کیا۔

۹۵ ملکوں اور علاقوں کی مدد کی گئی:۔ پاکستان ۹۵ ملکوں اور علاقوں میں سے ایک ہے جہاں یونی سیف بچوں کو مدد دے رہا ہے۔ صرف ایشیا میں ۱۳ ملکوں اور ۱۰ علاقوں کو یونی سف کی امداد ملتی ہے۔

یونی سیف کی امداد کی حیثیت مستقل ہے۔ کسی بچے کو تپ دق سے محفوظ رکھنا یا کسی ماں کو اپنے بچے کی صحیح پرورش کرنا سکھانا دوررس فائدے دیتا ہے، اور فوائد صرف جذباتی نہیں، اقتصادی بھی ہیں۔ بیمار بچہ خاندان کے لیے بوجھ ہوتا ہے۔ بیمار آدمی اپنی جماعت کے لیے بوجھ ہے۔ اگر یہ تعداد سیکڑوں اور ہزاروں تک پہنچے تو قوم کی معیشت پر اثر پڑتا ہے۔

آغاز کی ابتدا:۔ یونی سیف نے کروڑوں بچوں کو فائدہ پہنچایا ہے، جس کی صورت میں ساری دنیا سے چندہ اور امداد اکٹھا کر کے اور جہاں سب سے زیادہ ضرورت ہو بچوں کی صحت کے لیے اور ان کی بہبود کے منصوبوں کے لیے تقسیم کر کے۔ اس سال یونی سیف کی امداد ساری دنیا کے ۵۹۳۰۰۰۰۰ بچوں تک پہنچ رہی ہے۔ یہ بہت بڑی تعداد ضرور ہے لیکن ضرورت کے لحاظ سے کامیابی بہت کم ہے۔ دنیا کے نوّے کروڑ بچوں میں سے دو تہائی ابھی تک زندگی کی ابتدائی ضروریات سے محروم ہیں۔ انہیں مناسب غذا، کپڑے اور امراض سے پناہ نہیں ملتی۔ یونی سیف کا کام ابھی شروع ہوا ہے، اور یہ ایک آغاز کی ابتدا ہے ؎

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل
آموزش

۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)